



پچی کہانیاں آپ بیتیاں جگ بیتیاں

کراچی

سنگرز شہت

ماہنامہ

مارچ 2013

نگران اعلیٰ

معراج و عمل

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

بایں مختلف تجرکوں کو اکٹھا کر کے
کامیابیت میں لے جانے والی ممالک کے غیر ملکی خبریں
پے اور معاہدگی میٹر میں زندگی گزارتی رہی

www.paksociety.com

خود ساز

ادارہ

ایک صفحہ میں مکمل، مختصر، مختصر
ایک نادر روزگار کا تعارف

عکس زندگی

کالی قسمت

ابن کبیر

اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل
کی لسانی ٹیلی ویژن سیریز میں زندگی گزار دی

خراج تحسین

سپراسٹار

شاہد جہانگیر شاہد

خاموش سلیم کا سپراسٹار جرنل
پشاور میں جنم لیا، سیل پر دو خاک ہے

سفر کشانی

افریقا اور افریقا

الطاف شینخ

افریقا کا وہ رخ جسے عام
طو پر دیکھ لیا، نہیں جانتا

شہر خیال

مدیر اعلیٰ

آپ کی باتیں آپ کے خیال آپ
کے مشورے اور آپ کے سوال

حالات و واقعات

نصیب خفتہ

شکیل صدیقی

وہ ارب پتی مصنف تھا
لیکن ہر اتوا تھا حلالی تھا

تحقیق

تلاش مرقد

مختار آزاد

ملکہ سلویطہ کی قبر خسر
ہے کہیں ایک محقق کی روداد

معلومات

سحر ساحری

امجد اوسلو

جادوئی کی اصل حقیقت کیا ہے؟
کیا اس علم میں قوت ہے؟

بابے خشتاں

ڈاکٹر ساجد امجد

زندگی کو برتنے والی ایک
اہم شخصیت کا زندگی نامہ

نظم و صحافت

فلمی الفیلہ

علی سفیان آفاقی

فلم و صحافت کی کہی ان کہی کہانیاں،
فلم نگری کی باتیں، یادیں

داستان عشق

لازوال محبتیں

منزہ قادری عطاری

محبت کے بحر میں ڈوب
کرنا پسند کرنے والوں کا انداز

مہم جونی

تلاش

طارق عزیز

اس دور کا قصہ جب لوگوں
کو نیکی و وسعت کا اندازہ نہ تھا

سراب

کاشف زبیر

بلند حوصلوں اور بے مثل ولولوں
سے گندھی تہلکہ خیز داستان

پہلی سچ بیانی

تلافی

امجد

وہ اپنے جبر کی تلافی کے لئے مجبور
تھا ہوا اس نے ایسا کر دیکھا

چوتھی سچ بیانی

ڈالما

ابرار

ایک ڈرامے نے اس کی زندگی
بدل دی اور وہ بد گزیر بن گیا

ساتویں سچ بیانی

بیٹی

امجد

بسی خدا کی مغسرت ہے
جسے سمجھنے کے لیے وقت چاہیے

بیت بازی

قارئین

شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے
والوں کے لیے ایک دلچسپ سلسلہ

دوسری سچ بیانی

ڈیوٹی

عدنان

ایک دلچسپ الگ انداز کی سچ بیانی
اپنی ڈیوٹی نبھانے کے لیے پیدا ہوا ہے

پانچویں سچ بیانی

قصور

زلیخا

اس کا قصور کیا تھا کوئی بتائے
گا؟ کیونکہ زندگی تلخ ہو گئی تھی

آٹھویں سچ بیانی

جرم

خورشید عالم

کس نوعیت کے تھے یہ جرم؟ ایسے
انوکھے قصے سرگزشت کا خاصہ ہے

علمی آزمائش

ادارہ

ذہین قارئین کے ذوق جستجو کی
تسکین کے لیے منفرد انعامی سلسلہ

تیسری سچ بیانی

چور

آصفہ ضیا احمد

ایک انوکھے چور کا قصہ
عجیب وہ انسان نہیں تھا

چھٹی سچ بیانی

نجمہ جارفتن

فریدی

وہ باپ بیٹے عجیب نمٹے میٹھے تھے
کیونکہ محلے والوں نے زندگی بھر کی تھی

نویں سچ بیانی

قسمت

ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری

ایک ایسٹرن ڈراموں کی داستان وہ
موت کو شکست دے کر آیا تو...

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور
تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر
آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

ماہ نامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں، کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس کے کسی بھی حصے
کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔
تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کئے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح سے ذمہ دار نہ ہوگا۔

21 فروری 1865ء کو گوجرانوالہ کے ایک انتہائی غریب گھر میں اس نے جنم لیا۔ گھرانہ اتنا غریب تھا کہ اس گھر کو روشن کرنے کے لیے چراغ کا تیل خریدنا بھی مشکل تھا اس لیے اس نے اندھیرے کمرے میں آنکھ کھولی تھی، غربت کی گود میں پل کر وہ ہوش مندی کی منزل تک پہنچا۔ غربت کے بوجھ تلے دبے، کراہتے سکتے اس خاندان کے کسی بچے کا تعلیم حاصل کرنا ایک ناممکن سی بات تھی۔ یوں بھی اس دور میں تعلیمی رجحان کا فقدان تھا۔ اچھے اچھے گھروں کے بچے جہالت میں گھرے خوش ہوتے۔ الف ب ت کو بزدلی کی علامت قرار دیتے۔ خواہ خواہ کی کھاوت کھڑی تھی کہ علم حاصل کرنے سے انسان بزدل بن جاتا ہے۔ اس دور میں کسی بچے کا، وہ بھی ایک ایسے گھرانے کے بچے کا جسے دو وقت بھر پیٹ کھانا بھی نصیب نہ ہوتا ہو تعلیم کی طرف رجحان ایک حیرت انگیز بات تھی۔ وہ اپنے طور پر، کسی کی مدد لیے بغیر خود ہی پڑھتا رہا، کبھی اس کے پاس تو کبھی اس کے پاس جا کر اچھڑکتا تھا پھر 12 سال کی عمر میں وہ اپنے چچا احمد دین کے ساتھ گوجرانوالہ سے لاہور چلا آیا۔ اس دور میں لاہور مغربی ہند کا شہر العروس تھا۔ اس سے بڑا کوئی شہر نہ تھا، ترقی کے وہاں مواقع بھی تھے۔ لاہور آ کر اس نے تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دی۔۔۔۔۔ چچا سے اپنے کام میں مدد لینے کے لیے لے کر آئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ایک مفت کا نوکر ہاتھ آ گیا ہے۔ اس نے بھی کبھی خدمت میں کوتاہی نہیں کی۔ کسی کام سے جی نہ چڑایا مگر پڑھائی کی طرف سے بھی غافل نہ رہا، خود ہی محنت کرتا رہا اور فاضل کا امتحان دیا۔ اس نے یہ امتحان اپنی محنت اور قابلیت سے دیا تھا۔ کسی استاد سے مدد نہیں لی تھی صرف کبھی کبھی چچا سے تھوڑی بہت مدد لے لیتا تھا۔ پھر بھی اس نے اس امتحان میں امتیازی حیثیت حاصل کر لی۔ بہت زیادہ نمبر حاصل کیے۔ اس کامیابی پر اسے یونیورسٹی سے نقد انعام ملا۔ نہ صرف نقد رقم بلکہ قیمتی کتابیں بھی یونیورسٹی نے فراہم کیں۔ یہ ایک بہت بڑی اور تاریخی بات تھی کہ کسی ہندی مسلمان کو یہ اعزاز ملا۔ مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن گھریلو فتنے واریاں بھی سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ ان کا مقابلہ بھی کرنا تھا۔ چچا مولوی احمد دین نسبتاً خوشحال تھے تو انہوں نے استطاعت بھر مدد کر دی تھی۔ اب تمام تر ذمے داری اسے ہی اٹھانی تھی اور وہ ذمے داری اٹھانے پر مجبور بھی تھا کہ یہ اس کا فرض بھی تھا۔ چچا کے پریس میں کام کرنے پر مزدوری بھی ملتی تھی جسے وہ پورا کا پورا گھر بھیج دیتا تھا۔ پریس میں کام کرتے کرتے اس کام میں دسترس حاصل کر چکا تھا۔ یوں بھی چچا اب عمر کی اس منزل پر پہنچ چکے تھے جہاں بیٹے کو آرام کی طلب زیادہ ہوجاتی ہے۔ تو یہی جواب دینے لگتے ہیں بھتیجا اب اس قابل ہو چکا ہے کہ وہ پریس سنبھال لے، اس بات کا اور اک انہیں ہو چکا تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد انہوں نے پریس پر سے ہاتھ اٹھالیا اور کئی طور پر اسے بیٹے کے حوالے کر دیا۔ بیٹے کا عقل میں چچا سے سوا تھا اس نے پریس کا بیج استعمال کیا۔ اس پریس کو دوسرے لوگوں کی چیزیں چھاپنے کے لیے وقف نہ رکھا۔ اس نے اپنا کام شروع کرنے پر غور کیا۔ ہر کام کے لیے سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے جس کی اس کے پاس بہت زیادہ کمی تھی مگر اس کے پاس دماغ تھا۔ وہ غور و فکر کرتا رہا بالآخر اس نے اخبار نکالنا شروع کر دیا۔ اخبار کے کام میں بہت زیادہ جدت تھی۔ اخبار کا نام علم یا علم سے جڑی چیزوں پر نہیں رکھا۔ نہ اس کا نام فکروں سے جوڑا بلکہ اخبار کا نام ”پیشا“ رکھا جو صرف ایک پیسے میں بکتا تھا۔ اخبار کو کچھ ایسا انداز دیا کہ وہ دیکھتے ہی دیکھتے ہندوستان بھر کے معاصر اخبارات سے آگے نکلنے لگا۔ گوجرانوالہ میں رہ کر ”پیشا“ وہ کامیابی حاصل نہیں کر پا رہا تھا جو اسے مطلوب تھی۔ کافی غور و خوض کے بعد اس نے اپنا پریس گوجرانوالہ سے لاہور منتقل کرنے کی ٹھانی اور لاہور چلا آیا۔ ایک معقول جگہ بھی نظر آ گئی۔ وہ جگہ حاصل کی پھر پریس کو لاہور منتقل کر دیا۔ یہ فیصلہ بروقت اور دانشمندانہ تھا۔ لاہور سے شائع ہوتے ہی ”پیشا اخبار“ نے مقبولیت کی معراج حاصل کر لی۔ ہر کوئی اسے پسند کرنے لگا تھا۔ دہلی، امرتسر کے اخبارات جو اس وقت لاہور میں خاصے مقبول تھے ان کی مقبولیت کم ہوتی چلی گئی۔ اخبار کی مقبولیت بڑھی تو آمدنی کا راستہ بھی کھلا۔ اب اس نے طباعت کے دوسرے شعبوں پر بھی توجہ دینا ضروری سمجھا اور کتابیں بھی شائع کرنے لگا۔ اس کے مکتبہ سے شائع ہونے والی کتابیں بھی پسند کی جانے لگیں کیونکہ طباعت کا معیار بہت اعلیٰ تھا پھر طباعتی مواد بھی کافی دماغ سوزی کے بعد وہ آگے بھیجتا تھا۔ پھر اس نے ماہنامہ پرچوں کی جانب توجہ دینی بچوں کا اخبار ”انتخاب“ لا جواب“ اور ”شریف بی بی“ کے نام سے رسائل شائع کرنے لگا۔ یہ رسائل بھی کامیابی کی ضمانت بن گئے۔ گھر گھر میں پسند کیے جانے لگے لیکن پیشا اخبار کی تو اب بھی بات الگ تھی، لوگ اس کے عادی بن گئے تھے۔ خود بھی انشائیہ لکھتا اور بہت اچھا لکھتا پھر تقریر بھی بہت اچھی کرتا تھا جس کی وجہ سے ہر بڑے جلسے میں جو مسلمانان ہند کے مسائل پر۔۔۔۔۔ منعقد ہوتے وہاں سے خصوصی طور پر دعوت نامے آتے۔ یورپ سے بھی دعوت نامہ آتا۔ یورپ کی سیاحت کا احوال ”سفر نامہ یورپ“ میں بڑے دلچسپ انداز میں لکھا جو عرصہ تک قطار شائع ہوتا رہا۔ 1912ء میں حج بیت اللہ پر بھی گیا۔ برصغیر میں پہلا اسلامی انسائیکلو پیڈیا بھی شائع کیا۔ بطور سماجی کارکن اور قلم کار شہرت کی بلندی حاصل کرنے والے اس خود سازی کے پیکر کا نام مولوی محبوب عالم تھا جس نے 23 مئی 1933ء کو اس دنیا سے رشتہ توڑا۔

قارئین کرام!
السلام علیکم!

میرے سامنے ایک معروف روزنامے میں شائع شدہ مولانا محمد خان شیرانی کا تحریر کردہ کالم ہے۔ وہ اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین ہیں، لکھتے ہیں کہ ”1992ء میں جب مجاہدین نے افغانستان میں ایک سپر پاور کو دوسری سپر طاقت میں بدلنے سے انکار کیا تو مغربی ممالک نے جہاد کا غلط استعمال کروایا اور بہت سے گروپ بنادے۔ میں اس دہشت گردی کو خانہ جنگی کا نام دیتا ہوں۔“ یہ مولانا کا اپنا نظریہ، اپنی معلومات ہو سکتی ہے لیکن ہم یہ ضرور کہیں گے کہ مغرب نے ایک بار پھر وہی چال چلی ہے جو کبھی ہسپانیہ میں اور کبھی بغداد کا عروج ختم کرنے کے لیے چلی گئی تھی یعنی جب جب مسلمان علم و فن میں عروج حاصل کر کے ترقی کے راستے پر چل پڑتے ہیں، دشمن نفاق کا سہارا لے کر انتشار پھیلا دیتا ہے اور مسلمان آپس میں دست و گریباں ہو کر اپنی تباہی کو آواز دینے لگتے ہیں۔ تقریباً 200 سال کی غلامی کے بعد نہ جانے کن کن برگزیدہ بندوں کی دعاؤں کے طفیل ہمیں ایک آزاد وطن نصیب ہوا مگر یہاں بھی آستین کے سانپ در آئے اور کلمہ گو کو کلمہ گو کے خون کا پیاسا۔۔۔ بننے لگے ہیں جس کا نتیجہ کونٹہ اور کراچی سمیت پورے پاکستان میں نظر آرہا ہے۔ ایسا کوئی دن نہیں گزرتا جب کسی کلمہ گو کے سینے میں کسی کلمہ گو کی گولی نہیں اترتی۔ ایسے وقت میں حبیب جالب کا یہ شعر بہت یاد آتا ہے۔

محبت گولیوں سے بو رہے ہو
وطن کا چہرہ خوں سے دھو رہے ہو
گماں تم کو کہ رست کٹ رہا ہے
یقین مجھ کو کہ منزل کھو رہے ہو

معراج رسول

مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول
مصورہ: شاہ حسین

شعبہ اشتہارات

نیوز اشتہارات عثمانیہ 0333-2256789
نمائندہ کراچی محمود شان خان 0333-2168391
رانہ حمید 0323-2895528
نمائندہ لاہور خزانہ ملی تلاش 0300-4214400

♦♦♦

قیمت فی پرچہ 60 روپے • زیر سالانہ 700 روپے

پبلشر و پریپر انشر: عذرا رسول

مقام اشاعت: C-63، فیز 11 ایکس ٹینشن
ڈپٹی سیکرٹری یونین کوریڈو
کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابن جن پرنٹنگ پریس

ہاکی اسٹڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا • پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone: 35804200 Fax: 35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com



شہر خیال



عجاز حسین لدھیانہ کی کچی کھوہ خانیوال سے شرکت آوری "فردری کا سرگزشت اپنی تمام تر اعلیٰ سمیت ہاتھوں میں ہے۔ پچھلے کچھ عرصہ سے اپنی تمام تر خواہش کے باوجود شہر خیال کی محفل میں حاضری نہیں دے سکا ہوں جس کا افسوس ہے۔ معراج رسول صاحب کی باتیں سیدھی دل پر اثر کرنے والی ہیں۔ ملک کو نہ جانے کس کی نظر لگ گئی ہے۔ ایک بحران سے نکلنے میں تو دوسرا سامنے منہ کھولے کھڑا ہوتا ہے۔ اس مشکل کی گھڑی میں بجائے اس کے کہ ہم ایک متحد قوم کا مظاہرہ کریں ہم ایک دوسرے کے گریبانوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے ہیں خدا را یہ روش ترک کر کے وطن دوستی کا ثبوت دیں۔ خاص کر حکمران طبقہ، خدا کے لیے ہوش کے ناخن لے اور ہر قسم کے جھوٹے پراپیگنڈا کا ڈٹ کر مقابلہ کرے۔ پاکستان قائم رہنے کے لیے بنا ہے اور انشا اللہ قیامت تک قائم رہے گا۔ یک سٹی سرگزشت میں جو بھی شائع ہوتا ہے ناقد روزگار ہوتا ہے۔ ماشا اللہ، زبردست مواد ہوتا۔ شہر خیال میں عجاز حسین سنا صاحب آن دی ٹاپ نظر آئے۔ باقی دوستوں کے تبصرے بھی اچھے ہیں خاص طور پر عزیز میرٹھی، ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی، رانا محمد شاہد نے بہت عمدہ لکھا۔ ایم اے خالق صاحب سدرہ بانو ناگوری صاحبہ کو محبتوں بھر اسلام۔ وحید مصر، تحریر نے وحید آبادی کے بارے میں گرانقدر معلومات فراہم کی ہیں۔ ویلڈن ڈاکٹر ساجد احمد صاحب، محمد ہاشم آلمہ کے بارے میں معلومات ملیں

واقعی ایک بارش کھلاڑی اور نماز روزے کا پابند بحان اللہ! سونے پہاگاہ یہ کہ ایک غیر مسلم ملک کی ٹیم میں۔ چمکتا چہرہ اور شاندار کھلاڑی اللہ ہاشم آلمہ کو اور زیادہ عزت، شہرت اور وقار دے آمین! کے ایف سی ہوٹل کے مالک کے بارے میں عمدہ معلومات ملیں واپسی ہمیشہ ترقی وہی کرتا ہے جو سخت محنت لگن اور ایمانداری کو زندگی میں شامل رکھتا ہو۔ لے بوائے کے بارے میں صرف سنا تھا سرگزشت نے سارا کچا چٹا کھول کے سامنے رکھ دیا۔ الطاف شیخ کا سفر نامہ افریقا افریقا اچھا ہے۔ سمندر کے تئیں ابھی پڑھ نہیں سکا۔ یورپین نے ہند کا سمندری راستہ تو ضرور تلاش کیا لیکن جولوٹ کھسوت کا بازار ایشیائی ممالک میں گرم کیا وہ بھی کم نہیں ہے۔ فلمی الف لیلہ ہمیشہ کی طرح زبردست۔ اللہ آفاقی صاحب کو لمبی زندگی اور صحت عطا فرمائے (آمین) پوپ میوزک کی روح بیٹلو کو کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ واقعی انہوں نے پوپ سنگھ کو لافانی شہرت دی۔ یوسف خان شہر بانو کے بارے میں پڑھا اچھا لگا۔ عشق رسول ﷺ میں ڈوبی تحریر نے روح و جسم دونوں کو بالیدگی بخشی۔ عشق رسول ﷺ میں ہی ہماری بھا اور آخرت کی کامیابی ہے۔ سراب ہمارے لیے بھی اب سراب ہی ہوتی جا رہی ہے۔ بہر حال سراب اپنی مخصوص اسپینڈ اور ٹیپو سے رواں دواں ہے۔ انگارے بہت زیادہ متاثر کیا یہ سچ ہے کہ اگر کوئی ایک اچھا کام کرنے لگتا ہے تو ہم اس پر سوطر کی باتیں کرتے ہیں۔ عمران نے سادگی سے شادی کر کے ہمیں آئینہ دکھا دیا ہے کہ جیڑ بھی لعنت اور فرسودہ رسوم سے بچیں جو غریب لوگوں کے لیے بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کرنے میں جاگتے ہیں۔ اگر ہم شادی کے معاملے میں سنت نبوی ﷺ پر عمل کریں تو کوئی بھی بیٹی جیڑ نہ ہونے کی وجہ سے بوڑھی ہو کر والدین کی دہلیز پر بیٹھی نہیں رہے گی۔ حریر عبرت انگیز تحریر اور نروان اچھوتی تحریر ہے۔ مہاشمت بھی عمدہ تحریر بھی۔ ہوس ہمارے معاشرے میں بسنے والے مختلف کرداروں کی آئینہ دار تحریر ہے۔ ماں باپ کو کچھ نہ کچھ تو سوچنا چاہیے تھا۔ آنکھیں بند کر کے ایک شخص پر اعتبار کر کے بیٹی کی زندگی تباہ کر دی۔ چار اچھی تحریر ہے۔ دماغ پھر جائے گا، اچھی محی۔ مذاق کرنے اور لطیفے سننے کی عادت نے زندگی کے قیمتی سال قیدی نذر کر دیے۔ دو ہر امداد بھی بہترین تحریر بھی۔ سبھی ماہیں اپنے لاڈلوں کے لیے چاندی بھو چاہتی ہیں، کیسا اپنا پن بس ٹھیک ہے۔ کبھی کبھی ایسے غیر متوقع حالات سے پالا پڑ سکتا ہے۔ سرگزشت کی انتظامیہ کو اتنا اچھا شمارہ شائع کرنے پر مبارکباد اور معراج رسول صاحب کی لمبی زندگی کے لیے ڈھیروں دعائیں، خدا حافظ!"

ہم ایم اے خالق بھٹی، رحیم یار خان سے لکھتے ہیں۔ "تازہ شمارہ ملا۔ جس ملک کے حکمرانوں میں احرام قانون نہ ہو اس ملک کا اللہ ہی مالک ہوتا ہے۔ بد قسمتی سے ووٹ کا حق ان لوگوں کو بھی حاصل ہے جو ووٹ کی اہمیت سے نااہل ہیں، منہ بازوں کو بھی ووٹ کا حق حاصل ہے بھلا وہ کیا جانیں ووٹ سے کیا تہذیبی رونما ہو سکتی ہے۔ موبائل ہمارے سادہ لوح لوگوں کے لیے فائدہ مند کم اور نقصان زیادہ کر رہا ہے۔ ہمارے یہ بھائی اپنا قیمتی سرمایہ موبائل بیٹلس کے نام سے غیر ممالک میں بھجوا رہے ہیں جس سے ہماری پس ماندگی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ مختصر یہی میں ڈاکٹر ملک غلام قسطنی کا ذکر تھا۔ فلمی الف لیلہ میں

پشاور کی معروف فلمی شخصیات کا ذکر پڑھنے سے معلومات میں اضافہ ہوا ہے ڈاکٹر ساجد احمد کی وحید مصر، ابن کبیر کی قابل فخر کھلاڑی، عائشہ جو نجی مکتبی، فکیل اور پس کی لے بوائے اور کافی ماہ بعد الطاف شیخ صاحب نے افریقا اور افریقا کے نام سے ستر کہانی لکھ کر اپنے سابقہ ریکارڈ کو برقرار رکھا ہے۔ مختار آزاد کی سمندر کے تئیں، طارق عزیز کی تلاش ہند، فکیل صدیقی کی چار گوئیے محمد ایاز راہی کی مختصر تحریر جلال عشق پڑھی ہے۔ سچ بیٹیوں کے مطالعے سے قبل لیزر لکھ رہا ہوں کہیں میرے اس اکلوتے کی ٹرین نہ چھوٹ جائے اور مابذول لیٹ کمز نہیں نہ آجائے۔ اس مرتبہ شہر خیال کی کرسی صدارت پر اچھے تبصرے کے ساتھ عجاز حسین سنا براجمان تھے۔ عزیز میرٹھی صاحب نے بھی مہینوں بعد ورتن کرائے ہیں۔ سدرہ بانو، ناگوری کے ساتھ ساتھ احمد خان توحیدی بھی کرسی صدارت کی سالانہ تفصیل کے ساتھ موجود تھے۔ فکیل احمد عباسی، رانا فیصل جاوید، رانا محمد شاہد، طاہر الدین بیگ، احمد ایاز راہی، ڈاکٹر ایم اے ملک مہمن، اور نامعلوم شخص نے خوب محنت سے شمارے پر تبصرہ کیا ہے تمام کے تمام مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اس مرتبہ لیٹ کمز کی طویل لسٹ بھی سرگزشت کی مقبولیت کا ثبوت پیش کر رہی تھی۔"

ہم عینا قیصرانی، کوٹ فقیران سے لکھتی ہیں "کسی بھی رسالے میں یہ میرا پہلا خط ہے۔ سرگزشت میرا فوٹو رسالہ ہے، میرے گھر میں سب شوق سے پڑھتے ہیں۔ میں اپنی فیورٹ بلکہ موٹ فیورٹ کہانی سراب پڑھتی ہوں۔ دسمبر 2012ء میں تعبیر خواب، پڑھ کر بہت اچھا لگا، شاہد جیسے باہت لوگ ہی زندگی کا چراغ ہوتے ہیں جو ادوروں کو بھی جیتا سکھاتے ہیں۔ میں زخم زخم ہوں، پڑھ کر اچھا بھی لگا اور بشری کی خود کشی پر افسوس بھی ہوا۔ بشری کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، بشری بے شک جذباتی تھی کیونکہ یہ عمر جذباتی ہی ہوتی ہے۔ لیکن اس میں ظفر کا کوئی قصور نہیں ہے وہ تو خود ذاتی مشکلات سے گزرا ہے۔"

عجاز حسین سنا کا اظہار یہ، نور پور قتل سے "کچھ پرانی روایات بدل رہی ہیں۔ دوست اپنی ذمہ داریوں سے پہلو بچا رہے ہیں۔ کتنا تجسس ہوتا تھا کہ سال بھر کا تجزیہ پیش کیا جائے گا تو کہیں اپنا نام بھی نظر آئے لیکن اب کی بار ایسا کوئی اہتمام دیکھنے کو نہ ملا تو مایوسی ہوئی لیکن ایک دوسری فکر نے گھیر لیا ہے کہ شاید وہ دوست خود کسی پریشانی یا تکلیف میں ہوں۔ ہم کہاں کے سچے اور ہم گسار ہیں کہ خبر تک نہیں لی۔ ایسا کریں کیا اب ہی کا خبر انجام دے ڈالیں۔ احمد خان توحیدی نے معمولی ہی سی، لیکن تجزیہ کیا ہے، شکر یہ قبول کریں۔ "قابل فخر کھلاڑی" میں ہاشم آلمہ کی رودادوں کی آنکھوں سے پڑھی ہے اور واقعی ہمیں بھی فخر ہوا ہے۔ وہ ہنرمند ہیں ساتھ اللہ کی ذات پر کامل یقین رکھتے ہیں ان کی ترقی و کامرانی کے لیے دعا کر رہے ہیں کہ مستقبل میں بھی وہ اپنی موجودہ رفتار میں برقرار رکھ سکیں۔ "فلمی الف لیلہ" سدا بہار سلسلہ ہے جس سے ہمیں ہر طرح کی معلومات حاصل ہو رہی ہیں۔ "سراب" کے ہنگامے ایک جگہ ٹھہر گئے ہیں، جوش و جذبہ قید ہو کر رہ گیا ہے۔ ایک ہی چھت تے اڑتیں صفحات کے واقعات پھیلا دیے گئے ہیں۔ سچی بات ہے ہم بھی ہلا گلا کے عادی ہو گئے ہیں۔ سچ بیٹیوں میں "انگارا" ایک دھماکا خیز کہانی ہے جس میں زندگی کی راہیں متعین کرنے کے کئی راستے ہیں لیکن ہم لوگ کبیر کے فقیر ٹھہرے۔ اچھا کام کرنے اور سیدھی راہ اپناتے ہوئے بھی چٹکپٹاتے اور چور نظروں سے دوسروں کے تاثرات دیکھتے ہیں اصل بات یہ ہے کہ کسی کو کہنے سننے کی بجائے خود کو باطل بنایا جائے اور شرمندہ کرنے کی بجائے احساس ذمہ داری پیدا کیا جائے۔ تبلیغ کے نام پر یرغمال بنانے کی بجائے سوچنے کا موقع دیا جائے۔ جب دل سے احساس جاگے گا تو وہ عمران کی طرح پوری برادری کے سامنے ڈٹ جائے گا۔ یہ الگ موضوع کی کہانی ہے جسے مناسب الفاظ سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس وجہ سے دل میں اتر گئی ہے۔ لکھاری کے علاوہ نوک پلک درست کرنے والے مبارک باد قبول کریں۔ "حریر" میں عذرا کا کردار قابل تقلید ہے۔ لڑکیاں عزت گوار خود کشی کر لیتی ہیں۔ یا جلتی کو جلتی رہتی ہیں اور عزت کے ٹیرے آزادی سے پھرتے ہیں۔ جب مرنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو اس حال تک پہنچانے والے کوتاہ کر دو تا کہ یہ زہر بھی ان کے ساتھ ختم ہو جائے یا وہ عبرت کا نشان بن کر نہیں اور دیکھنے والے عبرت پکڑیں۔ "نروان" کے واقعات تبصرے اور قیاس آرائی سے بالاتر ہیں۔ راہیلہ کی زندگی سنو گئی۔ آنے والے دنوں میں اسے بھٹک جانا تھا۔ وہ کوئی ایسا نیک کام کر بیٹھی تھی کہ نواز دی گئی بس اتنی ہی بات تھی "مہاشمت" کے واقعات میں تسلسل ضرور ہے لیکن جان نہیں ہے۔ "ہوس" میں روزی کو جیسے حالات پیش آئے امارات کی ساری ریاستوں میں ایسے واقعات سماعت سے نکراتے رہے ہیں اور اکثر لڑکیاں ہتھیار ڈال دیتی ہیں اور زمانے کا رنگ چڑھ جاتا ہے۔ لیکن شاہد جیسے اس پر کہ حیا کو زندہ رکھے ہوئے تھی یہی وجہ ہے کہ رمیز کو انتہائی سزا دی لیکن اب کوئی رکاوٹ راستے میں نہیں ہے تو وہاں سے اڑان بھرنے میں دیر

قارئین کے لیے اہم اعلان

ملک بھر میں ادارے کے ماہنامے مندرجہ ذیل تاریخوں میں دستیاب ہوں گے

* سنہس ڈائجسٹ: 17 تاریخ

* ماہنامہ پاکیزہ: 24 تاریخ

* ماہنامہ سرگزشت: 28 تاریخ

* جاسوسی ڈائجسٹ: 03 تاریخ

مذکورہ بالا تاریخوں پر پرچے دستیاب نہ ہونے کی صورت میں رابطہ کریں

شرع عباس: 0301-2454188

نہیں لگانی چاہیے تھی پارسی کا تعین کیا جاسکتا ہے۔ ”چار“ جیسے واقعات عام ضرور ہیں لیکن جھکنڈے بدلتے رہتے ہیں یہی وجہ ہے سادہ لوح کے علاوہ اچھے بھلے سمجھ دار باوبھی بے بس ہو جاتے ہیں۔ لوگ تھانے پکھری کے چکروں سے وقت برباد کرنے کی بجائے چپ کر کے گھر بیٹھ جاتے ہیں۔ یوں ایسے لوگوں کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے اور وہ دیدہ ویدی سے وارداتیں کرتے ہیں۔ ہمیں خود ہشیار رہنے کے ساتھ ایسے لوگوں کی اصلاح پر توجہ دینا چاہیے جسکی مثبت نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ ”دماغ پھر جائے گا“ دلچسپ واقعہ ہے جس نے مسکرانے پر مجبور کروایا۔ ”دو ہر معیار“ میں زیادہ کے بدلتے خیالات سے حیران رہ گیا یہ خود غرضی کی انتہا ہے یوں بھلا برائی، ناپسندزدواج اور خود ساختہ رسوم سے کیسے بچا جاسکے گا۔ یہ مجبور یوں کی زنجیر سے بنائے گئے جگر سے کیسے ٹوٹیں گے۔ یہاں انفرادی سوچوں میں تبدیلی کی ضرورت ہے جو پہلا عملی قدم اٹھانے کا وہ غازی کہلائے گا۔ ”کیسا اپنا پن“ میں میڈم ساجدہ اپنی حسرتوں اور محرومیوں کا انتقام اولاد سے لینا چاہتی تھی۔ وہ خاوند، اولاد اور دنیاوی سہولت کے باوجود شکر سے پن کا مظاہرہ کرتی رہیں اور ذہن کو گندے خیالات کی آماجگاہ بنائے رکھا اسی وجہ سے اوجھوے پن کا شکار رہی۔ اس محفل کے تمام دوستوں کو میرا خلوص بھر اسلام، زندگی ہے تو یہ روئیں آباد رہیں گی۔“

ہملا طاہرہ گلزار کی آمد پشاور سے ”اعجاز حسین سٹوار، ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی، عزیز میرٹھی، رانا محمد شاہد، ایم اے خالق بھٹی، سکیل احمد عباسی، صدرہ بانو ناگوری، احمد خان توحیدی اور کراچی سے نامعلوم قاری نے بڑا اکٹھا میلہ تبصرہ کیا ہے۔ سب سے زیادہ اچھا تبصرہ رانا شاہد اور جاوید سرکانی کا لگا۔ جاوید سرکانی آپ کا لفظ مصالحو سے کوئی لگاؤ لگتا ہے چلو آپ نے بات مان لی کہ میں اور جناب طارق عزیز خان دونوں درست ہیں۔ جاوید نے جہو بانڈ کے بارے میں خوب لکھا۔ یہ سیریز میں نے دیکھی ہے بلکہ راز مورتو میرے پسندیدہ اداکار ہیں۔ رانا شاہد صاحب اول تو میرا نام زہرہ گلزار نہیں ظاہر ہوگا ہے۔ دوسری بات آپ کی سچ ہے کہ میں کسی ظالم مرد کا شکار ہوئی ہوں۔ میری زندگی شادی کے نام پر تباہ کر دی گئی۔ یہ تو میرے والد کی مہربانی ہے کہ مجھے پڑھایا پھر 19 سال کی عمر میں میرا فیصلہ جاب کرنے کا بالکل صحیح نکلا۔ شکر ہے میں کسی کی محتاج نہیں ہوں لیکن یہ دکھ ساری عمر رہے گا کہ آدم کی خواہ کو مانگنے کی سزا ہم عورتیں کب تک بھگتیں گی۔ مجھے تو جو بھی مرد ملا دھوکے بازی ملا۔ آپ نے سچ فرمایا کہ مرد تو باپ، بھائی اور بیٹا بھی ہوتا ہے۔ باپ اور بھائی میرے ساتھ اچھے ہیں۔ کیونکہ میں ان کی بیٹی اور بہن ہوں لیکن وہ اپنی بیوی کے لیے تو باپ اور بھائی نہیں۔ آدم نے تو زندگی کا ساقی مانگا۔ نہ ماں، نہ باپ نہ بہن اور نہ بیٹی مانگی۔ اس لیے بیوی کی زندگی عذاب ہے۔ سچی یہ کہہ کر لوٹا جاتا ہے کہ مردوں کو تو اسلام نے چار شادیوں کی اجازت دی ہے۔ جبکہ یہ اجازت صرف اس وقت کے لیے تھی کیونکہ اس وقت مسلمان کم تھے۔ اگر اسلام نے اجازت دی بھی ہے تو اسلام نے بیوہ، طلاق شدہ اور زیادہ عمر والی سے شادی کا کہا ہے۔ مرد ہر لڑکی سے جھوٹ بے جھوٹ بولتا ہے، خود کو مظلوم ظاہر کرتا ہے اور عورت اپنی ازلی رحم دلی اور محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کے مرد کا تعین کر لیتی ہے اور بعد میں ساری عمر کے لیے روتی ہے۔ پہلے شوہر کے نام پر میری زندگی جہنم بنی اور پھر محبت کے نام پر جو جھوٹ کا سہارا لیا تھا اس بد ذات مرد نے لیکن شکر ہے کہ اللہ نے وقت سے پہلے اس کو میرے سامنے بے نقاب کیا۔ پورے 7 سال اپنی شادی چھپاتی تھی۔ رانا صاحب آئندہ مجھ سے مرد اور عورت کا بے جا ذکر مت کرنا میں اور طرح کی عورت ہوں۔ میں انسانیت کی تدکیل کی طور برداشت نہیں کرتی لیکن مردوں سے سخت نفرت ہے کیونکہ ان سے بڑھ کے کوئی منافق نہیں۔ 100 میں صرف 50 مرد سچے دل سے اپنی بیوی سے محبت کرتے ہیں لیکن افسوس کہ باقی 50 فیصد مرد ایسے بے جس عورتوں کو ملتے ہیں کہ ان بے چاریوں کی زندگی تباہ کر دیتے ہیں۔

ہملا ابن مقبول جاوید احمد صدیقی کا خلوص نامہ راولپنڈی سے ”ایڈیٹر ریل پڑھ کر کئی سنجیدہ باتیں ذہن میں آگئیں۔ ایک سچی پڑھ کر ملک غلام مرتضیٰ کا اور بھی احترام کرنے کو جی چاہا۔ وہ ایک دلی بندے تھے۔ چلیے جی شہر خیال میں اپنے ساتھیوں سے ملتے ہیں۔ اعجاز حسین، سٹوار مستند صدارت پر براجمان ہیں۔ سنجیدہ اور زبردست تبصرے کے ساتھ اتنا اچھا لکھ کر بھی جٹ اور سادہ آدمی ہیں تو بھی یہ بہترین صفات ہیں ان پر قائم رہیں۔ ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی، شکر ہے میرے نام سے دو گنا لسان نام بھی پڑھنے کو مل گیا۔ جی آپ نے جہیز بانڈ وغیرہ کے متعلق زبردست معلومات ارسال کی ہیں۔ بہت شکریہ۔ عدنان ڈاکر کی معلومات اچھی تھیں مگر ایڈیٹر کا نوٹ بھی ان کو صحیح کرنے میں زبردست تھا۔ رانا محمد شاہد کا خلوص بھر اور بھر پور طویل تبصرہ سب سے بہترین تھا۔ جی ہاں روپیہ نفس انصاری صاحب آپ کی آمد کا قارئین کو انتظار ہے۔ ضرور آئیں۔ ایڈیٹر کے نوٹ سے خوش خبری مل گئی اب اگلے شمارے کا انتظار رہے گا۔ سکیل احمد عباسی کی خواہش بھی پوری ہوئی۔ صدرہ بانو ناگوری کا بھی تبصرہ خوب تھا اور احمد خان توحیدی سلیس اردو پر توجہ دیں۔ محمد یازدہی صاحب کی کتاب کا ذکر خوب تھا۔ ڈاکٹر ایم اے ملک مختصر تبصرہ کے ساتھ آئے مگر خوب آئے۔ اور یہ نامعلوم شخص کراچی کا کون ہے؟ اتنا مگر مگر، غصے سے بھر پور انتہائی بلندی کا تبصرہ پڑھ کر کون کیا کرے گا؟ محض آدھ بھر کر دے گا۔ یہ باتیں سب جانتے ہیں۔ دل کے پچھو لے پھوڑنے کے لیے روزناموں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ساجد احمد کا وحید عصر بے مثال انسان کی بے مثال داستان ہے۔ انتہائی گہرائی لیے شعروں کا خالق ہمارے سامنے پوری زندگی کے لمحے لمحے کی کہانی سناتے ہوئے ہمارے دلوں میں اتر گیا۔ اور پھر طرہ تحریر بھی اپنی مثال آپ ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ پورا دیوانہ شائع ہو سکا نہ حفاظت کی گئی، افسوس ہے! قاتل فخر کھلاڑی، ہاشم آملہ کی داستان اسلام سے پہلے کے معاشرے سے جڑی ہے کہ انتہائی سفاک، ظالم اور تعصب پسند معاشرہ میں جس طریقے سے ہاشم زندہ رہا زندگی گزارا ہے اور پھر اسلام کی رسی کو ایمان مکمل کے ساتھ تھام کر اس سفید و کالے تفریق کے پل صراط سے کامیابی سے گزرتا رہا۔ لیکن ان تھک محنت اور سب سے بڑی بات ایمان کامل، اللہ پر غیر جزئل بھروسا ہو تو دنیا کی کوئی طاقت اپنے مقصد و مقصود کو پانے سے نہیں روک سکتی۔ والد کی بہترین نصیحت کو مضبوطی سے پکڑ کر ہاشم آج نیک نامی و شہرت کی بلندی پر پہنچا ہوا ہے۔ کئی عالمی ریکارڈ کا حامل ہے۔ ایک زمانے کا ٹھکانا یا ہوا الا کا محنت اور لگن سے کہ اس کے لیے ایمان کا درجہ رکھتے تھے شہرت کی بلندی پر ہے۔ سمندر کے کیس تو حیرت انگیز رہی۔ میں تو تمام معلومات کو ایک ہی سانس میں پڑھ گیا۔

جس اور تھیرے بھر پور اس سمندر کے باسیوں کی عادات بھی عجیب و غریب ہیں کہ بچہ پیدا ہوا اور پھر سمندر کے حوالے کر دیا۔ اس ماڈرن دنیا میں اپنے بڑوں کے اصولوں اور چاروں سے بڑے ہوئے یہ لوگ ماورائی دنیا میں رہ رہے ہیں۔ بڑی تفصیلاً معلوماتی کاوش دل میں اتر گئی۔ اس طرح تلاش و ہند بھی بڑی جی چیزوں سے بھر پور کہانی تھی۔ سات ملکوں کی معلومات دے کر تو جیسے دنیا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ زبردست معلوماتی کہانی تھی۔ چارگوئیوں نے عالمی شہرت حاصل کی اور ہر ایک کیسے کیسے نامساعد حالات سے لڑتا ہوا ہیرا جٹا چلا گیا۔ یہ گروپ جھٹو تو گلوبل اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ چار کی آگ تو جہاں بے تحاشا قسم کی معلومات بھی دے گئی وہاں میں بھی تیس سال پیچھے یادوں کے ماضی میں آ گیا کہ جب یوسف اور شر بانو کی لازوال داستان کے حامل علاقے میں تھا تو اپنے پشتون بھائیوں سے یہ داستان بڑی تفصیل سے سنا تھا۔ اس کے باوجود بہت سی باتوں کی معلومات اس کہانی سے حاصل ہوئی۔ جلال عشق تو جناب انسی داستان ہے کہ حیات جاوید پا کر یہ لوگ رہتی دنیا تک زندہ رہیں گے۔ عشق رسول ﷺ میں کئی ایسے واقعات آئے اور پھر یہ چند ایک لوگ تو امر ہو گئے۔ عبدالرحمان شہید کی داستان بھی اٹھ رہے والی ہے۔ سبحان اللہ، ایمان کو تازہ کر گئی، یہ لازوال داستان۔ اب کچھ حالات و واقعات کہ کراچی تو صحیح معنوں میں ختم ہو رہا ہے اور خاک و خون کا گڑھ بن گیا ہے۔ روزانہ 10، 15 افراد مار گتہ گتہ کے نام پر موت کے گھاٹ اتار دیے جاتے ہیں۔ بھٹا خوری پر آئے دن تاجر و صنعت کار مظاہرے کر رہے ہیں۔ اغوا برائے تادان کی وارداتیں بڑھ رہی ہیں۔ کارخانے کراچی سے دوسرے شہر میں ہی نہیں دوسرے ممالک میں منتقل بھی ہو رہے ہیں۔ عام آدمی خاص کر خواتین بھی اسی تذبذب کا شکار رہتی ہیں کہ ان کے بچے کل اسکول جاسکیں گے یا نہیں۔ مرد و خواتین بغیریت گھر واپس آجائیں یہی شکر ہے۔ ٹرانسپورٹرز کا خوف کہ کہیں اچانک فائرنگ نہ شروع ہو جائے، اصل مسئلہ کراچی کی اونر شپ ہے اسے کوئی اون نہیں کرتا اور لگتا ہے یہ شہر لاوارث ہو چلا ہے۔ روشنیوں کا شہر اندھیروں میں ڈوب رہا ہے۔ مگر یاد رکھو مسلمانو! تم میں سے جو بھی ان تمام وارداتوں اور قتل و غارت میں ملوث ہے اللہ کی لاٹھی بے آواز، کسی لمحے، کسی وقت بھی تم پر قہر الٰہی بن کر ٹوٹ پڑے گی۔ سدر جاؤ!“

ہملا ڈاکٹر ایم اے ملک کا گلین ڈیمیری لینڈ یو ایس اے کا اظہار خیال۔ آپ میرے خطوط کو سرگزشت کے قیمتی صفحات میں جگہ دیتے ہیں، جو میرے لیے باعث عزت ہے۔ اور اس پر طرہ رکھ کر میری ہی تنقید پر میری ہی رائے مانگ کر مجھے اس افتخار اور فخر کے پہاڑ پر بٹھا دیا ہے۔ جس کا میں غالباً اہل نہیں ہوں۔ بہر حال آپ نے مجھ سے ڈاکٹر ساجد احمد کے مضامین کے فارمیٹ کے بارے میں مشورہ مانگا ہے۔ عرض ہے کہ میں انم کہ من دائم، لیکن آپ کے حکم کی تعمیل سے گریز کرنے کی بھی مجھ میں ہمت نہیں۔ عرض ہے اگر ڈاکٹر صاحب وہی انداز اختیار فرمائیں، جو محترم الیاس بیٹا پوری، علی سفیان آفاقی، ابن کبیر، نجی الدین نواب، منٹل صاحب کا تھا اور ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کے مضامین یکسانیت کا شکار ہو کر اپنی دلچسپی اور افادیت کھو بیٹھیں۔ اگر وہ اپنی تحریر کی روش مندرجہ بالا مصنفین کی طرز پر اپنائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ لوگ پھر سے ان کے مضامین ذوق و شوق سے نہ پڑھیں۔ (آپ کا مشورہ بجا ہے لیکن ہر صاحب تحریر کا اپنا انداز ہوتا ہے اور ڈاکٹر صاحب کا شروع سے ایک جیسا انداز ہے) ابن کبیر کے مضمون سنڈی پر غور فرمائیں۔ انہوں نے ایک عظیم المیہ کو اس طور سے تحریر کیا کہ شروع سے آخر تک اس کی بحر کاری میں گرفتار رہے اور انہوں نے اس المیہ میں ایسی ایسی باتیں اس لطیف ہر رائے میں تحریر کیں۔ تو ایسے لوگوں کو بھی ان باتوں کا پتا چل گیا جو خود امریکا کے رہنے والے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریروں میں بوریت اور عدم دلچسپی اس وقت درآتی ہے جب ڈاکٹر صاحب ایک ہی صنف اور سٹ اور ایک ہی طرز میں اپنے مضامین تحریر فرماتے ہیں، جس سے کہانی کے تسلسل اور روانی میں خلل آ جاتا ہے۔ ان سے گزارش کریں کہ ایک تو وہ موضوع عنوانات اور نئے دلچسپ مضامین کو لکھیں، جس میں کہانی کا عنصر زیادہ ہو، تاریخ، پیدائش، وقت، والدین نہ ہو۔ مضمون ہلکا پھلکا اور بار بار ہو، تاکہ قاری شروع سے آخر تک اس کے بحر میں گرفتار رہے۔ آپ کی تحریر الفاظ کی الجھاؤ سے بھری ہوتی ہے۔ ایک آدھ صفحہ کے بعد اپنی دلچسپی اور قاری کی توجہ کھودتی ہے۔ (نیم تجاویز اور دیگر تاریخی کہانیاں، ناویں لکھنے والے اس طرح لکھتے تھے لیکن سرگزشت نے ابتدا سے ہی سن و دیگر حقائق کو ضروری سمجھا اور اپنی ڈگر الگ بنائی) محترم مدیر صاحب امید ہے کہ آپ میری حقیر رائے پر اگر مناسب سمجھیں تو توجہ دیں۔ ابن کبیر کا ہاشم آملہ کے بارے میں کہانی حسب معمول ایک دل افروز تحریر تھی اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ کے ایف سی کے بانی کے بارے میں عائشہ کی ایک بے حد معلوماتی اور گہرا گرم تحریر تھی۔ پلے بوائے کے بارے میں کچھ لکھنا گنہ گری نہیں لیکن یہ ایک اچھی کاوش ہے۔ یہ انگریزی جریہ مغربی ماحول میں ایک خاص طبقہ میں پاپولر ہے۔ حسب سابق محترم الطاف شیخ کا سفر نامہ دلچسپی اور نئی معلومات سے مزین کینیا کے بارے میں انکشاف بھی نئی بات تھی۔ فلمی الف لیلہ پر اس مرتبہ پشاور ہی چھایا رہا۔ پڑھ کر بے حد لطف اندوز ہوئے۔

ہملا صدرہ بانو ناگوری کا خلوص نامہ ”خوبصورت اور دلکش رنگوں سے سجاسورپ بے حد پسند آیا اعجاز حسین سٹوار ایک مرتبہ پھر صدارت کی کرسی پر فائز نظر آئے۔ مبارک ہو آپ کو اتنا اچھا تبصرہ کرنے پر۔ کراچی کے نامعلوم قاری کا اظہار یہ بھی پسند آیا۔ محترم اپنا نام تو لکھ دیجئے۔ محنتی، عائشہ صاحبہ کلن دوست کے بانی کا احوال کیا خوب بیان کرتی نظر آئیں کہ وہی صفحات میں پوری زندگی کی روداد بیان کر ڈالی۔ سرباب اس دفعہ جانی بیچانی قطر رہی یوں لگا کہ واقعات دہرائے جا رہے ہوں غالباً زرین والی قسط تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ دہرائی گئی سو اس دفعہ قسط سو سو رہی فاضلی نے خوب دھوکا دیا، گو یا شوبی کا وار شوبی پر پلٹ دیا۔ مرشد کا کردار اس بار ڈھیلا ڈھالا رہا۔ سیکریٹری اور فاضلی کی نوک جھونک کے دوران مرشد ایک امتی اور بیوقوف سا جاگیر دار نظر آیا جو فیصلہ کی قوت سے عاری تھا۔ براہ کرم ذرا اس کے کردار پر بھی دھیان دیجئے۔ ”فلمی الف لیلہ“ میں آفاقی انکل نے پاکستانی فلمی صنعت اور بھارتی فلمی صنعت کو آسمان پر پہنچا دینے والے فنکاروں پر تبصرہ کیا مگر انکل یہ کیا بات لکھی ہے آپ نے کہ شاہ رخ خان نے قیام پاکستان کے بعد پشاور کا دورہ کیا! کیا شاہ رخ خان قیام پاکستان سے پہلے کے ہیں جبکہ ان کی اتنی عمر تو نہیں ہے (وہ دہلی میں پیدا ہوا۔ اس کے والد پشاور کے تھے) ایک تصویر کے نیچے لکھا ہے پشاور کے 3 خان ایک ہندو 2 مسلمان راج کپور نے اپنے آپ کو خان نہیں کہا (پر تھوڑی راج خود کو خان لکھواتا تھا) آپ نے لکھا ہے کہ سیف علی خان کی شادی کیم

دسمبر کو ہوئی لیکن دعوت نامے کے عکس میں 18 اکتوبر لکھا ہے (دعوت نامہ ویسے کا ہے) شوکت رحمن ٹھٹک بھی تشریف لائے اور انتہائی عرق ریزی سے حاصل کی گئی معلومات ہم تک پہنچائی۔ انہوں نے اپنی طبیعت کے بارے میں نہیں لکھا (بڑا چاہا سب سے موذی مرض ہے) سادہ اور آسان لفظوں میں لکھی گئی پہلی سچ بیانی نے بہت متاثر کیا اور پڑھ کر حیرت بھی ہوئی کہ کیا واقعی ایسا دور آگیا ہے کہ سنتوں پر عمل کرنے والوں کو زندگی انکارا لگنے لگے۔ لوگوں کے طعنے اور طنز یہ لگاؤں صرف اس وجہ سے جیتا دھوا کر دیں کہ ہم اپنے رسم و رواج کو تو ذکر خدا کا حکم مان رہے ہیں ہم نسلی مسلمان تو ہیں مگر اصلی مسلمان شاید ہم میں سے کوئی نہیں ہے۔

☆ رانا فیصل جاوید کی علی پور سے شرکت "حیرت کی بات ہے کہ بدترین لوڈ شیڈنگ اور امن و امان کی دگرگوں کنڈیشنز کے باوجود رسالہ ہمیں بروقت مل رہا ہے۔ یہ ادارے کے تمام ارکان کی مخلصانہ کوششوں کا ثمر ہے۔ ادارہ میں وطن فروشوں کے سیاہ چہروں سے پردہ اٹھایا گیا۔ میسج کے ذریعے ہونے والے منفی پروپیگنڈے نے نوجوان نسل کو گمراہ کر رکھا ہے۔ نمایاں مدرس میں ڈاکٹر غلام مرتضیٰ کی کامیابیوں کا احاطہ کیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے خوب محنت کی اور عروج حاصل کیا۔ شہر خیال میں اعجاز حسین، رانا شاہد، عزیز میرٹھی اور ملک جاوید نے خوب لکھا، باقی خطوط بھی اچھے تھے، کراچی سے نامعلوم قاری کی باتیں درست تھیں لیکن ادارہ تو ان خرافات کے لیے ذمہ دار نہیں۔ وحید عصر میں انتخاب کلام لا جواب تھا۔ ہاشم آملہ قابل فخر کھلاڑی ہیں۔ جو چار سو برائیوں کی دلدل ہونے کے باوجود تقویٰ کا دامن نہیں چھوڑتے۔ چکن روٹ کے بانی کا احوال پڑھا۔ ویسے ہمارے دیہی علاقوں میں ہری مرچ کی پٹنی اور ساتھ میں پودے کا تڑکا لگا ہوتا وہی روٹ چکن ہے بلکہ اس سے بڑھ کے ہے۔ عبدالرحمان شہید جیسے عبادت گزار رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہر خطے میں موجود ہیں جو عشق رسول میں کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کرتے۔ دو صفحات پر مشتمل اس اثر انگیز تحریر نے ایمان تازہ کر دیا۔ سراسر پڑھتے ہوئے تو ایسا لگا جیسے وقت ضائع کر رہا ہوں اس کا اختتام ہونا چاہیے۔"

☆ عدنان ذاکر کا ای میل کراچی سے "فروری کے شمارے کی خاص چیز ڈاکٹر ساجد امجد کا "وحید عصر" تھی۔ ڈاکٹر صاحب کا انداز تحریر اتنا دلچسپ ہے کہ پڑھنے کا لطف آ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ طارق عزیز کی تلاش ہند بھی اچھی مگر مبارک باد (طارق عزیز اردو میں سمندری سفر پر لکھنے والے اکلوتے لکھاری ہیں۔ مبارک باد ان سطور سے پہنچ گئی) افریقا اور افریقا کا دوسرا حصہ لا جواب تھا۔ الطاف شیخ صاحب سے میری ملاقات اسلام آباد میں ہوئی تھی۔ بہت محبت سے باتیں کرتے ہیں۔ نوجوانوں کی حوصلہ افزائی بھی بہت کرتے ہیں۔ ہو سکے تو ابن حنبل یعنی افتخار خان کے سفر ناموں کو پھر سے شمارے کی زینت بنائیں۔"

☆ فہیم صدیقی کا ای میل "ہماری فلمیں صرف رومانس پیش کر رہی ہیں جبکہ باقی لوگوں نے آرٹ ڈرامے، فلمیں بنا کر اپنا اور اپنے ملک کا نام روشن کیا ہے۔ جیسے بھارت کی دو ٹیکھا زین، مدرائیا، ایسی فلمیں انٹرنیٹک تو نہیں ہوتیں لیکن معاشرے کی اصلاح میں مددگار ہوتی ہیں۔ آفاقی صاحب کی خدمت کو میں بیان نہیں کر سکتا بس ان سے میری گزارش ہے کہ وہ پاکستانی فلمیں جنہیں ناقدین نے پسند کیا چاہے عوام نے ناپسند کیا ہو ان کی لسٹ تیار کر دیں، ان کی محنت اور قابلیت کو سامنے لائیں۔"

☆ طاہر الدین بیگ میر پور خاص سے رقمطراز ہیں "قلبی الف بیلہ سے شروع کرتے ہیں آفاقی صاحب نے سرحدوں کے خانوں کے لیے خوب لکھا پھر بھولے بسرے فنکاروں کا ذکر بھی کافی شاندار رہا۔ شاعر غزنوی صاحب کے بارے میں پڑھا ہندوستان میں ان جیسے بہت سے لوگوں نے بڑا خوبصورت کام کیا غزنوی صاحب پاکستان آکر عطاء اللہ ہاشمی سے وابستہ ہوئے مگر بھارت کی طرح یہاں کوئی کام نہیں کیا۔ ان حضرات نے مسلسل بھارتی کہانیوں کی لفظ بہ لفظ نقالی کی۔ ضیا سرحدی صاحب نے بھی کوئی تیر نہیں مارا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہاں آکر ان کی فنی صلاحیتیں رنگ آلود ہو چکی تھیں آفاقی صاحب، باغی کی کہانی عرش لکھنؤ میں مرحوم اور انسان کے ہدایت کار قدیر غوری صاحب تھے۔ اس دفعہ سچ بیتیاں معاشرتی اور سبق آموز تھیں۔ پہلی کہانی انکارا حربہ اور کیسا اپنا پن کافی جاندار کھاتھی، یوسف خان شیر بانو پر بھی کافی خوبصورت انداز میں لکھا گیا مگر یہ تو اُن ہے کہ یوسف خان شیر بانو سرحد کے رومانوی کردار تھے ان کی اموات اور کچھ واقعات کا تذکرہ متضاد رہا۔ وحید عصر ڈاکٹر صاحب کی معلوماتی تحریر کافی جانفشانی سے لکھی گئی۔ اس طرح ہاشم آملہ پر بھی بہت پرکشش انداز میں لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ بلاشبہ ساؤتھ افریقا کا یہ کرکٹ کا شہسوار مسلمان قوم کے لیے ایک قابل فخر اور قابل ستائش ہے، بخنتی کوئی دیکھ لیں ایک بہت والے نوجوان کی داستان ہے ہالینڈ جس کا نام مختصر مگر عائشہ صاحبہ نے سمندر کو کوڑہ میں بند کر دیا ہے۔ شہر خیال میں سٹار صاحب اپنے خوبصورت تبصرہ کے ساتھ پہلے نمبر پر آئے۔ عزیز میرٹھی صاحب (مشہور کہانی نویس) نے کچھ واقعات کی درستی کی ہے میرٹھی صاحب یہ عرض کر دیں کہ آپ کی لکھی ہوئی کہانی میں نہ یہ چاند ہو گا نہ تارے رہیں گے، یہ گانا بھارتی فلم سے لفظ بہ لفظ نقل کیا گیا ہے۔ آخر اس کی ضرورت کیوں ہوئی۔"

☆ ڈاکٹر ایم آر امی کا خلوص نامہ ریاض، سعودی عرب سے "دسمبر کے شمارے میں ادارتی کالم کا آپ نے اختتام و اصف صاحب کے عہدہ اور یا معنی شعر سے کیا۔ دور جہالت میں ایسا بہت کم ہوتا تھا لیکن موجودہ دور کا راستی جو ہزن بن گیا ہے وہ شجر کا سایہ بھی لوٹ گیا ہے۔ جنوری کے شمارے میں سرگزشت علمی ذوق کی دلیل ہے لیکن غالباً سہو، رحمانیت کوشیطانیت کا مجموعہ تضادات میں ذکر کر دیا گیا۔ رحمانیت اقوام و فصل میں صرف رحمان عظیم کی ذات اعلیٰ سے ہی منسوب و مرجوع ہو سکتی ہے۔ رحمانی جلال و عظمت کے نوری دائرہ (ہالہ نور) کے ادنیٰ سی جھلک بھی طاغوتی قوتوں کی رسائی تک ممکن نہیں۔ محمد یاز دہائی اور الطاف شیخ نے "ترک" اور افریقا اور افریقا، میں معلوماتی، ستائشی، منفید اور دلچسپ علمی عکس بندی کی ہے۔ دونوں حضرات مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب نے ڈپٹی تذکرہ پر خوب تحقیقاتی مضمون قلمبند فرمایا، جو ان کی علمی جستجو کی بخوبی دلالت کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا فرمانا کہ جو جیسے ہوئے

ڈھنوں کو صحیح منزل کا پتا دے اسے بلاشبہ وقت کا معلم کہا جاسکتا ہے لیکن منزل بھی تو با معنی اور حق کی علمبردار ہو اور معلم بھی متحد ہو جو قول و فعل کی حقیقت کا ترجمان ہو۔ پھر خود اپنی صاحب بذات خود عربی کے عالم اور قرآن کے حافظ ہو کر بھی تصوف کے فلسفہ کی جستجو اور رموز و اسرار میں سرگرداں تھے حالانکہ قرآن کریم اور نبی معلم اعلیٰ نے تصوف کو با معنی اور با مقصد وقت قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ نے زمین و افلاک کے سب حقائق و دراز بیان کر دیے۔ پھر ایسی جستجوچہ معنی کی تھی جس نے متعدد بار فرمایا کہ میں اپنے پیچھے کتاب اللہ اور اپنی ہمت چھوڑے جا رہا ہوں اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رکھتا ورنہ طاغوتی اور شیطان تو میں سوکھے پتوں کی طرح تکبیر دیں گی۔ کیا محترم ڈاکٹر صاحب اس مضمون میں ظاہر یا بہم غلط منطق یا روشن دلائل کی نشاندہی کرنا پسند فرمائیں (ڈاکٹر صاحب صرف احوال شخصیت لکھتے ہیں تبصرہ و تنقید سے گریز کرنا بھی ضروری ہے کہ سرگزشت عوامی پرچہ ہے)۔"

☆ محمد عمران جوٹانی نے کراچی سے لکھا ہے "سرگزشت کا بہت پرانا قاری نہیں ہوں مگر مختصر وقت میں جس طرح اس شمارے نے دل میں گھر کیا ہے اس کی مثال ذرا مشکل سے ملے گی۔ یہ میرا پہلا خط ہے چنانچہ آپ لوگوں کے لیے میرا نام نیا ہے۔ معراج صاحب نے ٹھیک کہا کہ موبائل فون پر ایس ایم ایس کے ذریعے جس کے دل میں جو آتا ہے لکھ کر بھیج دیتا ہے اور عام طور پر ہم بلا سوچے سمجھے اسے فارورڈ کر دیتے ہیں جس کا خمیازہ پوری قوم سہکتی ہے۔ ایک مٹی سرگزشت میں ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ کا احوال پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ مرحوم و مغفور کے دل کا اخلاص اور نیت کی پاکیزگی نمایاں تھی۔ شہر خیال میں اعجاز حسین سٹار کری صدائے پر جلوہ افروز تھے۔ اپنے جامع تبصرہ کے ساتھ۔ رانا محمد شاہد صاحب آپ کا انداز تحریر مجھے بہت پسند ہے اسی طرح تفصیل سے لکھتے رہیں۔ اس کے علاوہ ملک جاوید محمد خان سرکانی ورنہ انی عزیز میرٹھی اور سدرہ بانو کے تبصرے بھی جاندار تھے۔ ایم اے خالق بھی صاحب آپ نے جس بریلی سرودی کا ذکر کیا ہے اس سے ہم کراچی والے ذرا کم ہی واقف ہیں یہاں درجہ حرارت 10 کے قریب بھی ہو تو تھر تھر ہو جاتا ہے۔ وحید الہ آبادی سے ڈاکٹر ساجد امجد نے اپنے خاص انداز میں ملوایا۔ دین و دنیا کا احتراز بھی جناب کی شخصیت، یہ واقعی بڑی بات ہے کہ استاد اپنے شاگرد کے نام سے جانا جائے، کلام کے انتخاب نے دل چھو لیا۔ ابن کبیر کا خاص شکر ہے، ہاشم آملہ سے ملنے کی عرصے سے خواہش تھی سچ ہے کہ گن گنی ہو تو کامیابی قدم چومتی ہے۔ کے ایف سی بابا جی کا تذکرہ نوجوانوں کے لیے مشعل راہ ہے لیکن، مستقل مزاجی اور انتھک محنت نے انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ الطاف صاحب گھر بیٹھے دنیا کی سیر کروا دیتے ہیں، جس طرح ہلکے پھلکے پھلکے نامہ معلومات دیتے ہوئے قاری کو ساتھ لے کر چلتے ہیں وہ ان کا خاصہ ہے ویسے سچ ہے اس رات الطاف صاحب کوئی زندگی ملی ورنہ اس "گوریلے" نے تو کسر نہیں اٹھائی تھی۔ میں نے سرگزشت ایک دوست کے کہنے پر قلمی الف لیلہ کی وجہ سے ہی شروع کی تھی اور آج بھی میرا سب سے پسندیدہ سلسلہ ہے۔ آفاقی صاحب نے اس مرتبہ پشاور کے ہنرمندوں سے اپنے رواں انداز میں روشناس کروایا۔ آپ کی تحریر میں جاوہر ہے۔ روانی سے خط لکھنا تبصرہ کرنا ہر کسی کا کام نہیں، دوستوں کو شہر خیال میں دیکھ کر مجھے بھی مغفل میں شریک ہونے کا شوق اٹھا ہے۔ امید ہے لکھتار ہوں گا تو یکہ جاؤں گا۔"

☆ رانا محمد شاہد بورے والا سے لکھتے ہیں "فروری کا شمارہ سبز چتری اوڈھے حسین و شیزہ کے ساتھ ملا۔ ادارہ ایک تلخ حقیقت پر مبنی تھا۔ ہمارے ہاں کسی بھی ایجاد کا ثبت سے زیادہ منفی استعمال ہوتا ہے۔ کمپیوٹر ہو یا موبائل، اس میں کافی حد تک ذمہ دار حکومت بھی ہے جو ایسے اقدامات نہیں کرتی کہ جس سے انفرادی سطح پر اس سلسلے کی حوصلہ شکنی ہو۔ ہم جانتے ہیں کہ ہماری نوجوان نسل کمپیوٹر و انٹرنیٹ اور موبائل کا ثبت سے زیادہ منفی استعمال کرتی ہے۔ اسکول کے طالب علم ہوں یا کالج کے، ان کا زیادہ وقت چنگ پر گزرتا ہے۔ ہمارے وزیر صاحب تو یہ کہہ کر جان چھڑا لیتے ہیں کہ "آپ کے ہاتھ میں چھری دے دی جائے تو آپ سیب بھی کاٹ سکتے ہیں اور کسی کا گلا بھی" مگر شاید وہ ایسے اقدامات نہیں کرنا چاہتے کہ جس سے ان سائنٹ کا مکمل طور پر خاتمہ ہو اور جس سے ٹیکنالوجی کے منفی استعمال کی حوصلہ شکنی ہو۔ ایک مٹی سرگزشت میں معروف علمی و ادبی شخصیت ڈاکٹر غلام مرتضیٰ ملک کے بارے میں معلومات پڑھنے کو ملیں۔ ڈاکٹر صاحب کا ٹیلی ویژن پر اسلامی پروگرام "ضابطہ حیات" آج بھی ذہنوں میں محفوظ ہے۔ ان کے بات کرنے کا انداز یعنی دھماپن سننے والے کو فوراً متوجہ کر لیتا تھا۔ اعجاز حسین سٹار کی بات بالکل سچ ہے کہ معاشرے مل جل کر اجتماعی مفادات کو سامنے رکھ کر چلتے اور قائم رہتے ہیں۔ وہ معاشرے جہاں کے لوگ صرف اپنے اپنے مفادات کے لیے زندہ ہوں، وہاں بے حسی ڈیرے بھاگتے ہیں اور یہ بات معاشرے و ملک کو تخریب کی طرف لے جاتی ہے۔ سکیل احمد عباسی! یہ سچ ہے کہ سیاست میں موجود منافقت اور بے ایمانی نے اسے اتنا گندا کر دیا ہے کہ لوگ اب اس پر بات کرنا بھی مناسب نہیں سمجھتے۔ کوشش کیجیے گا کہ اس دفعہ ووٹ کا سچ استعمال ہو۔ اردو کے ایک بڑے شاعر وحید الہ آبادی پر ڈاکٹر امجد صاحب نے دلچسپ مضمون تحریر کیا۔ ہنگامہ بات تو یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب بہت سے گناہ (ہمارے لیے) مشاہیر سے متعارف کروا رہے ہیں۔ ایک شاعر و نثر نگار کے لیے اس کا کلام، اس کی اولاد کی طرح ہوتا ہے۔ یہ پڑھ کر دکھ ہوا کہ اس نے بڑے شاعر کا کلام اور کتب خانہ سب تر بہتر ہو گیا۔ علم سے محبت کرنے والوں کے لیے کتب کی بہت زیادہ اہمیت ہے ورنہ تو کھانا پینا ہی زندگی ہوتا ہے کہ اس پر تو روزانہ 5 ہزار مٹی خرچ کر دیے جائیں تو کم ہے ہاں کتاب 300 کی بھی ہو سکتی ہے۔ کرکٹ کی تاریخ کے ایک بڑے بلے باز ہاشم محمد آملہ کی زندگی کا احوال ابن کبیر نے بڑے دلچسپ بجرائے میں بیان کیا۔ ہاشم آملہ نے ڈین جونز کے مضہبانہ رویے کے حوالے سے جو واقعہ بیان کیا، اس کے بعد تو ان لوگوں کو اپنے گریبانوں میں بھی جھانکنے کی ضرورت ہوگی جو مسلمانوں کو دہشت گرد سمجھتے ہیں۔ ہاشم آملہ نے شراب تیار کرنے والی کمپنیوں کے لوگوں کا استعمال نہ کر کے نہ صرف اپنا بلکہ ساری مسلم دنیا کا سرخسر سے بلند کر دیا۔ ہاشم آملہ تم پر تمہارے بڑے بھائی کوئی نہیں ہم سب مسلمانوں کو فخر ہے۔ عائشہ جونہی تحریر بخنتی، یہ پیغام دینی نظر آتی کہ محنت اور کوشش سے انسان اپنا نام ضرور پیدا کرتا ہے۔ کے ایف سی کا نام تو اکثر جگہوں پر پڑھا تھا۔ اب اس نام کی حقیقت بھی جان گئی۔"

☆ محمد ارسلان اکبر ندکی خضدار سے تشریف آوری "سب سے پہلے تمام قارئین کو میری طرف سے سلام۔ معراج صاحب، آپ ایک پاکستانی شہری ہونے کے ناتے اپنا بہترین کردار ادا کر رہے ہیں۔ پاکستان کے مسائل اجاگر کرتے ہیں۔ پاکستان کے سیاست دانوں کو لوٹ کھسوٹ کے علاوہ کوئی کام

نہیں ہے۔ ان کے پاس عوامی مسائل کا حل نہیں ہے۔ اس بار الیکشن میں نئے چہرے آکر دیکھنا چاہیے۔ سرگزشت ایک سستی تفریح ہے، پڑھائی کے بعد فارغ اوقات میں سرگزشت کا مطالعہ بہترین لگتا ہے۔ زیادہ تر کہانیاں سچ پر مبنی ہوتی ہیں۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ آپ نواب محمد اکبر خان بکٹی کی داستان حیات شائع کریں۔ جن لوگوں کو نواب بکٹی کے بارے میں نہیں پتا تو ان کو پتا لگ جائے گا کہ پاکستان کے حق میں انہوں نے کتنا کام کیا تھا۔ سرگزشت کے ذریعے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ لوگوں کے حالات و واقعات بھی پڑھنے کو ملتے ہیں۔ سچ پوچھیں تو سرگزشت کو آل راؤنڈر کی حیثیت حاصل ہے۔ اس بار میرا نام شہر خیال میں شامل تھا مگر تاخیر سے موصول ہونے والے خطوط میں۔ کیا یہ خطوط بعد میں شائع کیے جاتے ہیں یا ردی کی نوکری کا حصہ بن جاتے ہیں؟ (تاخیر سے موصول خطوط تلف کر دیے جاتے ہیں)۔

✽ شاہد جہاگیر شاہد کا پشاور سے مکتوب ”ماہنامہ سرگزشت اپنی پہلی اشاعت سے لے کر اب تک زیر مطالعہ ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ کئی بار شہر خیال کے دروازے پر دستک دی لیکن اذن بازیابی نہ پاسکا۔ ایک بار پھر کوشش کرتے ہیں امید ہے کہ شہر خیال کے مکین اس بار اپنی محفل میں شریک ہونے کا ضرور موقع دیں گے۔ ادارہ حسب معمول اس بار بھی ایک سنگتے ہوئے موضوع کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اللہ ہم پر اور ہمارے پیارے پاکستان پر اپنا رحم کرے آمین! ڈاکٹر ساجد امجد صاحب نے ایک بار پھر میدان مار لیا ہے۔ وہ حق رکھتے ہیں کہ سرگزشت جیسے معیاری جریدے کے اولین صفحات پر انہی کی تحریر و تحقیق کو جگہ دی جائے۔ کرکٹ کے عالمی شہرت یافتہ ساؤتھ افریقین مسلم کھلاڑی ہاشم آملہ کی خوبصورت خودنوشت پڑھ کر ایمان تازہ ہو گیا۔ کے ایف سی کے بانی و مالک کی انتھک محنت اور کامیابی دیکھ کر واقعی یہ کہادت سچ لگتی ہے کہ محنت میں عظمت ہے۔ اور اب پلے بوائے، اف۔ بس رہنے دیجیے نام بدنام تو دیئے بھی ہے ایسے بھی سہی۔ چار گوتوں پیٹلو، کا شور شرابے سے بھرپور میوزک، سچ تو یہ ہے کہ نہ تو نکل ہمیں پسند تھا اور نہ ہی آج، ہمیں تو بس دھیمے اور مدھر سُرور اور شائستہ شاعری سے مزین گیت اور ان کا میوزک ہی پسند ہے۔ صوبہ سرحد (خیبر پختونخواہ) کی مشہور لوک پشتو رومانی داستان جو کہ زمانہ قدیم میں گوئیے اور داستان گو حضرات ہی محفلوں میں غایا کرتے تھے اس سے پہلے مشہور پشتو شاعر و ادیب علی حیدر جوشی صاحب نے اسے تحریری شکل میں اور بعد ازاں پشتو کی پہلی فلم یوسف خان شیر بانو، کے لیے لکھا گیا۔ خاص بات یہ تھی کہ اس کے پہلے محضر میں خود محترم علی حیدر جوشی صاحب نے پردہ فلم پر نمودار ہو کر اپنا اور پشتو کی پہلی فلم کا تعارف کروایا تھا۔ غالباً ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ پشتو کی پہلی فلم کے ہدایت کار عزیز تبسم تھے جو کہ پاکستان فلم انڈسٹری کے مشہور ڈائریکٹر پرویز ملک کے اسٹنٹ تھے۔ بدرنیر اور فلم کا دیگر تمام تکنیکی عمل بھی وحید مراد مرحوم کے فلمی ادارے فلز آرٹس، ہی سے وابستہ تھا۔ یہ تمام افراد اپنے اپنے شعبے میں معاہدین کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ پشتو کی پہلی فلم کے بنانے میں ان سب نے دن رات محنت کی اور اللہ نے ان کی محنت کو شائع نہیں کیا۔ یوسف خان شیر بانو پشتو کی پہلی فلم کی حیثیت سے سپر ہٹ ثابت ہوئی۔ اور بدرنیر و یاسمین خان مرحومین دونوں ہی اس فلم کی کامیابی کی وجہ سے پشتو فلموں کے پہلے سپر اسٹارز کی حیثیت سے ایک طویل عرصہ تک پشتو فلم انڈسٹری پر چھائے رہے۔ کافی عرصہ بعد تک بھی لوگ انہیں ان کے اصل ناموں کی بجائے یوسف خان شیر بانو کے ناموں سے ہی پکارتے رہے۔ پیار کی آگ کے نام سے ذوالفقار ارشد گیلانی صاحب نے اسے تاریخی سیاق و سباق کے حوالوں اور مقامی پچھ کے لحاظ سے بہترین انداز میں اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ کاشف زیر صاحب معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تھک سے تھے ہیں سراب کی پوری قسط شہباز ملک نے ایک کھنڈر میں سوتے جاتے ہی گزار دی۔ کوئی ہنگامہ برپا نہ کیا جو کہ خون گرانے کا بہانہ بنا۔ نائل اسٹوری انکار لو اچھی ایک سچی آموز کہانی ہے۔ کاش کہ ہمارے ملک کے سبھی نوجوان عمران کی طرح ہو جائیں تو غریب گھرانوں کی لاکھوں بیٹیاں بڑھاپے کی دہلیز تک پہنچنے سے قبل ہی پیار کے گھروں کو پیاری ہو جائیں، آمین! آخر میں ذکر کرتے ہیں استاد گرامی۔ محترم علی منیان آفاقی صاحب کی فلمی الف لیلہ کا، عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کی تحریر مزید جوان ہوتی جا رہی ہے (اللہ کرے زور قلم اور زیادہ) اس بار تو انہوں نے حد ہی کر دی کہ ایک ہی قسط میں میرے شہر پشاور سے تعلق رکھنے والے سبھی بڑے فنکاروں کے بارے میں مفصل مضمون لکھ ڈالا اور ہم جیسے چوٹے موٹے لکھاریوں کے لیے کچھ بھی باقی نہیں چھوڑا۔ رہی سہی کسر برادر مرحوم شوکت رحمان عکس نے پریم تاج پشاور کی کے بارے میں خط لکھ کر پوری کر دی۔ آفاقی صاحب کو اگر فلم انڈسٹری کا آخری مغل کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ پاکستان فلم انڈسٹری کے عروج و زوال کی داستان کو تفصیل سے لکھ چکے ہیں اب صرف فلم انڈسٹری کا نوچ لکھنا باقی ہے کیونکہ اب تو صرف لٹی ہوئی محفلوں کی راکھ ہی باقی ہے۔“

✽ مہوش رفیق کا تبصرہ کراچی سے ”بچہ زکی وجہ سے مصروف تھی اس لیے غیر حاضر تھی کچھ ملکی حالات پر اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتی ہوں۔ کراچی کے حالات دیکھ کر دل بوجھل ہے، شاید سرگزشت سے شیر کر کے بوجھ ہلکا ہو جائے۔ دبیر میں میرے بی اے فائنل کے پیچھے تھے تین پیچھے ز خیر و عافیت کے ساتھ ہو گئے مگر کچھ تھے پیچھے میں جو کہ 15 دبیر کو تھا اچانک کراچی کے حالات خراب ہوئے اور پیچھے کینسل ہو گیا۔ جبکہ صبح کے ٹائم بی ایس سی فائنل کا پیچھ ہو گیا تھا۔ میرا سارا شیڈول خراب ہو گیا۔ کیونکہ مجھے بہت ضروری کام کے سلسلے میں اسلام آباد جانا تھا۔ 19 دبیر کو میں اسلام آباد کے لیے روانہ ہو گئی۔ 20 دبیر کو وہاں پہنچی گئی شام میں دوست کا میٹج آ گیا کہ 15 دبیر والا پیچھ 23 دبیر کو ہے۔ اف میری جو حالت وہ بیان سے باہر ہے۔ میرے لیے واپسی ناممکن تھی۔ بات بتانے کا مقصد صرف اتنا سا ہے کہ میرا پورا سال برباد ہو گیا مجھے ایک پیچھے کے لیے پورے سال انتظار کرنا پڑے گا۔ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ اور تم یہ ہوا کہ 23 دبیر کو اتوار تھا بہت سے طلبہ غیر حاضر تھے کیونکہ کہیں بھی اعلان نہیں کیا گیا کہ 23 کو پیچھے ہے۔ ویسے بھی کراچی تو اب اللہ کے آسرے پر ہے حکومت کچھ نہیں کر سکتی۔ پولیس بے بس ہے بلکہ عوام تو عوام اب تو پولیس سی آئی، ڈی کوئی بھی محفوظ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے کراچی پر۔ میں نے دو تین فرمائشیں کی تھیں جو ابھی تک پوری نہیں ہوئیں۔ پینز پوری کر دیں۔ احمد یار خان، ملک مسعود حیات، محبوب عالم کی کوئی ایک کہانی (یہ سچنس کے لیے لکھتے ہیں، زیادہ لکھ نہیں سکتے) جنوری کے پرچے میں ادارہ یہ پڑھا۔ واقعی پاکستان کے دہشت گرد آنے والی نسلوں کو پولیو زود دیکھنا

چاہتے ہیں۔ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں دوسرے ممالک کے سامنے کہ پاکستان کا مطلب صرف اور صرف دہشت گردی، مہنگائی، ناگرت کھنگ ہے۔ ہمارے ملک کو اس ناظم سرید احمد خان، علامہ اقبال، قائد اعظم، لیاقت علی خان جیسے لیڈروں کی ضرورت ہے جنہوں نے سوئی ہوئی قوموں کو بیدار کیا تھا۔ اب آتے ہیں فردری کے پرچے کی طرف۔ 29 جنوری کو ہی پڑ چل گیا تھا۔ اس لیے جلدی جلدی پڑھنا شروع کر دیا کہ کہیں پھر شہر خیال سے غیر حاضر نہ ہو جاؤں۔ سب سے پہلے ادارہ یہ پڑھا واقعی وطن عزیز پر بہت برا وقت آن پڑا ہے۔ بی وی کھلو تو دل اداں ہو جاتا ہے ہر جگہ دہشت گردی، بم بلاسٹ، لوٹ مار، خیر یہ تو سچ ہے کہ موہاں اس وقت کی اہم ضرورت ہے۔ مجھے ایک بات بتائیں خاص موقع پر موہاں سرورس بند ہوتی ہے کہ دہشت گردی کا خطرہ ہوتا ہے تو کیا عام دنوں میں کم دہشت گردی ہو رہی ہے۔ موہاں سرورس بند ہونے سے بھی عوام کو پریشانی ہوتی ہے۔ کوئی بھی محفوظ نہیں ہے خواتین بچے مرد۔ موہاں کوں پر دن پھر غلط سلطہ سچ آتے ہیں لیکن حکومت خاموش ہے کوئی ایکشن نہیں لیتا کیونکہ یہ پاکستان ہے سب خاموش ہیں سب چلتا ہے یہاں۔ انڈیا کی مثال کر لڑکی نے ایک دہشت گرد کو ڈان کہا تو اسے گرفتار کر لیا۔ کاش ہماری سوئی ہوئی حکومت بھی بیدار ہو جائے تو دہشت گردوں کو کھیر کر دار تک پہنچا دے۔ اپنے شہر خیال کے یاسین کو السلام و علیکم، اعجاز حسین۔ خاں صاحب کو کرسی صدارت مبارک، ویسے شاید یہ کرسی ہمیں نصیب نہ ہو کیونکہ ہم تو تیرہ کے فن سے نا آشنا ہیں۔ اعجاز حسین صاحب ہمیں بھی تھوڑا سا تبصرہ کرنا سکھا دیں۔ ہم آپ کے خیالات سے سو فیصد متفق ہیں۔ اللہ تعالیٰ پاکستان پر اپنا خاص کرم فرمائے آمین تبصرہ دلچسپ تھا۔ سدرہ بانو ناگوری لکھا ہے آپ کو میرا تبصرہ پسند نہیں آتا۔ کبھی بھی پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا۔ باقی سب کے تبصرے بھی دلچسپ لگے۔ محنتی میں حاکم جو بھی معلومات کافی بہترین لکھیں واقعی محنت میں عظمت ہے، فلمی الف سائیں آفاقی انکل آپ! داد دینی پڑے گی اتنی ہسٹری آپ کو کیسے یاد ہے پاکستانی اداکاروں اور ہندوستانی ستاروں کی مکمل ہسٹری، ہماری معلومات میں اضافہ ہوا۔ پشاور تاریخی مقام بلکہ شہر ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے ستاروں کو جنم دینے کا بھی شہر ہے۔

✽ ڈاکٹر روبینہ نقیص ثاقب انصاری کا خلوص نامہ بھکرے ”فردری کا سرگزشت بہت لیٹ ملا، ہر بار ایسا ہی ہوتا ہے اور پھر لکھنے کی تاریخ نکل جاتی ہے جس کی وجہ سے میں ایک آہ بھر کر رہ جاتی ہوں۔ اس بار تو مجھ ارادہ کیا اور لکھنے بیٹھ گئی۔ سرورق پر مٹی موم بتی نے کچھ امیدوں کو حقیقت کا تصور یاد نہ تو پاکستان کے موجودہ حالات دیکھ کر دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ یہ چند سال پہلے والا پاکستان تو نہیں ہے۔ ہر طرف قیامت کا منظر ہے پر کیا کیا جائے کہ قصور تو ہمارا ہے کیونکہ ووٹ دیتے وقت ہم ہوش سے نہیں جوش سے کام لیتے ہیں۔ بے نظیر کی وفات پر عوام اسے جوش میں آگئی کہ اپنا اچھے برے کا احساس ہی ختم ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو سرے پانی گزر چکا تھا۔ اب کیا کر سکتے ہیں سوائے صبر اور دعا کے۔ اللہ پاک ہر پاکستانی کو حفظ و امان میں رکھے اور ہمیں نیک اور ایماندار حکمران عطا فرمائے۔ تاکہ ہم بھی سر اٹھا کر دنیا کے سامنے کہہ سکیں کہ ہم پاکستانی ہیں۔ شہر خیال میں کچھ نئے چہرے نظر آئے شہر خیال میں پہلے جیسی بات نہیں صرف کہانیاں پر تبصرہ اور بس۔ وہ بھی دن تھے کہ جب سب ایک دوسرے کی خبر رکھنا کرتے تھے۔ اپنی خوشی اور غمی شہر خیال کے توسط سے آگاہ کرتے تھے۔ اب تو سب اپنی اپنی بولیاں بولتے ہیں اور اللہ اللہ خیر سلا۔ سہیل احمد عباسی، کہانی پڑھنے کی اتنی جلدی کیوں میں نے کہانی بھیج دی ہے۔ جلد ہی لگ جائے گی۔ پڑھ کر بتائیے کہ ضرور کہ کہانی کیسی لگی۔ حوصلہ افزائی ہوئی تو انشا اللہ توفیق دے دے کہانیاں لکھتی رہوں گی۔ رانا محمد شاہد کوئی بات نہیں چھوٹا موٹا احسان ہم کرتے رہتے ہیں۔ ایم اے خالد تبصرہ پسند کرنے شکر یہ۔ کراچی کے نامعلوم قاری کی باتیں دل کو لگیں سوائے اس کے کہ انہوں نے اپنا نام نہیں لکھا۔ جناب ایسی بھی کیا پردے داری۔ اس بار کراچی سے چاند نظر نہیں آیا۔ ارے بھائی میں چاند کی بات کر رہی ہوں۔ سچ بیانیوں میں انگارے بہت مٹا کر کیا۔ حیرت ہوئی ہے کہ شارق اور عمران جیسے نوجوان آج بھی اس خود غرض، مٹلی دنیا میں موجود ہیں۔ واقعی ہم لوگ شادیوں پر فضول کی رسموں پر بے انتہا چرسا خرچ کرتے ہیں اپنے دل کی تسکین کو مگر لوگوں کو یہ یاد کرانا چاہتے ہیں کہ ہمارے پاس بھی فالتو چرسا بہت ہے۔ لوگ واقعی طور پر ادواہ واہ کر کے چلے جاتے ہیں پھر یہی لوگ پیٹھ پیچھے ان رسومات کی برائیاں کرتے ہیں، عمران شارق نے سنت رسول پر عمل کر کے ثابت کر دیا کہ آج اس ماڈرن دور میں مشکلات کا سامنا کرنا کوئی بڑی بات نہیں، اللہ پاک نے انہیں خوشیوں سے نوازا، بے شک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتا۔ محمد سلیم اختر کی تحریر کردہ ہوس، پڑی تو دل و دماغ سکے میں آگیا اسپتالوں میں یہ سب بھی ہو رہا ہے۔ طاقتور لوگ کب تک کمزوروں کی بے بسی کا فائدہ اٹھاتے رہیں گے سونے پر سہا کا کہ روزی کے والدین نے اپنی ہوس کا نشانہ اپنی بیٹی کو بنایا۔ کیا ماں باپ بھی ہوس میں اندھے ہو جاتے ہیں کہ حلال حرام کی تمیز کھو بیٹھتے ہیں۔ لعنت ہے ایسے والدین پر جن کے لیے اولاد سے بڑھ کر پیسا ہوتا ہے۔ ریمز نے روزی کو اپنی محبت کے جال میں اس چالاک سے پھنسا یا کہ وہ بے بس ہو گئی مگر خود کو آزاد نہ کر سکی نہ جانے مرد ذات اتنی خود غرض کیوں ہوتی ہے۔ مجھے ایسے مردوں سے سخت نفرت ہے جو معصوم لڑکیوں سے محبت کر کے اپنی ہوس کا نشانہ بنا کر بے یار و مددگار چھوڑ دیتے ہیں۔ مرد ذات پر کبھی اعتبار نہیں کرنا چاہیے، بس اسی پیغام کے ساتھ ان سب لڑکیوں کے لیے دعا گو ہوں جو کسی نہ کسی مرد کی محبت و دل میں بسائے انتظار کر رہی ہیں۔ اللہ پاک سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔“

تاخیر سے موصول خطوط:

سہیل احمد عباسی، ہنوعاقل، ڈاکٹر ساجد محمد روشن، برہ زئی محمد احمد خان توحیدی، کراچی۔ معراج الدین، مردان۔ سعید احمد، حیدر آباد۔ صلاح الدین، سکھر۔ ارشد ریاض، جھنگ۔ ریاض سکھیر، لاہور۔ شمیم ریاض، راولپنڈی۔ ملک غلام رسول، مینپوٹ۔ نیاز احمد ششی العین (یو اے ای) صاحب جان، پشاور۔ زینب وٹو، ملتان۔ ملک ممتاز حسن، شیخوپورہ۔ انصافی حسن کاظمی، سرگودھا، فلک شیر میو، کجرات۔ نعیم الحسن، سیالکوٹ۔

باب درخشاں

ڈاکٹر ساجد امجد

دوستوں کے ہجوم میں بھی وہ تنہا تھا گویا صبح میں بھی شام کی طرح تھا۔ باتوں میں خواہشات کا کاسہ تھا مگر سکون دل سے تہی دست تھا، دل میں ایک آگ سی سلگ رہی تھی۔ وہ انگریزوں کی چالبازیاں بھی دیکھ رہا تھا اور اپنیوں کی کج ادایاں بھی سمجھ رہا تھا کہ راستہ کتنے بے دھوپ میں شدت ہے مگر سائے کی محبت میں وہ آگے بڑھنے پر تیار ہو گیا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ سیاست کی مکروفریبی اس کی برداشت سے باہر ہے اس لیے بلا واسطہ وہ سیاست میں حصہ لے رہا تھا کیونکہ اسے منزل پر پہنچنے سے مطلب تھا۔ اس لیے اس نے اپنے مکان کو حصول پاکستان کی کوشش کرنے والوں کے لیے وقف کر دیا تھا، مگر اسے کیا ملا؟

تحریک پاکستان کے ایک سرکردہ شخصیت کا زندگی نامہ

صاحب کی صحبت میں بولنے کا ڈھنگ خوب آ گیا تھا۔ ایک گواہی کے سلسلے میں عدالت میں پیش ہونا پڑا۔ گواہی کے دوران مخالف وکیل نے جرح کے لیے نئے پینٹرے بدلے الٹی بخش نے اس جرح کا بڑے عمل سے مقابلہ کیا۔ کئی مواقع پر تو اس نے وکیل کو جواب کر دیا۔ جج انگریز تھا۔ الٹی بخش کے جوابات کو بڑے غور سے سن رہا تھا۔

”کچھ پڑھے لکھے ہو؟“ جج نے پوچھا۔

”تھوڑی بہت حرفوں کی پہچان ہے۔“

”تم مجھے ذہین معلوم ہوتے ہو۔ اگر کچھ پڑھ لکھ لو تو تمہیں بہت فائدہ ہوگا۔“ انگریز جج کی یہ بات اس کے دل کو ایسی لگی کہ حصول علم کی طرف متوجہ ہو گیا۔ حافظ صاحب جید عالم تھے اور پھر ان کے پاس آنے والے لوگ بھی صاحب علم تھے۔

کاشت کاری کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور عربی، فارسی کی تعلیم بھی حاصل کی۔ اردو لکھنے پڑھنے میں بھی مہارت

لاہور کے رہنے والے الٹی بخش نے عمر کی کچھ ہی منزلیں طے کی تھیں کہ اپنے باپ رحیم بخش کے ساتھ مل کر زراعت اور کاشت کاری کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اسکول کی شکل نہ باپ نے دیکھی تھی نہ بیٹے کو اسکول بھیجا۔ وہ نرا چال رہ جاتا اگر اس کی ملاقات حافظ ولی اللہ سے نہ ہوئی ہوتی۔ یہ صاحب لاہور میں عیسائیت کی تبلیغ کا زور توڑنے کے لیے بڑا کام کر رہے تھے۔ آئے دن عیسائیوں سے مذاکرے کرتے تھے اور انہیں شکست دیتے تھے۔ جب انہوں نے مشہور پادری فورمین کو شکست دی تو الٹی بخش کو بڑی خوشی ہوئی۔ وہ حافظ صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ پڑھا لکھا تو تھا نہیں لیکن حافظ صاحب کی باتیں غور سے سنتا تھا۔ زراعت کے کاموں سے جب بھی فرصت ملتی وہ ان کے پاس پہنچ جاتا۔ وہ اسے دین کی باتیں بتاتے۔ وہ نہ صرف انہیں یاد رکھتا بلکہ ان پر عمل کرنے کی بھی کوشش کرتا۔ رفتہ رفتہ دین میں پختہ ہو گیا۔ پڑھنا لکھنا اب بھی نہیں سیکھا تھا لیکن حافظ



حاصل ہو گئی۔ دینی کتابیں ذوق و شوق سے پڑھنا شروع کر دیں۔ جوانی قریب آرہی تھی۔ قد خوب نکلا، بچپن سے محنت کی تھی لہذا ہاتھ پاؤں مضبوط تھے، مختصر یہ کہ ظاہری شخصیت بھی پرکشش ہوئی۔ کردار بھی ایسا بنایا کہ الہی بخش سے مولوی الہی بخش بن گیا۔

حافظ ولی اللہ کی تربیت سے وہ نہایت اچھا واعظ اور مقرر بن گیا اور تبلیغ دین میں مشغول ہو گیا۔ حافظ صاحب کے ساتھ مناظروں میں حصہ لینے لگا۔

قدرت جب کسی کو بنانا چاہتی ہے تو اسباب مہیا کر دیتی ہے۔ خلیفہ رجب الدین نے انہیں ایک مناظرے کے دوران سنا اور ان کے عقیدت مند ہو گئے۔ رجب الدین کے بھائی خلیفہ اسماعیل تھے جو ایک چھوٹی عدالت میں مختار تھے۔ مختار اس وکیل کو کہا جاتا تھا جو ماتحت عدالتوں میں مقدمہ لڑنے کے اہل ہوا کرتے تھے۔ الہی بخش کو انہیں دیکھ دیکھ کر شوق ہوا کہ وہ بھی مختار بن جائیں۔ انہوں نے خلیفہ اسماعیل سے مدد لی اور مختاری کا امتحان پاس کر لیا۔

تبلیغ دین بھی جاری رہی اور مختار کاری بھی لیکن تھوڑے ہی دن میں مختاری سے دل بھر گیا۔ دل میں یہ امنگ جاگی کہ بڑی کورٹوں میں وکالت کا کام کریں چنانچہ چیف کورٹ لاہور میں وکالت کا امتحان دیا اور کامیاب بھی ہو گئے۔

وکیل تو سب ہوتے ہیں لیکن انہوں نے اس شان سے وکالت کی کہ لاہور اور اس کے قرب و جوار میں دھوم مچ گئی۔

ضلع ہوشیار پور کے ایک گاؤں گھوڑے بابا میں عیسائی مشنریوں نے بہت سے مسلمانوں کو روپوں کا لالچ دے کر عیسائی بنالیا تھا۔ یہ بات ارد گرد کے پڑھے لکھے مسلمانوں کے علم میں آ گئی تو انہوں نے مداخلت کی۔ مسلمانوں اور عیسائیوں میں تصادم ہو گیا۔ معاملہ عدالت تک پہنچ گیا۔ اس وقت ہوشیار پور میں کوئی مسلمان وکیل نہیں تھا۔ تمام وکیل ہندو تھے یا سکھ۔ چند وکیل انگریز بھی تھے۔ مسلمانوں کا مقدمہ لڑنے کو کوئی تیار نہیں تھا۔ اس صورت حال سے پریشان ہو کر مسلمانوں کا ایک وفد لاہور آیا اور الہی بخش سے ملاقات کی۔ الہی بخش کو عیسائیوں سے مناظروں کا وسیع تجربہ تھا۔ ان کے لیے یہ مقدمہ لڑنا مشکل نہیں تھا۔ انہوں نے یہ مقدمہ لے لیا اور ہوشیار پور چلے گئے۔

وہ اس مقدمے کی پیروی کے لیے ہوشیار پور آئے تھے لیکن کيس کا فیصلہ ہو جانے کے بعد بھی وہاں کے مسلمانوں نے انہیں آنے نہیں دیا۔ ہوشیار پور ان کا وطن بن گیا۔ وہ اس ضلع میں واحد مسلمان وکیل تھے۔ وکالت کے ساتھ ساتھ وہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں بھی سرگرم عمل ہو گئے۔

مقبولیت اتنی بڑھی کہ ہندو مسلمان سب ان کے پاس مقدمات لانے لگے۔ ان کی شادی امرتسر میں ہوئی تھی۔ جس وقت وہ ہوشیار پور آئے۔ بیوی کو ان کے میکے امرتسر میں چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہ امید سے تھیں۔

ہوشیار پور میں انہیں بیٹے کی پیدائش کی خبر ملی جس کا نام انہوں نے عبدالعزیز رکھا۔ اس بچے نے بڑے ہو کر جدوجہد آزادی میں بڑا نام پیدا کیا۔

☆☆☆

عبدالعزیز اپنی تنہیال میں تھا۔ ذہین تھا لیکن بعض بیماریاں ایسی لاحق ہو گئی تھیں کہ جسمانی اعتبار سے بہت کمزور ہو گیا۔ ذرا ذہن پر زور دیتا تھا تو چکرا کر گر پڑتا تھا۔ بالآخر ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ اسے اسکول سے اٹھالیا جائے۔ تعلیم سے زیادہ اس کی جان عزیز تھی لہذا مجبوراً تعلیم چھوڑ دینا پڑی۔

اسکول جانا چھوٹ گیا تو وہ اس دکھ میں بیمار رہنے لگا کہ سب بچے اسکول جاتے ہیں، وہ کیوں نہیں جاتا۔ اتنا کمزور ہو گیا کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ تعویذ گنڈے، ڈاکٹر حکیم سب ایک کر دیے گئے۔ کھیل کود میں دل بہل سکتا تھا لیکن جسمانی صحت اس قابل بھی نہیں تھی کہ بچوں کے ساتھ زیادہ دیر کھیل سکتا۔

رفتہ رفتہ جیسے اسے صبر آ گیا۔ اسکول کا خیال دل سے نکل گیا۔ بچوں کے ساتھ کھیلنے کی ضد بھی نہیں کرتا تھا۔ بجے چراغ کی طرح گھر کے کسی کونے میں اکیلے کھلتا رہتا تھا۔ اس سے بھی تھک جاتا تو ماں کے پاس جا کر بیٹھ جاتا۔ یہی اس کے معمولات تھے۔

وہ اس حالت میں بھی خوش تھا لیکن قدرت نے اسے ایک اور امتحان سے دوچار کر دیا۔ اس کی ماں اچھی خاصی تھی کہ اچانک بیمار پڑ گئی اور ایسی بیمار پڑی کہ بستر سے لگ کر رہ گئی۔

ماں کی بیماری نے جیسے عبدالعزیز کے بدن میں جان ڈال دی۔ وہ اپنی کمزوری کو بھول کر ماں کی تہہ در تہہ میں

مشغول ہو گیا۔ ہر وقت ماں کی پٹی سے لگا رہتا۔ نہ تھکن تھی نہ نیند۔ اس سے اس کی ذہنی دار طبیعت کا اندازہ ہوتا تھا۔ عبدالعزیز کی عمر بارہ سال تھی کہ اس کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ گھر میں ایک ہی تو کھلوتا تھا، وہ بھی ٹوٹ گیا۔ اب اس کی عمر اتنی ہو گئی تھی کہ انتقال کا مطلب سمجھ سکتا تھا۔ مولوی الہی بخش ہوشیار پور سے آئے تو وہ ان کے گلے لگ کر خوب رویا۔

الہی بخش بھی سوچ میں پڑ گئے کہ اب کیا کیا جائے۔ بیوی کا انتقال ہو گیا، بیٹے کی تعلیم چھوٹ گئی۔ اب اس کی ذہنی داری انہیں اپنے سر لینی تھی۔ وہ اسے اپنے ساتھ ہوشیار پور لے آئے۔ چھوٹے بیٹے عبدالحفیظ کی عمر صرف ڈیڑھ سال تھی۔ بچوں کی دیکھ بھال کے لیے گھر میں عورت کا ہونا ضروری تھا، انہوں نے دوسری شادی کر لی۔

عبدالعزیز کی طرف سے ان کی فکر بڑھتی جا رہی تھی۔ انہوں نے ڈاکٹروں سے مشورہ کیا اور اسے اسکول میں داخل کروا دیا۔

وہ اب بھی جسمانی اعتبار سے کمزور ہی تھا لیکن اس کی ذہانت اور پڑھنے کے شوق نے اسے سہارا دیا۔ وہ کلاسیں پھلکا لگتا رہا۔ سترہ سال کی عمر ہو گئی تھی کہ اس نے بڈل پاس کیا۔ اس کے بعد اسے لاہور میں انجمن حمایت اسلام کے ہائی اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔

میٹرک کرنے کے بعد اس نے میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا۔ ایک مرتبہ وہ پھر خرابی صحت کی بنا پر تعلیم ترک کرنے پر مجبور ہو گیا۔

الہی بخش اس کی طرف سے بہت پریشان تھے۔ انہوں نے اپنے وکیل دوستوں سے مشورہ کیا۔ بعض کا خیال تھا کہ انہیں وکالت پڑھنے کے لیے انگلستان بھیج دیا جائے۔ اس کی صحت پر وہاں کی آب و ہوا کا بہت اچھا اثر پڑے گا۔ یہ مشورہ صائب تھا اور جب سر میاں شفیع بیرسٹر نے بھی یہی مشورہ دیا تو الہی بخش نے اسے انگلستان بھیجنے کا بندوبست کر دیا۔

وہ بذریعہ بحری جہاز انگلستان روانہ ہو گیا اور قانون کی مشہور درس گاہ ”لنکرن“ میں داخلہ لے لیا۔

قائد اعظم محمد علی جناح بھی وہاں قانون کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ہر چند کہ یہ ان کا آخری سال تھا لیکن عبدالعزیز سے ان کی اچھی خاصی دوستی ہو گئی۔

انگلستان کا قیام اس کی ذہنی ساخت کو بڑی تیزی سے

تبدیل کر رہا تھا۔ انگریزوں سے مرعوبیت کی بجائے ان کی طرف سے نفرت دل میں جمع ہو رہی تھی جس کا اظہار وہ اپنے خطوں میں اکثر کرتا رہتا تھا۔

”یہ ملک ایسا ہے کہ اگر آپ کے پاس پیسا ہے تو سب کچھ ہے اور اگر نہ ہو تو ایک منٹ میں سب ندارد۔ خاص کر جبکہ ایسے طوطا چشم انگریزوں سے واسطہ ہو۔“

ذہنی داری کا احساس اسے بچپن ہی سے تھا۔ وہ اب بھی گھر کے تمام وسائل کو سامنے رکھے ہوئے تھا۔ ہندوستان کے حالات بھی اس کے سامنے تھے اور انگریزوں کی طوطا چشمی سے بھی واقف تھا۔ انگلستان کی بے راہ رو آزاد فضا میں بھی اس نے کام سے کام رکھا۔ اسے جلد سے جلد پرانے ملک کو چھوڑ کر اپنے دیس میں پہنچنے کی تمنا تھی۔ وہ سخت محنت کر رہا تھا لہذا تمام امتحانات نہایت تیزی سے صرف نو مہینوں میں پاس کر لیے لیکن وہاں کے قانون کے مطابق تین سال سے پہلے بیرسٹری کی ڈگری نہیں مل سکتی تھی۔ وہاں کے قانون کے مطابق مقررہ ڈگریز میں شامل ہونا ضروری تھا۔

اس خالی وقت میں بھی وہ نچلا نہیں بیٹھا۔ محمد علی جناح (قائد اعظم) سے اس کی دوستی تو ہوئی چکی تھی۔ دونوں نے مل کر مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن قائم کی جس میں ہندوستان اور دوسرے ملکوں کے مسلمان طالب علم شامل تھے۔

ڈگریز کی منزل سے گزرنے کے بعد وہ بیرسٹر بن گیا۔ اس نے وطن واپسی کی تیاری شروع کر دی۔

17 جولائی 1898ء کو اس کا جہاز ممبئی کے ساحل پر لنگر انداز ہوا۔ اس وقت کسی مسلمان کا بیرسٹر بننے کے بعد ہندوستان واپس آنا معمولی بات نہیں تھی۔ وہ جب ممبئی سے بذریعہ ٹرین ہوشیار پور کے لیے روانہ ہوا تو جالندھر ریلوے اسٹیشن پر لوگوں کا بہت بڑا ہجوم تھا۔

چند روز ہوشیار پور قیام کرنے کے بعد وہ لاہور چلا گیا۔

اس نے یہاں رہ کر وکالت کا لائسنس حاصل کیا۔ دوستوں اور عزیزوں سے ملاقاتیں کیں اور کچھ دن ٹھہرنے کے بعد ہوشیار پور چلا گیا۔ یہاں الہی بخش اقامت گزریں تھے۔ عبدالعزیز کو کبھی یہیں نہیں رہنا تھا۔

اس نے یہاں والد کی نگرانی میں وکالت شروع کر دی۔ اہل ہوشیار پور کے لیے یہ بڑی خوشی کا موقع تھا۔ اب انہیں دو مسلمان وکیل میسر آ گئے تھے۔

الہی بخش صرف وکیل نہیں تھے۔ مسلمانوں اور خصوصاً ہوشیار پور کے مسلمانوں کے لیے ان کے دل میں بڑا درد تھا۔ وہ خدمت قوم کے بہت سے کام کرتے رہے تھے۔ عبدالعزیز کے آجانے کے بعد ان کاموں میں مزید تیزی آگئی۔

عبدالعزیز مستعد بھی تھا، باہمت بھی اور جذبہ دینی سے سرشار بھی۔ انگلستان میں رہ کر وہ اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ مسلمانوں کی ترقی تعلیم سے وابستہ ہے۔ اس نے وہاں کے تعلیمی اداروں کا مشاہدہ بھی کیا تھا لہذا ہوشیار پور آتے ہی اس نے اس کمی کو محسوس کیا کہ یہاں کوئی بڑا تعلیمی ادارہ موجود نہیں۔ اس نے ہوشیار پور کے اصحاب ثروت سے رابطے کیے اور ان کی توجہ ایک تعلیمی ادارے کی طرف دلائی۔ اس کی یہ کوششیں رنگ لائیں اور اتنی رقم جمع ہو گئی کہ ایک ہندو سے اس کا پرائیوٹ اسکول خرید لیا اور اس کا نام اسلامیہ مڈل اسکول رکھا۔ یہ مسلمانوں کا پہلا اسکول تھا جو ہوشیار پور میں قائم کیا گیا۔

یہ ابتدا تھی اور مسلمانوں میں حصول تعلیم کا جذبہ ابھارنے کی ایک کوشش تھی۔ اس نے والدین سے ملاقاتیں کر کے انہیں راغب کیا کہ وہ اپنے بچوں کو اس اسکول میں داخل کروائیں۔ بہت سے مسلمان لڑکے اسکول میں داخل ہو گئے۔

تین چار سال تک یہ اسکول پرانی عمارت ہی میں رہا لیکن اب طلبہ کی تعداد اتنی بڑھ گئی تھی کہ اسے ہائی اسکول بنانے اور ایک نئی عمارت تعمیر کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

وہ اس وقت وہی کام کر رہا تھا جو کبھی سرسید نے انجام دیا تھا۔ اس نے چندے کے لیے مختلف مقامات کے دورے کیے اور ایک قطعہ زمین خرید لیا۔ ایک شاندار عمارت کا نقشہ تیار کیا گیا جس میں بورڈنگ ہاؤس کے کمرے بھی شامل تھے۔

اسلامیہ ہائی اسکول کا سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب نہایت بڑو قار طریقے سے ادا کی گئی۔ سنگ بنیاد سرسید کے ایک ساتھی وقار الملک نواب مشتاق احمد کے ہاتھوں رکھا گیا۔ اس تقریب میں اور مہمانوں کے علاوہ علامہ اقبال بھی شامل تھے۔

اس زمانے میں ریل ہوشیار پور نہیں جاتی تھی۔ جالندھر اترتا پڑتا تھا اور وہاں سے پچیس میل کا سفر نیل

گاڑیوں سے طے کرنے کے بعد ہوشیار پور جایا جاتا تھا۔ ان حالات میں اس درس گاہ کے افتتاح کے لیے بڑی بڑی شخصیتوں کا ہوشیار پور پہنچنا عبدالعزیز کی کاوشوں ہی کا نتیجہ ہو سکتا تھا۔

اسکول کی تعمیر ہی کے زمانے میں یہ خیال آیا کہ بورڈنگ ہاؤس سے متصل جامع مسجد تعمیر کی جائے۔ چنانچہ اسکول سے کچھ فاصلے پر زمین خرید کر جامع مسجد کی تعمیر بھی شروع کر دی گئی۔

ہوشیار پور کے قیام کے دوران ہی میاں عبدالعزیز نے انجمن اسلامیہ کا ادارہ قائم کیا۔ عبدالعزیز کو اس کے سیکریٹری جنرل کے طور پر منتخب کیا گیا۔

اسلامیہ ہائی اسکول، جامع مسجد اور بورڈنگ ہاؤس کی نگرانی اسی انجمن کے سپرد تھی۔ ایک منصوبہ یہ بھی بنایا گیا کہ اس انجمن کے تحت ہر سال سالانہ تبلیغی جلسہ منعقد کیا جائے گا۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے علمائے کرام کو دعوت دی جائے گی اور وہ ان جلسوں میں تقاریر کریں گے۔ مسلمانوں کے سیاسی اغراض و مقاصد کے لیے ضلعی مسلم لیگ بنائی گئی۔ عبدالعزیز نے اس کے اغراض و مقاصد مرتب کیے۔

قومی خدمت کے ان کاموں نے عبدالعزیز کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ ہندو مسلمان سب اسے عزیز رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر سال میونسپلٹی کمیٹی کا رکن منتخب کیا جاتا رہا اور اسے یہ موقع ملتا رہا کہ ہوشیار پور میں ترقیاتی منصوبوں کے لیے آواز اٹھاتا رہے۔

اسے ہوشیار پور میں رہتے ہوئے تقریباً بیس سال ہو گئے تھے۔ یہ عرصہ بہت ہوتا ہے۔ خصوصاً اس کے لیے جس نے اپنے شب و روز قوم کے لیے وقف کر دیے ہوں۔ جب یہاں کے لوگوں نے یہ سنا کہ عبدالعزیز اور ان کے والد ہوشیار پور سے لاہور منتقل ہو رہے ہیں تو ان کے پاس وفود آنے شروع ہو گئے۔ ان میں مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی سبھی شامل تھے۔ سب کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ وہ ہوشیار پور میں رہیں لاہور نہ جائیں۔

لاہور، عبدالعزیز کا آبائی مسکن تھا۔ رشتے دار، زمین، جائیداد سب وہیں تھی۔ ہوشیار پور میں کب تک رہتے جبکہ اب سیاست کا بہاؤ اتنا تیز ہو گیا تھا کہ اس کا مقابلہ لاہور میں رہ کر ہی کیا جاسکتا تھا۔ اب وہ کسی گہرے دریا میں شامل ہونا چاہتا تھا۔

”آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔ میں لاہور میں رہ کر بھی آپ کو یاد رکھوں گا۔ جب آپ آواز دیں گے حاضر ہو جاؤں گا۔“ اس نے ہوشیار پور والوں سے کہا اور والد کو ساتھ لے کر مستقل طور پر لاہور آ گیا۔

☆☆☆

شاید قدرت اسے کسی خاص مقصد کے لیے لاہور بلا رہی تھی۔

اس نے جس روز لاہور کی زمین پر قدم رکھا اسی روز وہ سانحہ پیش آیا جسے سانحہ ”جلینا نوالہ باغ“ کہتے ہیں۔ گورنر پنجاب سر مائیکل اڈوائز کے حکم پر جلینا نوالہ باغ (امرتسر) میں نہتے لوگوں پر گولی چلائی گئی جس میں بے شمار لوگ مارے گئے۔

امرتسر سے لاہور دور ہی کتنا تھا۔ اس واقعے کی گونج لاہور تک پہنچ گئی۔ اہل ہند کے دلوں میں انگریزی حکومت کے خلاف شدید نفرت کے جذبات بھڑک اٹھے۔ پورا ہندوستان لاوے کی طرح پھٹ پڑنے کو تیار تھا۔ مظاہروں اور بیانات نے انگریزی حکومت کو دھلا کر رکھ دیا لیکن مائیکل اڈوائز نے شرمندہ ہونے اور معذرت کرنے کے بجائے امرتسر میں کرفیو لگا دیا۔ وہ انگریزی حکومت کے مخالفوں کو ختم کرنے پر تلا ہوا تھا۔ ہندوستان کے سیاسی رہنما اس بربریت کے خلاف آوازیں بلند کر رہے تھے۔

امرتسر میں داخل ہونا مشکل تھا لہذا رہنمایان ہند لاہور آئے تاکہ اس لیے کے خلاف احتجاج کیا جائے۔ ان رہنماؤں میں مولانا ابوالکلام آزاد، گاندھی جی، حکیم اجمل خان، مولانا شوکت علی جو ہر وغیرہ شامل تھے۔

انگریزوں کا خوف اس قدر طاری تھا کہ ان لیڈروں کو کوئی شخص اپنے گھر ٹھہرانے پر تیار نہیں تھا۔ ایک میاں عبدالعزیز تھے جنہوں نے اپنی کوشش کے دروازے ان لیڈروں کے لیے کھول دیے اور اس بے خوفی سے کہ ان کی کوئی حکومت مخالفوں کے لیے ہیڈ کوارٹر بن گئی۔

ان لیڈروں پر ہی منحصر نہیں جس کا جی چاہے وہ یہاں آ سکتا تھا۔ اجلاس ہوتے تھے، تقریریں کی جاتی تھیں۔ دیکھیں چڑھی رہتی تھیں ایک لنگر ساجاری تھا۔

انگریزوں سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کا عمل صرف یہیں تک محدود نہیں رہا بلکہ اگلے سال میونسپل کمیٹی کے انتخابات ہوئے تو میاں عبدالعزیز نے بھی اس میں حصہ لیا اور کامیاب ہوئے۔ لاہور میں یہ ان کی پہلی

بادشاہ مہمان

میاں عبدالعزیز کو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں بڑے احترام سے نوازا تھا۔ بے شمار بڑے لوگ مہمان کے طور پر ان کے مکان پر آئے۔ لاہور میں ان کا واحد مکان تھا جس میں اپنے وقت کی اہم شخصیتوں کے قدم پڑے۔ اس مکان میں یکے بعد دیگرے دو ایسے شخص بھی آئے جو بعد میں تخت بادشاہت پر متمکن ہوئے۔ ایک والی افغانستان امان اللہ خان دوسرا اسی ملک کا حکمران نادر شاہ۔

والی چترال بھی اس گھر میں آئے۔ میاں صاحب غالباً اپنے دور کے واحد شخص تھے جو نہ حکومت کے کسی منصب پر فائز تھے، نہ وزیر تھے، نہ بڑے افسر مگر اس درجہ کثیر تعداد میں ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی ان کے گھر آتے تھے کہ ان کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بہت بڑا اعزاز تھا جو معاشرتی طور پر انہیں حاصل ہوا۔

کامیابی تھی۔ ان لوگوں کو بھی انہوں نے کامیاب کروایا جو ان کے ہم خیال تھے۔ انہی کے بل بوتے پر انہیں وائس پریزیڈنٹ منتخب کیا گیا۔ کمیٹی کا صدر انگریز ڈپٹی کمشنر تھا۔ جب میاں صاحب وائس پریزیڈنٹ منتخب کیے گئے تو اس نے کمیٹی کے اجلاسوں میں آنا چھوڑ دیا۔ میاں صاحب ہی صدارت کرتے تھے۔ اپنی صدارت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اور اختیار استعمال کرتے ہوئے لارڈ لارنس کے مجسمے کو اکھڑوانے کی قرارداد منظور کروائی۔ یہ مجسمہ مال روڈ سے ملحق ایک باغ میں نصب تھا۔ اس بت کے ایک ہاتھ میں قلم تھا اور ایک میں تلوار اور نیچے انگریزی زبان میں لکھا تھا۔

”تم تلوار کی حکومت چاہتے ہو یا قلم کی۔“ یہ الفاظ ہندوستانیوں بالخصوص اہل پنجاب کی غیرت کے لیے زبردست چیلنج تھے۔

میاں عبدالعزیز نے اس بت کو اکھڑوانے کی قرار داد منظور کروائی تو حکومت نے اس کی مخالفت کی۔ حکومت کا موقف یہ تھا کہ یہ بت گورنمنٹ کی ملکیت ہے اس لیے کمیٹی کو اسے اکھڑوانے کا حق حاصل نہیں۔ کوئی اور ہوتا تو دیک کر بیٹھ جاتا لیکن میاں صاحب نے کمیٹی کے ریکارڈ سے یہ ثابت کر دیا کہ یہ بت جس شخص نے بنایا تھا اس نے کمیٹی کو دے

دیا تھا۔ کمیٹی کو یہ حق حاصل ہے کہ اسے رہنے دے یا کسی اور جگہ نصب کروائے یا اکھڑا دے۔

حکومت نے گھنٹے ٹیک دیے اور مصالحت کی غرض سے اس مجسمے کے نیچے لکھے ہوئے الفاظ کو ہٹانے پر تیار ہو گئی۔ طویل خط و کتابت کے بعد الفاظ ہٹا دیے گئے۔ میاں عبدالعزیز ہی کی نہیں اہل پنجاب کی یہ ایک بڑی کامیابی تھی۔

وہ حکومت کے خلاف ایک ایک کر کے قراردادیں پاس کروا رہے تھے اور حکومت کی آنکھ میں کانٹا بن کر کھٹک رہے تھے کہ پرنس آف ویلز ولی عہد برطانیہ کی ہندوستان آمد کا شور بلند ہوا۔ شہزادے کو خوش آمدید کہنے کے لیے بہت سے اداروں اور انجمنوں نے قراردادیں منظور کیں اور جشن منانے کی تیاریاں کی جانے لگیں۔

لاہور میونسپل کمیٹی میں دو دھڑے بن گئے۔ کچھ لوگ خیر مقدم کی قرارداد پاس کروانا چاہتے تھے۔ میاں عبدالعزیز نے اس کی سخت مخالفت کی۔ انہوں نے جلیانوالہ باغ کو بنیاد بنا کر شہزادے کے خلاف ایک محاذ بنا لیا۔ اتنے لوگ ہم خیال بنالیے کہ پرنس آف ویلز کی آمد پر بائیکاٹ کی قرارداد منظور کروالی۔

یہ بظاہر چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں لیکن اس سے انگریزی دشمنی کی فضا تیار ہو رہی تھی جو بعد میں آزادی پر جا کر ختم ہوئی۔

انگریز ڈپٹی کمشنر نے سخت جدوجہد کی کہ اس قرارداد کو منسوخ کروا دے۔ بہت سے ارکان کو لالچ دے کر توڑنے کی کوشش کی۔ کچھ کو توڑ بھی لیا لیکن وہ صرف اتنا کروا سکا کہ بائیکاٹ کے الفاظ واپس لے لیے گئے۔

اس کے باوجود ولی عہد کے استقبال میں کسی نے کوئی حصہ نہیں لیا۔ عملاً بائیکاٹ ہی رہا۔

یہ مرحلہ گزرا تو ایک اور امتحان سامنے آ گیا۔ شاہ عالم گیٹ کے باہر میونسپل کمیٹی کی تھوڑی سی جگہ تھی۔ وہاں ہندوؤں نے مندر اور مسلمانوں نے مسجد بنانے کی کوشش کی۔ دونوں فرقوں کے درمیان یہ کشمکش اتنی بڑھی کہ تصادم کی نوبت آ گئی۔ مسلمانوں کا ایک ہی سہارا تھا۔ وہ میاں عبدالعزیز سے ملے۔

”میاں صاحب، مسجد تو بن کر رہے گی اور آپ کو بنوانی ہوگی۔“

”میں اس تنازع کو اس طرح بھی ختم کر سکتا ہوں کہ

نہ مسجد بنے نہ مندر۔“

”یہ تو ہماری شکست ہوگی پھر آپ کا لاہور میں رہنے کا فائدہ کیا ہوا؟“

”میں ایک صورت میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔“

”فرمائیے۔“

”اگر آپ ایک رات میں مسجد تعمیر کر لیں تو یہ میرا دعویٰ ہے کہ مسجد گرنے نہیں دوں گا۔“

پہلے تو سب ششدر رہ گئے کہ بھلا ایک رات میں مسجد کیسے تعمیر ہوگی لیکن پھر وہ تعمیر پر تیار ہو گئے۔ زمین ہی کتنی ہوگی زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سولہ۔ اتنی بڑی تعداد میں عام مسلمان... اور مزدور تعمیر کے کام میں لگ گئے کہ ایک ہی رات میں مسجد تعمیر کر ڈالی۔ صبح کی اذان ہوئی اور باجماعت نماز پڑھی گئی۔

صبح کو جو اس طرف آیا حیران ہوتا تھا کہ خالی زمین پر مسجد کہاں سے ابھر آئی۔ ہندوؤں نے ہنگامہ کروانے کا منصوبہ بنایا لیکن ناکام رہے۔

یہ مسجد ہنگامی بنیاد پر عارضی طور پر بنائی گئی تھی۔ بعد میں وسیع پیمانے پر چندہ جمع کیا گیا اور مسجد کی دوبارہ تعمیر ہوئی۔ یہ مسجد آج تک قائم ہے۔

علامہ اقبال نے اپنا یہ مشہور شعر اسی مسجد کی تعمیر پر کہا تھا۔

مسجد تو بنالی شب بھر میں ایمان کی حوائت والوں نے

من اپنا پرانا پانی تھا برسوں میں نمازی بن نہ سکا

☆☆☆

میاں صاحب سیاسی و سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ ہر اجتماعی مسئلے میں مسلمانوں کی کھل کر مدد کرتے تھے لیکن اس کے باوجود ہندو، سکھ اور دوسرے غیر مسلم ان پر پورا اعتماد کرتے تھے۔ یہی ان کی کامیابی کا راز تھا۔ وہ ہر سال میونسپل کمیٹی کے انتخابات میں کامیاب ہوتے رہے ماسوا ایک انتخاب کے جس میں وہ علامہ اقبال کے حق میں دست بردار ہو گئے تھے۔

میاں عبدالعزیز جرأت مند بھی تھے اور بے نیاز بھی۔ ان کی کوشی انگریز مخالفوں کا مہمان خانہ بنی ہوئی تھی۔ جب بھی کوئی شورش برپا ہوتی اور سیاسی لیڈر لاہور میں جمع ہوتے تو میاں صاحب کی کوشی ہی میں ٹھہرتے۔

رولٹ بل ایکٹ کا نفاذ ہوا سائمن کمیشن کا

قیام۔ جب بھی کانگریس یا عام مسلمانوں کی جانب سے مخالفت ہوتی۔ ہڑتال یا فساد ہوئے میاں عبدالعزیز نے تہایت جرأت مندی سے مسلمانوں کا ساتھ دیا اور انگریزوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی۔ کسی صلے یا اعزاز سے بے پروا ہو کر۔

1927ء میں لاہور میں ہندو مسلم فساد ہوا۔ شہر میں ہڑتال ہو گئی۔ حکومت کی تمام تر کوششوں کے باوجود ہڑتال ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔

شہر کی صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے گورنر پنجاب باہر نکلا۔ اس نے سکھوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کے سرکردہ لوگوں سے ہڑتال ختم کرنے کی درخواست کی۔ ان سب نے یک زبان ہو کر کہا۔ ”اگر میاں عبدالعزیز یہ دتے داری قبول کر لیں کہ کوئی فریق کسی فریق کے خلاف کوئی مضرت رساں حرکت نہیں کرے گا تو ہڑتال ختم ہو سکتی ہے۔“

گورنر نے شہر کا دورہ منسوخ کیا اور میاں عبدالعزیز سے ملاقات کے لیے ان کی کوشی پر پہنچ گیا اور انہیں آمادہ کر لیا کہ وہ ہڑتال ختم کروانے میں حکومت کی مدد کریں گے۔

میاں صاحب نے تینوں فرقوں کے ذمے داروں سے ملاقاتیں کیں۔ تینوں کو آمادہ کیا کہ کوئی کسی کے خلاف قدم نہیں اٹھائے گا۔ جب تینوں کو تحفظ کا احساس ہو گیا تو ہڑتال ختم کر دی گئی۔

ان کی اس کوشش کو حکومت نے تعریفی نظر سے دیکھا۔ انگریز گورنر نے اپنی حکومت سے ان کے لیے ”سر“ کا خطاب دینے کی سفارش کی۔ میاں صاحب کو جب اطلاع ہوئی تو انہوں نے خطاب لینے سے انکار کر دیا۔

گورنر نے انہیں بلایا اور ان پر زور دیا کہ وہ اس خطاب کو ٹھکرا کر حکومت کی توہین نہ کریں بلکہ اس کے ثمرات سے فائدہ اٹھائیں۔

جب وہ کسی صورت نہ مانے تو اسپیشل اعزازی سند دینا چاہی۔ انہوں نے اس سے بھی انکار کر دیا۔ گورنر بہت برہم ہوا۔

”جب آپ نے ہماری مدد کی تو ہماری سند لینے سے کیوں انکار کرتے ہیں؟“

”میں نے انگریز حکومت کی کوئی مدد نہیں کی۔ میں نے تو اپنے لوگوں کی خدمت کی ہے۔ اس ہڑتال سے میرے لوگوں کا نقصان ہو رہا تھا، آپ کا نہیں۔ میں تو

نوشت عبدالعزیز

اسلام جبر و تغلب اور استبدادی استحصال کو روکا نہیں رکھتا۔ سودی کاروبار ارتکاز زر کی اساس اول ہے۔ اللہ اسے جنگ کے مترادف قرار دیتا ہے۔ اسلام ملوں، بیمہ کمپنیوں اور بڑی بڑی صنعتوں کو قومیا نے سے نہیں روکتا۔ اسلام ضرورت سے فالتو زرعی زمین پر قبضہ رکھنے کو جائز نہیں سمجھتا۔ اسلام روٹی، کپڑا اور مکان سے آگے گزر کر تعلیم و تربیت، علاج، انفرادی آزادی کا تحفظ (جس کا سوشلزم میں نام لینا بھی حرام ہے) اور نہ جانے کیا کیا نعمتیں عطا کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک انسانی بھائی چارے کی لڑی میں پرو دیتا ہے اور ایک خدا کی قانون کے تابع کرتا ہے جہاں اس کے سامنے ہر آن اپنے اعمال پر جواب دہ ہونے کا کھٹکا ہوتا ہے اور یہی وہ روح لطیف ہے جو تجریں و ترغیب، جبر و تغلب، استحصال و استبداد کے شجر خبیث کے لیے باوصصر ہے اور سوشلزم اس روح لطیف کی کلی نگی ہے۔

ہندوستان میں رہنے والی تینوں قومیتوں میں اتحاد کا خواہاں ہوں۔ اس کے لیے کام کرتا رہوں گا۔“

اس کے بعد 31ء اور 35ء میں بھی لاہور میں فسادات ہوئے۔ میاں عبدالعزیز نے ان فسادات کو ختم کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔

میاں عبدالعزیز نے ہر اس تحریک میں حصہ لیا جس سے مسلمانوں کا مفاد وابستہ تھا۔ مسلمانوں کے حقوق پر جہاں بھی آج آتی وہ مدد کے لیے پہنچ جاتے۔ لاہور تو خیر ان کا ہیڈ کوارٹر تھا ہی لیکن ارد گرد کے علاقوں میں مسلمانوں پر کوئی آفت آتی دیکھتے تو مدد کے لیے پہنچ جاتے۔ راول پنڈی میں ہندو مسلم فساد ہوا تو وہ فوراً وہاں پہنچے۔ سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کا وقت آیا تو میاں عبدالعزیز اس کے بائیکاٹ کے لیے پیش پیش تھے کیونکہ اوروں کی طرح ان کا بھی یہی خیال تھا کہ یہ کمیشن ہندوستانوں بالخصوص مسلمانوں کے خلاف ہے۔

ان کی کوششوں کا نتیجہ اس وقت سامنے آیا جب سائمن کمیشن کے ارکان لاہور ریلوے اسٹیشن پر اترے تو ایک بڑا جلوس کالی جھنڈیوں کے ساتھ اس کے استقبال کے

دے سکتی ہے مگر لاش اپنے قبضے میں نہیں کر سکتی۔ لاش تو آپ کو ہر حال میں وارثوں کے حوالے کرنی پڑے گی۔“

”شہر میں فساد کا خطرہ ہے اس لیے لاش یہاں نہیں لائی جاسکتی۔“ گورنر نے دلیل پیش کی۔

”آپ کو یقین ہے کہ آپ لاش نہیں دیں گے تو فساد نہیں ہوگا؟“

”میرا خیال یہی ہے۔“

”آپ کا خیال درست نہیں۔ لاش نہ دینے کی صورت میں فساد کا خطرہ زیادہ ہے۔“ یہ ملاقات نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئی۔ میاں عبدالعزیز حالات کی بدتری کا اندیشہ ظاہر کرتے ہوئے لوٹ آئے۔

وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ احتجاج کا سلسلہ ایسا بڑھا کہ حالات قابو سے باہر ہوتے نظر آنے لگے۔ اس مرتبہ گورنر نے خود انہیں بلایا لیکن اس بار وہ اکیلے نہیں گئے بلکہ ایک وفد لے کر پہنچے۔ اس وفد میں علامہ اقبال اور سر میاں

نے مسلمانوں کو مشتعل کر دیا۔ جگہ جگہ احتجاجی مظاہرے ہونے لگے۔ جلسے ہوئے، قراردادیں پاس ہوئیں۔ لاہور کی ایک عدالت میں راجپال کے خلاف مقدمہ دائر ہوا۔ عدالت کی طرف سے راجپال کو سزا ہو گئی۔ اس نے سیشن عدالت میں اپیل کی۔ سزا پھر بھی بحال رہی۔ جب اپیل ہائی کورٹ میں گئی جسٹس دلیپ سنگھ نے راجپال کو بری کر دیا۔ اس نے فیصلے میں لکھا کہ انگریزی حکومت کے مروجہ قانون میں مذہبی اکابر کے خلاف لکھنا قابل سزا جرم نہیں۔

اس کی رہائی نے لاہور میں آگ لگا دی۔ جلسے جلوس کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایسا ہی ایک جلسہ تھا۔ نوجوان علم الدین بھی اس جلسے میں شریک تھا۔ تقریر جیسے آگے بڑھ رہی تھی اس کا لہو گرم ہوتا جا رہا تھا۔ جلسہ ختم ہوا۔ لوگ اسے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔ علم الدین بھی اپنے گھر آ گیا لیکن رات بھر سوچتا رہا، جاگتا رہا۔ صبح اٹھ کر اس نے ناشتا کیا۔ اپنی بھابی سے کچھ پیسے لیے ایک بڑی چادر اپنے بدن پر ڈالی اور گھر سے نکل گیا۔ بازار جا کر ان پیسوں سے چاقو خریدا اور راجپال کے اشاعتی دفتر کی طرف چل دیا۔ یہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ راجپال ابھی نہیں آیا۔ وہ وہیں میٹھیوں کے نیچے چھپ کر بیٹھ گیا۔ راجپال نے جیسے ہی اپنے دفتر کی میٹھیاں چڑھیں علم الدین بھرے ہوئے شیر کی طرز اٹھا۔ چادر دوڑ بھینکی اور راجپال پر حملہ کر دیا۔ راجپال مارا گیا لیکن علم الدین پکڑا گیا۔

اس پر مقدمہ چلا، میاں عبدالعزیز نے اپنی خدمات پیش کیں لیکن مقدمہ سر میاں محمد شفیع بیرسٹر نے لڑا۔ وہ مقدمہ ہار گئے۔ علم الدین کو پھانسی کی سزا سنائی گئی۔

اپیل کے لیے قائد اعظم محمد علی جناح سے رابطہ کیا گیا۔ اس اپیل میں بھی پھانسی کی سزا بحال رہی اور اسے پھانسی دے دی گئی۔ اس کی وصیت کے برعکس اسے جیل ہی میں دفن بھی کر دیا گیا۔

مقدمے کے دوران بھی لاہور میں ہنگامے ہوتے رہے تھے لیکن انگریزوں کی اس حرکت نے پورے پنجاب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ایک ہی مطالبہ تھا کہ علم الدین کی میت لاہور لائی جائے اور یہیں انہیں دفن کیا جائے۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے میاں عبدالعزیز نے گورنر سے ملاقات کی۔

”قانون کی رو سے انگریزی حکومت کسی کو پھانسی تو

خواہاں ہیں۔ آپ کی مدد سے یہ کام آسان ہو سکتا ہے۔ کیا یہ ملاقاتیں آپ کے گھر پر ہو سکتی ہیں؟“

میاں عبدالعزیز نے اس پر خوشی کا اظہار کیا اور انہیں لاہور آنے کی دعوت دی۔ یہ بڑا اعزاز تھا کہ محمد علی جناح ان کے گھر تشریف لارہے تھے۔ کوٹھی کو آراستہ کر دیا گیا۔ پلوں کا شامیانہ، آنکھوں کا فرش بچھ گیا، عقیدت مندوں نے راستوں کو جھنڈیوں سے سجا دیا۔

2 مئی 1936ء کو میاں صاحب کی کوٹھی پر اجلاس ہوا۔

میاں عبدالعزیز کی کوٹھی کا نصیب اس وقت مزید جاگ گیا جب انہی کی کوششوں سے علامہ اقبال، لیاقت علی خان، ملک برکت علی، خلیفہ شجاع الدین، غلام رسول بیرسٹر اور بعض دیگر حضرات نے اس اجلاس میں شرکت کی۔ اس اجلاس میں مسلم لیگ کی تنظیم اور تشکیل نو کا فیصلہ کیا گیا اور پنجاب مسلم لیگ کے نئے عہدے دار منتخب ہوئے۔ اس کے بعد بھی کئی اجلاس ہوئے۔

ان دنوں اس دھان پان سے شخص میاں عبدالعزیز کی سرگرمیاں قابل دید تھیں۔ کسی بھی عہدے سے بے نیاز بھاگ دوڑ میں مصروف تھے کہ وہ ہمیشہ مسلم لیگ کا ساتھ دیں گے۔ ایسے بے لوث افراد ہی تھے جن کی قربانیوں نے مسلم لیگ کے سفر کو آسان بنایا۔

اس کے بعد ہی انہوں نے قانونی امداد کا خاص شعبہ مقرر کیا۔ اس شعبے کا کام غریب اور نادار مسلمانوں کو مفت قانونی امداد فراہم کرنا، ان کی ضمانتیں کروانا تھا۔ ہندو مسلم فسادات عام ہو گئے تھے۔ ایسے موقع پر وہ نہ صرف اس آگ کو بجھانے میں آگے آگے ہوتے تھے بلکہ گرفتار مسلمانوں کے مقدمات بلا فیس لڑتے تھے۔

وکالت ان کی آمدنی کا ذریعہ تھی لیکن قومی خدمت میں انہوں نے اس آمدنی کی بھی پروا نہیں کی۔

☆☆☆

لاہور میں اس وقت سخت سراسیمگی پھیل گئی جب ایک غریب نوجوان نے ایک ہندو تاثر راجپال کو قتل کر دیا اور گرفتار ہو کر جیل پہنچ گیا۔

راجپال نے ایک کتاب ”رنگیلا رسول“ کے نام سے شائع کی تھی۔ کتاب کا نام ہی گستاخانہ تھا۔ کتاب کے مندرجات میں بھی نبی اکرم کی ذات اقدس اور اسلام کے بارے میں رکیک حیلے کیے گئے تھے۔ اس کتاب کی اشاعت

لیے دہلی دروازے سے لنڈے بازار میں داخل ہوا اور ریلوے اسٹیشن کی طرف بڑھا۔ پولیس نے لاشی چارج کیا جس سے بہت سے لوگ زخمی ہوئے۔

سائنس کمیشن اس وقت کا بہت بڑا سیاسی مسئلہ تھا۔ میاں صاحب کی کوششوں سے لاہور میں اس کا بھرپور بائیکاٹ ہوا۔

اس واقعے کے بعد میاں عبدالعزیز کی شہرت پنجاب سے نکل کر پورے ہندوستان میں پہنچ گئی۔ وہ ایک ماہر وکیل تو تھے ہی اب ان کا شمار سیاست دانوں میں بھی ہونے لگا۔

1937ء میں میاں عبدالعزیز نے اس وقت سیاست میں باقاعدہ قدم رکھ دیا جب وہ مسلم لیگ کی طرف سے پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے (عبد المجید مالک نے راجا غنفر علی کا نام لکھا ہے)

انتخابات کے بعد یونینسٹ پارٹی (Unionist Party) کی حکومت قائم ہوئی۔ سر سکندر حیات پنجاب کے وزیر اعظم بنے۔ میاں صاحب مسلم لیگ ہی میں رہے۔ پنجاب اسمبلی میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ ریونیو پر معمولی سائیکس عائد کر کے اس آمدنی سے بادشاہی مسجد کی مرمت کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ اس کے لیے سات ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔

میاں عبدالعزیز نے اس تجویز کی مکمل حمایت کی لیکن کمیٹی کی مخالفت کی۔ اس لیے اس میں ایک یا دو کے سوا سب غیر مسلم تھے اور وہ بھی سرکاری ملازم۔

اپوزیشن میں ہونے کے باوجود انہوں نے اس شدت سے آواز بلند کی کہ غیر مسلموں کی جگہ مسلمانوں کے عہدے دار اس کمیٹی کے رکن مقرر کیے گئے اور بادشاہی مسجد کی مرمت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

☆☆☆

قائد اعظم نے جب پنجاب میں مسلم لیگ کو مضبوط و منظم کرنے کا ارادہ کیا تو سب سے پہلے ان کی نظر میاں عبدالعزیز پر پڑی۔

میاں صاحب کی صلاحیتوں سے قائد اعظم اس وقت کے معترف تھے جب وہ انگلستان میں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کر رہے تھے پھر وہ پنجاب میں ان کی گونا گوں خدمات کو بھی دیکھ رہے تھے۔ قائد اعظم نے ممبئی سے انہیں خط لکھا ”وہ پنجاب میں مسلم لیگ کی تنظیم نو کرنا چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں لاہور کے سرکردہ لوگوں سے ملاقات کے

WELCOME BOOK SHOP
of U. A. E

WELCOME BOOK SHOP

IASOOSI SUSPENSE PAKEEZA SARGUZASHT

P.O.Box 27869 Karama, Dubai Tel: 04-3961016
Fax: 04-3961015 Mobile: 050-6245817
E-mail: welbooks@emirates.net.ae

Best Export From, Pakistan

WELCOME BOOK PORT
Publisher, Exporter, Distributor

All kinds of Magazines, General Books and Educational Books

Main Urdu Bazar, Karachi Pakistan
Tel: (92-21) 32633151, 32639581 Fax: (92-21) 32638086
Email: welbooks@hotmail.com
Website: www.welbooks.com

مارچ 2013ء

محمد شفیع بھی شامل تھے۔
”گورنر صاحب، میں آپ سے پہلے بھی کہہ کر گیا تھا کہ علم الدین کی لاش اگر مسلمانوں کو نہ دی گئی تو حالات مزید خراب ہوں گے۔ اب بھی وقت ہے ورنہ یہ وقت بھی ہاتھ سے نکل جائے گا۔ مسلمان اس خرابی کی ذمہ داری حکومت پر عائد کر دیں گے۔“

”اگر لاش مسلمانوں کے حوالے کر دی گئی اور لاہور میں اس کی نماز جنازہ ہوئی تو امن عامہ کی ذمہ داری آپ لوگ قبول کرتے ہیں۔ اگر آپ لوگ گڑبڑ نہ ہونے کی یقین دہانی کروائیں تو میں فیصلہ کروں گا۔“
وفد کے ارکان اس ذمہ داری کو قبول کرتے ہوئے ہچکچاہے تھے لیکن میاں عبدالعزیز نے گورنر کو یقین دلایا کہ کوئی گڑبڑ نہیں ہونے دیں گے۔

”مسلمانوں کا مطالبہ ہے کہ لاش ان کے سپرد کی جائے۔ جب ان کا یہ مطالبہ پورا ہو جائے گا تو وہ کیوں گڑبڑ کریں گے۔“
آدھی رات کو علم الدین کی لاش میاں عبدالعزیز، علامہ اقبال اور سر میاں شفیع کے حوالے کر دی گئی۔ دوسرے دن شہر میں جنازے کی نماز کا اعلان کر دیا گیا۔
یونیورسٹی گراؤنڈ کے قریب رائل رینج میں نماز جنازہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ نماز جنازہ سے قبل گورنر جنازہ گاہ میں آیا۔ میاں عبدالعزیز موجود تھے اور انتظامات کی نگرانی کر رہے تھے۔

”آپ کے خیال میں کتنے لوگ جنازے میں شامل ہوں گے؟“
”اتنے لوگ شامل ہوں گے کہ زمین نظر نہیں آئے گی۔“ میاں صاحب نے جواب دیا۔
”ایک گھنٹا نماز میں رہ گیا ہے اتنے لوگ کہاں سے لاؤ گے؟“

گورنر کے جاتے ہی ہر طرف سے لوگ ہجوم درہجوم چلے آ رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کئی لاکھ آدمی جمع ہو گئے۔ یہ جنازہ بغیر کسی تحریک کے تھا۔ بڑی بڑی تحریکوں میں بھی اتنے لوگ مشکل سے جمع ہوتے تھے۔ میاں صاحب کا کہنا درست ثابت ہوا کہ اتنے لوگ ہوں گے زمین نظر نہیں آئے گی۔
شہر میں مکمل ہڑتال تھی۔ غم غصہ بھی تھا لیکن ایک شیشہ

بھی کہیں نہیں ٹوٹا۔ علم الدین شہید کو قبرستان میانی صاحب میں دفن کیا گیا۔
☆☆☆
شروع ہی سے میاں عبدالعزیز ایک ایسے ہمدرد وکیل کا روپ دھار چکے تھے جو بعض قومی نوعیت کے مقدمات مفت لڑ رہے تھے۔ خاکساروں کے وہ تمام مقدمات جو پولیس اور خاکساروں کے درمیان جھگڑے سے متعلق قائم کیے گئے تھے، میاں عبدالعزیز نے لڑے حالانکہ اس وقت وہ پنجاب اسمبلی کے رکن تھے اور پنجاب میں سرسکندر حیات کی حکومت تھی لیکن معاملہ مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان تھا اس لیے میاں صاحب پیش پیش رہے۔

اسی طرح سید عطا اللہ شاہ بخاری کے مقدمے کی پیروی کا سہرا بھی میاں عبدالعزیز کے سر رہا۔
جنگ عظیم شروع ہوئی تو برطانوی حکومت اس جنگ کی ایک بڑی فریق تھی اور اس کی طرف سے ہندوستانیوں کو فوج میں بھرتی کر کے محاذ جنگ پر بھیجا جا رہا تھا۔ مجلس احرار کا موقف یہ تھا کہ ہندوستان کے لوگ فوج میں بھرتی ہو کر جنگ میں حصہ نہ لیں۔

سرسکندر حیات ہر صورت میں انگریزوں کی حمایت کرنے پر مصر اور مجلس احرار کی آواز دبانے کے درپے تھے۔ احرار رہنما عطا اللہ شاہ بخاری فوجی بھرتی کے خلاف تقریریں کرتے ہوئے ضلع مظفر گڑھ پہنچے تھے کہ گرفتار کر لیے گئے۔

مولانا بخاری کی گرفتاری کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ مجلس احرار کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا اور قرارداد پاس کی گئی۔

”مسلمانان ہند اس وقت تک اس جنگ میں حکومت برطانیہ کے ساتھ تعاون نہیں کریں گے جب تک کہ برطانیہ اسلامی ملکوں سے اپنی فوجیں واپس نہ بلا لے۔ نیز ہندوستان کو مکمل طور پر آزاد نہ کر دے۔“

اس قرارداد نے جلتی برتنیل کا کام کیا۔ ابھی تک تو عطا اللہ شاہ بخاری گرفتار کے گمے تھے، اب انہیں سیشن جج راول پنڈی کی عدالت میں بھیج دیا گیا۔ کوئی الزام ثابت نہیں ہوا۔ شاہ جی بری ہو گئے۔

چند ماہ بعد انہیں پھر گرفتار کر لیا گیا۔ الزام یہ لگایا گیا کہ لالہ مویٰ میں تقریر کرتے ہوئے شاہ جی نے لوگوں کو انگریزوں کے قتل پر ابھارا تھا۔ اس تقریر کا رپورٹر لدھارام

ایک ہندو تھا، اس کو گواہ کی حیثیت سے پیش ہونا تھا۔ اس مقدمے کی سماعت ابتدا میں مجسٹریٹ کی عدالت میں ہوئی۔ شاہ جی مقدمے کی پیشی کے لیے کمرہ عدالت میں پیش ہوئے۔ لدھارام ہیڈ کاشیل بھی سرکاری گواہ کی حیثیت سے پیش ہوا جس نے تقریر کے نوٹ لیے تھے اور مبینہ طور پر حکام بالا کی خاص ہدایات کے مطابق اس تقریر میں رد و بدل کر دیا تھا۔

گواہ عدالت میں حاضر ہوا اور اپنے سامنے میاں عبدالعزیز کو دیکھا جو فوجداری مقدمات میں مانے ہوئے وکیل تھے۔ میاں صاحب نے کچھ اس انداز سے جرح کی کہ اس کے ضمیر نے سچ بات اگل دی۔

”شاہ صاحب پر وزیراعظم اور ان کے پرسن اسٹنٹ کی ہدایات سے جھوٹا مقدمہ بنایا گیا ہے۔“
سرکاری وکیل نے درخواست دی کہ اس مقدمے کو ہائی کورٹ میں منتقل کیا جائے کیونکہ لدھارام گواہ نے وزیراعظم کو اس مقدمے میں پھنسانے کی کوشش کی ہے۔ اب یہ معاملہ کسی عدالت ماتحت کے بس کا نہیں رہا۔

مقدمہ ہائی کورٹ میں منتقل کر دیا گیا۔ ہائی کورٹ میں مقدمہ شروع ہوا تو سرکاری وکیل کے دلائل سننے کے بعد چیف جسٹس نے میاں عبدالعزیز سے پوچھا۔

”کیا آپ کو مقدمے کی از سر نو سماعت پر کوئی اعتراض ہے؟“

میاں عبدالعزیز نے جواب دیا۔ ”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ مقدمے کی سماعت از سر نو شروع ہو گئی۔

یہ مقدمہ کئی مہینے چلتا رہا۔ آخر میاں عبدالعزیز سرخرو ہوئے۔ لدھارام گواہ کو عدالت نے ناقابل اعتبار قرار دیا اور سید عطا اللہ شاہ بخاری کو بری کر دیا گیا۔

اس مقدمے کی کامیاب پیروی کے بعد تو میاں عبدالعزیز کی شہرت بلند یوں کو چھونے لگی اور یہ معلوم ہونے لگا کہ جب تک میاں عبدالعزیز ہیں انگریز حکومت کسی مسلمان کو بے جا مقدمے میں نہیں پھانس سکے گی چنانچہ میاں عبدالعزیز نے متعدد علمائے دین، زعمائے قوم اور سیاسی و مذہبی قائدین کے مقدمات لڑے اور تمام میں کامیاب ہوئے۔

مولانا ظفر علی خاں ایک نہیں کئی مرتبہ جیل گئے اور مقدمات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے ہر مقدمے کی سماعت میاں صاحب نے ہی کی۔

مردم خیز

سن 32 یا 33 کا ذکر ہے، میں (میاں عبدالعزیز) چند دوستوں کی معیت میں علامہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، دوستوں نے حسب معمول علامہ صاحب سے شکوہ کیا کہ ”حضور اب مسلمانوں کا کیا ہو گا؟“

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ ”تمہیں کیا فکر ہے۔ اللہ مالک ہے۔“ پھر ایک دم پوری توجہ کے ساتھ بول اٹھے۔ ”آپ نے بھی یہ نہیں دیکھا کہ زمیندار ایک دفعہ جس زمین میں گندم بوتا ہے اس زمین کے کسی ٹکڑے کو خالی چھوڑ دیتا ہے صرف اس لیے کہ آئندہ سال وہ ٹکڑا زیادہ طاقت سے فصل پیدا کر سکے۔ اسی طرح بعض زمینیں مردم خیز بھی ہوتی ہیں۔ کبھی اس میں بڑے بڑے نامور لوگ پیدا ہوتے ہیں اور پھر خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ یہ قانون قدرت ہے۔ عربستان، افغانستان اور ایران نے کیسے کیسے شہسوار پیدا کیے مگر اب کیوں پیدا نہیں ہو رہے صرف اس لیے کہ منشاے ایزدی کے مطابق یہ زمینیں آرام کر رہی ہیں۔ دعا کرو کوئی اللہ کا بندہ پیدا ہو اور ہم لوگوں کی نجات کا موجب بنے۔“ یہ فقرہ کہتے ہوئے علامہ صاحب آبدیدہ ہو گئے۔ اس وقت ان کا چہرہ دیکھنے کے قابل تھا۔ نہایت سرخ، آنسو ضبط کرنے کی لاکھ کوشش کرتے مگر وہ ٹپک ہی جاتے تھے۔

ایک دفعہ جیل سے رہا ہوئے تو انگریزی حکومت کے ڈر سے کوئی انہیں اپنے گھر میں جگہ دینے کو تیار نہیں تھا کہ کہیں ان سے ہمدردی کی وجہ سے وہ بھی حکومت کے عتاب کی زد میں نہ آجائے۔ میاں صاحب نے کسی خوف کی پروا نہیں کی اور رہا کروا کے انہیں اپنے گھر لے آئے جہاں انہوں نے دو مہینے تک قیام کیا۔

یہ تیاریاں اس لیے ہو رہی تھیں کہ 1945ء کے انتخابات ہونے والے تھے۔ یہ انتخابات اس لحاظ سے بہت اہم تھے کہ انہی انتخابات پر ملک کی آزادی اور پاکستان کے قیام کا انحصار تھا۔ برصغیر کی تمام سیاسی جماعتیں کامیابی سے ہم کنار ہونے کے لیے جدوجہد کر رہی تھیں۔ پنجاب کی سیاست برادر یوں کے گرد گھومتی تھی۔

آرائیں برادری بہت بڑی تھی۔ میاں عبدالعزیز بھی اسی آرائیں برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ قائد اعظم نے انہیں خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ وہ اپنی برادری میں انتخاب کے لیے کام کریں۔ مسلم لیگ کے لیے راہ ہموار کریں۔ ان کے آپس کے اختلافات دور کر کے سیاسی شعور بیدار کریں۔

جنگ ختم ہونے کے ساتھ ہی سلطنت برطانیہ کے ہر حصے میں انتخابات کی گہما گہمی شروع ہو گئی تھی۔ ہندوستان بھی سلطنت برطانیہ کا ایک حصہ تھا۔ مرکزی اسمبلی توڑ دی گئی تھی۔ بعض صوبائی اسمبلیوں میں انتخابات کا اعلان بھی کر دیا گیا تھا۔ جن صوبوں میں اسمبلیاں کام کر رہی تھیں وہ بھی بس ٹوٹنے والی تھیں۔

صوبہ پنجاب میں بھی انتخابات ہونے والے تھے۔ سیاسی امیدوار مختلف برادریوں کو اپنے حق میں کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

خاکساروں کے سوا سب ہی جماعتیں مضبوط تھیں اور تجربہ کار بھی۔ مسلم لیگ مسلمانوں کی نمائندہ بن کر ابھر رہی تھی لیکن جریفوں سے مقابلہ سخت تھا۔

سب سے پہلے یونینٹ پارٹی کے سحر کو توڑنا تھا کیونکہ حکومت اسی کی تھی۔ میاں عبدالعزیز نے آرائیں برادری کو متحد کرنے کے لیے یونینٹ پارٹی اور اس کی حکومت کی ناقص کارکردگی کو اپنی برادری کے سامنے بیان کیا۔

”یونینٹ پارٹی کے خداوندوں نے ہماری برادری کے ساتھ جو کچھ کیا وہ ہم بھلا نہیں سکتے۔ اس پارٹی کے بزرگوں نے نہ تو ہم راہیوں کو زراعت پیشہ سمجھا اور نہ اس نے ہمیں وہ حقوق دیے جس کے ہم ہر طرح سے مستحق تھے۔ ملازمتوں، تقسیم مناصب وغیرہ میں ہمیں ہمیشہ نظر انداز کیا۔ اب بھی اگر کوئی آرائیں بلا سوچے سمجھے کوئی امداد یونینٹ پارٹی کی کرے تو سخت غلطی کرے گا۔“

اسلامی جماعتیں انتخابات کی تیاری کر رہی ہیں تو پھر کیوں ہماری انجمن راعیان ہندان سے گفت و شنید نہیں کرتی اور کیوں اپنے حقوق ان کے سامنے پیش نہیں کرتی۔

عوام کی اس وقت انتخاب میں حصہ لینے والی جماعتوں میں سے زیادہ ہمدردی لیگ کے ساتھ ہے کیونکہ مسلم لیگ ایک آل انڈیا جماعت ہے۔

میں اپنے بھائیوں سے یہ گزارش کروں گا کہ اس وقت تک کسی فرد واحد یا جماعت سے وعدہ نہ کریں جب تک ان کی انجمن اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہ کرے۔“

انتخابات نزدیک آئے تو میاں عبدالعزیز نے ووٹروں کے نام ایک گشتی مراسلہ جاری کیا جس میں ووٹروں سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ اپنے ووٹوں کا اندارج ضرور کروائیں۔

”دوسری قومیں تو اپنے آپ کو منظم کر کے جنگ آزادی میں کود چکی ہیں لیکن ہم ابھی تک اپنے آپ سے بے خبر ہیں۔ ہمارا قومی فرض ہے کہ ہم آئندہ انتخابات سے پورا فائدہ اٹھائیں۔ یہ ہم اسی حالت میں کر سکتے ہیں کہ آئندہ اسمبلی کے لیے زیادہ سے زیادہ ووٹ درج کروائیں۔“

قوموں کی زندگی کا انحصار ووٹروں کی کثرت پر ہے۔ وہ قوم جن کے ووٹروں کی تعداد زیادہ ہو حقیقی معنوں میں زندہ قوم ہے۔ آج ہم نے اپنی زندگی کا ثبوت دینا ہے اور دکھانا ہے کہ پنجاب میں مسلمان آبادی کے لحاظ سے ہی اکثریت میں نہیں بلکہ ان میں ووٹروں کی بھی کثرت ہے۔“

☆☆☆

پنجاب میں انتخابات ہو چکے تھے جس میں مسلم لیگ کو کامیابی ہوئی لیکن مسلم لیگ کے بجائے کولیشن کی وزارت بن گئی۔ میاں عبدالعزیز کے کاغذات نامزدگی ایک سازش کے تحت مسترد کر دیے گئے تھے۔ وہ قائد اعظم کی ہدایت کے مطابق آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب لڑ رہے تھے۔

برطانیہ کی طرف سے وزارتی مشن تصفیہ کی نئی اسکیم لے کر آیا جو تین وزیروں پر مشتمل تھا۔ اس وزارتی مشن کی تجویز کے دو حصے تھے۔ ایک کا تعلق مرکز میں عبوری حکومت کے قیام سے تھا۔ دوسرے حصے کا تعلق ملک کے مستقل انتظامات سے تھا۔ آخری حصے کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندوستان کے صوبوں اور ریاستوں کی ایک یونین قائم کی جائے جس کے سپرد دفاع، امور خارجہ اور خزانہ ہوں۔ صوبوں کو اندرونی خود مختاری دی جائے اور انہیں تین گروہوں میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ جو صوبے پاکستان کے مطالبے کے پیش نظر یکجا ہونا چاہیں وہ اپنا ایک گروپ بنالیں۔

ان تجاویز میں چونکہ پاکستان کے مطالبے کی تکمیل نہ ہوتی تھی اس لیے مسلمانوں نے اسے مسترد کر دیا۔ ممبئی مسلم لیگ کے اجلاس میں ”راست اقدام“ کا عزم کیا اور پہلے مرحلے میں مسلم لیگیوں نے خطابات ترک کرنے شروع کر دیے۔ راست اقدام کا سنتے ہی ہندوؤں نے مسلمانوں سے لڑنے کی تیاری کر لی۔ کلکتہ میں ہولناک فساد ہوا جس میں ہزاروں ہلاک، ہزاروں مجروح ہوئے پھر ممبئی، الہ آباد،

نواکھلی ہر جگہ خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔

حالات اس نہج پر پہنچ گئے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک جائز زندگی بسر کرنا غیر ممکن ہو گیا۔ کابینہ مشن مایوس ہو کر واپس چلا گیا اور ہندوستان میں ایک عبوری وزارت قائم کر دی گئی جس میں کانگریس اور لیگ کو نمائندگی دی گئی۔

عبوری حکومت کی یہ نیا زیادہ دن نہ چل سکی۔ پنجاب کے وزیر اعظم ملک خضر حیات نے فسادات کا بہانہ بنا کر مسلم لیگیوں کی گرفتاریوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مسلمانوں میں وہ نامقبول ہوتے چلے گئے۔

خضر حیات شاید اب بھی ڈٹے رہتے لیکن وزیر اعظم برطانیہ کی جانب سے یہ اعلان آ گیا کہ حکومت برطانیہ اختیارات حکومت ہندوستانوں کی طرف منتقل کرنے والی ہے تو خضر حیات کو اپنی کمزور پوزیشن کا احساس ہوا۔ انہوں نے تو عزت اسی میں سمجھی کہ استعفیٰ دے دیں۔ انہوں نے اس بیان کے ساتھ استعفیٰ دے دیا۔

”میں اب تک پنجاب میں کولیشن وزارت کے قیام کا حامی ہوں اور جہاں تک ملت اسلامیہ کا تعلق ہے میں اس کے مطالبات کی پوری پوری تائید کرتا ہوں لیکن چونکہ انتقال اختیارات ہونے والا ہے اس لیے میں مسلم لیگ کے لیے میدان خالی کر رہا ہوں تاکہ وہ حتی الامکان وزارت مرتب کرے۔“

ملک خضر حیات کے استعفیٰ کے ساتھ ہی بند ٹوٹ گیا۔ لاہور اور دوسرے مقامات پر ہندوؤں اور سکھوں کے متحدہ جلسے ہونے لگے۔ ان جلسوں نے فرقہ واریت کو ہوا دی۔ صوبے بھر میں فسادات شروع ہو گئے۔ دوسرے مقامات میں ہندوؤں اور سکھوں نے قیامت مچادی۔

ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کے وائسرائے مقرر ہو کر آئے۔ انہوں نے آتے ہی گاندھی جی اور قائد اعظم کے دستخطوں سے ایک اعلان شائع کروایا جس میں اہل ملک کو امن وامان سے رہنے کی نصیحت کی گئی تھی۔

یہ اعلانات بے کار گئے۔ فسادات زور پکڑتے گئے۔ امرتسر اور لاہور دونوں شہروں میں امن وامان ختم ہو چکا تھا۔ لاہور سے ہندو آبادی بھاگ رہی تھی۔ امرتسر کے مسلمان لاہور کا رخ کر رہے تھے۔

فسادات کی آندھی ہولناک نشانات چھوڑ کر رخصت ہوئی تو دونوں طرف کی حکومتیں اپنے اپنے زخم بھرنے میں مصروف ہو گئیں۔ سب سے بڑا مسئلہ شرنارتھیوں اور

شکوہ

میں (میاں عبدالعزیز) اور ڈاکٹر اقبال چیف کورٹ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ باتیں کر رہے تھے۔ دوڑ حائی بچے ہوں گے تو وہ مجھے کہنے لگے۔ ”تم نے مقدمہ تیار کر لیا؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں۔“

کہنے لگے۔ ”چلو مکان پر چائے وہیں بیٹیں گے۔“ چنانچہ ہم دونوں اس انارکلی والے مکان میں جوش نصیر الدین کیمسٹ کی دکان کے اوپر تھاکے۔

اقبال کہنے لگے۔ ”میں نے ایک نظم لکھی ہے جو میں چاہتا ہوں تمہیں سناؤں۔“ جب نظم سنا چکے تو کہنے لگے۔ ”میں سوچ رہا ہوں اس کا نام کیا رکھوں؟“

میں نے کہا۔ ”آپ نے تو اس کا نام خود ہی تجویز کر دیا ہے۔“

کہنے لگے۔ ”کیا؟“

میں نے کہا۔ ”شکوہ۔“

کہنے لگے۔ ”بہت خوب! اس کا نام شکوہ رکھوں گا۔“ یہ تھی اقبال کی مشہور نظم شکوہ جس پر بڑی لے دے ہوئی اور اقبال کو جواب شکوہ بھی لکھنا پڑا۔

مہاجرین کی آباد کاری کا تھا۔

میاں عبدالعزیز نے یہ دن خاموشی سے گزارے اور تذلیل انسانیت کے مظاہرے دیکھتے رہے۔ اس دور میں خاموش ہی رہا جاسکتا تھا۔ کچھ دن پہلے تک ہندو اور سکھ دونوں میاں صاحب کے عقیدت مند تھے لیکن اب سب کی آنکھوں میں خون اتر ا ہوا تھا۔

فسادات کی آگ سرد ہوئی اور وہ گھر سے نکلے تو شہر کی صورت ہی بدلی ہوئی دیکھی۔ تمام صورتیں اجنبی نظر آرہی تھیں۔ تمام سڑکوں پر ہزاروں لوگ مختلف چیزوں کے خوائے لگائے بیٹھے تھے۔ یہ سب مہاجرین تھے۔ جن کا سب کچھ برباد ہو گیا تھا۔

وہ آدھے رات سے لوٹ آئے۔ اپنی کوشی کے دروازے مہاجرین کی شکایات سننے کے لیے کھول دیے۔ مہاجروں کی مالی امداد کے لیے ساتھی دکلا کی ایک کمیٹی بنائی۔

ان کی کوشی مہاجرین کا سینٹر بنی ہوئی تھی جہاں ان کو

بسانے کا انتظام بھی کیا جاتا تھا اور ان کی مالی امداد بھی کی جاتی تھی۔ جو مہاجرین اپنی جائیدادیں چھوڑ کر آئے تھے انہیں کلیم داخل کروانے میں بھی طرح طرح کی دقتیں پیش آرہی تھیں۔ انہیں صحیح معاوضہ دلانے کے لیے میاں صاحب کی بیٹائی ہوئی دکھا کی کمیٹی کام آئی۔

یہ وقت ہی ایسا تھا کہ صاحب ثروت افراد بھی ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ اس وقت کسی سے چندہ وصول کرنا آسان نہیں تھا لیکن میاں صاحب پر سب ہی بھروسہ کرتے تھے۔ میاں صاحب نے اپنے ذاتی تعلقات استعمال کیے اور مہاجرین کی آباد کاری کے لیے رقم اکٹھی کر کے ان پر خرچ کی۔

مہاجروں کے لیے جو سرکاری سینٹر بنائے گئے تھے میاں صاحب ان سینٹروں سے زیادہ کام کر رہے تھے۔ جس کو ذرا بھی شکایت ہوئی سرکاری سینٹروں میں جانے کے بجائے میاں صاحب کی کوشی کا رخ کرتا تھا۔ ان کی عمر 75 سال ہو گئی تھی لیکن مہاجروں کا دکھ دیکھ کر وہ یوں اٹھ کھڑے ہوتے جیسے پھر سے جوان ہو گئے ہوں۔

☆☆☆

ان کی نظر کئی سال پہلے سے کمزور ہونا شروع ہو گئی تھی۔ اب اس کمزوری میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ علاج چلتا رہا اور بالآخر یہ طے ہوا کہ آنکھ کا آپریشن کروایا جائے۔ ڈاکٹروں کا بھی یہی مشورہ تھا کہ آپریشن کے بعد نظر بحال ہو جائے گی۔ ایک ماہر ڈاکٹر سے آپریشن کروایا گیا۔ وائے قسمت کہ آپریشن کامیاب نہ ہوا۔ بینائی جاتی رہی۔ دنیا اندھیر ہو گئی تھی۔ جس پاکستان کا خواب دیکھا تھا وہ پورا ہو گیا تھا۔ اب اسے پھلتے پھولتے دیکھنے کا وقت تھا کہ بینائی چلی گئی۔ نئے پاکستان کی خدمت کے لیے بہت عزائم دل میں تھے جن کی تکمیل اب مشکل نظر آرہی تھی۔

ثابت قدمی اور اللہ کی رضا پر شاکر رہنا ان کی فطرت میں شامل تھا۔ بینائی چلی جانے کے بعد بھی نہ کوئی افسوس تھا نہ حرف شکایت زبان پر۔ دوستوں کو البتہ افسوس ہوتا تھا لیکن وہ اسے اللہ کی مرضی کہہ کر سب کو خاموش کر دیتے تھے۔

”اللہ کی مرضی یہی تھی۔ اس نے اس جہان میں بڑی عزت دی۔ بہت دنیا دیکھی۔ اب اس کی رضا پر خوش ہوں۔“

ایسے ہی دوستوں میں سے ایک نے یہ نوید دی کہ ایک ماہر چشم بیرون ملک سے آیا ہوا ہے۔ اگر اسے بھی دکھالیا جائے تو کیا حرج ہے۔

”مجھے اپنی بیٹائی زائل ہونے کا افسوس ضرور ہے لیکن میں اللہ کی ذات سے مایوس نہیں۔ مرض پر رونا دھونا ایک بات ہے اور علاج کے لیے کوشاں رہنا دوسری بات ہے۔ میں اس ڈاکٹر کو ضرور دکھاؤں گا۔“

اسی وقت اپنے بڑے بیٹے عبدالحمید کو بلایا اور ہدایت کی کہ مذکورہ ڈاکٹر سے وقت ملاقات لے کر انہیں اس ڈاکٹر کے پاس لے چلیں۔

گھر میں خوشی کا ماحول تھا۔ جس عزم و امید کے ساتھ وہ ڈاکٹر کے پاس جا رہے تھے اس سے یہی لگتا تھا کہ خدا ان کی سن لے گا لیکن جب گھر واپس لوٹے تو چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

”بھئی، یہ ڈاکٹر اپنے فن میں ماہر نہیں، کہتا ہے بینائی بحال نہیں ہو سکتی۔ چلو قدرت کوئی اور انتظام کرے گی ورنہ خدا کی مرضی۔“

اس کے بعد جب بھی سنتے کہ کوئی ڈاکٹر یہاں آیا ہے تو اس سے ضرور ملتے اور مشورہ لیتے۔ جب ہر طرف سے انکار کی صدا آئی آنے لگیں تو اپنی ہسٹری شیٹ یورپ کے ایک ڈاکٹر کے پاس بھیجی اور لکھا کہ اگر علاج ممکن ہے تو میں وہاں آنے کو تیار ہوں۔ وہاں سے بھی جواب لٹی میں آیا۔ اس کے بعد انہوں نے کسی ڈاکٹر کو نہیں دکھایا۔

بینائی چلی گئی تھی۔ معمولات زندگی میں فرق آ گیا تھا لیکن کوئی مایوسی نہیں تھی۔ اخبارات کسی سے سن لیا کرتے تھے۔ پاکستان کے سیاسی حالات کی طرف سے سخت فکر مند تھے لیکن مایوس اب بھی نہیں تھے۔ امید کی کرن ہر وقت ساتھ رہتی تھی۔

جدوجہد آزادی کے بہت سے سپاہیوں کی طرح انہیں بھی فراموش کر دیا گیا تھا۔ انہیں دکھ تھا تو صرف اس بات کا 1966ء میں عمر عزیز 94 سال کی ہو چکی تھی کہ حج بیت اللہ کا ارادہ باندھا۔ بینائی زائل ہو گئی تھی لیکن قویٰ مقصّل نہیں ہوئے تھے۔

بیٹے، بہو اور دو ملازموں کے ساتھ رخت سفر باندھا۔ تین چار دن کراچی میں اپنے اعزہ کے ساتھ ٹھہرنے کے بعد بحری سفر کا آغاز کیا۔

جہاز جدہ پہنچا تھا کہ حکومت پاکستان کے جج آفیسر شیخ

اعزاز نیاز جہاز پر آئے اور کشم وغیرہ کا مرحلہ آسان کروادیا۔ حاجیوں کے لیے گورنمنٹ نے یہ انتظام کیا تھا کہ تمام حجاج جدہ سے سیدھے مدینہ منورہ جائیں گے لیکن انہیں پہلے عمرہ ادا کرنا تھا لہذا شیخ اعزاز نیاز نے اسی وقت اسٹیشن کار کا انتظام کر دیا۔ رات کا ڈیڑھ بجنا تھا کہ میاں صاحب اپنے ہمسفروں کے ساتھ مکہ معظمہ پہنچے اور عمرے کے ارکان ادا کیے۔ شیخ اعزاز یہاں بھی ساتھ تھے لہذا سہولتیں ملتی رہیں۔ دوسرے دن پھر جدہ پہنچ گئے۔ حجاج کرام مدینہ جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ یہ بھی بذریعہ کار مدینہ منورہ روانہ ہو گئے۔

مدینہ منورہ سے پھر جدہ آ گئے۔ یہاں سے مکہ پہنچے۔ رہائش کے لیے مکان پہلے ہی لے لیے گئے تھے۔ حج سے فراغت کے بعد یوم عید کو مزدلفہ منی کے لیے روانہ ہوئی۔ منی پہنچ کر اس مکان میں ٹھہرے جو کرائے پر لے لیا گیا تھا۔ یہاں انہیں اطلاع ملی کہ وائس چانسلر مدینہ یونیورسٹی ان سے ملاقات کے متمنی ہیں۔ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ وائس چانسلر سے ملاقات کے لیے پہنچے۔

وائس چانسلر ایک بڑے خیمے میں اقامت پزیر تھے۔ ان کا نام بھی عبدالعزیز تھا اور پیدائشی نابینا تھے۔ میاں عبدالعزیز بھی اب نابینا ہو چکے تھے۔ لوگ اس منظر کو دیکھ رہے تھے کہ دو نابینا باہم گلے مل رہے ہیں۔

بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ جب خیمے سے باہر نکلے تو کسی نے بتایا کہ اس وقت ہم شاہ فیصل کے محل کے سامنے ہیں۔ سنتے ہی تڑپ گئے۔

”چلے ان سے ملاقات کریں۔“

”جب تک پہلے سے وقت نہ لیا ہو، ان سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔“ ان صاحب نے بتایا۔

”ملاقات نہ ہوئی تو کوئی حرج نہیں کوشش تو کر دیکھیں۔ شاید وہ ملاقات کا شرف بخش ہی دیں۔“

یہ صاحب جو اس وقت ان کے ساتھ تھے حافظ احسان الہی تھے۔

حافظ صاحب ان کے اصرار پر محل میں داخل ہو گئے۔ محل کے ایک کمرے میں چند اشخاص بیٹھے ہوئے تھے۔ حافظ صاحب غائبی جانتے تھے۔ انہوں نے ان لوگوں سے کہا کہ ہم لوگ پاکستان سے آئے ہیں اور شاہ فیصل سے ملاقات چاہتے ہیں۔ ان لوگوں میں سے ایک کسی طرف غائب ہو گیا۔ غالباً وہ اجازت لینے گیا تھا۔ چند منٹ بعد

سوانحی خاکہ

نام..... میاں عبدالعزیز

والد..... مولوی الہی بخش

آبائی شہر..... لاہور

رواگئی..... انگلستان 1895ء

عارضی قیام..... ہوشیار پور

تکمیل پیرسٹری..... 1898ء

عہدے..... صدر لاہور میونسپل کارپوریشن،

رکن پنجاب لچسٹو اسمبلی لاہور، صدر پنجاب صوبائی مسلم

لیگ، رکن صوبائی اسمبلی (پنجاب)، میئر لاہور

کارپوریشن (بعد از قیام پاکستان)

پیدائش..... امرتسر (1872)

تدفین..... مصری شاہ قبرستان (لاہور)

واپس آیا۔ اجازت مل گئی تھی۔ وہ ان دونوں کو ایک طویل و عریض کمرے میں لے گیا جو خوب صورت کرسیوں سے مزین تھا۔

شاہ فیصل اپنی جگہ سے اٹھ کر آگے آئے اور میاں عبدالعزیز کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ میاں صاحب چونکہ عربی نہیں جانتے تھے لہذا انگریزی میں گفتگو کا آغاز کیا۔

”میں لاہور سے آیا ہوں اور سلام عرض کرنے کی غرض سے حاضر ہوا ہوں نیز کچھ مفروضات بھی پیش کرنے کا خواہش مند ہوں۔“

حافظ احسان الہی کے ذریعے عربی میں گفتگو ہوتی رہی۔ جتنی دیر گفتگو ہوئی شاہ فیصل میاں صاحب کا ہاتھ مسلسل اپنے ہاتھوں میں لیے رہے۔

حافظ صاحب نے شاہ فیصل کو بتایا۔ ”میاں صاحب کی عمر 94 سال ہو چکی ہے۔ اس کے باوجود آپ جوانوں کی طرح سفر پر نکلے ہیں۔“

شاہ فیصل نے تین مرتبہ ماشاء اللہ کے الفاظ دہرائے۔ ان کی سماجی خدمات کا سن کر بھی بہت خوش ہوئے۔ یہ ملاقات تقریباً دس منٹ جاری رہی۔ اس کے بعد مصافحہ کرنے کے بعد شاہ فیصل نے رخصت کیا۔

ان بیش قیمت یادوں کو لے کر وہ اور ان کے ساتھی جدہ آ گئے۔ اب واپسی کا سفر درپیش تھا۔ جدہ سے عدن پہنچے

اور پھر کراچی۔

اعزہ کو آمد کی اطلاع ہو چکی تھی لہذا بہت سے عزیز
انرپورٹ پر موجود تھے۔ یہ 23 اپریل 1966ء بھی
جب ان کا جہاز لاہور انرپورٹ پر اترا۔

1966ء کی ایک چمکیلی صبح تھی جب کچھ لوگوں نے
آپ کے دروازے پر دستک دی۔ ملازم نے آکر بتایا کہ
ریڈیو پاکستان کی طرف سے کچھ لوگ ملاقات کے لیے
حاضر ہوئے ہیں۔

”شاید انٹرویو وغیرہ کا کوئی سلسلہ ہوگا۔“ آپ نے
ملازم سے کہا۔ ”عبدالحمید یا عبدالجید (بیٹے) میں سے کوئی
ساتھ رہے تاکہ انٹرویو کے دوران میری معاونت ہو سکے۔
بہت سی باتیں میں بھول بھی گیا ہوں۔ وہ یاد دلا دیں گے۔“

جب آنے والے اندر آئے تو حقیقت حال کچھ اور
ہی تھی۔ معلوم ہوا ریڈیو پاکستان کی طرف سے نشر و اشاعت
کی اصلاح کے لیے ایک سوال نامہ جاری کیا گیا تھا جو مختلف
حضرات کی خدمت میں بھیجا گیا تھا۔ یہ لوگ خود ان کے
پاس چل کر آئے تھے تاکہ بالمشافہ ایسی تجاویز حاصل کریں
جس سے ریڈیو کا نظام بہتر بنایا جاسکے۔

”میاں صاحب، آپ ریڈیو سنتے ہیں؟“

”اب فرصت کا مشغلہ یہی رہ گیا ہے۔“

”اس ادارے کی کارکردگی اور اس کے نقائص بھی
آپ کے سامنے ہوں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ کے
مشوروں سے استفادہ کریں اور آپ کے مشوروں پر عمل
کرتے ہوئے ریڈیو کا نظام بہتر بنائیں۔“

”بھئی میرا پہلا مشورہ تو یہ ہے کہ صبح کے پروگرام میں
راگ رنگ کی بے ہودگی کا کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے۔
جناب یہ وقت کھیل کود کا نہیں ہوتا بلکہ کام کاج اور اصلاح
کا ہے۔“ ریڈیو کے ارکان نے ان تجاویز کو ایک کاغذ پر لکھنا
شروع کر دیا۔

”ایسا انتظام کیا جائے کہ دوران تلاوت کلام
پاک، درس قرآن یا خبروں کے وقت بجلی کے سوئچ نہ
بدلنے پائیں جس سے ریڈیو بند ہو جاتا ہے۔ بجلی
اور ریڈیو دونوں سرکاری محکمے ہیں اس لیے ان میں باہمی
رابطہ بہت ضروری ہے۔“

”جناب پچھلے دنوں میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی
ماہانہ نشری تقریر سن رہا تھا۔ یہ تقریر عین مغرب کے وقت
ہوتی رہی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر سہ ماہی کے بعد

پروگراموں کے اوقات تبدیل ہوتے رہیں کیونکہ نمازوں
کے اوقات کار میں تبدیلی آ جاتی ہے۔ ایوب خان کی تقریر
کے ساتھ یہی ہوا تھا۔“

”ہر مجلس کا آغاز تلاوت کلام پاک اور اس کے
ترجے سے ہونا چاہیے خواہ پانچ منٹ کے لیے ہی کیوں
نہ ہو۔“

”تقریر یا خبروں کا اظہار یک طرفہ نہیں ہونا چاہیے
بلکہ حزب اختلاف کو بھی اپنے خیالات کے اظہار کا موقع ملنا
چاہیے۔ اخبارات کے اقتباسات سنائے جاتے ہیں۔ اس
میں صرف سرکاری اخبارات کو نہ لیا جائے۔“

”ریڈیو پاکستان پر محرم کے دس روزہ پروگرام میں
راگ رنگ کے پروگراموں کی قطعی ممانعت ہوتی ہے۔ ماہ
رمضان المبارک بھی چونکہ پوری مسلم قوم کے لیے بابرکت
اور عبادتوں کا مہینا ہے اس مہینے میں بھی طبلہ سارنگی پر
پابندی ہونی چاہیے۔“

”بچوں کے لیے کہانیاں تاریخ اسلام سے لی
جائیں جو سچی بھی ہوں گی اور سبق آموز بھی۔ من گھڑت
کہانیوں سے گریز کیا جائے۔“

”ریڈیو پروگرام رات بارہ بجے تک جاری رہتے
ہیں۔ یہ وقت رات دس بجے تک ہونا چاہیے۔ لوگ رات
بارہ بجے تک ریڈیو سنتے رہتے ہیں۔ اس سے ان لوگوں کی
نیند میں خلل ہوتا ہے جو جلد سونے کے عادی ہیں۔ گھر گھر
سے ریڈیو کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔“

”ریڈیو کا ماہوار رسالہ ”آہنگ“ نکلتا ہے۔ اس کی
قیمت بہت زیادہ ہے۔ اسے چاہے مختصر کرنا پڑے لیکن
قیمت کم کر دی جائے۔“

”خبروں کا شعبہ خاص طور پر درست اردو اور درست
انگریزی کا آئینہ دار ہونا چاہیے۔ خبریں پڑھنے والے تلفظ کا
خیال رکھیں۔ ایسے حضرات ملازم رکھے جاسکتے ہیں جو خبریں
پڑھنے والوں کا تلفظ درست کر دیاں۔“

”اسی طرح ایسے تمام پروگراموں کی تیاری کی
جائے جو اخلاق سوز ہیں۔ پاکستان اسلامی اصولوں پر
قائم کیا گیا ہے۔ ریڈیو کو بھی اسلامی اصولوں کو مدنظر رکھنا
چاہیے۔“

ان تجاویز کے بعد بھی انہوں نے ریڈیو کی اہمیت اور
اس کے ذریعے معاشرے پر پڑنے والے اثرات پر طویل
تقریر کی۔ ریڈیو کے لوگ سخت متاثر ہوئے۔ ان تجاویز کو

حکام بالا تک پہنچایا بھی گیا کچھ پر عمل ہوا کچھ نہیں ہوا۔
اب میاں صاحب تقریباً گوشہ نشینی کی زندگی گزار
رہے تھے۔ کوئی آ جاتا تو اس سے مل لیتے ورنہ عبادت میں
وقت گزارتے۔

اسی سال یعنی 1966ء میں قائد اعظم کا یوم ولادت
آیا تو صحافیان ان کے پاس بھی آئے اور ان سے اس موقع پر
پیغام کی فرمائش کی۔ وہ بولتے گئے اور ایک صحافی اسے قلم بند
کرتا گیا۔ ان کا یہ پیغام ان کے دلی تاثرات بھی تھے اور
قیام پاکستان کی تاریخ بھی۔

”حضرات! میری عمر اس وقت 95 سال ہے۔
آنکھوں کی بینائی جانے کی وجہ سے گوشہ تنہائی میں پڑا رہتا
ہوں۔ نہ معلوم کس دن بلاوا آجائے۔ میری معلومات کے
مطابق جب مسلمانوں کو بالکل بے بس کر دیا گیا تو نواب
سلیم اللہ آف ڈھاکا نے مسلم لیگ کے قیام کا فیصلہ کیا۔“

قائد اعظم سے میری ملاقات انگلستان میں ہوئی
تھی۔ وہ مجھ سے چار سال چھوٹے تھے۔ جب وہ ہندوستان
واپس آئے تو انہوں نے کانگریس سے اپنا سیاسی سفر شروع
کیا لیکن جب ان پر ہندو کی عیاریاں ظاہر ہوئیں تو انہوں
نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی اور اس جماعت کو
فعال کرنے کے لیے دن رات ایک کر دیے۔ متحدہ پنجاب
میں سب سے پہلے میرے ہی غریب خانے پر اجلاس ہوا
جس کی صدارت قائد اعظم نے فرمائی۔ اس اجلاس میں مسلم
لیگ کی تنظیم نو کا فیصلہ کیا گیا۔

یہ انہی کی دانش تھی کہ اللہ تعالیٰ نے پاکستان جیسی عظیم
الشان مملکت عطا فرمائی۔ افسوس! کہ اس اعلیٰ اقدار کو ہم
اپنی بے عملی سے پامال کر رہے ہیں۔ یہ ملک اس لیے بنا تھا
کہ یہاں رہ کر مسلمان آزادی سے اپنے مذہبی اصولوں کو عملی
جامہ پہنا سکیں گے لیکن سب کچھ اس کے برعکس ہو رہا ہے۔

ہمارے ملک میں اب تک اسلامی آئین نہیں بن
سکا۔ رشوت خوری روز بہ روز عام ہوتی جا رہی ہے۔ غنڈوں
کو پناہ دی جاتی ہے اور مظلوم بے چارہ در بدر کی ٹھوکریں
کھاتا ہے۔

میری جب آنکھیں تھیں تو وہ نظارے دیکھے ہیں کہ
ہمارے علماء کرام پر تقریریں کیا کرتے تھے کہ ہمارا مذہب
اسلام ہے۔ ہماری ثقافت، ہمارے تمام قوانین تمام اقوام
عالم سے الگ ہیں۔ ہم ایک الگ ملک چاہتے ہیں۔ ہماری
کتاب، ہمارا دین، ہمارا قبلہ ایک ہے لہذا اس بات پر ہم

سلیقہ

جب علامہ اقبال کا جنازہ اٹھا تو آگے پیچھے بڑا
ہجوم تھا۔ جب جنازہ دہلی دروازے میں داخل ہوا۔
تنگ بازار سے گزرا اور پانی والے تالاب کے پاس
پہنچا۔ خلقت کبھی ادھر جا رہی تھی کبھی ادھر جا رہی تھی۔
بڑی بد نظمی تھی۔ یہ بد نظمی دیکھ کر کسی نے زور سے پکارا۔
”اوقبال! تو اس قوم کے لیے مر گیا جس قوم کو تیرا
جنازہ اٹھانے کا بھی سلیقہ نہیں۔“

سب مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ اسی اتفاق و اتحاد کی بدولت
اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ عظیم مملکت عطا فرمائی جس کو آج ہم
پارہ پارہ کر رہے ہیں۔

حضرات! یہ تلخ حقائق میں نے ایک فریضہ سمجھتے
ہوئے آپ کے گوش گزار کر دیے ہیں۔ اب یہ ہمارا فرض
ہے کہ ہم اچھے اصولوں کو اپنائیں اور اپنے اس ملک کو صحیح
اسلامی ملک بنائیں جس کا آئین اسلامی اور جمہوری ہو۔“

ان کا یہ پیغام اخبارات میں شائع ہوا۔ سب کی
نظروں سے گزرا۔ اس نے سب کے دلوں پر اثر بھی کیا ہوگا
لیکن تبدیلی کوئی نہیں آئی۔ ملک اپنی ڈگر پر چلتا رہا۔

انہیں فراموش کر دیا گیا تھا لیکن کبھی کبھی ان کی
خدمات لوگوں کو یاد بھی آ جاتی تھیں۔ کہیں کہیں ان کو خراج
تحسین پیش بھی کر دیا جاتا تھا۔

”آرائیں برادری کے بزرگ میاں عبدالعزیز
تحریک آزادی اور لاہور کی مسلم ثقافت و قیادت کی مایہ ناز
یادگار ہیں۔ بزم لاہور کی یہ شمع عیدانہ سالی کے باوجود آج
بھی ان روشنیوں کی امین ہے جس نے غلامی کے گھناؤپ
اندھیروں میں بھٹکتی ہوئی قوم کو منزل آزادی کا راستہ دکھایا۔

ظلمت کدہ ہند میں جو بھی عوامی اور جمہوری تحریک اٹھی میاں
عبدالعزیز کی فہم و فراست اور ولولہ انگیزیوں نے کسی نہ کسی
رنگ میں اسے سہارا دیا اور عوامی جذبات کی یہ تند و تیز لہریں
پوری توانائی کے ساتھ استبداد کی چٹانوں سے ٹکرائیں اور
انہیں پاش پاش کر ڈالا۔

دہلی دروازے کے باہر میاں صاحب کی قدیم طرز
کی قلعہ نما قیام گاہ کی بے نور آنکھوں نے زمانے کے لا تعداد
نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ کبھی دیس پنجاب کی سیاست نے
یہاں جنم لیا تھا۔ اس دیس کی سیاست اس کوٹھی میں پھلی

پھولی اور پروان چڑھی۔

یہی وہ مکان ہے جہاں بلبل ہندسروجنی نائیڈو کے مترن قہقہہ گونجے تھے۔ اسی کوٹھی نے فاضل مہمان مولانا ابوالکلام آزاد کے سنجیدہ مباحث سے تھے۔ کبھی مولانا محمد علی جوہر اسی مکان میں ٹھہرتے تھے اور ان فضاؤں نے حکیم اجمل خاں کی حجت کا حظ اٹھایا تھا۔ سیاست کی جادہ پیا کی کے دوران مسلمانوں کے قافلہ سالار قائد اعظم اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہیں ٹھہرے تھے۔

یہ مجلس تمام ہوئیں البتہ صحبت شب کی جلی ہوئی ایک شمع اب بھی موجود ہے اور وہ ہیں اس حویلی کے کیس میاں عبدالعزیز بارایت لا، پچانوے سال کے انسان، جنہوں نے پرنس آف ویلز کے استقبال سے انکار کر کے دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا۔

”ذرا اس واقعے پر روشنی تو ڈال لے۔“

”ٹھہریے، ذرا خیالات جمع کر لوں۔“ میاں صاحب نے اپنی بے نور آنکھوں پر پڑی پلکوں کی جھلر جھپکاتے ہوئے کہا۔ ”بس یوں سمجھئے کہ ایک طوفان آگیا تھا۔ پرنس آف ویلز کے استقبال سے کوئی انکار کر دے۔ کوئی یقین کر سکتا تھا؟“

”اس انکار کی نوبت کیوں آئی تھی میاں صاحب؟“ ”برادر محترم! جلیانوالہ باغ کا حادثہ ہوئے کچھ ہی دن گزرے تھے۔ شہیدوں کی ماؤں اور سگواری بہنوں کے آنسو ابھی خشک نہیں ہوئے تھے۔ ہمیں اچھا نہیں لگا کہ قاتل قوم کے اس شہزادے کا استقبال کریں۔ ہمارا دل رورہا تھا اور حکومت کا اصرار تھا کہ شہزادے کی راہوں میں دیدہ دل نہجھاور کیے جائیں۔ میونسپل کمیٹی ولی عہد کا استقبال کرنے کی قرارداد منظور کرے۔ میں ان دنوں میونسپل کمیٹی لاہور کا چیئرمین تھا۔ مجھ سے یہ گوارا نہیں ہوا کہ قومی غیرت کا سودا کروں۔ میں نے بائیکاٹ کی قرارداد منظور کر دی۔ مجھے دھمکیاں دی گئیں لیکن میں ٹس سے مس نہیں ہوا پھر معلوم ہے کیا ہوا۔“

میاں صاحب کچھ دیر کے لیے رکے اور قدرے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”انگریز حکمرانوں کو پرنس آف ویلز کی تقریبات منسوخ کرنی پڑیں۔ فتح ان شہیدوں کی ہوئی جنہوں نے جلیانوالہ باغ، امرتسر میں سینوں پر گولیاں کھائی تھیں۔“

جلیانوالہ باغ کا ذکر کرتے کرتے اچانک ان کا چہرہ

سرخ ہو گیا۔ انہیں سر جان لارنس کا مجسمہ یاد آ گیا۔ انہوں نے مضمون نگار سے پوچھا۔ ”تمہیں معلوم ہے سر جان لارنس کے مجسمے کی کہانی؟ چلو میں بتاتا ہوں۔ اسے پچھلے مضمون میں شامل کرنا۔ سر جان لارنس نے 1857ء کی جنگ آزادی میں بڑے مظالم ڈھائے تھے۔ ایسے ظالم مجسمہ لاہور میں نصب کر دیا گیا تھا اور نیچے لکھ دیا گیا تھا کہ پرقلم سے حکومت کی جائے یا تلوار سے۔ یہ لکھ کر اہل لاہور کی غیرت کو لکا کر ا گیا تھا۔

میں نے یہ حیثیت چیئرمین میونسپل کمیٹی اس کو ہٹانے کی قرارداد پیش کر دی۔ گوگل چند وزیر بلدیات تھے انہوں نے قرارداد مسترد کر دینے کے لیے خوب شور مچایا اور دھمکی بھی دی کہ بلدیہ کا جو اہلکار مجسمے کے احاطے میں داخل ہو گرفتار کر لیا جائے گا۔

مجھے انگریز گورنر نے طلب کیا اور پوچھا یہ مجسمہ تمہارا کیا لیتا ہے جو تم اس کے پیچھے پڑ گئے ہو۔ میں نے کہا یہ مجسمہ عوام کو دکھ دیتا ہے اور حکومت کا کام عوام کو دکھ دینا نہیں۔ اگر آپ کو اتنا ہی عزیز ہے تو اسے گورنمنٹ ہاؤس کی زینت بنا لیجیے مگر یہاں سے ہٹا دیجیے ورنہ عوام خود اسے ہٹا دیں گے۔

لوگوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ مجھے گورنر نے بلایا ہے۔ انہیں ڈر ہوا ہوگا کہ کہیں مجھ پر کوئی دباؤ ڈالا جائے۔ کسی من چلنے رات کی تاریکی میں مجسمے کا ہاتھ قلم کر دیا۔ حکومت کو عوام کے تیور کا علم ہو گیا تھا لہذا اس کی عبارت تبدیل کر دی گئی۔

”میں قلم اور تلوار سے تمہاری خدمت کروں گا۔“ اب یہ لارنس کا نہیں ایک خادم کا مجسمہ تھا۔

یہ اور اس جیسے دوسرے بہت سے سوالات ہوئے اور مضمون لکھ دیا اور رفت روزہ نصرت (لاہور) میں شائع ہوا۔ ممتاز حسن مشہور ادیب تھے اور مختلف سرکاری عہدوں پر رہ چکے تھے۔ اس وقت نیشنل بینک کے سینیٹر ڈائریکٹر تھے۔ قائد اعظم اور لیاقت علی خان کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے۔ اقبال کے عاشقوں میں تھے۔ فکر اقبال پر کئی مضامین تحریر کر چکے تھے۔ انہیں خیال آیا کہ میاں عبدالعزیز کی اقبال سے دوستی تھی۔ انہیں بہت سے واقعات یاد ہوں گے۔ اب وہ چراغ آخر شب ہیں نہ جانے کب رخصت ہو جائیں۔ ان سے اقبال کے بارے میں کچھ باتیں کر لی جائیں۔ انہیں محفوظ کر لیا جائے۔ کچھ دوسری باتیں بھی

ہو جائیں گی۔ انہوں نے چند اور علمی شخصیات کو ساتھ لیا اور میاں صاحب کا انٹرویو ریکارڈ کرنے پہنچ گئے۔ ان شخصیات میں پروفیسر حمید احمد خاں، مولوی ظفر اقبال، چوہدری محمد صفی وغیرہ تھے۔ گفتگو کی ابتدا ممتاز حسن نے کی۔

”قبلہ میں آپ سے آج استفادہ کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کے اور علامہ اقبال کے تعلقات کیسے تھے اور آپ سے ان کی پہلی ملاقات کب ہوئی۔ اس کے بعد ملنے کے کیا کیا مواقع آتے رہے؟“

میاں صاحب نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا۔ ”مجھے پہلی مرتبہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے 1902ء کے اجلاس میں ان کی نظم سن کر خواہش ہوئی کہ ان سے ملاقات کروں لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ تاہم ان سے بھائی دروازے میں جہاں وہ رہتے تھے ملنے کا اتفاق ہوا۔“

”وہ نظم یاد ہے کون سی تھی؟“

”غالباً نظم یہ تھی“

میں منت کش تاب شنیدن داستاں میری خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری ملاقاتیں تو اور بھی ہوئیں لیکن ان سے بے تکلفی اس

وقت ہوئی جب میں نے ہوشیار پور میں اسکول کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے وقار الملک سے درخواست کی۔ دوسرے زعماء بھی میری دعوت پر ہوشیار پور آئے۔ ان میں اقبال بھی تھے۔ یہاں ڈاکٹر صاحب سے میرے تعلقات استوار ہوئے پھر جب بھی میں لاہور آتا تھا ڈاکٹر صاحب سے ملتا تھا پھر کسی مقدمے کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب ہوشیار پور آئے تو ہر وقت کی ملاقاتیں رہنے لگیں۔ ان مجلسوں میں غلام قادر گرامی بھی شریک ہوتے تھے جو فارسی کے استاد شاعر تھے۔ گرامی صاحب کون کر ہی اقبال کو شوق ہوا تھا کہ وہ بھی فارسی میں شعر کہیں۔ گرامی صاحب نے کہا اگر اقبال فارسی میں شعر کہہ کر بھیج دیا کریں تو وہ ان کی اصلاح کر کے بھیج دیا کریں گے۔ طے یہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب فارسی میں شعر کہہ کر میرے پاس بھیجا کریں گے اور میں اس کلام کو گرامی صاحب کی اصلاح کے بعد ڈاکٹر صاحب کو بھیج دیا کروں گا کیونکہ اقبال لاہور میں تھے اور گرامی ہوشیار پور میں۔ اس طرح اقبال سے میرے تعلقات زیادہ بڑھ گئے۔ یہ اصلاح صرف تین مرتبہ ہوئی پھر گرامی صاحب نے کہا، اس سے کہنا اب وہ اپنا کلام مجھے نہ بھیجے خود ہی نظر ثانی کر لیا کرے۔“

مارچ 2013ء کا پرچار شمارہ

خوب صورت کہانیوں کا مجموعہ

سپر سٹار ڈائجسٹ

ماہنامہ

مزید

کاشت و بیہ ایم لے دلالت

تتویر ریاضہ مختار آزاد

کی دلقریب کہانیاں اور نک و نیلوٹ

کے کارنامے آپ کے منتظر

رنگین عمارت

انوار صدیقی کے قلم سے کشکول کے سنسنی خیز واقعات اور ناصر ملک کے دلوں میں ہلچل مچاتے سلسلے مسافر کے رنگین لمحات، مرزا امجد بیگ کے سنگین دلائل، محفل شعر و سخن اور آپ کے خط

ممتاز حسن نے پوچھا۔ ”اچھا یہ بتائیے ڈاکٹر اقبال کی کون سی خاص بات آپ کو پسند آتی؟“

”میں ان کی صاف گوئی کو پسند کرتا تھا۔“

”آپ میں اور ان میں بھی کوئی رنجش ہوئی؟“

”قطعاً نہیں، کبھی نہیں حالانکہ ہمارے تعلقات تقریباً 32 سال یعنی ان کی موت تک رہے۔“

”اقبال سے متعلق کوئی دلچسپ واقعہ سنائیے؟“

”ایک دن مکان کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک ہندو آیا۔ ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور چلا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ساتھیوں سے کہا، جانتے ہو یہ کون تھا پھر خود ہی فرمایا، یہ مالک مکان تھا۔ اس کو اس بات کی کچھ سمجھ نہیں آئی کہ کوئی مسلمان ہوتے ہوئے بیٹھتی کراہ دے سکتا ہے۔ میں اسے ہر مہینے بیٹھتی کراہ دے دیتا ہوں۔ یہ اپنی بیوی سے کہتا ہے کہ یہ شخص دھرم مانتا ہے۔ اسی لیے ہر صبح آکر مجھے پرنام کرتا ہے اور چلا جاتا ہے۔“

کچھ سوالات اور ہوئے اور پھر گفتگو کسی اور طرف مڑ گئی کیونکہ پروفیسر حمید احمد خاں نے قائد اعظم سے متعلق ایک سوال کر دیا تھا۔

”پاکستان بننے کے بعد جب پہلی دفعہ قائد اعظم لاہور تشریف لائے تو اس وقت کیا ہوا؟“

”جب میری ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے مجھے ہیلو عبدالعزیز کہہ کر مخاطب کیا۔ میں نے کہا۔ میں اچھا ہوں لیکن عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ اپنا خیال رکھیے۔ آپ مجھے بہت کمزور نظر آ رہے ہیں۔ مہربانی کر کے اپنی صحت کی فکر کیا کریں اور جو آدمی اپنی گورنمنٹ میں لیں وہ باعتبار ایمان دار اور لائق آدمی ہوں۔“

”مجھے جو کرنا ہے انہی کھوٹے سکوں سے کرنا ہے جو میری جیب میں ہیں۔“ قائد اعظم نے کہا۔

”پھر بھی اپنی صحت کا خیال رکھیے گا۔“

”شکر یہ خیال رکھنے کا۔“

”آپ نے علم دین کے مقدمہ قتل میں کوئی حصہ لیا تھا؟“

”میں نے کوئی حصہ نہیں لیا البتہ اس کے رشتے دار میرے پاس آئے ضرور تھے۔ وہ اقبالی تھا۔ موقع پر گرفتار ہوا اور چاقو بھی برآمد ہو گیا تھا ان سے میں نے کہا کہ اس کا یہ بیان اسے بچا سکتا ہے جیسا کہ وہ بیان کرتا ہے کہ اس نے جب راجپال سے جا کر یہ پوچھا کہ اس نے یہ توہین آمیز کتاب

کیوں لکھی تو راجپال نے سخت توہین آمیز الفاظ رسول اکرم کی شان میں کہے۔ اگر علم دین اپنے کلام میں سچا ہے تو اسے اس پر پابند رہنا چاہیے۔ یہ اشتعال کا کیس بن جائے گا اور اسے پھانسی نہیں ہوگی۔ زیادہ سے زیادہ سات سال کی سزا ہو جائے گی۔

اس کے رشتے دار اس پر بضد تھے کہ وہ قتل سے انکار کر دیے لہذا میں نے معذرت کر لی۔ اس نے بہکاؤ سے بھر آکر قتل سے انکار کر دیا۔ شواہد اس کے خلاف تھے لہذا پھانسی ہو گئی۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ میں نے علم دین کی لاش کی وصولی میں ضرور کردار ادا کیا تھا۔“

”وہ کیا قصہ تھا؟“

”بھائی، بات یہ ہوئی کہ علم دین کو میانوالی لے جا کر پھانسی دی گئی اور وہیں اس کی لاش کو دفن کر دیا گیا۔ میں نے چند لوگوں کو جمع کیا۔ ان میں ڈاکٹر اقبال بھی شامل تھے اور ہر تمام لوگ گورنر سے ملے اور لاش کی واپسی کا تقاضا کیا میں نے عرض کیا کہ مجھے کوئی قانون ایسا معلوم نہیں جس کی رو سے لاش گورنمنٹ اپنے قبضے میں رکھے اور اس کو واپس نہ کرے۔“

انہوں نے کہا۔ ”اندیشہ فساد کا ہے۔“

میں نے اس پر کہا۔ ”ہم اس کی ذمہ داری لیتے ہیں بشرطیکہ لاش ہمارے حوالے کر دی جائے۔ پولیس اس میں مداخلت نہ کرے۔“ گورنر صاحب خاموش ہو گئے پھر سوچنے کے لیے وقت مانگا اور ہمیں دو دن بعد طلب کیا ہم پھر گئے۔ بات نہیں بنی بالآخر تیسری ملاقات میں وہ لاش دینے کو تیار ہوئے۔

لاش کو پونچھ ہاؤس لاہور پہنچا دیا گیا۔ میں نے علم دین کے رشتے داروں کو اطلاع کر دی۔ پونچھ ہاؤس جا کر لاش وصول کی۔ ہم سے دستخط لے لیے کہ ہم فساد ہونے کی ذمہ داری لیتے ہیں۔“ یہ انٹرویو بڑی دیر تک چلتا رہا۔ کئی گھنٹوں بعد ممتاز حسن نے اجازت چاہی۔

”میں اپنے ساتھیوں سمیت آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اس پیرانہ سالی میں اپنے افکار عالیہ سے ہمیں مستفید کیا۔“

”شکر یہ تو مجھے ادا کرنا چاہیے کہ ڈاکٹر اقبال کی جو باتیں میرے علم میں تھیں آپ کے زور و بیان کر دیں۔“

”اللہ تعالیٰ نے آپ کو 95 سال کی عمر عطا کی ہے۔ اس عمر میں بھی آپ بے شمار نوجوانوں سے زیادہ مستفید ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کا سایہ ہم سب پر رکھے۔“

ان لوگوں کے چلے جانے کے بعد بھی وہ بڑی دیر تک ماضی کی یادوں میں گم رہے۔ جانے والے انہیں ماضی میں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ان یادوں سے باہر آئے تو ماضی سے موجودہ دور کا موازنہ کرنے لگے۔ یہ 1967ء تھا۔ ملک میں مارشل لا تھا۔ فوجی حکومت تھی۔ وہ سوچ رہے تھے ہم نے تو اسلام اور جمہوریت کے لیے یہ ملک بنایا تھا۔ دس سال سے ہم آمریت میں زندہ ہیں۔ قائد اعظم کی جیب میں کیا واقعی کھوٹے سکے تھے۔ خود ان کی موت کس حال میں ہوئی۔ لیاقت علی خان کے ساتھ کیا ہوا۔ ان کے بعد وزارتوں کی تبدیلی کتنی جلدی جلدی ہوئی پھر ملک فوج کے حوالے ہو گیا۔ ایک جنگ بھی ہم نے دیکھ لی۔

وقت اور آگے بڑھا 1970ء کی دہائی آگئی۔ میاں صاحب ملک میں ہونے والے تماشوں کو دیکھ تو نہیں سکتے تھے بڑے دکھ سے سن ضرور سکتے تھے۔ نظریاتی سرحد پر حملے ہو رہے تھے۔ کوئی وقت کے تقاضوں کے مطابق دین کو ڈھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کوئی اسلامی تاریخ کو نظر انداز کر کے اپنا رشتہ داہر اور گندھارا سے جوڑتا نظر آ رہا تھا۔ روٹی، کپڑا اور مکان کے نعرے بھی ان کے کانوں تک پہنچ رہے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ ہم پیٹ کے بندے ہیں ہماری کوئی نظریاتی سرحد نہیں۔ افسوس کہ ہم اس کا حل سوشلزم میں تلاش کر رہے ہیں۔ پوری قوم طبقات میں بٹی ہوئی ہے۔ کہیں تو میتیوں کے بھگڑے ہیں کہیں فرقوں کے۔ کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں۔ جب اسلام ایک ہے تو مسلمان اتنے گروہوں میں کیوں بٹ گئے ہیں۔ اگر اسلام کا نام لیا بھی جا رہا ہے تو محض اقتدار کا زینہ بنانے کے لیے۔ ایسے میں اگر اسلامی ذہن رکھنے والے ایک نہ ہوئے تو ہمارے دن گئے جا چکے۔

ان کا دکھ بڑھتا ہی گیا۔ بے اختیار ہاتھ اس میز کی طرف بڑھا جہاں کاغذ اور قلم رکھا رہتا تھا پھر خود ہی ہاتھ کھینچ لیا۔ انہیں یاد آ گیا کہ وہ تو بصارت سے محروم ہو چکے ہیں۔ فریاد کس سے کروں کون سنے گا۔ اگر اپنے خیالات اعلیٰ کروادوں تو سب سے بڑھنے والوں کا بھلا ہو جائے گا۔ اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن نظر آئی۔ انہوں نے اپنا مضمون اعلیٰ کرنا شروع کیا۔

”یہ ملک جو اسلامی نظریہ حیات کے نشو و نما کے لیے حاصل کیا گیا تھا آج جس بحرانی کیفیت سے دوچار ہے وہ انتہائی تشویش ناک ہے۔ اسلام جس کا سلوگن بلند

”ایک قائد اٹھتا ہے گوریل جنگ کی دھمکی دیتا ہے۔ کیا وہ اپنے بھائیوں کے خلاف اعلان جنگ کر رہا ہے یا موجودہ حکومت کے خلاف؟ دوسرا طبقاتی طبل بجک بجاتا ہے اور یہ طبقات مزدوروں کے، یہ طبقات کسانوں کے، یہ طبقات دانشوروں کے، یہ طبقات صنعت کاروں کے، یہ طبقات زمینداروں کے۔ اگر یہ ایک دوسرے پر پل پڑیں تو اس ملک میں باقی کیا رہ جائے گا۔“ (تقریر بر سے اقتباس)

کر کے اسلامیان ہند کو جمع کیا گیا اور جس کے صدقے میں ہمیں اسلامی مملکت ملی اسی مملکت میں اسلام سب سے زیادہ مظلوم ہے۔“

”اس کہانی کا انتہائی الم انگیز حصہ اس دس سالہ دور پر محیط ہے جسے آمریت کا دور کہا جاتا ہے۔ اس عشرے میں انسانوں سے ان کی حریت فکر چھین گئی، ان کی متاع ایمان لٹ گئی، ان کی دینی حیات مر گئی پھر بھی یہ مظلوم دین مشکل اوقات میں ہمارے لیے حصار بن رہا مگر ہم ہمیشہ ایسے معجزوں کی امید پر نہیں جی سکتے۔ قانون مکافات کی طرف سے بہت اتمام حجت ہو چکی۔ شاید ہمیں اب اور موقع نہ ملے۔“

”کیا ان واقعات سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ہم انسانیت کے اعلیٰ مقام سے بہت نیچے آ گئے ہیں اور ہم نہیں چاہتے کہ ایک ملت واحدہ کی صورت میں جییں۔ ہم جس دین کے نام نہاد پیر و کار ہیں وہ جغرافیائی یا طبقاتی نہیں آفاقی دین ہے۔ نہیں بلکہ آفاقی سے آگے گزر کے ماورائے اوراک کی ساری کائنات پر محیط ہے۔ اس پر تنہا سندھیوں یا پنجتونوں کی اجارہ داری نہیں۔ یہ عربوں کی وارث نہیں۔ یہ ساری کائنات کے لیے آخری پیغام ہے۔“

”اس وقت پاکستان کو روٹی، کپڑا اور مکان کے نام پر ابھارا جا رہا ہے۔ میں انسان کی ان بنیادی ضرورتوں سے پہلو تکی نہیں کرتا لیکن اس کا پائیدار حل سوشلزم میں نہیں۔“

”ہم مسلمان بھی کہلا میں اور نظام معیشت کے لیے مارکس سوشلزم سے اپنے گھائے پورے کریں۔ امریکا سے جمہوریت درآمد کریں، فرانس سے ثقافت لیں اور دین کو محض مذہب قرار دیتے ہوئے مسجدوں تک محدود کریں۔ یہی کچھ سوشلسٹ ممالک میں ہوا ہے۔“

”اس وقت حصول اقتدار کی خاطر ہم کتنے گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں اور تقریباً تمام گروہ اسلام کو سلوگن کے

طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اشتراکی دین بھی اسلام ہی کی آڑ لینے پر مجبور ہیں۔ اس دعوے کے پیچھے کہیں بنگلہ قومیت کا دفرما ہے تو کہیں سندھی۔ کہیں پنجتون ہے تو کہیں پنجابی۔ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ حکم صرف اللہ ہی کا چلے اور ہمیں وہی کرنا ہے جس کا اللہ نے حکم دیا ہے تو پھر ذاتی اقتدار کے لیے یہ رسہ کشی کیوں؟“

اس مضمون کے آخر میں انہوں نے لکھا۔

”میں عمر کے لحاظ سے سو برس کے لگ بھگ ہونے کے علاوہ نابینا بھی ہوں تاہم تیار ہوں کہ پاکستان کو اسلامی تجربہ گاہ بنانے کے لیے ابتدائی گفت و شنید کی خاطر اپنا غریب خانہ پیش کر دوں جو پہلے بھی تحریک پاکستان کے لیے وقف تھا۔“

اب وہ ایسی عمر کو پہنچ گئے تھے کہ بیمار پڑنا تو لازمی تھا۔ صحت کتنی ہی اچھی ہو، بڑھاپے میں بیماریاں تو لاحق ہو ہی جاتی ہیں۔ وہ بھی بیمار پڑ گئے۔ بیماریاں چلتی ہی رہتی تھیں لیکن اس مرتبہ وہ بستر پر پڑ گئے، کئی مہینے کی علالت کے بعد ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ 28 جولائی 1971ء کو صبح نو بجے دماغ کی شریان پھٹ گئی۔ دنیائے فانی سے منہ موڑا اور عالم آخرت کی راہ لی۔ ان کا جنازہ ان کی رہائش گاہ پکی گیٹ سے اٹھایا گیا اور مرحوم کے آبائی قبرستان مصری شاہ میں دفن کیا گیا۔

ان کی نماز جنازہ مولانا عطا اللہ حنیف نے پڑھائی جس میں وکیلوں، ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے ججوں، سماجی کارکنوں نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

ان کے انتقال کے بعد معلوم ہوا کہ لوگوں نے انہیں فراموش نہیں کیا۔ کوئی اخبار ایسا نہیں تھا جس نے اس وفات حسرت آیات کی خبر نمایاں طور پر شائع نہ کی ہو اور انہیں خراج تحسین پیش نہ کیا ہو۔

روزنامہ امروز (لاہور) نے لکھا:

”میاں عبدالعزیز مرحوم لاہور آرائیں برادری کے سرکردہ رکن، تحریک آزادی وطن کے بے لوث مجاہد اور اپنے زمانے کے نامور فوجداری وکیل تھے۔ وہ تحریک خلافت سے لے کر تحریک پاکستان تک، مسلم حقوق کی ہر جدوجہد میں شریک رہے۔ بلدیہ لاہور کے متعدد بار صدر اور مشیر بنے۔ دو مرتبہ پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کو قائد اعظم کی قیادت نصیب ہوئی تو میاں عبدالعزیز کتنی کے چند رہنماؤں میں شامل تھے جنہیں قائد اعظم کی

رفاقت کا اعزاز حاصل ہوا۔ میاں صاحب نے زندگی بھر برطانوی حکومت سے اعزاز یا عطیہ قبول نہیں کیا۔“

روزنامہ نوائے وقت نے خراج تحسین پیش کیا:

”ان کی پکی دروازے کے باہر والی کوٹھی برسوں سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنی رہی چنانچہ آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا سہ روزہ اجلاس جو قائد اعظم کی زیر صدارت ہوا تھا اسی کوٹھی میں منعقد ہوا تھا اور یہی وہ کوٹھی تھی جہاں متحدہ ہندوستان کے بڑے بڑے لیڈر آیا کرتے تھے جن میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد قابل ذکر ہیں۔ مرحوم نے آج تک اس کمرے کو جوں کا توں رکھا تھا جس میں قائد اعظم بیٹھتے تھے۔“

ہفت روزہ ”الاعتصام“ نے لکھا:

”حکومت برطانیہ اور اس کے استبداد و مظالم کے خلاف مولانا ابوالکلام آزاد کی قیادت میں جو تحریک آزادی ہند شروع ہوئی میاں عبدالعزیز فوراً اس کے ہراول دستے میں شامل ہو گئے اور اس سلسلے میں کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ مولانا آزاد نے انگریزوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے اپنے پرچے الہلال کے ذریعے جب ایک جماعت حزب اللہ کے قیام کا اعلان کیا اور نوجوانوں نے اس دعوت پر لبیک کہی تو اس کے لیے مولانا آزاد کے ہاتھ پر جو بیعت عمل میں آئی وہ میاں عبدالعزیز کی اسی تاریخی کوٹھی میں ہوئی جس سے اب میاں صاحب کا جنازہ اٹھا ہے۔ جب تحریک آزادی ہند نے تحریک پاکستان کی صورت اختیار کر لی تو میاں صاحب اسی ورثاتی جذبہ دینی و قومی کے تحت اس میں شامل ہوئے۔“

ایک رسالے میں ”ایشیا کی انقلابی شخصیت کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا جس کا ایک اقتباس یہ ہے۔

”میاں عبدالعزیز اور قائد اعظم بڑے گہرے اور دیرنیہ دوست تھے۔ ان کی دوستی کی ابتدا لندن میں دوران تعلیم ہوئی۔ دونوں ہم مکتب، ہم خیال رہنما تھے چنانچہ قائد اعظم نے ان سے رابطہ کیا اور مسلم لیگ کا سب سے پہلا اجلاس 1936 میں میاں صاحب کی کوٹھی میں دو دن جاری رہا اور مسلم لیگ کے تین مردہ میں نئی روح ڈالی گئی۔“

ماخذات

میاں عبدالعزیز مالواڑہ محمد اطلق بھٹی، سرگشت عبدالمجید سالک



کالی قسمت

ابن کبیر

اس نے ایک علم پرور گھرانے میں آنکھ کھولی، تاعمر ترسیلِ علم کی چاکری کی۔ بڑی بڑی نامور شخصیات اس کی شاگرد ہیں۔ یہاں تک کہ اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل نے بھی اس سے تعلیم حاصل کی لیکن اس کے آخری ایام ایدھی بوم میں لاوارثی کی حالت میں گزرے۔ اتنی اہم شخصیت کا یہ حال کیسے ہوا۔ کیوں وہ بے کسی کی مجسم تصویر بنی۔ کس طرح وہ ایدھی بوم پہنچی؟

ایک عبرت بھری کتھا اسی شہر کراچی سے

اچانک سرد ہو گیا تھا۔ کوئٹہ کی ہوائیں گلیوں میں داخل ہو چکی تھیں۔ گرم کپڑے نکالنے کا وقت آن پہنچا تھا۔ شہر میں گردش کرتی ہواؤں نے ایدھی سینٹر کے مشرقی حصے کی کھڑکیوں پر دستک دی تو ضعیف العمر عورتوں نے خود کو

اکتوبر، 2011ء، کراچی: شام ہوتے ہی شہر کی فضاؤں میں خنکی اتر آئی۔ دفاتر خالی ہونے لگے۔ اسٹریٹ لائٹس روشن ہو گئیں۔ سڑکوں پر ٹریفک کا دباؤ بڑھنے لگا۔ ہر شخص جلدی میں تھا۔ موسم ماہنامہ نسوگوشٹ

چادر میں لپیٹ لیا اور صبح ہاتھ میں لیے کونوں میں دبک گئیں۔ یہ حصہ ایک وسیع و عریض کمرے پر مشتمل تھا جو بے گھر خواتین کے لیے مختص تھا۔ وہاں کئی بستر لگے تھے۔ اسی کمرے کے ایک کونے میں دو بوڑھی عورتیں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ ان کے چہروں پر جھریاں تھیں، جو ان کے دکھ بھرے ماضی کی چٹلی کھاتی تھیں، پر لمحہ حال میں وہ مطمئن معلوم ہوتی تھیں۔ ان کی گفتگو سے جھلکتی بے ساختگی اس جانب اشارہ تھی کہ انہوں نے ایسی ہی سب سے گھراؤنا گھر مان لیا ہے۔

ایسے میں ایک لڑکی چائے کی ٹرے لیے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کا نام روشنی تھا۔ وہ سینئر میں ملازم تھی۔ بوڑھی خواتین کی دیکھ کر کچھ اسی کے ذمے تھی۔ باقی عورتوں کو چائے تقسیم کرنے کے بعد وہ اس کونے میں آئی جہاں دونوں عورتیں بیٹھی تھیں۔ اس نے مسکراتے ہوئے ٹرے آگے کی "کیسی ہیں زلیخا خالہ؟" "ٹھیک ہوں بیٹیا، پروردگار کا احسان ہے۔ تو کیسی ہے؟" زلیخا نے جھریوں بھرے ہاتھ سے کپ اٹھایا۔

"میں ٹھیک ہوں۔" لڑکی نے ٹرے دوسری عورت کی جانب بڑھائی "اماں جی، یہ آپ کی چائے۔ بغیر چینی والی!"

"جیتی رہ بیٹی! اللہ ڈیروں خوشیاں دے۔" اماں جی نے اسے دعائیں دیں۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔ "بیٹی، بی بی قریشی دوپہر میں تیرے ساتھ گئی تھی۔ لوئی نہیں... خیر تو ہے۔ کیا اس کے گھر والے آئے تھے؟" نظریں بائیں جانب والے بستر پر گئی تھیں جس کے سر ہانے چند کتابیں رکھی تھیں۔

روشنی پاس ہی بیٹھ گئی "اماں جی، بی بی قریشی گورنر سندھ سے ملنے گئی ہیں۔ ابھی آتی ہوں گی۔" لہجے سے احساسِ تفاخر جھلکتا تھا۔

"گورنر سندھ سے؟" زلیخا کے چہرے پر حیرت تھی۔ "خیریت تو ہے بیٹیا؟"

"ہاں زلیخا خالہ سب ٹھیک ہے، آپ پریشان نہ ہوں۔" روشنی نے انہیں اطمینان دلایا۔ "آپ تو جانتی ہیں، حالات کی ستم ظریفی بی بی قریشی کو یہاں لے آئی، ورنہ وہ بہت بڑھی لکھی اور قابل خاتون ہیں۔" اس کے چہرے پر تاسف تھا۔ "پی ایچ ڈی کرنے والی پاکستان کی پہلی خاتون۔ تحریک آزادی کی کارکن اور..."

"روشنی... اے اور روشنی!" کسی نے اسے پکارا۔

"ابھی آئی۔" یہ کہتے ہوئے وہ ابھی اور چلی گئی۔ اور مصروفیات میں الجھ کر بھول گئی کہ اسے دو بوڑھی عورتوں کو ایک کہانی سنانی ہے۔

سرد ہواؤں کی دستک جاری رہی۔ بوڑھی عورتوں نے چائے ختم کی، خود کو چادر میں لپیٹا اور اپنے بستروں پر چلی گئیں۔

کہانی پھر ادھوری رہ گئی... مگر ادھورا پن اس کا مقدر نہیں تھا۔ اس کی تکمیل کا لمحہ آن پہنچا تھا۔

اگلے چند روز میں اس ان کہی کہانی کو کروڑوں سامعین میسر آنے والے تھے!!

☆ ☆ ☆
اظفر حسین کا اصل وطن تو ضلع بجنور کا قصبہ جگینہ تھا، پر اولاد کو زیور علم سے آراستہ کرنے کی خواہش انہیں مراد آباد بھیج لائی، جہاں انہوں نے محلہ ڈیریا میں رہائش اختیار کی۔ مگر جگینہ سے قطع تعلق نہیں کیا۔ زمینیں تو وہیں تھیں۔ جگینہ آنا جانا رہتا تھا۔

سیاسی و سماجی سرگرمیوں نے بھی اظفر حسین کو مصروف رکھا۔ قانون کی خوب سمجھ تھی۔ وکیلوں سے گاڑھی چھنتی تھی۔ مدلل گفتگو کرتے اور سامنے والے کوپلوں میں قائل کر لیتے۔

مراد آباد سیاسی سرگرمیوں کا مرکز تھا اور اظفر حسین سیاست کے دلدادہ۔ بکے کا گھر لکھی۔ گاندھی جی کے پیروکار۔ انگریز سرکار کے خلاف چلنے والی کئی تحریکوں میں وہ پیش پیش رہے۔ تاہم سیاست کے جھیلوں میں پڑ کر کبھی گھر کو نہیں بھولے۔ انہیں خاندان کی ضروریات کا پورا ادراک تھا۔ بچوں کی تعلیم و تربیت سے بھی غافل نہیں تھے۔

خدا نے اظفر حسین کو دو بیٹیوں اور ایک بیٹے سے نوازا تھا... اور اب ایک اور خوشی دروازے پر دستک دینے کو تھی... ان کی زوجہ امید سے تھیں۔

26 نومبر 1922 کو اظفر حسین کے گھر بچے کے رونے کی آواز گونجی۔ خدا نے انہیں بیٹی سے نوازا تھا۔ اس زمانے میں لڑکیوں کی پیدائش پر خوشیاں نہیں منائی جاتی تھیں مگر اظفر حسین ایک پڑھے لکھے اور روشن خیال آدمی تھے۔ بیٹے کو خدا کی نعمت اور بیٹی کو خدا کی رحمت تصور کرتے تھے، سو جو بیٹی کی پیدائش کی خبر ملی، انہوں نے رب کا شکر ادا کیا۔

بیٹی کا نام اصغر بیگم رکھا گیا۔ اس دھان پان سی بچی کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ جب پڑوسن نے اسے دیکھا تو بے ساختہ کہا۔ "یہ تو

بالکل باپ پر جی ہے۔" "باپ کی طرح بڑے ہو کر قانون کی گتیاں سلجھایا کرے گی!" ساتھ بیٹھی عورت مسکرائی۔

"ارے، لڑکیوں کو کیا پڑھانا لکھانا۔ لڑکیاں تو پرانی ہوتی ہیں۔" تخت پر بیٹھی بوڑھی خاتون نے چھالیا کرتے ہوئے کہا جنہیں پورا محلہ بی اماں کہہ کر پکارتا تھا۔

اظفر حسین دالان سے گزر رہے تھے۔ یہ الفاظ کان میں پڑے، تو وہ ٹھٹھک گئے۔ "لڑکیاں پرانی ضرور ہوتی ہیں بی اماں مگر انہیں پڑھنے کا پورا حق ہے۔" آواز میں ٹھہراؤ تھا۔ "مگر بیٹا، لڑکی ذات پڑھ کر بھی کیا تیر مار لے گی۔ اس کا اصل کام تو گھر سنبھالنا ہے۔" بی اماں کے چہرہ فہمائش تھا۔

"خالہ جان، ہندوستان بیدار ہو رہا ہے۔ ہمیں انگریزوں سے مقابلہ کرنا ہے۔ ایسے میں مسلمان گھرانوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے بچوں کو بلا تفریق تعلیم کے زیور سے آراستہ کریں، ورنہ وہ دیگر قوموں سے پیچھے رہ جائیں گے۔" اظفر حسین نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

بہن، جو بھائی کے مزاج سے واقف تھی، درمیان میں کود پڑی۔ "ہاں ہاں، ہماری اصغر بی پڑھے گی، لکھے گی، یونیورسٹی جائے گی، کیوں!"

"ہاں۔" اظفر حسین نے دو ٹوک جواب دیا۔ "میں بیٹے اور بیٹی میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ جو سہولیات اور مواقع اس کے بھائیوں کو میسر ہوں گے، وہ اسے بھی ملیں گے۔" اس جملے کے ساتھ ہی وہ تیزی سے باہر نکل گئے۔ دالان میں خاموشی چھا گئی۔

وہ ایک پڑا سرا لکھ تھا۔ اصغر بی بیگم کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا تھا۔

☆ ☆ ☆
گھر بھری وہ لاڈلی تھی۔ سب پیار سے اسے بی بی کہا کرتے۔ بچوں تو سب ہی اسے بہت چاہتے مگر باپ کی تودہ جان تھی جو گھر لوٹتے ہی اسے گود میں بٹھا لیتا۔ اس سے باتیں کرتا۔

شعور کی دہلیز عبور کرنے کے بعد جس پہلی شے نے اصغر بی بی کے ذہن پر گہرے نقوش چھوڑے، وہ تھے کاغذ اور قلم۔

اس نے پہلی بار اپنے باپ کے ہاتھ میں قلم دیکھا تھا اور نہ جانے کیا سوچ کر ہاتھ پھیلا یا اور قلم مانگ لیا۔

پہلے تو اظفر حسین اس معصوم خواہش پر حیران ہوئے۔ ٹھکڑے سے کھینچنے کی عمر میں قلم کا تقاضا؟ پھر مسکرا دیے اور قلم اصغر بی کو تھما دیا۔ اگلا تقاضا ورق کا تھا۔ یہ خواہش بھی پوری ہوئی۔

آنے والے دن قلم سے ورق پر حاشیے کھینچنے گزرے... اور ان ہی دنوں نے یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ اس کی زندگی کتابوں کے ساتھ گزرنے والی ہے۔

شوقِ مطالعہ تو کبھی میں پڑا تھا۔ کتابیں اجداد کا ورثہ تھیں۔ جلد ہی حروف سے دوستی ہوئی۔ بڑی بہن اور اصغر بی کی عمر میں خاصا فرق تھا۔ وہ چھ برس بڑی تھی۔ مزاج مختلف تھا۔ تربیت الگ ڈھب پر ہوئی تھی۔ چھوٹی بہن سے اسے پیار تو بہت تھا مگر مصروفیات اسے باندھ رکھتیں۔ پہلے پڑھائی۔ اس سے فرصت ملتی تو باورچی خانہ، صفائی ستھرائی۔

اس دوری نے اصغر بی کو اپنے بھائیوں اختر اور اصغر کے قریب کر دیا۔ دھیرے دھیرے وہ ان کے مزاج میں ڈھلنے لگی۔ ان کی تقلید کرنے لگی۔ اور پھر ان ہی کی طرح سوچنے لگی۔

عمر تو گڈے گڑیا سے کھینچنے کی تھی، مگر طبیعت ادھر نہیں جاتی تھی۔ اسے تو بھائیوں کی طرح باسکٹ بال کا کھیل پسند تھا۔ بیڈمنٹن کھینچنے کو جی چاہتا تھا۔ اور اس نے ایسا کیا بھی کہ والد کی طرف سے آزادی تھی۔ وہ اس کی جائز خواہشات پوری کرنے میں ایک لمحے کا بھی تاثر نہیں کرتے تھے۔

جب ہر طرف کتابیں ہوں، علم دوست باپ کی سرپرستی میسر ہو، بھائیوں کا ساتھ ہو تو تعلیمی سفر کی درس گاہ کا محتاج نہیں رہتا۔

خاندان کی بڑی بوڑھیاں اکثر سوچتیں۔ "گھر میں تعلیم تک تو ٹھیک ہے، چلو اسکول بھی چلی جائے گی مگر کالج، یونیورسٹی؟ نہ جی نہ!"

مگر اظفر حسین بھی دھن کے بکے تھے، وہ اپنی بیٹی کو اعلیٰ تعلیم دلانے کا پختہ فیصلہ کر چکے تھے۔

بالآخر وہ دن آن پہنچا جب اصغر بی کو جسے سب بی بی کہہ کر مخاطب کرتے تھے، اسکول بھیجا گیا۔

باپ نے پرتاپ سنگھ ہائی اسکول کا چناؤ کیا۔ کیوں؟ کیونکہ... وہ علاقے کا سب سے معیاری اسکول تھا۔ اس وقت چند رشتے داروں نے یہ مشورہ دیا کہ

بیٹی کو کسی مسلم اسکول میں داخل کروادو۔

”ٹھیک ہے میاں اظفر، مسلم اداروں کا معیار پرتاپ سنگھ ہائی اسکول سانچیں، مگر ہے تو مسلمانوں کا اسکول ناں!“

ناصح اظفر حسین کو قائل نہیں کر سکے۔ وہ تو کانگریسی تھے۔ یقین رکھتے کہ ہندو اور مسلمانوں کو اختلافات بھلا کر انگریز سرکار کے خلاف اجتماعی جدوجہد کرنی ہوگی۔ اسی بات کا وہ درس دیا کرتے تھے۔ ایسے میں اگر بیٹی کو کسی مسلم درس گاہ میں داخل کروادیتے، تو اُن کے نظریات کی کیا اہمیت رہ جاتی۔

بی بی اسکول جانے لگی۔ نئے ماحول سے ہم آہنگ ہونے میں اُسے کسی قسم کی وقت پیش نہیں آئی۔ والد کا عطا کردہ اعتماد جو ساتھ تھا، وہ ہر محاذ پر معاون ثابت ہوا۔ ہر سرگرمی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ چند ہی دنوں میں اس کا شمار قابل طالبات میں ہونے لگا۔ سچ تو یہ ہے کہ گھر کی طرح بی بی اسکول میں بھی سب کی لاڈلی بن گئی تھی۔

☆☆☆

”کیا کہا، تم برقع نہیں پہنو گی؟“ خالہ زاد بہن کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

”ہاں تم نے درست سنا، میں برقع نہیں پہنوں گی!“ اُس نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

اُس زمانے میں برقع مسلمان عورتوں کی پہچان تھی۔ خاندان کی تمام عورتیں بھی برقع پہنا کرتی تھیں۔ اسکول اور کالجوں کی طالبات برقع ہی میں نظر آتیں۔ ایسے میں برقع نہ پہننے کا فیصلہ معاشرتی قیود کے خلاف اعلان بغاوت کے مترادف تھا۔

بڑی بوڑھیوں کو یقین تھا کہ اظفر حسین کی لاڈلی بھی اوروں کی طرح برقعے میں چھپ کر ہی گھر سے نکلا کرے گی کہ یہی رواج ہے مگر بغاوت کا اعلان کر دیا گیا تھا جس نے ہر ایک کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا تھا۔

”اے لڑکی، کیا عقل گھاس چنے مچھی ہے؟“ پھوپھی نے فہمائشی انداز میں کہا۔

”پڑھ لکھ کر دماغ خراب ہو گیا ہے تیرا۔“ خالہ بولیں۔

”محترمہ اپنی پرواز محدود رکھیں، آپ کے والد صاحب کبھی اجازت نہیں دیں گے۔“ خالہ زاو نے بھی جھجکی۔

”مجھے یقین ہے، ابا اجازت دے دیں گے۔“ بی بی

کے لہجے میں عزم تھا۔

اور ایسا ہی ہوا۔ اظفر حسین نے نہ تو ماضی میں اپنی بیٹی پر کوئی روک لگائی تھی، نہ ہی مستقبل میں ایسا کوئی ارادہ رکھتے تھے۔ اسے اجازت مل گئی۔

گھر والوں نے اس فیصلے پر شدید احتجاج کیا۔ اظفر حسین سے درجنوں سوال کیے گئے۔ اندیشوں سے آگاہ کیا گیا مگر اُس شخص نے ایک ہی جواب دیا۔ ”مجھے اپنی تربیت پر پورا بھروسہ ہے۔“

یہ بھروسہ بی بی کی قوت تھی، جو اب اسے ایک اور تبدیلی کے لیے تیار کر رہا تھا۔

اُسے خاندانی نام سے خال خال ہی پکارا جاتا۔ سب بی بی کہا کرتے، مگر اُسے اس طرز پر مخاطب کیا جانا اچھا نہیں لگتا تھا۔ بڑا بھائی اصغر حسین اپنے نام کے ساتھ قریشی لگایا کرتا تھا۔ بس، اُس نے فیصلہ کر لیا کہ اپنے نام کے ساتھ بھی ”قریشی“ کا لاحقہ لگایا جائے۔

قدرت کے کھیل بھی نرالے ہوتے ہیں، بی بی قریشی ہونے کے بعد وہ یکسر بدل گئی۔ اصغری بیگم کہیں میلوں پیچھے رہ گئی۔

اب اس میں ایک نئی روح تھی۔ ایک باغی روح!!

☆☆☆

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔

ہندوستان میں دو قومی نظریے کی بازگشت سنائی دینے لگی تھی۔ مسلم لیگ تیزی سے قوت حاصل کر رہی تھی۔ مراد آباد کی گلیوں میں بھی یہ خیال پنپنے لگا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔ مسلم لیٹی طلباء کی سرگرمیاں بھی دھیرے دھیرے ظاہر ہونے لگیں۔

یہ روشن خیالات بالیدگی کی دہلیز پر کھڑی بی بی قریشی کے کانوں میں بھی بڑے اور سیدھے دل میں اتر گئے۔

وہ اردو اور انگریزی ادب کی دلدادہ تھی۔ عیدالہلم شرر، ڈپٹی نذیر احمد، ڈکنز کی کتابیں مطالعے میں رہتی تھیں۔ مگر اب اس کا وقت سوچ بچار میں گزرنے لگا۔ کتابوں سے وہ عارضی طور پر دور ہو گئی۔

اخبارات تو وہ پہلے بھی باقاعدگی سے پڑھا کرتی تھی لیکن اب خصوصی طور پر ان کا مطالعہ کرتی۔ مسلمانوں کے ترجمان تصور کیے جانے والے اخبارات توجہ کا خصوصی مرکز تھے جن میں پیش کردہ تجزیات اُسے اپنے خیالات کے قریب تر معلوم ہوتے۔ مسلم لیگ کے ہم خیال طلباء و طالبات سے

بھی اُس کی ملاقات رہنے لگی۔ پہلے تو چھپ چھپ کر مسلم لیگ کے اجلاسوں میں شرکت کی، مگر جب نظریہ پختہ ہو گیا تو اپنے خیالات کے اظہار کا فیصلہ کر لیا۔

پہلے بھائیوں سے اس بابت گفتگو کی۔ اپنی فکر سے آگاہ کیا۔ اُن کا رد عمل مبہم تھا۔ نئے، توانا خیالات کی بازگشت اُن کی سماعتوں سے بھی ٹکرانی تھی، مگر انہیں یہ احساس بھی تھا کہ باپ کانگریسی ہے، علاقے کی سیاست میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے، اپنی جماعت کے لیے کئی قربانیاں دے چکا ہے۔ ایسے میں گھر پر مسلم لیگ کا جھنڈا لہرانا قبل از وقت ہوگا۔

چند روز تو اس دلیل نے بی بی کو خاموش رکھا، مگر جلد ہی دل کی پکار اسے میدان عمل میں لے آئی۔ وہ مسلم لیگی طلباء و طالبات کی نشستوں میں باقاعدگی سے حصہ لینے لگی۔

جب سہیلیوں نے باز رکھنے کی کوشش کی، سمجھایا کہ یہ لڑکیوں کے کام نہیں تو بی بی قریشی نے دو ٹوک لہجے میں جواب دیا۔ ”مجھے تو والد نے لڑکوں کی طرح پالا ہے۔ کبھی کوئی پابندی عائد نہیں کی۔ اور یاد رکھو، لڑکے اور لڑکیوں میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں برابر ہیں۔“

”مگر تم سمجھنے کی کوشش کرو، سیاست آگ کا دریا ہے۔“ ایک سہیلی نے کہا۔

”کیا ہمارے سامنے محترمہ فاطمہ جناح کی مثال نہیں ہے۔ ان کی جدوجہد ہمیں درس دیتی ہے کہ ہم بھی میدان عمل میں قدم رکھیں اور مسلم لیگ کے لیے جدوجہد کریں۔“ اس کا لہجہ واضح تھا۔

اظفر حسین کو اس بات کا تو ادراک تھا کہ مسلمان تیزی سے مسلم لیگ کی جانب راغب ہو رہے ہیں۔ وہ کانگریس کے نظریات سے متفق نہیں، مگر انہیں اس بات کا قطعی اندازہ نہیں تھا کہ ان کی اپنی بیٹی بھی اس ڈگر پر چل پڑی ہے۔ اس بات کا پتا تو اُس روز چلا، جب انہوں نے مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے ایک جلوس کو ہائی کورٹ کے سامنے سے گزرتے دیکھا، جس میں اُن کی بیٹی بھی شامل تھی۔

شام میں گھر میں عدالت لگی۔ بی بی قریشی کو کٹہرے میں کھڑا کیا گیا۔ باپ نے جراح کی۔ ملزم نے اپنی صفائی دی۔ کافی دیر تک یہ مکالمہ جاری رہا۔ بالآخر اظفر حسین نے فیصلہ سنا دیا۔ ”اگر تمہیں مسلم لیگ کے نظریے پر یقین ہے تو میری طرف سے آزادی ہے، ہم اُس میں شمولیت اختیار کر

سکتی ہو۔“

وہ ایک خوش گوار لمحہ تھا۔ راہِ زیست کا حتمی تعین ہو چکا تھا۔

☆☆☆

سیاسی شعور تو پرتاپ سنگھ ہائی اسکول ہی کے زمانے میں بیدار ہو گیا تھا۔ گوگل داس گریڈ کالج میں داخلہ لینے کے بعد اس نے مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں شمولیت اختیار کی۔ گوگل داس کالج لڑکیوں کی تعلیم کے لیے بہترین درس گاہ تصور کیا جاتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ مسلم لیگ کی دلدادہ بی بی قریشی نے اس کا حصہ بننے میں تامل نہیں کیا۔ اُس ادارے سے اس نے انٹر کا مرحلہ طے کیا۔

بارہویں جماعت پاس کرنا بڑی کامیابی تھی مگر یہ اکلوتا کارنامہ نہیں تھا۔ اس عرصے میں اُس نے ہم نصابی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ تقریری مقابلوں میں شرکت کی۔ بیڈمنٹن اور ٹیبل ٹینس کے مقابلوں میں خود کو منوایا۔

اب وہ سماجی کاموں میں بھی حصہ لینے لگی تھی۔ جب کبھی کسی لڑکی کے والدین تعلیم بھروسہ کر اُسے گھر بٹھانے کا ارادہ ظاہر کرتے، وہ دوڑی دوڑی بی بی قریشی کے پاس آ جاتی۔ اور وہ اپنے دلائل کے ہتھیار لیے اُس لڑکی کے ساتھ چل پڑتی۔

اظفر حسین کو وہ مسلم معاشرے کے لیے رول ماڈل تصور کیا کرتی تھی۔ مباہتے کے دوران وہ اُن کی مثال پیش کرتی۔ دھواں دھار تقریر کرتی، پھر لڑکی کے والدین کو اس بات پر قائل کر کے ہی لڑتی کہ انہیں اپنی بیٹی کو اعلیٰ تعلیم دلانی چاہیے۔

انٹر کے بعد بی بی قریشی نے کس ادارے کا رخ کیا؟ اس بابت زیادہ سوچ بچار کی ضرورت نہیں۔ یہ تو واضح تھا۔ علی گڑھ یونیورسٹی اس زمانے میں مسلم لیگ کی سرگرمیوں کا مرکز تھی۔ اور یہی ادارہ گریجویٹیشن کے لیے بی بی قریشی کی پہلی اور آخری ترجیح تھی۔

بیٹی کو ہوسٹل میں قیام کی اجازت دینا بہ ظاہر ایک مشکل فیصلہ معلوم ہوتا ہے مگر اظفر حسین نے یہ فیصلہ کرنے میں ایک منٹ بھی ضائع نہیں کیا۔

وہ جانتے تھے کہ اُن کی بیٹی خود کو مسلم لیگ کے لیے حج چکی ہے، سو انہوں نے اس کے فیصلے کی قدر کی۔ پھر ایک سبب اور بھی تھا۔ یونیورسٹی گھر سے دور تھی۔ آنے جانے میں خاصا وقت ضائع ہوتا۔ بہتر یہی تھا کہ وہ ہوسٹل میں قیام کرے۔ گریجویٹیشن کے لیے بی بی قریشی نے آرٹس کے

مضمون کا چناؤ کیا۔ گوکہ وہ چاہتی تو بڑے بھائی کی مانند قانون کے شعبے میں بھی جاسکتی تھی۔ سہولیات اور مواقع دونوں ہی میسر تھے۔ گھر سے راہ نمائی مل جاتی لیکن وہ تقلید کی مخالف تھی۔ جب ایک سہیلی نے اس بابت استفسار کیا، تو اس نے جواب دیا۔ ”میں وکیل بن کر کیا کروں گی۔ لوگ یہی کہیں گے ناں کہ وکیل کی بہن وکیل بن گئی۔ میں یہ نہیں سنا چاہتی۔“

علی گڑھ یونیورسٹی میں قدم رکھتے ہی اُس کی آزاد روح کو اپنی منزل مل گئی۔ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا پلیٹ فارم میسر تھا اور جذبات آسمان کو چھو رہے تھے۔ ایک الگ ریاست کے قیام کا خواب آنکھوں میں بس چکا تھا اور اب اس خواب کا بیج دیگر مسلمانوں کے دلوں میں بونا تھا، تاکہ یہ ایک تن آور درخت بن سکے۔

☆☆☆

”واہ جی واہ، باپ کا نگر لیس کے جلسوں میں شرکت کر رہا ہے اور بیٹی علی گڑھ یونیورسٹی میں ویمین مسلم لیگ کی صدر بننے جا رہی ہے۔“ کہنے والے کے لہجے میں طنز بھی تھا اور استعجاب بھی۔

”یہی تو جمہوریت کا حُسن ہے۔“ بی بی قریشی نے جواب دیا۔

”مگر محترمہ یہ بھاری ذمے داری ہے اور آپ ایک منحنی سی خاتون ہیں۔“ ایک رئیس زادے نے لقمہ دیا۔

”خاطر جمع رکھیے۔ مجھے اپنی ذمے داریوں کا پوری طرح احساس ہے۔“ جواب میں کاٹ تھی۔

سیاسی میدان میں تو فعال تھی ہی مگر ویمین مسلم لیگ کی صدارت سنبھالنے کے بعد سرگرمیوں میں مزید تیزی آ گئی۔ تحریک پاکستان اُس کا اوڑھنا بچھونا بن گیا۔ ہر جلسے جلوس میں وہ پیش پیش ہوتی۔

اُس عرصے میں بی بی قریشی کو تمام قد آور سیاسی شخصیات سے نہ صرف ملنے بلکہ ان سے تبادلہ خیال کرنے کا بھی موقع ملا۔

قائد اعظم محمد علی جناح سے ملاقات کا دن تو یادگار تھا۔ اپنے عظیم قائد سے ہونے والے مکالمے کی مہک برسوں اس کے دل و دماغ کو مہکاتی رہی۔ لیاقت علی خان اور محترمہ فاطمہ جناح سے بھی ملاقات ہوئی۔

پھر گھر گھر جا کر تحریک پاکستان کے لیے چندہ جمع کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ بہ ظاہر مشکل معلوم ہونے والا

یہ کام بی بی نے آسان بنا لیا تھا۔ خطابت پر اسے کمال حاصل تھا، دلائل دینے میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ بس، جس مسلمان کے گھر پر دستک دی، اس نے اپنی استعداد کے مطابق چندہ مہم میں حصہ ڈالا۔

یہ مہم اسے شہروں سے نکال کر دیہی علاقوں میں لے گئی، جہاں اس نے زندگی کو قریب سے دیکھا۔ سچے، محنتی اور سادہ لوح انسانوں سے ملاقات کی، جن کے دل پاکستان کے لیے دھڑکنے لگے تھے۔

اسی اثنا..... میں 45 کا سال آ گیا۔ بی بی قریشی نے گریجویشن کا زینہ عبور کر لیا۔

گھر سے بلاوا آیا کہ بہت پڑھ لیس۔ تمہارے ہاتھ پیلے کرنے کا وقت آن پہنچا ہے، اب لوٹ آؤ۔

آزاد پنچھی کو پنجرے میں قید کرنا آسان نہیں۔ اور پھر اُس کی پرواز کا تو ایک واضح مقصد تھا۔ آزادی!

تحریک پاکستان سے علیحدگی کا تصور بی بی قریشی کے لیے محال تھا۔ اُسے پایہ تکمیل تک پہنچانا ہی اُس کا مقصد زیست تھا اور دنیا کی کوئی قوت اُسے اپنے مقصد سے پیچھے نہیں ہٹا سکتی تھی۔

”میں علی گڑھ یونیورسٹی سے ماسٹرز کرنا چاہتی ہوں۔“ اس نے دو ٹوک جواب دیا۔

گھر والے جانتے تھے کہ ماسٹرز کا تقاضا درحقیقت تحریک پاکستان سے جڑے رہنے کا بہانہ ہے۔ مگر بحث کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اس کی ضد سے بھلا کون مقابلہ کر سکتا تھا۔ گھر سے اجازت مل گئی۔

اکناکس کا مضمون شاید اوروں کے لیے مشکل ہو، مگر بی بی قریشی کو یہ خاصا دلچسپ لگا۔

اس مضمون کے چناؤ کا ایک سبب اور بھی تھا۔ اس زمانے میں کئی ہندو خواتین معاشیات کے میدان میں کام کر رہی تھیں جب کہ مسلم خواتین خال خال ہی اس شعبے میں نظر آتی تھیں۔ بس یہی سوچ کر اُس نے اس میدان کا انتخاب کیا۔

گھر سے پھر پیغام آیا۔ ”تمہارے لیے رشتوں کا تانتا بندھ گیا ہے۔ اچھے گھرانوں کے کئی لڑکے تم سے شادی کرنے کے خواہش مند ہیں!“

وہ مسکرا دی۔ شادی کے خواہش مندوں کی تو یونیورسٹی میں بھی کمی نہیں تھی۔ کئی طلباء تہذیب اور احترام کے دائرے میں رہتے ہوئے اُسے شادی کے پیشکش کر چکے تھے، مگر اُن

سب کو مایوس لوٹا پڑا۔ اُس کی منزل تو کہیں اور تھی۔ جدوجہد کے اُس زمانے میں وہ اپنے پیروں میں بیڑیاں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ خود کو قید نہیں کرنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

فضائیں یا سیت تیر رہی تھی۔ جس بڑھتا جا رہا تھا۔ زمین بھر اور پھر ملی تھی۔ مایوسی کے سائے تعاقب کر رہے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ مسافر منزل پر پہنچنے سے قبل ہی تھکن کے ہاتھوں ہار جائے گا۔

یکبارگی مشرق سے کرنیں پھوٹیں۔ سورج طلوع ہونے لگا۔ جوں ہی روشنی پھیلی، پرندوں کی چہکار سے آسمان بھر گیا۔ یاسیت نے راہ فرار اختیار کی۔ راستہ صاف نظر آنے لگا۔ پنجرہ زمین سے کوئٹلیں پھوٹ پڑیں۔ سبز لہرائے لگا۔ مسافر نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ سورج کی روشنی افق پر پھیلی تھی۔ اور وہاں... ایک پرچم لہرا رہا تھا، سبز ہلالی پرچم...

وہ منزل کے قریب پہنچ گیا تھا۔ بی بی قریشی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے فوراً بستر چھوڑ دیا۔ کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی، جہاں سے افق نظر آتا تھا، جس پر کرنیں بکھری تھیں۔ ٹھیک اُسی لمحے علی گڑھ یونیورسٹی کے کمپس میں موزن کی آواز گونجی۔

”پاکستان۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔ یکم جنوری 1947 کا سورج طلوع ہو چکا تھا۔

☆☆☆

”لے کے رہیں گے پاکستان، بٹ کے رہے گا ہندوستان!“ نعروں کی گونج میں وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ اہل علم پیش گوئی کر چکے تھے کہ ایک اسلامی ریاست کے قیام کا وقت آن پہنچا ہے۔ آزادی کے متوالوں کو بھی اس کا کامل یقین تھا۔

بالآخر 14 اگست کا دن آن پہنچا۔ پاکستان قائم ہو گیا اور برصغیر کے مسلمان سجدے میں گر گئے۔ تحریک آزادی کے ہزاروں کارکنان کی مانند بی بی قریشی بھی اُس دن انوکھی مسرت سے گزری جسے الفاظ میں بیان کرنا سہل نہیں۔ اگر کوئی یہ ارادہ باندھے تو شاید دفتر کے دفتر سیاہ ہو جائیں۔

ایک جانب جہاں مسرت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا، وہیں اندیشے بھی تھے، کیونکہ نفرت نے پھنکارتے سانپ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ فسادات کے عفریت نے جنم لے لیا تھا جو انسانی خون کی قربانی چاہتا تھا۔ بنگال اور بہار میں

زبردست ہندو مسلم فسادات ہو رہے تھے۔ افسوس ناک خبروں کا تانتا بندھ گیا تھا۔ لوٹ مار، قتل و غارت گری، عصمت دری اور وحشت کا بازار گرم ہو گیا تھا۔ مراد آباد میں بھی حالات گمبیر تھے۔ گوکہ اظفر حسین کا گھر انامالی وسامی طور پر خاصا مستحکم تھا مگر صورت حال اتنی بگڑ چکی تھی کہ وہاں مزید قیام کرنا دشوار معلوم ہونے لگا تھا۔ کانگریسی لیڈر امن کے قیام کی کوشش میں ناکام رہے تھے اور ہریانہ میں بیت ناک اطلاعات لارہا تھا۔

یہی سوچ کر بی بی قریشی کے خاندان نے رخت سفر باندھا اور پاکستان کا رخ کیا۔ لاہور اُن کا مسکن ٹھہرا۔ البتہ بڑے بھائی نے وہیں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا کہ وہ سرکاری ملازم تھے اُن مشکل حالات میں بی بی قریشی نے ایک عجیب فیصلہ کیا۔ وہ ہندوستان ہی میں ٹھہر گئی۔ گھر والوں کو لکھ بھیجا کہ میں تعلیم مکمل کر کے ہی پاکستان آؤں گی۔

اس جرأت مندانہ اقدام نے سب کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ ایک نازک سی لڑکی اور اتنا حوصلہ؟ پر وہ کوئی عام لڑکی نہیں تھی۔ وہ ارادوں کی پکی تھی، حالات کا مقابلہ کرنے کا ہنر جانتی تھی۔ یقین کی قوت سے لیس تھی۔

سو وہ ڈٹی رہی۔ فسادات کی کرب ناک کہانیاں اُسے ہلا نہیں سکیں۔ اندیشوں کی آندھی اُس کے پاؤں اکھاڑنے میں ناکام رہی۔ وہ... اُس محاذ پر بھی جیت گئی۔

☆☆☆

مٹی کی خوشبو نے اُس کی روح کو معطر کر دیا۔ آنکھوں میں مسرت کی نمی تیر گئی۔ اور یہ ایک ایسا تجربہ تھا جس کا بیان ممکن نہیں۔ اسی مٹی کے لیے تو اُس نے جدوجہد کی تھی۔ دشوار گزار گھاٹیاں عبور کیں تھیں۔ اسی مٹی کا تو اُس نے خواب دیکھا تھا۔

”میں اسی مٹی میں دفن ہونے کے لیے پیدا ہوئی ہوں، اُس نے خود سے کہا۔ یہ 1950 کا سن تھا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد بی بی قریشی لاہور پہنچ چکی تھی جہاں خاندان اُس کا منتظر تھا۔

اب وہ اپنے ملک میں تھی جہاں امن تھا، سکون تھا، مگر وہ گھر بیٹھنے والوں میں سے نہیں تھی۔ بی بی قریشی جانتی تھی کہ قیام پاکستان کا مرحلہ تو طے ہو گیا ہے مگر تعمیر پاکستان کا مرحلہ ابھی باقی ہے اور اس کے لیے اسے اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔

شعبہ تدریس اس کا میدان تھا اور علم کے چراغ روشن کرنے کی خواہش دل میں بجھتی تھی۔

ماہنامہ مسرگزشت

ان ہی دنوں حکومت پاکستان کی جانب سے شعبہ تدریس میں ملازمتوں کا اعلان ہوا۔ اُس نے محکمہ تعلیم، حکومت پنجاب میں درخواست جمع کروادی، اس یقین کے ساتھ کہ بلاوا ضرور آئے گا۔

انتظار کے دنوں میں وہ فارغ نہیں بیٹھی۔ ”کام، کام اور صرف!“ وہ قائد اعظم کے اس قول کی عملی تصویر تھی۔ اُس نے لاہور کی مختلف لیسٹوں کا رخ کیا جن کی گلیوں میں پروان چڑھنے والے بچے تعلیم سے محروم تھے۔ مہاجرین کے کیمپوں میں بھی کام کیا۔ فلاحی اداروں کا ساتھ دیا۔ اگر فارغ وقت میسر آتا تو کتابوں میں گم ہو جاتی۔ ان دنوں وہ معروف فلسفی برٹریڈ رسل کو پڑھ رہی تھی۔ اب وہ اٹھائیس برس کی ہو چکی تھی۔ گھر والوں کی خواہش تھی کہ وہ بیاگھر سدھار جائے مگر اُس کے ارادے مختلف تھے۔

”مجھے ملک سنبھالنا ہے۔ معیشت داں کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کرنا ہے۔“ وہ دونوک لہجے میں کہا کرتی۔ ملازمت کے لیے اُسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ چند روز بعد ہی محکمہ تعلیم کی جانب سے لیٹر آ گیا۔ اب ٹیسٹ کے مراحل سے گزرنا تھا اور یہ اس جیسی قابل طالبہ کے لیے ایک آسان مرحلہ تھا۔

ٹیسٹ کے نتائج آئے تو بی بی قریشی کی علمی حیثیت و قابلیت واضح ہو گئی۔ وہ اکنامکس پڑھانے کے لیے، ملک بھر سے منتخب ہونے والے دس امیدواروں میں شامل تھی۔ اس فہرست میں شامل اکلوتی خاتون تھی۔

یہ ایک بڑا کارنامہ تھا لیکن بی بی قریشی فقط اس پر اکتفا نہیں کرنے والی تھی۔ اُس کی آنے والی زندگی میں مزید کارنامے رونما ہونے کو تھے۔

☆☆☆

پنڈی گرلز کالج میں گزرے ابتدائی ماہ و سال ایک خوش گوار یاد کی صورت اُس کے ذہن میں ہمیشہ نقش رہے۔ گو کہ وہ ایک سخت گیر اور نظم و ضبط کی پابند استاد کی شہرت رکھتی تھی مگر طالبات اُس کی دلدادہ تھیں۔ انہیں اس بات پر فخر تھا کہ وہ تحریک پاکستان کی ایک کارکن سے براہ راست اکتساب فیض کر رہی ہیں۔

کردہتی۔ جو الجھن سامنے آتی، اگلے ہی لمحے سلجھ جاتی۔ جب کسی موضوع پر بولتی تو یوں لگتا کہ علم کا دریا بہہ رہا ہے۔ نجر زمین پلوں میں سیراب ہو جاتی۔

معاشیات جیسے خشک مضمون کو وہ اس خوبی سے پڑھاتی کہ طالبات پر کبھی اکتاہٹ حملہ نہیں کرتی۔ وہ انہیں اس مضمون کی اہمیت سے آگاہ کرتی اور ساتھ ہی نصیحت کرتی کہ وہ مستقبل میں اسی میدان کا چناؤ کریں کیونکہ پاکستان کو معیشت کے شعبے میں خواتین کی تخت ضرورت ہے۔

پنڈی گرلز کالج میں بی بی قریشی آٹھ برس تک قلیل معاوضے کے عوض علم پامنتی رہی۔ اور اُن ہی برسوں کی یکسانیت نے اسے نئے تجربات کے لیے تیار کیا۔

”میں معاشیات کے میدان میں مزید کام کرنا چاہتی ہوں۔“ ایک روز اس نے اپنی ساتھی سے کہا۔

”مزید کام؟“ سوال کرنے والے کے لہجے میں حیرت تھی۔

”ہاں، میں بی ایچ ڈی کا ارادہ باندھ رہی ہوں۔“ اُس نے دھیرے سے کہا۔

جلد ہی یہ خبر پورے کالج میں پھیل گئی۔ اُس وقت خواتین خال خال ہی بی ایچ ڈی کے بارے میں سوچا کرتی تھیں۔ خصوصاً معاشیات جیسے خشک مضمون کی جانب تو کسی نے توجہ نہیں دی تھی۔ عام خیال تھا کہ یہ مردوں کا میدان ہے۔ اسی وجہ سے بیش تر افراد نے اُس کے ارادے کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا، لیکن جو لوگ بی بی قریشی کو جانتے تھے، انہیں ادراک ہو گیا تھا کہ وہ ایک اور سنگ میل عبور کرنے کو ہے۔

ایک اور کارنامہ رونما ہونے والا ہے۔

☆☆☆

لندن، علم و ادب و تہذیب کا مرکز، جدید و قدیم تعمیرات کا انوکھا اجتماع، روشن خیالی کا منظر، ترقی کی علامت... کوئی اور ہوتا تو لندن کی چمک دیک سے اس کی آنکھیں خیرہ رہ جاتیں، لیکن یہ بی بی قریشی تھی جسے مرعوب کرنا آسان نہیں تھا۔ لندن کو اُسے متاثر کرنے کے لیے بہت زور مارنا پڑا۔

جس شے نے بی بی قریشی کو حقیقتاً متاثر کیا، وہ تھیں لندن کی درس گاہیں۔ وہاں کے کتب خانے۔ وہاں کی ترقی کرتی معیشت، جسے سمجھنے کی خواہش اسے یہاں لے آئی تھی۔ وہ اپنے ملک کے لیے ایک معاشی ماڈل بنانا چاہتی

تھی۔ ایسا ماڈل، جو پاکستان کو ترقی کی راہ پر گامزن کر دے۔

ہاں، اُس شہر کی ایک شے نے ضرور اُس کا دل موہ لیا اور یہ تھی برف باری۔

جب پہلی بار اس نے یہ منظر دیکھا، اُس کا دل محبت سے بھر گیا۔ آنکھوں میں خوشی کے آنسو تیر گئے۔

”آہ، کتنا خوب صورت منظر ہے۔“ اس کے منہ سے نکلا۔ اور وہ منظر واقعی خوبصورت تھا۔ خاموش درخت برف سے ڈھکے تھے۔ آسمان پر نیلی روشنی رقصاں تھیں۔ موسم دل پذیر تھا۔

تحقیق، وہ بھی زرعی معاشیات میں کسی طور آسان نہیں۔ لیکن بی بی قریشی کی لگن کسی مشکل کو خاطر میں نہیں لائی۔ اس نے تیزی سے تحقیقی کام مکمل کیا اور سامان باندھ لیا۔ اب اس کی منزل یورپ کا ایک جزیہ تھا جسے آئر لینڈ کہہ کر پکارا جاتا تھا۔

☆☆☆

وہ اپنے ملک سے میلوں دور ایک اجنبی جزیرے پر تھی، پر چہرے پر کسی قسم کی گھبراہٹ نہیں تھی... وہاں تو تجسس تھا۔

آئر لینڈ یورپ کا تیسرا بڑا جزیرہ ہے۔ اس کی ایک جانب بحر اوقیانوس ہے اور دوسری جانب بحیرہ آئرش، جو اسے گریٹ برٹن سے الگ کرتا ہے۔ بحیرہ آئرش ہی کو عبور کر کے بی بی قریشی نے اس زمین پر قدم رکھا تھا۔

آئر لینڈ آمد کا سبب ڈبلنگ کا مشہور زمانہ ٹرینی کالج تھا، جس کا شمار یورپ کی اہم ترین درس گاہوں میں ہوتا تھا، خصوصاً معیشت داں اُسے خصوصی اہمیت دیتے تھے۔

سمندر کے کنارے آباد ڈبلنگ نے بی بی قریشی کو لندن سے زیادہ متاثر کیا، جس کا کلیدی سبب دریائے لنی ٹھہرا۔

یہ ڈبلنگ سے گزرنے والا اکلوتا دریا ہے جو شہر کو دو حصوں میں تقسیم کرتا۔ دریا پر تعمیر کردہ پل دونوں حصوں کو جوڑنے کا بنیادی ذریعہ تھے اور اُس پل سے گزرتا بی بی قریشی کو بہت اچھا لگتا تھا۔ نیچے بہتا دریا اُسے قدرت کا مظہر معلوم ہوتا۔ اپنا اپنا لگتا۔ رواں، مسلسل بہتا ہوا، آگے بڑھتا ہوا۔ ٹھیک اس کی مانند!

34 فٹ بلندی ”ستون نیلسن“ کے روبرو کھڑے ہوتا بھی ایک انوکھا تجربہ رہا۔ اور ٹرینی کالج کا تو ذکر ہی کیا۔

1952 میں قائم ہونے والی اس قدیم درس گاہ کے تعلیمی اور تحقیقی نظام کو بی بی قریشی نے اپنے مزاج کے انتہائی قریب پایا۔

ابتداءً اسے جن موضوعات پر تحقیق کرنے کی پیشکش ہوئی، وہ تمام روایتی قسم کے تھے۔ ان میں عدالت نہیں تھی۔ بیشتر پر پہلے بھی کام ہو چکا تھا۔ مگر بی بی قریشی کچھ نیا کرنا چاہتی تھی۔ اُس نے دونوک الفاظ میں کہہ دیا۔

”میں اپنے ملک، اپنے خاندان سے میلوں دور یورپی معاشی نظام، امریکی معیشت کے اثرات، ایشیائی زرعی نظام کا جائزہ لینے نہیں آئی۔ یہ گھسے پٹے موضوعات ہیں، جن پر میں اپنا وقت نہیں ضائع کرنا چاہتی۔“

اس صاف گوئی نے پہلے تو کالج کے منتظمین کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا، مگر جلد ہی انہیں اندازہ ہو گیا کہ اُن کے سامنے کوئی عام عورت نہیں۔ پاکستان سے آنے والی یہ طالبہ حیرت انگیز صلاحیتوں کی مالک ہے۔ علم کی متلاشی ہے۔ مشکل پسند ہے اور چیلنج پسند کرتی ہے۔

”تو پھر آپ ہی بتائیں، آپ کس موضوع پر تحقیق کرنا چاہتی ہیں؟“ اُس سے سوال کیا گیا۔

”میں ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کی زرعی اصلاحات کا تقابلی جائزہ لینے کا ارادہ رکھتی ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”یہ بے حد دقیق اور وسیع موضوع ہے۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ اس کا احاطہ کر لیں گی؟“ ڈائریکٹر کے لہجے میں تذبذب تھا۔

”بالکل، مجھے یقین ہے۔“ اُس کی آواز میں عزم تھا، جس کے پیچھے یقین کی قوت تھی۔ یقین، جس سے معجزات جنم لیتے ہیں۔

آنے والے ماہ تحقیق میں صرف ہوئے۔ ترقی یافتہ ممالک کی کٹنگری میں اس نے برطانیہ اور جاپان کی زرعی اصلاحات کا جائزہ لیا۔ ترقی پزیر ممالک میں انتخاب پاکستان اور انڈیا تھے، جہاں کی ثقافت اور مسائل سے وہ بہ خوبی واقف تھی۔

مقالہ لکھنے کے لیے کئی کتب خانے کھنگالے۔ سیکڑوں ماہرین سے رابطہ کیا۔ ہر پہلو کا احاطہ کیا۔ خوب محنت کی۔ اس دوران اگر کبھی وہ تھک جاتی تو کوئی ناول پڑھنے لگتی۔ طاہرہ سید اور نور جہاں کی آواز اسے بہت پسند تھی۔ فرصت کے لمحات میں اُن کی گانے سنتی۔ لیکن زیادہ وقت ریسرچ ہی

میں صرف ہوتا۔

محنت بے ثمر نہیں مگنی۔ اُس کے تحریر کردہ مقالے کی خاصی پزیرائی ہوئی۔ برطانیہ اور جاپان کے زرعی ماہرین نے اُس پر حوصلہ افزا تبصرے لکھے۔

ایک روشن صبح کالج میں خصوصی تقریب منعقد ہوئی، جس میں اُسے پی ایچ ڈی کی ڈگری دی گئی۔ انتظامیہ نے اسے قابل فخر طالبہ قرار دیا۔

دوسرے دن اخبارات میں خبر شائع ہوئی۔ ”ڈاکٹری بی قریشی، زرعی معاشیات میں پی ایچ ڈی کرنے والی پہلی پاکستانی خاتون!“

ایک معروف امریکی زرعی ماہر نے اُس کے مقالے پر خصوصی مضمون بھی لکھا جس میں یہ خیال ظاہر کیا کہ اگر پاکستان اور انڈیا میں اس کے تحقیقی نتائج اور آئیڈیاز کا اطلاق کیا گیا تو زرعی میدان میں انقلاب آجائے گا۔

آنے والے دن خوشیوں سے لبریز تھے۔ وہ لوٹنے کی تیاریوں میں جٹی تھی۔ اس یقین کے ساتھ کہ اب اپنی تحقیق کو پاکستان میں بروئے کار لائے گی۔

جس وقت وہ پاکستان جانے والے ہوئی جہاز میں سوار ہوئی، آنکھوں میں زرعی انقلاب لانے کا پنا تھا، ایسا انقلاب جو پاکستان کی قسمت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بدل دے گا۔ لیکن یہ پنا جلد ٹوٹنے والا تھا!

☆☆☆

عجیب بے حسی تھی۔ لائق تھی۔ شاید جذبے ماند پڑ گئے تھے۔ شاید خوشیوں کو زنگ لگ گیا تھا۔

”یہ وہ پاکستان تو نہیں جسے میں چھوڑ کر گئی تھی۔“ اس نے خود سے کہا۔ ”یہ بدل چکا ہے۔ شاید اسے بے حسی کا روگ لگ گیا ہے۔“

کیا ایسا ہی تھا؟ پاکستان بدل چکا تھا؟

زرعی معاشیات میں ملک کی اولین خاتون پی ایچ ڈی کے ساتھ برتا جانے والا ناروا سلوک اس تلخ سوال کا جواب اثبات میں دیتا ہے۔

اس کی آمد کا کوئی نوٹس نہیں لیا گیا۔ محکمہ تعلیم کے افسران کو اُس کے کارنامے کا علم ہی نہیں تھا۔ جن کے پاس یہ اطلاع پہنچی بھی، انہوں نے اسے درخور اعتنا نہیں جانا۔ اخبارات نے بھی اس جانب توجہ نہیں دی۔

اتنی ناقدری؟ حیرت انگیز!!

بی بی قریشی کو دکھ ضرور تھا مگر وہ مایوس نہیں ہوئی۔ وہ

بے لوث خدمت پر یقین رکھتی تھی مگر بد قسمتی سے... یہاں اس کی بھی گنجائش نہیں تھی۔

کارہائے نمایاں انجام دینے والی اس خاتون کو دوبارہ پنڈی گرلز کالج ہی میں ڈتے داریاں سنبھالنا پڑیں۔

اس بات پر تو اسے افسوس نہیں تھا کہ وہ وہاں کے ماحول سے مانوس تھی، کالج کے درود یوار سے انسیت بھی تھی۔ لیکن اب اسٹاف بدل چکا تھا۔ نئے لوگ آگئے تھے، جنہیں یہ قبول نہیں تھا کہ اتنی پڑھی لکھی اور قابل استاد اُن کے درمیان ہو۔

حاسدین بی بی قریشی کی جانب سے متواتر کی جانے والی اصلاحات کے تقاضوں کو بھی وقت کا ضیاع تصور کرتے تھے۔

اس ماحول میں جلد ہی بی بی قریشی کو ٹھن محسوس ہونے لگی۔ لگے بندھے معمولات کا ٹٹے کھانے کو دوڑنے لگے۔ اکتاہٹ قوی ہونے لگی۔ اور پھر... ایک سرد شام مایوسی کے سانپ نے اُسے ڈسا۔

اداسی کے زہر سے اُس کا وجود بھر گیا۔ یہ احساس ستانے لگا کہ وہ اجنبی دیس میں ہے۔

”مجھے پرواز کے لیے نئے آسمان تلاش کرنے ہوں گے۔“ اس نے خود سے کہا۔ ”ایسی درس گاہیں تلاش کرنی ہوں گی، جہاں صلاحیتوں کے اظہار کے، تحقیق کے مواقع میسر ہوں۔ مجھے ایسے طلباء ڈھونڈنے ہوں گے جو مستقبل میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔“

شاید وہ قبولیت کا لمحہ تھا۔ کیونکہ جس وقت یہ خیالات بی بی قریشی کے ذہن میں پنپ رہے تھے، قدرت مغربی افریقا کی ایک غریب ریاست میں مصروف عمل تھی جہاں سے ابھرنے والا ایک بچہ مستقبل میں اقوام متحدہ کا سیکریٹری جنرل بننے والا تھا۔

☆☆☆

گھانا... ایک گرم اور مرطوب ملک، جہاں وسائل کی قلت تھی۔ تعلیمی مواقع کی کمی تھی۔ بڑے حصے پر سبزے اور غربت کا راج تھا، پر ثقافتی اعتبار سے... وہ ایک زرخیز سرزمین تھی۔

نوآبادیاتی نظام سے قبل بھی یہ علاقہ یورپ گروں کی توجہ کا مرکز رہا تھا۔ 1874 میں دوسروں کے وسائل پر زندگی گزارنے والا برطانوی سامراج اس خوبصورت زمین پر قابض ہو گیا تھا۔ 1957 میں حریت پسندوں کی طویل جدوجہد کے بعد اسے غلامی کے شکنجے سے آزادی ملی۔ گھانا افریقا کی اُن ابتدائی ریاستوں میں سے تھا، جس نے طوق

غلامی گلے سے اتار پھینکا۔ اپنے ہیروں پر کھڑے ہونے کا عزم کیا۔

وہ جانتی تھی کہ نئے اور یکسر مختلف ماحول سے ہم آہنگ ہونا آسان نہیں ہوگا۔ مگر اُسے اس کی پروا نہیں تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر زندگی میں مشکلات نہ ہوں، یکسانیت ہو، تو وہ اوب جاتی تھی۔ یہی سبب ہے کہ اُس نے خوشی خوشی یونیورسٹی آف کیٹ پوسٹ کا حصہ بننے کا فیصلہ کر لیا۔

گھانا کا رخ کرنے کا ایک سبب وہاں کی تحریک آزادی کے قائد کو اسے انکروما بھی تھے، جن کی وہ مداح تھی۔ 1966 میں گھانا کے لیے رخت سرفراز ہوئے دل میں یہی خواہش تھی کہ وہاں جا کر اس عظیم لیڈر سے ملاقات کرے۔ مگر یہ خواہش پوری نہیں ہوئی... جس روز وہ گھانا جانے والے ہوائی جہاز میں سوار ہوئی، انکروما کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔

یہ ایک بھاری ڈکھ تھا جس کے ساتھ اُس نے گھانا کی زمین پر قدم رکھا جہاں بے یقینی کی فضا تھی۔

آنے والے دنوں میں بھی بے یقینی بے قرار رہی۔ بے درپے ہونے والی بغاوتوں نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ سیاسی نظام عدم استحکام کا شکار ہوگا۔ جمہوری سسٹم کی کمر ٹوٹ گئی۔ مگر بی بی قریشی نے اس جانب توجہ نہیں دی۔ اُس کا مقصد تو فقط علم کا فروغ تھا۔

اُس کے معمولات میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ وہی ہوٹل کی زندگی۔ صبح بیدار ہو کر کمرہ جماعت کا رخ کرتا۔ وہاں سے فراغت کے بعد کچھ وقت کتب خانے میں گزارنا۔ چارلس ڈکنز اور رسل کی کتابیں پڑھنا۔ اگر کوئی تقریب ہو تو اُس میں شرکت۔ ورنہ تحقیق، تحقیق اور تحقیق!

ہاں، ماضی کے برعکس اس بار گھر سے دوری نے اُسے تھوڑا اداس رکھا۔ علی گڑھ کے زمانے میں تو تحریک آزادی کے سحر نے جکڑ رکھا تھا۔ مصروفیات ایسی تھیں کہ گھر والوں سے رابطے کا موقع بھی کم ہی ملتا۔ کچھ ایسا ہی معاملہ لندن اور آئرلینڈ کا بھی تھا جہاں تحقیقی مصروفیات نے سر کھانے کا موقع نہیں دیا۔ مگر گھانا آنے کے بعد اسے گھر یاد آنے لگا۔

خیر، طلباء و طالبات کی محبتوں نے اس غم کو بڑی حد تک کم کر دیا۔ وہ یونیورسٹی آف کیٹ پوسٹ کی اکلوتی خاتون پروفیسر تھی۔ وہ بھی ایسے مضمون کی جس کی جانب اُس کی ہم وطن خواتین کی مانند گھانا کی عورتیں بھی شاذ و نادر ہی آتی

تھیں۔

بی بی قریشی کو وہاں مکمل آزادی حاصل تھی۔ یونیورسٹی انتظامیہ کو اس کی صلاحیتوں پر بھروسہ تھا۔ تحقیق کے مواقع بھی میسر تھے۔ پھر طلباء و طالبات میں بھی کچھ نئے سکھنے کا جذبہ تھا۔ وہ تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اور بی بی قریشی کی زندگی کا مقصد ہی تعلیم کا فروغ تھا۔ یوں اُس نے خود کو ایک سانچے میں ڈھال لیا۔ وہ فوجی بغاوتوں سے، آئینی کی معطلی سے بے پروا ہو گئی۔ فکر تو بس یہ تھی کہ تدریسی عمل معطل نہ ہو۔ اس ضمن میں اس نے عملی اقدامات بھی کیے۔

سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے والے طلباء و طالبات کی وہ حوصلہ افزائی ضرور کرتی کہ نوجوانی میں خود بھی فعال سیاسی کارکن رہی تھی مگر ساتھ ہی انہیں یہ نصیحت کرتی کہ وہ تعلیم کی جانب بھی توجہ دیں۔ اس ضمن میں اپنی مثال پیش کرتی۔

”میں بھی ایک سیاسی کارکن تھی لیکن اس عمل سے میری پڑھائی متاثر نہیں ہوئی۔ میں نے تمام امتحانات اچھے نمبروں سے پاس کیے۔ آپ کو بھی اپنی پڑھائی سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔“

☆☆☆

گھانا میں اُسے کئی قابل طلباء میسر آئے، جنہوں نے آنے والے برسوں میں بین الاقوامی اداروں میں ڈتے داریاں نبھائیں۔

اور اُن ہی میں ایک ایسا نوجوان بھی شامل تھا جو مستقبل میں اُس ترقی پذیر ریاست کی پہچان بننے والا تھا... اُس کا نام کوئی عنان تھا۔

دھان پان ساوہ لڑکا خاصا شرمیلا اور کم گو تھا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کل وہ اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل جیسا اہم عہدہ سنبھالنے والا ہے۔

کوئی عنان بھری پڑی کلاسوں میں کبھی نمایاں طور پر سامنے نہیں آیا۔ وہ پیچھے والی نشستوں پر خاموش بیٹھا رہتا۔ بی بی قریشی بی بی اے آنرز اور ایم اے کے اسٹوڈنٹس کو یکپہر دیا کرتی تھی۔ کوئی بھی وہیں ہوتا، لیکن ایک آدھ بار ہی اُن دونوں کا سامنا ہوا۔

ایک بار کوئی نے کلاس میں مختصری تقریر کی تھی جو خاصی بے ربط تھی۔ دوسری بار اسائنمنٹ کے سلسلے میں اُس نوجوان نے بی بی سے سے مشورہ کیا تھا۔ بس!! یہی سبب ہے کہ جب برسوں بعد کوئی عنان کے

اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل بننے کی اطلاع ملی، وہ خوشگوار حیرت سے گزری۔ ”تم اتنے بھی نالائق نہیں تھے، جتنا میں تمہیں سمجھتی تھی!“ وہ مسکرائی۔

☆☆☆

لاٹینی امریکا کے معروف ادیب گبریل گارسیا مارکیز نے ایک بار کہا تھا۔ ”نئی زمینوں کا سفر انسان کو نئے امکانات سے روبرو ہونے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ خود کو دریافت کرنے کا حوصلہ دیتا ہے۔“

یہ بات بی بی قریشی کی زندگی پر صادق آتی ہے جس کے لیے گھاتانے نئے امکانات کا دروا کر دیا۔ وہیں اُس نے خود میں چھپے مضمون نگار کو پہچانا... ایسا مضمون نگار، جسے کوئی لکار خوف زدہ نہیں کر سکتی تھی۔ جس کا قلم دودھاری تلوار تھا۔ جو کج کا داعی تھا۔

معیشت اس کا میدان، مگر جب قلم تھا تو بی بی قریشی نے بین الاقوامی سیاست کے موضوع کا جناؤ کیا۔

گلی لپٹی رکھنے والوں میں سے وہ تھی نہیں۔ سچ کہنے میں تامل کیسا۔ سوجب لکھنا شروع کیا، تو پہلا حملہ سامراج قوتوں کے سرپرست اعلیٰ اسرائیل پر کیا جس نے فلسطینیوں پر مظالم کے پہاڑ توڑ رکھے تھے۔

پہلی ہی تحریر نے اخبار میں جگہ حاصل کر لی۔ خوب واہ واہ ہوئی۔ اس کی بے باکی کو سراہا گیا۔ مگر چند خیر خواہ نے دبے لفظوں میں یہ مشورہ بھی دیا کہ اس موضوع پر ذرا احتیاط رویہ اختیار کیا جائے۔

پہاڑوں پر بیرا کرنے والی شاہین کو قید نہیں کیا جاسکتا۔ اُس کا کام تو پرواز ہے۔ بی بی قریشی نے بھی محدود ہونے سے انکار کر دیا۔ سچ لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔

اُس زمانے میں جنوبی افریقا میں نیلسن منڈیلا حق و صداقت کی جنگ لڑ رہے تھے۔ آزادی کی قدرداں بی بی قریشی کو اس سپاہ فام لیڈر کی فکر نے بہت متاثر کیا۔ اس نے نیلسن منڈیلا کی تحریک کو موضوع بنایا۔ اس تعلق سے مضامین لکھے اور پیش گوئی کی کہ اس جدوجہد کے نتیجے میں جنوبی افریقا میں نیا سورج طلوع ہوگا۔

چند تحریروں کی اشاعت ہی کے بعد پورے گھاتانے میں اس پاکستانی خاتون کی جرأت کا چرچا ہونے لگا۔ اسرائیلی مظالم کی نشان دہی نے گھاتانے میں تعینات مختلف ممالک کے سفیروں کو بھی اُس کی جانب متوجہ کیا جن میں مصر کے سفیر پروفیسر حسنی بھی شامل تھے۔

بی بی قریشی کے مضامین نے انہیں گرویدہ بنا لیا۔ انہوں نے اس زرعی ماہر سے ملاقات کی۔ کام کو سراہا اور لکھنے کا سلسلہ جاری رکھنے کی درخواست کی۔

”لوگ تو مجھے باز رہنے کی تنبیہ کر رہے ہیں اور آپ حوصلہ افزائی!“ وہ مسکرائی۔

”کیونکہ میں سچ کا قدر داں ہوں“ پروفیسر نے کھٹکھار کر گلا صاف کیا۔ ”میں نے اپنے اسٹاف کو آپ کے مطبوعہ مضامین مصر بھجوانے کی ہدایت کر رکھی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مصری صدر کو یہ پسند آئیں گے۔ اور امید ہے کہ مصری قارئین بھی انہیں پڑھنا چاہیں گے۔“

”یہ تو بہت خوشی کی بات ہوگی۔“ وہ مسکرائی۔

اُس نے سچ لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ طلباء و طالبات کی جانب سے بھی اس سلسلے کو بہت پسند کیا گیا۔ وہ اپنے رشتے داروں اور دوستوں کو فخر یہ بتاتے کہ وہ بی بی قریشی کے طالب علم ہیں۔ مداحوں کی فہرست میں کوئی عنان بھی شامل تھا۔

پروفیسر حسنی ہر تحریر کی اشاعت کے بعد اُسے فون کرتے۔ کالم پر بات ہوتی۔

پھر ایک شام بی بی قریشی کو حسنی مبارک کی غیر متوقع فون کال موصول ہوئی۔ سلام دعا کے بعد اُس نے پوچھا۔ ”پروفیسر صاحب، آج کیسے یاد کر لیا؟ آج تو مضمون کی اشاعت کا دن نہیں۔“

”سچ فرمایا۔“ پروفیسر نے عادتاً کھٹکھار کر گلا صاف کیا۔ ”لیکن فون کرنے کا سبب آپ کے مضامین ہی ہیں!“

”کہیے میں سن رہی ہوں۔“

”جیسا کہ آپ کے علم میں ہے... گزشتہ چند ماہ سے میں آپ کے مضامین کی کٹنگ صدر مصر کو ارسال کر رہا ہوں۔ آپ کے تحریروں نے انہیں بہت متاثر کیا۔ اور اب وہ چاہتے ہیں...“ پروفیسر نے ایک لمحہ کا توقف کیا۔ ”کہ حکومت مصر کی دعوت پر محترمہ ڈاکٹر بی بی قریشی مصر کا دورہ کریں۔“

”ارے...“ لہجے میں استعجاب تھا۔ ”مگر میں تو ایک معمولی انسان ہوں۔“

”ایسا آپ سوچتی ہیں محترمہ۔ مگر مجھے آپ سے اختلاف ہے۔“ پروفیسر نے فوراً کہا۔ ”سچ تو یہ ہے کہ اگر آپ مصر میں ہوتیں، تو اس وقت وزیر معیشت ہوتیں۔ خیر، یہ تو الگ موضوع ہے۔ میں نے یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا

کہ ہماری قابل احترام شاہی مہمان... یعنی آپ کے تمام سفری انتظامات مکمل ہیں۔ آپ تیار رہیں۔ اگلے ہفتے آپ مصر روانہ ہو رہی ہیں۔“

”مگر میرے لیے یہ ممکن نہیں۔ یونیورسٹی میں کلاسیں...“

پروفیسر نے بات کاٹ دی۔ ”میں وائس چانسلر سے بات کر چکا ہوں، اگلے ہفتے!!“

اور فون بند ہو گیا۔

☆☆☆

مصر... اسرار کی سرزمین، جس کی فضاؤں میں جادو تھا۔ جہاں بلند و بالا اہرام ہزاروں راز چھپائے، زمین کے سینے پر خاموش کھڑے تھے۔ اور قاہرہ کے تو کیا ہی کہنے جہاں بازاروں میں قدیم اور جدید ثقافت کا حسین امتزاج دمکتا تھا۔

ان سب کی اہمیت اپنی جگہ، مگر سب سے زیادہ بی بی قریشی کو دریائے نیل نے متاثر کیا جہاں تاریخ سبک روی سے بہتی تھی۔

مصر میں اس پاکستانی خاتون کا استقبال شاہی مہمان کی حیثیت سے کیا گیا۔ اس نے صدر کے عشاءے میں شرکت کی۔ اعلیٰ حکومتی شخصیات سے ملاقات کی۔ مصری علما سے تبادلہ خیال کرنے کا بھی موقع ہاتھ آیا۔ تاریخی مقامات کی سیر کی۔ جامعہ الازہر بھی جانا ہوا۔

سچ تو یہ ہے کہ ان چند دنوں میں بی بی قریشی کئی پُر تجسس تجربات سے گزری۔ لوٹتے وقت اُس نے سوچا۔ ”جب فراغت نصیب ہوگی، میں اس دلچسپ سفر کی تفصیلی رپورٹ لکھوں گی!“

مگر قسمت نے یہ موقع نہیں دیا!!

☆☆☆

بی بی قریشی کے گھانا لوٹنے کی خبر ملتے ہی طلباء میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

تدریسی عمل شروع ہو گیا۔ پھر وہی بھری مپری کلاسیں۔ ایک ایک گھنٹے کے لیکچرز۔ کتب خانے۔

مصرفیات کے اُن دنوں میں ایک خواہش دھیرے دھیرے بی بی قریشی کے دل میں پنپ رہی تھی، خانہ خدا دیکھنے کی خواہش۔ وہ عمرہ کرنا چاہتی تھی، سعودی عرب کے لیے رخصت سفر باندھنے کا ارادہ تھا۔

اس ضمن میں سعودی عرب میں تعینات گھانا کے سفیر

سے رابطہ کیا گیا۔ وہاں سے جواب تو فوراً ہی آ گیا، مگر وہ خاصا مایوس کن تھا۔

”ہم آپ کی خواہش کا احترام کرتے ہیں، مگر... یہ ممکن نہیں۔“

سبب دریافت کیا گیا، تو پتا چلا کہ سعودی عرب کی حکومت محرم کے بغیر کسی عورت کو ویزا جاری نہیں کرتی۔

یہ ایک گنبد مسئلہ تھا۔ کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔ دوسری جانب خانہ خدا کی زیارت کی آرزو ہر گزرتے دن کے ساتھ قوی ہوتی جا رہی تھی۔

اس ضمن میں اُس نے پروفیسر حسنی سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

فون پر اپنا مدعا بیان کرنے کے بعد اُس نے گہرا سانس لیا۔

دوسری طرف خاموشی تھی۔ چند ساعتوں بعد پروفیسر کی آواز سنائی دی۔ ”ڈاکٹر صاحبہ، یہ ایک پیچیدہ معاملہ ہے۔“

بی بی قریشی کو امید دم توڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔

”لیکن میں کوشش کرتا ہوں۔ مجھے تھوڑا وقت دیجیے۔“ یہ کہہ کر پروفیسر نے فون رکھ دیا۔

اب بی بی قریشی کو انتظار کرنا تھا، جو طویل ثابت ہوا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ مایوسی بڑھتی گئی مگر پھر ایک روز فون کی گھنٹی بجی۔

”ڈاکٹر صاحبہ، مبارک ہو۔ ویزے کا انتظام ہو گیا۔“

دوسری طرف پروفیسر حسنی تھے۔

”یہ تو بہت ہی اچھی خبر ہے، مگر پروفیسر صاحب اجازت کیسے ملی۔“ حیرت اور مسرت، دونوں ہی جذبات بی بی قریشی کے دل میں دھڑک رہے تھے۔

”اس بات کو جانیں دیں۔ آپ تیاری کریں۔“

پروفیسر حسنی نے جواب دیا۔

یہ تو اُسے بعد میں پتا چلا کہ اس ضمن میں پروفیسر نے کتنی بھاگ دوڑ کی تھی۔ سعودی حکام کو منانے کے لیے اُسے کتنے پاپربلیٹے پڑے تھے۔

جس دوپہر وہ گھانا سے سعودی عرب جانے والی فلائٹ میں سوار ہوئی، دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اندرون میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔

چند گھنٹے جذبات میں تلاطم رہا، مگر جونہی جہاز سعودی عرب کی زمین پر اترا، ہلچل ختم گئی۔ طوفان ٹھہر گیا۔ بس اب

ایک ہی خواہش تھی، جلد از جلد مکہ پہنچنے کی خواہش۔
 مسجد الحرام میں داخلے کے وقت بی بی قریشی کن
 کیفیات سے گزری، اس کا بیان ممکن نہیں۔ آنکھوں میں نمی
 تھی اور دل میں عقیدت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔
 وہاں نماز ادا کی۔ طواف کیا۔ حبسہ اسود کو بوسہ دیا۔
 خانہ خدا کے خلاف کو چوما۔ سعی کا مرحلہ طے کیا۔ اور پھر
 گھنٹوں وہاں خاموش بیٹھی رہی۔
 مدینے کا سفر تو ایک روحانی تجربہ تھا جسے الفاظ میں بیان
 نہیں کیا جاسکتا۔
 گھانا لوٹنے وقت وہ انتہائی مغموم تھی۔ اُس نے
 جہاز کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ رن وے پر دھوپ پھیلی تھی
 جس سے پرے مکانات نظر آرہے تھے۔
 ”میں پھر آؤں گی!“ اُس نے آہستگی سے کہا۔
 ☆☆☆
 کوئی اُس کا تعاقب کر رہا تھا۔
 اُس نے مڑ کر دیکھا۔ کوئی نہیں تھا۔ پارک میں مکمل
 سناٹا تھا۔
 ”شاید میرا وہم ہو۔“ وہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔
 لیکن یہ احساس جلد ہی لوٹ آیا۔ اس بار بازار سے گزرتے
 وقت اُسے محسوس ہوتا کہ کسی کی نظریں اُس پر گڑی ہیں۔
 چند ہی روز میں اُسے یقین ہو گیا کہ کوئی اُس پر نظر
 رکھے ہوئے ہے۔ جب اُس نے اپنے خیر خواہوں سے
 بات کی تو وہ بھی پریشان ہو گئے۔
 بالآخر اُس نے وائس چانسلر سے بات کرنے کا
 سوچا۔
 ”موساد کے اہل کار۔“ اُس کی بات سننے ہی وائس
 چانسلر کے منہ سے نکلا۔
 ”موساد؟“ بی بی قریشی کے لہجے میں حیرت تھی۔
 ”ناممکن! بھلا انہیں میرا تعاقب کرنے کی کیا ضرورت
 ہے؟“
 ”ضرورت تو ہے!“ وائس چانسلر نے سگار جلایا۔
 ”آپ مسلسل اسرائیل کے خلاف لکھ رہی ہیں۔ ان
 تحریروں نے آپ کو گھانا کی ہر دلعزیز شخصیت بنا دیا ہے۔
 مصر کا بھی آپ دورہ کر چکی ہیں۔ وہاں صدر کی مہمان
 رہیں۔ چین کا سفر کیا۔ چند دن ایران میں بھی قیام کر چکی
 ہیں۔ کیا آپ کو نہیں لگتا کہ اسرائیل کی خفیہ ایجنسی کو متحرک
 کرنے کے لیے یہ عوامل کافی ہیں!“

چند ساعت وہ خاموش رہی۔ پھر سر اٹھایا۔ ”آپ
 درست ہی کہتے ہیں۔ اُن کے لیے میں واقعی ایک دشمن
 ہوں۔“
 ”ایک سبب آپ کا پاکستانی ہونا بھی ہے۔ جیسا کہ
 ہم جانتے ہیں، آپ کے ملک نے اسرائیل کو تسلیم نہیں کیا۔“
 ”اور کرے گا بھی نہیں۔“ بی بی قریشی نے ٹھوس لہجے
 میں کہا۔
 ”مجھے اس کا یقین ہے ڈاکٹر صاحبہ۔“ وائس چانسلر
 نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میرا مشورہ ہے کہ آپ ذرا
 احتیاط سے کام لیں۔ چاہیں تو ہم پولیس کو اطلاع دے سکتے
 ہیں۔“
 ”فی الحال اس کی ضرورت نہیں۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔
 مگر جلد ہی پولیس کو اطلاع دینے کی نوبت آ گئی۔ بی
 بی قریشی کو محسوس ہونے لگا کہ اس کی ٹیلی فون کا ٹریک ریکارڈ
 ہو رہی ہیں، اس کے نام آنے والے خطوط پہلے ہی پڑھ لیے
 جاتے ہیں۔ ہوٹل کے باہر بھی چند مشکوک سرگرمیاں اس کی
 نظر سے گزریں۔ اور پھر ایک روز... ایک مبہم دھمکی آمیز خط
 موصول ہوا۔
 اب اُس کی برداشت سے باہر ہو گیا تھا۔ وہ خط لے
 کر پولیس اسٹیشن پہنچ گئی۔ پولیس نے شکایت درج کر لی، مگر
 تفتیش کا کوئی نتیجہ سامنے نہیں آیا۔
 یہی پریشانی کیا کم تھی کہ چند روز بعد وہ ایک اور کرب
 ناک تجربے سے گزری۔
 وہ کافی دنوں سے محسوس کر رہی تھی کہ ساتھی اساتذہ
 اس سے کھینچے کھینچے رہنے لگے ہیں، مگر اُس نے اس جانب
 کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ مگر ایک دن تو حد ہی ہو گئی۔
 اُس شام اُسے ایک پروفیسر کے بیٹے کی سالگرہ میں
 شرکت کرنا تھی۔ وہ ہوٹل سے نکلنے کو تھی کہ ایک غیر متوقع
 کال موصول ہوئی۔
 فون کرنے والے نے خود کو پروفیسر کے ملازم کی
 حیثیت سے متعارف کروایا۔ ”ڈاکٹر صاحبہ، تقریب ملتوی
 ہو گئی ہے۔ برائے مہربانی آپ گھر میں آرام کریں۔“
 دوسرے دن جب وہ یونیورسٹی گئی، تو یہ جان کر حیران
 رہ گئی کہ تقریب پروگرام کے مطابق منعقد ہوئی تھی۔ اُس
 نے پروفیسر سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔
 ”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے ڈاکٹر صاحبہ۔ میرے گھر
 کے کسی ملازم نے ایسی کال نہیں کی۔“

اُس نے صاف محسوس کیا کہ پروفیسر کی آنکھیں اُس
 کے بیان سے متصادم ہیں، مگر وہ خاموش رہی۔
 اس ضمن میں اس نے دیگر اساتذہ سے بھی بات کی۔
 بیشتر نے یہی کہا کہ وہ وہم کا شکار ہو گئی ہے۔
 مگر پھر... ایک خیر خواہ نے سچ اگل ہی دیا۔ ”انتظامیہ
 پر تمہیں الگ کرنے کے لیے دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔“
 یہ انکشاف تھا۔ ”کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟“
 ”ہاں،“ وائس چانسلر اور انتظامیہ کو شش کر رہی ہے۔
 مگر مجھے لگتا ہے وہ دباؤ برداشت نہیں کر پائیں گے!“
 چند ساعت خاموشی چھائی رہی۔ پھر اُس نے کہا۔
 ”میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے کسی کو اپنی ملازمت سے
 ہاتھ دھونا پڑے۔ بہتر یہی ہے کہ میں اس ادارے سے الگ
 ہو جاؤں۔“
 یہ کہنے کے بعد وہ ہوٹل لوٹ آئی۔ اگلے چند گھنٹے
 موج بچا میں گزرے۔ شام میں جب وہ چہل قدمی کے
 لیے نکلی، مستقبل کا فیصلہ ہو چکا تھا۔
 دراصل چند روز قبل اُس کی نظر سے یونیورسٹی آف
 نیروبی کا ایک اشتہار گزرا تھا، جنہیں فوری طور پر اکنائکس
 کے ایک تجربے کار پروفیسر کی ضرورت تھی۔
 ہوٹل میں لوٹنے سے قبل وہ بہ ذریعہ ڈاک ملازمت
 کے لیے درخواست روانہ کر چکی تھی!
 ☆☆☆
 کینیا، ایک نئی سرزمین... اور یونیورسٹی آف نیروبی،
 ایک نئی درس گاہ!
 گھانا سے رخصتی کا اُسے ڈکھ تو بہت تھا لیکن نیروبی
 کے حسین موسم نے اس غم کو خاصا کم کر دیا۔ اُس پر فضا شہر نے
 بی بی قریشی کی شخصیت پر انتہائی خوش گوار اثرات مرتب کیے۔
 روزمرہ معمولات کا سلسلہ جہاں سے ٹوٹا تھا، وہیں
 سے جو گیا۔ ایک ایک گھنٹے پر طویل لیکچرز۔ سیکڑوں طلباء
 طالبات پر مشتمل کلاسیں۔ کتابوں سے بھرے کتب خانے۔
 فراغت کے لمحات میں ڈکنز اور رسل کی کتابیں۔ طاہرہ سید
 اور نور جہاں کی آواز۔ جدوجہد آزادی پر مشتمل فلمیں۔
 کینیا میں بھی ہزاروں طلباء نے اس کے علم سے استفادہ
 کیا۔ ساتھی اساتذہ بھی اس کا بہت احترام کرتے تھے۔
 اس عرصے میں پاکستان بھی آنا جانا رہا۔ بنیادی سبب
 گھر والے ہی تھے، جو خوب آؤ بھگت کرتے۔ خاندان کے
 بچے اُس کے گرد ڈیرا ڈال لیتے۔ پورس کی کہانیاں سنانے کی

نسخہ سیرپاور

ماریشس لا علاج اور خوف زدہ حضرات کیلئے عظیم سرمایہ

جسمانی اعصابی اور خاص کمزوری
 شوگر، بلڈ پریشر کی وجہ سے پریشان
 مریض زندگی میں ایک بار اسے ضرور
 استعمال کریں اور تمام عمر فٹ رہیں

ایسی خواتین کیلئے بھی مفید ہے جو شوگر کی وجہ سے
 دماغی جسمانی اور اعصابی کمزوری محسوس کرتی ہیں۔
 چنڈلیوں جوڑوں اور پٹھوں کے درد سے مکمل نجات دلاتا ہے
 کورس 15 دن صرف 2500 روپے

نوٹ نسخہ سیرپاور
 سونے، چاندی یا قوت، زمرہ، حقیقی، مرجان اور ہیرے جواہرات
 کا مرکب ہے جو کہ بہت قلیل مقدار میں تیار ہوتا ہے لہذا یہ بازار
 سے نہیں ملتا صرف ہمارے ہاں ہی دستیاب ہے۔ آپ خود ٹیسٹ
 یا کمریٹھے فون کر کے وی پی پارسل سکوالیں No Side Effect

پتھری
 گردہ مثانہ یا پتھ میں ہوا نشاء اللہ تعالیٰ ریت بن کر نکل
 جائے۔ کورس (20) دن صرف (1500) روپے

موٹاپا
 بڑھا ہوا پیٹ ڈھلکا ہوا پیٹ قد سے زائد وزن
 جسم کی فالٹو چربی پسینہ بن کر خارج ہو جائے گی
 کورس ایک ماہ صرف 2000 روپے

گیس ٹریل
 سینے کی جلن تیزابیت، دائمی قبض، پیٹ سخت ہونا
 معدے کے زخم اور انتڑیوں کے زخم کا کامیاب علاج
 کورس ایک ماہ صرف 1200 روپے

طب یونانی کے مایہ ناز
 دواخانہ حکیم عالم شیرکھل
 بلوچستان شاہ روضہ داؤد الیانی قصہ شہر
 0345-6397367
 0300-4280816

فرمائش کرتے۔ اور وہ مسکراتے ہوئے کوئی قصہ چھیڑ دیتی۔
کبھی اہرام مصر سے پیوست اسرار کا ذکر ہوتا۔ کبھی
عمرے کے تجربات زیر بحث آتے اور کبھی کھانا اور کینیا کے
جنگلات موضوع بن جاتے۔

جب کبھی وہ پاکستان لوٹی، ایک شے کا احساس بڑی
شدت سے ہوتا۔ ”جس ملک کے لیے میں نے جدوجہد کی
تھی، یہ پاکستان اس سے کتنا مختلف ہے۔ ہر کوئی مفادات
کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ اپنے اثاثے بڑھانے میں لگا
ہوا۔ قائد اعظم کی تعلیمات کو بالکل بھلا دیا گیا ہے۔“
بے قیمتی کالمیہ بھی اُسے اداس کر دیتا۔ اُس جیسی کار
ہائے نمایاں انجام دینے والی عورت کی خدمات کا حکومت
نے نوٹس لینے کی کبھی زحمت نہیں کی۔ کبھی اخبارات میں اُس
کے کارناموں کا ذکر نہیں ہوا۔ لیکن وہ منفی خیالات ذہن پر
سوار نہیں ہونے دیتی۔ سر جھٹک دیتی اور دوبارہ خاندان
کے ننھے سنے بچوں میں گم ہوجاتی، جنہیں کینیا کے جنگلات
کے سب سے خوں خوار چیتے کی کہانی سننے کی خواہش اُس
تک چھ لاتی۔

☆☆☆

نیروبی کے ابتدائی دنوں میں کئی بار بی بی قریشی کو اُس
پُر اسرار احساس نے ستایا، جو کھانا چھوڑنے کا سبب بنا تھا۔
چہل قدمی کے دوران کئی بار اُسے محسوس ہوا کہ کوئی
اُس کا تعاقب کر رہا ہے مگر اُس نے اس جانب توجہ دینے کی
ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ لکھنا ترک کر چکی تھی اور اب اُس
کی کل توجہ تدریس پر مرکوز تھی۔

ایسا نہیں تھا کہ وہ لکھنے کی آرزو مند نہیں تھی۔ دراصل اب
بیماریاں خصوصاً امراض چشم اُسے پریشان رکھنے لگے تھے۔
مطالعے کی راسخ عادت کی وجہ سے نظر پہلے ہی کمزور
تھی مگر پھر ایک دن... اچانک آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا
گیا۔ محاسبہ کروایا تو پتا چلا کہ آنکھوں میں کالا پانی اتر آیا ہے۔
علاج کے لیے اُس نے پاکستان کا رخ کیا۔ معالجین
نے آپریشن کروانے کا مشورہ دیا۔

”ایسا ہے، تو ایسا ہی کسی!“ اُس نے دحیرے سے کہا۔
آپریشن کامیاب رہا۔ چند روز آرام کرنے کے بعد
نیروبی کے لیے رخت سفر باندھ لیا۔ پھر تدریس سرگرمیوں
میں الجھ گئی لیکن اندھیرا تعاقب میں تھا۔ کچھ عرصے بعد پھر نظر
کی کمزوری اُسے معالجین تک لے گئی۔
اس بار مویجے کی تشخیص ہوئی۔ دوبارہ پاکستان کا رخ

کیا۔ آپریشن کروانے کے بعد کئی دن آرام کرتے گزرے۔
صحت یاب ہونے کے بعد سیاحت کی اس شائق کے
دل میں نئے تجربات کی خواہش نے انگڑائی لی۔ اُن دنوں
1964 میں آزاد ہونے والی افریقہ کی انتہائی جنوبی ریاست
زمبیا کی یونیورسٹی آف لوساکا میں ایک اسامی نکلی تھی۔ خاصی
سوچ بچار کے بعد بی بی قریشی نے اُس ملازمت کے لیے
اپلائی کر دیا۔

یونیورسٹی کے لیے اتنی قابل اور تجربے کار خاتون کی
جانب سے درخواست موصول ہونا ایک حیران کن امر تھا۔
فوراً ہی جواب آ گیا۔ ”ہم آپ کے منتظر ہیں!“
چند روز بعد وہ زمبیا کے مرکزی شہر لوساکا میں تھی جو
اُس کی توقعات کے بالکل برعکس نکلا۔

وہاں کی زندگی پر جمود طاری تھا۔ سیاسی منظر پر
یکسانیت کا غلبہ تھا۔ ایک طرح کی بیزاری تھی۔
لیکچرز، کتب خانے، نورجہاں کی آواز، ڈکنز کے
ناول... کوئی بھی اس بیزاری کو نہیں توڑ سکا۔

اکتاہٹ کے اُن دنوں میں اُسے گھر شدت سے یاد
آنے لگا۔ یہ خواہش پنپنے لگی کہ سب چھوڑ چھاڑ کر اب ایک
سیدھی سادی زندگی گزاری جائے۔

شادی کی تو عمر نکل گئی لیکن بھانجے بھانجیاں تو ہیں،
ان کی شادیاں کروائی جائے۔ بھائی بھابھوں کے ساتھ
وقت پتایا جائے۔ پیشہ ورانہ اوقات کار سے آزاد ہو کر کچھ
سیاحت کی جائے۔

اُن دنوں پاکستان کے ساتھ ساتھ ہندوستان بھی
اسے یاد آنے لگا تھا۔ مراد آباد کا محلہ ڈیرہ، گوگل واس کالج،
علی گڑھ یونیورسٹی۔ دل میں خواہش ہوئی کہ ہندوستان کا
رخ کیا جائے۔

وہ ماضی کی ان حسین یادوں میں گم شب و روز گزار
رہی تھی کہ ایک ہیبت ناک خبر موصول ہوئی... کراچی میں مقیم
چھوٹا بھائی کینسر کے مرض میں مبتلا ہو گیا تھا۔ آہ، وہ ایک دکھ
بھرا لمحہ تھا۔

اس خبر نے سب تلپٹ کر دیا۔ وہ اداس رہنے لگی۔
تنبہائی اُسے گھیرنے لگی۔ تنہائی... جو ایک ظالم ساتھی ہے،
اپنے ہم سفر کو نگل لیتی ہے۔

بی بی قریشی کو بھی تنہائی کا روگ لگ گیا تھا۔ ہر رگ
پھیکا پڑ گیا۔ روشنی اپنا اجلا پن کھو بیٹھی۔ بے خواب راتوں کی
کثرت نے اکتاہٹ بڑھا دی۔ اس پر مستزاد، لوکا سا

یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے بھی نہیں سمجھی، جو اس بات پر
شاک تھی کہ ادارے میں کوئی اُس سے قابل خاتون بھی موجود
ہے۔ ایسی خاتون، جو بین الاقوامی شہرت کی حامل ہے۔

ابتدا میں تو بی بی قریشی نے اُس کے ناروا سلوک کو
اہمیت نہیں دی، مگر جب اُس عورت نے اُس کی قابلیت پر
سوال اٹھایا، وہ غصے سے آگ بگولا ہو گئی۔

وہ رات کائناتوں کے بستر پر گزری۔ جب سورج طلوع
ہوا، وہ ایک بڑا فیصلہ کر چکی تھی۔

چند روز بعد بی بی قریشی نے خاموشی سے زمبیا چھوڑ
دیا۔ یوں اکتا کس کی اس انتہائی باصلاحیت پروفیسر کا
تدریسی کیریئر اختتام کو پہنچا... اور یوں ایک ایسے کا آغاز ہوا۔

☆☆☆

اپنا ملک، اپنی زمین... پر اس کی مٹی کو کیا ہوا۔ اس
کی خوشبو ویسی تو نہیں ہے، جیسی 1950 میں تھی۔
کچھ بدل گیا تھا۔ یا شاید... وہ خود بدل گئی تھی۔

پاکستان آنے کے بعد اُس نے خود کو نئی مصروفیات
میں الجھالیا۔ ایک بھائی کا گھر کراچی میں تھا، ایک کا اسلام
آباد میں۔ خاندان کا ایک حصہ ہندوستان میں مقیم تھا۔
خاصی جمع پونجی تھی اور سیاحت کا شوق۔ تو کبھی وہ اسلام آباد
میں نظر آتی، کبھی ہندوستان پہنچ جاتی۔ مگر زیادہ وقت کراچی
ہی میں گزرتا۔ اس عرصے میں حج کے ارادے سے سعودی
عرب کا بھی رخ کیا۔

بھانجے بھانجیاں، بھتیجے بھتیجیاں، اُن کے بچے۔ محبت
کرنے کی سہولت میسر تھی۔ اور بی بی قریشی کے پاس محبت
تھی، جو وہ بانٹ رہی تھی۔

بین الاقوامی درس گاہوں میں خدمات انجام دینے
والی بی بی قریشی اب ایک گھریلو عورت بن گئی۔

شادی بیاہ کے معاملات میں وہ آگے آگے ہوتی۔
خرچے بھی اٹھاتی۔ تحائف دینے میں پہل کرتی۔ الغرض
ہمیشہ ہاتھ کھلا رکھا۔

مگر ایک شے اُسے پریشان کرنے لگی تھی... وقت،
ظالم وقت! 84-85 میں پاکستان لوٹنے کے بعد اب اُس
کے پاس وقت ہی وقت تھا۔ اُس نے ایک مصروف زندگی
گزاری تھی۔ فراغت سے نہ جتنی نہیں تھی۔

مصروفیات کھوجنے کی اُس نے کوشش کی۔ ابتدا میں
اس میدان میں کامیاب رہی، مگر دحیرے دحیرے حالات
بدلتے گئے۔ ظالم تنہائی... جس کا آسیب پہلی بار زمبیا میں

ظاہر ہوا تھا، اب اپنا وار کرنے کا ارادہ باندھ چکی تھی۔ اور یہ
وار مہلک ثابت ہونے والا تھا۔

☆☆☆

بے شک بی بی قریشی نے خاصی بچت کی تھی، مگر خرچ
کیا جائے تو قارون کا خزانہ بھی ختم ہو جاتا تھا، سو آہستہ
آہستہ جمع پونجی گھٹنے لگی۔ اور جب اُسے ادراک ہو، اُس
وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

اس نے سر پیٹ لیا۔ خود سے کہا۔ ”بی بی قریشی، تو
خود ماہر معاشیات ہے، مگر تو اس بات کا احساس ہی نہیں
کر سکی کہ جو کچھ تو نے کمایا تھا، وہ تیزی سے گھٹ رہا ہے۔“
اُسی موقع پر یہ منحوس سوال سامنے آیا کہ اب بڑھاپے
میں، جب جمع پونجی ختم ہو جائے گی، میرا خیال کون رکھے گا؟

یہ خیال سم قاتل ثابت ہوا۔ اور اُس نے ایک اور کاٹ
دار سوال کو جنم دیا۔ ”کیا میں نے شادی نہ کر کے غلطی کی؟“
اُسے اپنا پھوپھی زاد یاد آیا، جس سے کبھی اس کی منگنی
طے ہوئی تھی۔ چار برس تک وہ منگنی کے بندھن میں بندھی
رہی۔ پھوپھی زاد انتظار کرتا رہا، مگر جب دوبارہ شادی کے
معاملے نے زور پکڑا، اُس نے آگے پڑھنے کا ارادہ ظاہر
کرتے ہوئے یہ قصہ ہی ختم کر دیا۔ پھوپھی زاد سے کہہ
دیا، ”آپ کسی اور سے شادی کر لیجیے!“

تنہائی کے اُن ہی دنوں میں اُسے لندن یاد آیا، جہاں
کئی طلبائے اُسے رشتے کی پیشکش کی تھی۔ گھانا کے زمانے
میں بھی کئی بڑھے لکھے، خاندانی افراد نے اس خواہش کا
اظہار کیا تھا، مگر اُس نے ایک ہی جواب دیا۔ ”اگر کسی
انسان کو اپنی آزادی ختم کرنی ہو، تو شادی کر لے!“

ماضی کی یادوں نے امراض میں گھری اس بوڑھی
عورت کو اداس کر دیا۔

”کیا شادی نہ کرنے کا فیصلہ درست تھا؟“ دل سے
سوال کیا۔ جواب نداد!

☆☆☆

تنہائی کا پہلا ادارا
دل میں یہ خیال پنپنے لگا کہ رشتے دار دولت کی وجہ
سے اُس کے ناز اٹھاتے ہیں۔ چند ہی روز میں اس خیال
نے جڑ پکڑ لی۔ شک بھی ساتھ ہی چلا آیا، جس کی آمیزش
نے تنہائی کو مزید مہلک بنا دیا۔ اب محفل میں ہوتے ہوئے
بھی اکیلے پن کا احساس ہوتا۔ محبت کرنے والوں کی
موجودگی میں دکھ ستاتا۔

تفکرات نے صحت پر بھی منفی اثرات مرتب کیے۔ نظر تو پہلے ہی کمزور تھی۔ مگر اب سماعت بھی پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ اونچا سنا کی دیتا تھا۔ دھان یاں تو تھی۔ اب مزید وزن گر گیا۔ ہڈیوں کا ڈھانچا نظر آنے لگی۔

امراض کے حملوں نے اُسے چڑا بنا دیا۔ وہ گھر والوں سے کھینچی کھینچی رہنے لگی۔ ماضی کی یادیں بے رنگ ہو گئیں اور زندگی میں زہر گھلنے لگا۔

☆☆☆

جس نے شہر کا احاطہ کر رکھا تھا۔ سڑکیں دھول سے اٹی تھیں۔ درخت نیچے ہوئے تھے۔ پرندوں کی پرواز ٹھکن کی عکاس تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے ہر شخص تنہائی کا شکار ہے۔ وہ کمرے کی کھڑی میں کھڑی تھی جس کے باہر گرم دھوپ بچے گاڑے بیٹھی تھی۔

تفکرات چہرے سے عیاں تھے۔ یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ آزاد شہری کی حیثیت سے پیدا ہونے والی، بھرپور زندگی گزارنے والی عورت اب ایک کمرے میں قید ہے۔ گھر سے باہر قدم رکھنے کے لیے دوسروں کی محتاج ہے۔

اُس نے گہرا سانس لیا۔ پردہ کھینچ دیا۔ اور پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔ میز پر آج کا اخبار پڑا تھا۔ کچھ دیر پہلے نتیجے نے اخبار کی سرخیاں پڑھ کر سناٹی تھیں جوئل و غارت گری، دھماکوں اور المیوں کی داستان سن رہی تھیں۔

ملک کے بگڑتے ہوئے حالات نے اسے مغموم کر دیا۔ ”اس ملک کے شہری اپنی آزادی کی قدر کیوں نہیں کرتے؟“ اس نے خود سے سوال کیا۔ ”کیا وہ نہیں جانتے کہ اس کے لیے کتنی قربانیاں دی گئیں۔ آہ، حب الوطنی کا جذبہ کہاں گیا؟“

ذہن کے پردے پر فلم سی چل رہی تھی۔ تحریک پاکستان کا زمانہ۔ حصول علم کا جذبہ۔ والد کی حوصلہ افزائی۔ چندہ جمع کرنے کی مہم۔ قائد اعظم سے ملاقات۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے دن۔ پی ایچ ڈی کی ڈگری وصول کرنا۔ تدریس سے جڑے حسین لمحات... اچانک اندھیرا چھا گیا۔

اُس نے آنکھیں ملیں۔ اندھیرا قائم رہا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ کھڑکی پر پڑے پردے پر روشنی کا عکس تھا۔ ”شاید لائٹ چلی گئی۔“ اس نے خود سے کہا۔ اچانک کھٹکا ہوا۔ ملازمہ کمرے میں داخل ہوئی۔ ”اف، کتنا اندھیرا ہے۔ کھڑکی سے پردے تو ہٹا

دیتیں۔“ یہ کہتے ہوئے اُس نے پردہ ہٹا دیا۔ کمرے میں چمکتی ہوئی دھوپ در آئی۔

”بی بی جی، آپ کیا کھائیں گی؟“ بتادیں۔“ ملازمہ کے لہجے میں خفیف سی بیزاری تھی۔

”ارے بیٹا مجھ سے کیا پوچھتی ہو۔ زندگی کا بڑا حصہ ہوٹل میں گزارا، اچھے کھانوں کا ذائقہ ذہن سے اتر گیا۔ بس سادہ کھانا مل جائے، یہی کافی...“

دھڑ سے دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ ملازمہ جا چکی تھی۔

دل میں درد کی لہر اٹھی۔ اس نے ایک سرد آہ بھری اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

ماضی پھر آنکھوں کے سامنے تھا۔ کچھ عرصے قبل اُس نے کراچی میں ایک فلیٹ خریدا تھا۔ پھر رشتے داروں کے مشورے پر اسے فروخت کر دیا۔ ساری رقم کاروبار میں لگا دی، یہ سوچ کر کہ منافع ہوتا رہے گا، مگر یہ کھانے کا سودا ثابت ہوا۔ رقم ڈوب گئی۔

”اب میں دوسروں کے رحم و کرم پر ہوں۔ دینے والا ہاتھ، لینے پر مجبور ہے۔“ یہ احساس رعب اور دبدبے کے ساتھ زندگی گزارنے والی اُس عورت کے لیے اذیت ناک تھا۔

اکٹائے ہوئے ماہ و سال گزرتے رہے۔ اب اُسے زندگی بے مصرف معلوم ہونے لگی تھی۔ وہ خود کو رشتے داروں پر بوجھ تصور کرنے لگی تھی۔ دل کا موسم تبدیل ہو گیا تھا۔

تنہائی کا آسیب، بڑھتی عمر کے ساتھ قوی ہوتا جا رہا تھا!

☆☆☆

2008ء، اسلام آباد۔

گھر میں کھرام مچا ہوا تھا۔ چہروں پر پریشانی تھی۔ اندیشے فیضا میں تیر رہے تھے... بی بی قریشی گزشتہ کئی گھنٹوں سے لاپتہ تھی۔

اُس روز بہن بھائی سیاست کے موضوع بات کر رہے تھے۔ بات بڑھتے بڑھتے بحث کی شکل اختیار کر گئی۔ بی بی قریشی ناراض ہو گئی اور اٹھ کر کمرے میں چلی گئی۔

سب کا یہی خیال تھا کہ یہ ناراضی عارضی ہے، مگر ایسا نہیں ہوا۔ بحث کے چند گھنٹے بعد 87 سالہ بی بی قریشی نے خاموشی سے گھر چھوڑ دیا۔

اہل خانہ کے لیے وہ لمحات عذاب ناک تھے۔ فوراً ہی تلاش شروع ہو گئی۔ دیگر رشتے داروں کو فون کیا گیا۔ کئی

گھنٹوں تک اسلام آباد کی سڑکیں کھنگالی گئیں، ریلوے اسٹیشن کا رخ کیا گیا، لیکن یہ کوششیں ثمر آور ثابت نہیں ہوئیں۔

جب گمشدگی کو خاصا وقت بیت گیا، تو یہ اندیشہ سر اٹھانے لگا کہ کہیں وہ کسی حادثے کا شکار نہیں ہو گئی۔ گھر میں رونا پینا مچ گیا۔

چند روز بعد پتا چلا کہ جس دن بی بی قریشی لاپتہ ہوئی تھی، اُس روز ایک ضعیف المعر عورت قریشی اسٹیشن سے کراچی جانے والی ٹرین میں سوار ہوئی تھی۔ اس اطلاع نے مایوس رشتے داروں میں نئی روح پھونک دی۔ پھر تلاش شروع ہوئی۔ اس بار مرکز کراچی تھا، مگر دو کروڑ کی آبادی والے اُس شہر میں کسی کو ڈھونڈنا تقریباً ناممکن تھا۔ یہ بھوسے میں سوئی تلاش کرنے کے مترادف تھا۔

خیر، پولیس سے رجوع کیا گیا۔ فلاحی تنظیموں کے دفاتر کھنگالے گئے۔ اخبار میں اشتہار دیا گیا، مگر ہر کوشش رائیگاں گئی۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا، گھر والوں کی مایوسی بڑھتی گئی۔ اب دعا ہی واحد سہارا تھا۔

چار ماہ بعد، جب ہر امید دم توڑ چکی تھی، اچانک اہل خانہ کو ایدھی سینٹر سے ایک فون کال موصول ہوئی جس نے انہیں بیک وقت حیرت اور مسرت سے دوچار کر دیا۔

فون کی دوسری طرف بی بی قریشی تھی، جو نام بدل کر ایدھی سینٹر میں رہ رہی تھی۔

کسی ایسے عزیز کی آواز سننا، جس کی زندگی کے تعلق سے آپ مایوس ہو چکے ہوں، ایک عجیب و غریب تجربہ ہوتا ہے۔ گھر والے دوڑے دوڑے گئے اور اُسے لے آئے۔ کسی نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ انہیں ڈر تھا کہ وہ پھر نہ روٹھ جائے۔ کچھ ایسا دیکھا کہ بیٹھے۔

☆☆☆

ایدھی سینٹر سے واپسی کے بعد وہ جب رہنے لگی تھی۔ گوکہ اس کا خیال رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی، لیکن وہ تنہائی کے حصار سے باہر نہیں آسکی۔

ایدھی سینٹر میں گزرے چار ماہ نے اس پر عجیب اثرات مرتب کیے تھے۔ وہاں اس نے بے گھر اور تنہائی کی شکار ہو چھی خواتین کے کرب کا قریب سے مشاہدہ کیا۔ اُن کا غم اُسے اپنے دکھ کے قریب معلوم ہوا۔ یوں لگنے لگا کہ اُس کی اصل جگہ وہیں ہے، اپنی جیسی تنہا اور بے گھر خواتین کے درمیان۔

وہ گھر کے ماحول سے ہم آہنگ نہیں ہو پائی۔ ذہن پر بے رنگ ماضی سوار تھا۔ وہ زود رخ ہو گئی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناراض ہو جاتی۔ خود کو کمرے تک محدود کر لیتی۔ جہاں سچ یا دیں منتظر ہوتیں، جن کی یلغار اُسے تاریک گھاٹی میں لے جاتی۔

خاموشی کے وقفوں میں جب وہ اپنے فیصلوں کا تنقیدی جائزہ لینا شروع کرتی، تو تنہائی کا عفریت پاس آن بیٹھتا۔ کانوں میں سرگوشیوں کرتا تھا کہ اُس کی زندگی کا ہر فیصلہ غلط تھا کہ وہ ہار چکی ہے۔

آخر کار تنہائی کے عفریت نے اُسے ایک انتہائی اقدام کے لیے تیار کر لیا!

☆☆☆

ایک ضعیف المعر عورت ایدھی سینٹر میں داخل ہوئی۔ استقبال پر پہنچ کر اس نے کھٹکھار کر گلا صاف کیا۔

”میں ایک بے گھر عورت ہوں۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔ ”میرے پاس رہنے کے لیے کوئی جگہ نہیں۔“

استقبال پر بیٹھی عورت نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ایک منحنی سی عورت سامنے کھڑی تھی۔ چہروں پر جھریاں، آنکھوں پر موٹے شیشے کا چشمہ۔

”آپ کا نام؟“ اُس نے سوال کیا۔

”ڈاکٹر بی بی قریشی!“ اس نے دھیرے سے کہا۔

وہ ایک بار پھر گھر چھوڑ چکی تھی... ایک بار پھر رشتے داروں کے چہروں پر اندیشے تھے۔ ایک بار پھر اُسے تلاش کیا جا رہا تھا۔

خوش قسمتی سے ماضی کے برعکس اسے جلد ہی کھوج لیا گیا۔ چند ہی روز بعد گھر والے پہنچ گئے۔ منا کر، سمجھا بکھا اسے واپس لے آئے۔

وہ گھر تو آگئی، لیکن روح کہیں پیچھے رہ گئی۔ وہ انہوں سے کٹ گئی تھی۔ اکٹاہٹ حاوی ہو چکی تھی۔

اسی اکٹاہٹ نے 2011 کے وسط میں ایک بار پھر ایدھی سینٹر کا رخ کرنے کی تحریک دی۔ گھر والوں سے ضد کرنے لگی کہ وہ اُسے سینٹر چھوڑ دیں، ورنہ وہ خود چلی جائے گی۔

اہل خانہ نے بہت سمجھایا، مگر وہ ایک نہیں مانی۔ بالآخر اس شرط پر کہ وہ چند روز بعد لوٹ آئے گی، اُسے ایدھی سینٹر چھوڑ دیا گیا، جہاں اُس نے خود کو اپنی جیسی دکھوں کی ماری خواتین کے درمیان پایا۔

اس کی زندگی میں کوئی پراسراریت نہیں تھی، البتہ موت پراسرار حالت میں ضرور ہوئی۔ وہ آزاد زندگی گزارنے کا قائل تھا۔ پیٹ بھر کر شراب پینا، کلبوں میں رقص کرنا اور ملکوں ملکوں کی سیر کرنا اس کا شیوہ تھا۔ اس کے پاس پیرس چلیں۔ پیرس اس کے خوابوں کی جنت تھی۔ اسی لیے چونکہ ذاتی جیٹ طیارہ تھا، اس لیے نقل و حرکت کرتے ہوئے اسے کوئی وقت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ جب بھی تفریح کرنے اور شا میں رنگین کرنے کو دل چلتا تو وہ اپنی بیوی سے کہتا کہ آؤ پیرس چلیں۔ پیرس اس کے خوابوں کی جنت تھی۔ اسی لیے

نصیب خفتہ

شکیل صدیقی

اس کا شمار عالمی پیمانے پر مشہور ناول نگاروں میں ہوتا تھا، اس نے جو کچھ لکھا وہ سونے کے بھاٹو بکا۔ دولت اس کے گھر کی لونڈی بن چکی تھی۔ عالم یہ تھا کہ وہ صبح ایک شہر میں ناشتہ کرتا تو دوپہر کا کھانا کسی دوسرے ملک کے تفریحی مرکز میں۔ عیش و عشرت میں اس کا ثانی نہیں تھا لیکن جب مرا تو سکندر کی طرح اس کے بھی دونوں ہاتھ خالی تھے۔

ایک بد نصیب مصنف کی خوش نصیبی کا قصہ



نہیں ملنا چاہتی۔
”مرنے کے بعد انہیں میرا چہرہ نہیں دیکھنا دیا جائے!“
☆☆☆

☆ 14 اگست 2012

آنکھوں کے سامنے سبز ہلالی پرچم تھا۔ سماعتوں میں نعرے گونج رہے تھے۔ ”لے کر رہیں گے پاکستان، بٹ کے رہے گا ہندوستان... قائد اعظم زندہ باد، پاکستان تابندہ باد!“
فرط جذبات سے دھڑکن تیز ہوئی۔ آنکھوں میں نمی تیر گئی۔

”کیا ہوا بہن، تم ٹھیک تو ہو؟“ ایک عورت نے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ اُس کے چہرے پر اندیشے تھے۔
”ہاں، ٹھیک ہوں۔“ اُس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”بس، اپنے رب کا شکر ادا کر رہی ہوں کہ اُس نے ہمیں آزادی جیسی نعمت دی۔ تم جانتی ہو...“ اُس نے ہاتھ پکڑ کر عورت کو پہلو میں بٹھالیا۔ ”14 اگست ہی کے روز ہمیں آزادی ملی تھی۔ وہ رمضان المبارک کا مہینا تھا۔ ستائیسویں شب تھی... آہ، اُس روز میں کتنی خوش تھی۔“

”سبحان اللہ!“ عورت کے منہ سے بے اختیار نکلا۔
”اس بار بھی چودہ اگست رمضان ہی میں آئی ہے۔“
”ہاں سچ کہتی ہو۔“ بی بی قریشی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ”کتنا بابرکت دن ہے یہ۔“
عورت اٹھ کر چلی گئی۔ بی بی قریشی یونہی بیٹھی رہی۔ خیالات میں گم۔ خاموش۔ اُس کے دل میں ایک دعا تھی۔ ایک معصوم دعا۔

اور جونہی دعا لیوں پر آئی، قدرت مسکرائی کہ وہ قبولیت کا لمحہ تھا۔ اُس رات کا انتخاب کر لیا گیا تھا۔
بتیاں بچھا دی گئیں۔ بی بی قریشی خاموشی سے اپنے بستر پر آگئی۔ جہاں پر سکون نیند منتظر تھی۔
چند لمحوں بعد وہ نیند کی آغوش میں تھی۔ سبز ہلالی پرچم پہلو میں رکھا تھا۔

وہ رمضان کا مبارک مہینا تھا، 14 اگست کی بابرکت رات تھی اور لوٹنے کا وقت آن پہنچا تھا۔

سحری میں اٹھنے والوں نے محسوس کیا کہ سینٹر میں ایک پاکیزہ خوشبو پھیلی ہے۔
وہ جا چکی تھی!!

اُن ہی دنوں ایک صحافی کا ایڈیٹر سینٹر جانا ہوا جہاں ایک بوڑھی عورت فر فر انگریزی بول رہی تھی۔
جب بات چیت شروع کی تو یہ انکشاف ہوا کہ وہ خاتون نہ صرف بی ایچ ڈی ہے، بلکہ کئی بیرونی درس گاہوں میں تدریسی فرائض انجام دے چکی ہے۔

اگلے دن یہ اسٹوری اخبار کی زینت بن گئی اور اہل کراچی کو ایک حیرت نے آلیا۔ حکومتی شخصیات بھی اس جانب متوجہ ہوئیں۔ کہانی کی مزید پرتیں کھلیں۔ پتا چلا، ایڈیٹر سینٹر میں مقیم یہ عورت کوئی عنان کی استاد رہ چکی ہے، تحریک پاکستان کی کارکن ہے۔ کئی ملکوں کے دورے کر چکی ہے۔
بی بی قریشی کی گورنر سندھ ڈاکٹر عشرت العباد سے ملاقات کا اہتمام کیا گیا۔

اُسے گورنر ہاؤس میں قیام کی پیشکش کی گئی، مگر اُس نے معذرت کر لی۔
”آپ کا شکریہ۔ مگر میرے لیے ایڈیٹر سینٹر کا ایک بستر کافی ہے۔“ اُس نے کہا۔ ”وہاں میرا بہت اچھی طرح خیال رکھا جا رہا ہے۔“
اگلے چند روز میں بی بی قریشی کی ادھوری کہانی مکمل ہو گئی۔

وہ اخبارات اور ٹی وی چینلوں کا مرکز بنی رہی۔ میڈیا کی توجہ کے طفیل جہاں برسوں گم نامی کی زندگی گزارنے والی اس عظیم عورت کو شناخت ملی، شہرت ملی، وہیں اُس کے خاندان پر انگلیاں اٹھنے لگیں۔ اُن پر تنقید کی جانے لگی۔
یہ صورت حال اہل خانہ کے لیے انتہائی پریشان کن تھی۔ وہ دوڑے دوڑے گئے اور اُسے گھر لے آئے۔ اس بار بھانجے کے گھر قیام کا بندوبست کیا گیا۔

اگلے چند ماہ خاموشی سے گزرے، مگر 2012 کے اوائل میں بی بی قریشی پھر اُوب گئی۔ اسے ایڈیٹر سینٹر کی یاد آنے لگی۔ بوڑھی، دکھی عورتیں یاد آنے لگیں۔

”میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔“ اُس نے ضد شروع کر دی۔ ”اب میرا تمہارے ساتھ رہنا ممکن نہیں۔“
گھر والوں نے سمجھانے کی کوشش کی، لیکن اُس کی ضد سے جیتنا مشکل تھا۔

”مجھے جانے دو۔ میں اکتا چکی ہوں۔“

ایک بار پھر وہ ایڈیٹر سینٹر میں گئی۔ اور یہ عزم لے کر آئی تھی کہ اب وہ گھر واپس نہیں جائے گی۔ اُس نے سینٹر کی انتظامیہ سے بھی یہ کہہ دیا تھا کہ اب وہ اپنے گھر والوں سے



اس نے کئی ناول پیرس کے پس منظر میں لکھے۔ اس کے علاوہ وہ شہروں شہر گھومتا پھرتا تھا۔ اس کے مختلف ریاستوں میں ذاتی مکانات تھے۔ مثال کے طور پر لاگ آئی لینڈ میں اس کا فارم تھا (دو سو برس قدیم) اپنی شاموں میں رنگ آمیزی کرنے اور یار دوستوں کے ساتھ وقت گزارنے کے لیے اس نے ایک کلب بھی بنایا لیا تھا۔ مشہور زمانہ اداکار یال نیوین اس کا پڑوسی تھا، جس سے اس کی اچھی شناسائی تھی۔ اس کے مکان کے دروازے ادیبوں اور فکشن رائٹروں کے لیے ہمہ وقت کھلے رہتے تھے۔ وہ ادب اور فکشن پر بات کرتے تھے تو اس کے ذہن کو زرخیزی حاصل ہوتی تھی۔ پھر جب اس کے ذہن میں بننے والا پلاٹ مکمل تفصیل پا جاتا تو وہ اسے صفحہ قرطاس پر منتقل کر دیتا۔ اس طرح سے ایک نیا ناول وجود میں آ جاتا اور کئی ماہ تک بیسٹ سیلرٹ پر رہتا۔

فلوریڈا کے علاوہ اس کا ایک مکان نیپلز میں تھا جس کی کھڑکیاں گلف آف میکسیکو کی طرف کھلتی تھیں۔

جب اس نے گریجویٹیشن کر لیا تو میری ریدو کا سے شادی کر لی جو اداکارہ تھی۔ وہ ایک تعلیم یافتہ، سمجھ دار اور سکھڑ مزاج تھی۔ گفتگو کرنے کا سلیقہ رکھتی تھی اور زندگی کیسے گزاری جاتی ہے، یہ اسے پتا تھا۔ میری نے اس کی زندگی میں حسن ترتیب اور ہمواری پیدا کر دی۔ وہ نشست و برخاست کے آداب سے آگاہ تھی۔ یہ سب اوصاف اس نے اپنے شوہر میں بھی رچا بسا دیے۔ اس بے ہنگم اور بد وضع شخص کو اس نے تراش خراش کر ہیرا بنا دیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ اس کے ناولوں کو ایڈٹ بھی کیا کرتی تھی، انہیں تراش خراش کر کے اشاعت کے قابل بنا دیا کرتی تھی۔ میری سے شادی کرنے کے نتیجے میں اس کے تین بچے ہوئے۔

بھاری چہرے والا ناول نگار ہمہ وقت متحرک اور رواں زندگی گزارنے کا قائل تھا۔ اس وقت وہ گم صم اور ساکت ہو گیا جب اس کی بیوی میری کو سرطان ہو گیا۔ اس نے ہر اچھے اسپتال میں اس کا علاج کرایا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا اور میری 11 نومبر 1996ء کو آنجمانی ہو گئی۔ وہ بے سہارا اور تنہا رہ گیا۔ اس کے دل کو ایک لمحہ بھی قرار نہیں تھا۔ وہ کسی کی باتوں کا متلاشی تھا۔ کسی شائے کی تلاش میں تھا جس پر وہ سر رکھ کر دنیا کے سارے غموں کو فراموش کر سکے۔ ایسے میں اس کی ملاقات کیرین ڈیون سے ایک کلب میں ہوئی۔ اس عورت کی آنکھوں میں نہ جانے کیا بات تھی

کہ وہ اس کے سحر میں گرفتار ہو گیا۔ کیرین حالانکہ تین بار کی شادی شدہ تھی اور شوہر تبدیل کرنا غالباً اس کا شغف تھا۔ وہ میری کا عشر عشر بھی نہیں تھی۔ اس کے بھی خواہوں نے اسے کیرین سے شادی کرنے کو منع کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ ایک لاپچی عورت ہے۔ وہ اس کا دل تو نہیں بہلا سکے گی، البتہ اسے تلاش ضرور کر دے گی۔

اس کے وکیلوں نے کیرین سے کہا کہ اگر وہ ناول نگار سے شادی کرنا چاہے تو اسے چند شرائط تسلیم کرنا ہوں گی اور ایک فارم پُر کرنا پڑے گا۔ کیرین نے اس سے انکار کیا اور کہا کہ وہ شادی کرنے کے لیے بے قرار و مضطرب نہیں ہے، اس لیے کسی معاہدے کو ماننے سے انکار کرتی ہے۔ جب کہ ناول نگار ایک قد آور شخصیت کا مالک تھا اور شہرت و عزت اس کے قدموں کی باندیاں تھیں۔ اس کے باوجود اس نے 7 مارچ 1997ء کو فلوریڈا کے ایک چرچ میں بغیر کسی معاہدے کے شادی کی رسومات پوری کر دیں اور کیرین کا ہو کر رہنا منظور کر لیا۔ پھر انہوں نے فلوریڈا ہی میں ہنسے کو ترجیح دی۔ کلب کو انہوں نے فروخت کر دیا۔

ابھی شادی کے معاہدے (نکاح نامے) کی سیاہی خشک بھی نہیں ہوئی تھی کہ کیرین نے اپنا روپ دکھانا شروع کر دیا۔ شادی سے پیشتر ان کے جذبات کچھ بھی رہے ہوں مگر شادی کے بعد محبت کے شہد کی مٹھاس پھینکی پڑنے لگی۔ کیرین نے علیحدہ خواب گاہ میں سونا شروع کر دیا۔ وہ شوہر کو کتنا چاہتی تھی، یہ خود اس کے شوہر کو بھی پتا نہیں تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے اپنے شوہر کو اس کے دوستوں اور عزیزو اقارب سے علیحدہ کرنا شروع کر دیا۔ اس کے رویے سے جھلکتا تھا کہ وہ لاپچی اور خود غرض ہے۔ اسی اثنا میں اس نے اپنی شادی کی انگلی کا سودا کر ڈالا، حالانکہ شوہر نے اسے جو انگلی دی تھی وہ کافی قیمتی تھی، لیکن کیرین نے اسے فروخت کر ڈالا اور دوسری انگلی خریدی جس میں بڑا سا ہیرا لگا ہوا تھا۔ شوہر کی بیٹی گلائنس سے اس کی نہیں بنتی تھی، اس لیے کہ وہ اسے سر عام ایک ایسی عورت سے تشبیہ دیتی تھی جو انسان کی آنکھ کا کامل نکال لیتی ہے اور جسے کسی کان کن کی طرح صرف سونا کھودنے سے دلچسپی ہوتی ہے۔

وہ ایک بار پھر تنہائی کا شکار ہو گیا۔ اس نے میری کی یادوں کو فراموش کرنے کے لیے ہی کیرین کی زلفوں کا سہارا لیا تھا لیکن زمین ایک بار پھر اس کے قدموں تلے سے نکل گئی اور وہ خود کو خلا میں محسوس کرنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا

سب کچھ ٹٹ چکا ہے۔ اس کا دل خالی خالی سا ہو گیا ہے۔ اس کے گرد اجنبی چہرے تھے اور نا آشنا ماحول۔ وہ ہجوم میں رہتے ہوئے بھی تنہا تھا۔

اس اثنا میں کیرین نے واقف کاروں سے شکایت کرنا شروع کر دی کہ اگر اس کا شوہرا چانک کسی دن آنجمانی ہو گیا تو وہ کہیں کی نہ رہے گی۔ اس کے قدموں تلے سے سب کچھ نکل جائے گا۔ اس کا کوئی پُرسانہ حال تک نہ ہوگا۔ غالباً وہ فلوریڈا کے اس قانون سے ناواقف تھی کہ اگر شادی سے پیشتر کوئی معاہدہ نہیں ہوا ہے تب بھی اسے اپنے شوہر کی جائداد سے ایک بڑا حصہ ملے گا۔ اب اس نے اپنی حد سے زیادہ ہڑپ کرنے کے چکر میں شوہر پر زور ڈالنا شروع کر دیا کہ وہ اپنی وصیت میں تبدیلی کرے اور اسے اپنی دولت کا مالک بنادے۔

مرتے وقت اس نے کیرین کے نام ساڑھے تین کروڑ ڈالر کی جائداد کر دی جو نیپلز کے ایک مکان کی صورت میں تھی۔ اس کے علاوہ موشانا کی کچھ جائداد اور مجموعی طور پر دس لاکھ ڈالر۔ اس کے علاوہ اسے فلموں سے ملنے والی رقم تقریباً ایک ارب ڈالر تھی۔ اگر باقاعدہ حساب کیا جائے تو اس کی دولت اس سے زیادہ نکلتی گی۔ اس لیے کہ اس کے ناول مسلسل فروخت ہوتے رہے اور فلموں کی ویڈیوز بکتی رہیں۔

اس کی موت پر اسرار حالات میں ہوئی۔ کیرین سے شادی کے چوتھے برس ایک دن جب وہ اپنے فلوریڈا والے مکان میں بیٹھا تھا کہ آگ لگ گئی۔ جب آگ بجھانے والے اس کے مکان پر پہنچے تو انہوں نے اسے ایک کرسی پر نیم دراز حالت میں پایا۔ وہ چیخ رہا تھا، کمرے میں دھواں ہی دھواں بھرا ہوا تھا۔ 1994ء میں اس کا بانی پاس آپریشن ہوا تھا اور اس کی ٹانگوں کے جوڑوں میں درد بھی ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ آتش زدہ کمرے سے نکل نہیں سکا۔ اس کی بیوی اور ایک نرس اس مکان کے دوسرے کمرے میں تھیں، مگر وہ اس کی جان بچانے کے لیے نہیں آئیں۔۔۔۔۔ حالانکہ مکان میں آگ بجھانے کے آلات بھی جا بجا لگے ہوئے تھے۔ ان سے آگ بجھائی جاسکتی تھی۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس کمرے میں آگ تھی اور اس کے کپڑے جل رہے تھے۔ آگ بجھانے والا عملہ جب باورچی خانے کی طرف گیا تو اس نے کیرین کو ایک جام تیار کرتے دیکھا۔ اسے آگ کے بارے میں بتایا گیا تو اس نے معصومیت سے کہا کہ اس کے کانوں تک شوہر کی چیخیں نہیں

آکسفورڈ یونیورسٹی

آکسفورڈ دریائے آکس کے کنارے

انگلستان کا مشہور شہر ہے۔ اس کے معنی دریائے آکس کا گھاٹ کے ہیں، اس جگہ انگلستان کا مشہور اور قدیم ترین دارالعلوم واقع ہے۔ اس کی بنیاد قدیم زمانے میں رکھی گئی تھی، لیکن منظم تدریس کا آغاز 1133ء سے ہوا جب پیرس کے رابرٹ پولین نے یہاں تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ اس نے یونیورسٹی کی صورت 1163ء میں اختیار کی۔ اس میں پینتیس کالج ہیں جن کی اقامت گاہیں بھی ہیں۔ لیکن تدریس تمام کالجوں کے مشترکہ لیکچروں کی صورت میں ہوتی ہے اور کالجوں کے ٹیوٹر اپنی اپنی اقامت گاہوں پر بھی طلبہ کی تعلیمی رہنمائی کرتے ہیں۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کی شہرہ آفاق بوڈیلین لائبریری 1595ء میں قائم ہوئی جسے دنیا بھر کی سب سے بڑی لائبریری کہا جاتا ہے۔ اس کی مزید توسیع 1946ء میں جدید بوڈیلین لائبریری کی شکل میں ہوئی، جس میں پچاس لاکھ کتابوں کی گنجائش رکھی گئی۔ اس کا نام سر تھامس ہاڈلے 1545-1613ء کے نام پر رکھا گیا۔

مرسلہ: ہدایت علی ملک، نوشہرہ

آکنٹلیک، فیلڈ مارشل سر کلاڈ

1884ء - 1981ء برطانوی فوجی افسر۔

فوجی زندگی کے طویل تجربے کے بعد 1933ء تا 1936ء ہندوستان کے شمال مغربی سرحدی صوبے میں کمانڈنگ افسر رہا۔ دوسری جنگ عظیم میں جولائی 1941ء میں جنرل آرچی بالڈ کی جگہ مشرق وسطیٰ کی اتحادی فوجوں کی کمان اس کے سپرد کی گئی۔ نومبر 1941ء میں لیبیا میں جنگ لڑی۔ جنوری 1942ء میں مصر میں اتحادی فوجوں کا کمانڈر مقرر ہوا۔ جون 1943ء میں ہندوستان کا کمانڈر انچیف بنایا گیا اور 1946ء میں فیلڈ مارشل۔

مرسلہ: نعمان اشرف، لاہور

پہنچی تھیں، اس لیے وہ آگ سے لاعلم رہی۔ اسے کوئی شعلہ بھڑکتا نظر نہیں آیا۔ سوختہ جاں کی حالت نازک معلوم ہوتی تھی۔ تاہم جب ایمبولینس آئی اور اسے اسپتال لے جایا جانے لگا تو اس کی بیوی نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ قیاس لگانے والوں کا کہنا ہے:

جب آگ لگی (یا لگانی گئی) تو وہ گھر سے نکل گئی۔ پھر جب فائر بریگیڈ کا عملہ آگیا تو وہ بھی کسی خفیہ راستے سے اندر آگئی اور کچن میں چلی گئی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس آگ کے بارے میں پولیس میں کوئی رپورٹ نہیں لکھوائی گئی اور نہ اس کی خبر اخبارات کی زینت بنی۔ یہ بات صرف چند نزدیکی لوگوں کو ہی معلوم ہے۔ اس سے ملتا جلتا کوئی واقعہ آج کے دور میں ہوا ہوتا تو سوئی کا بھالا بجتے دیر نہ لگتی۔

پہلی بیوی میری کا بیٹا جو نائن ان میڑھے میڑھے اور پڑچیدہ واقعات سے مضطرب و بے چین تھا۔ اس نے اپنے والد کی سوانح حیات لکھنے والوں کو بتایا کہ اس کا خیال ہے کہ آگ لگنے کے بعد فوری طور پر نہیں بھڑک سکتی تھی، لہذا اس پر کوئی ایسا محلول ڈالا گیا ہے جس سے وہ فوری طور پر بھڑک گئی اور اس نے پورے کمرے کو اپنی پلیٹ میں لے لیا۔ ناول نگار کے دوستوں اور رشتے داروں کو کیرین کی وفاداری پر شبہ تھا، اس لیے کہ وہ اسپتال میں اپنے شوہر کو دیکھنے اور اس کی خیریت پوچھنے بھی نہیں گئی تھی۔

سوختہ جاں ناول نگار جب اسپتال سے گھر آگیا تو بھی اس کی اذیت اور کرب کم نہیں ہوا۔ اسے خود کو نہ سکون رکھنے کے لیے مارفین لینا پڑتی تھی۔ پھر جب وہ مکمل طور پر صحت یاب ہو گیا تو اس نے اپنی وصیت تبدیل کر دی اور تقریباً ساری دولت کیرین کے نام کر دی۔ یہ وصیت اس نے اپنی موت سے صرف سولہ روز پیشتر لکھی تھی۔

کیرین کو اس سے کتنی محبت تھی اور اس کے دل کے نہاں خانے میں شوہر کس انداز سے بسا ہوا تھا، یہ تو کسی کو نہیں معلوم، البتہ اتنا سب کو معلوم ہے کہ شوہر کی موت کے ایک ہفتے بعد ہی اس نے وکیل کو فون کیا اور گونج دار آواز میں کہا کہ اس کے شوہر کا ترکہ اسے کب ملے گا؟ اور ہاں وہ 40 لاکھ ڈالر کیا ہوئے جو اسے فوری ملنے والے تھے؟

ایک خیال ہے کہ اس کی موت دل کا دورہ پڑنے سے ہوئی تھی، ایسی صورت میں اس کا پوسٹ مارٹم کرانا ضروری تھا لیکن اس کا پوسٹ مارٹم کرانے کی کسی نے زحمت گوارا نہیں کی۔ اس سے پہلے کہ ڈاکٹر اس کا طبی معائنہ کرتا اسے

دفن کر کے قبر کو سینٹ سے پختہ کر دیا گیا۔ اس کی موت کا سبب کیا تھا، فلوریڈا کی حکومتی سطح پر اس کا اعلان نہیں ہوا۔ بہر حال معاملے سے پڑاسرایت ظاہر ہوتی ہے، اس لیے کہ اس کے بچے کے کہنے کے مطابق اپنی موت سے سترہ روز پیشتر وہ فسی بول رہا تھا اور کسی بیماری کی کوئی علامت دور دور تک نہیں تھی۔ وہ آگ لگنے والے واقعہ کے ایک ماہ بعد ہی اس جہان فانی سے کوچ کر گیا تھا۔ اگر اس کے خلاف کوئی سازش کی گئی تھی تو اس کا پتا نہیں تھا، لیکن پولیس کے محکمے کے بعض افسران دلی زبان سے اس بارے میں کہتے سنائی دیتے ہیں۔ اس کے بچے نے بتایا کہ بچانے اپنی موت سے پیشتر اس کا شبہ ظاہر کر دیا تھا کہ ممکن ہے اس کی موت قدرتی طور پر نہ ہو، چنانچہ اس کے بچے نے چچا کی موت کے بعد مونٹانا کے شرف سے درخواست کی کہ اس کے چچا کی موت کی تحقیق کی جائے۔ سارے حالات بے حد پڑاسرا اور تشکیک کی دھند میں لپٹے ہوئے ہیں۔ جب کیرین کے لیے وصیت دوسری بار لکھی گئی تو اس کے اثاثوں کا تخمینہ نہیں لگایا گیا تھا اس کے باوجود کیرین کو تقریباً ایک کروڑ ڈالر کی رقم مل گئی۔ یہ سب کیسے ہو گیا، یہ کوئی نہیں جانتا، اس لیے کہ شوہر کے ناول 'بورن آئی ڈیٹھ' سے ہونے والی آمدنی میں سے اسے جو حصہ ملا تھا وہ اس کی موت کے بعد وصول ہوا تھا۔ پھر اس میں سے کیرین حصے دار کیسے بن گئی؟

اس کے بچے کا کہنا ہے کہ اس نے وصیت پر کیے گئے اپنے چچا کے دستخط دیکھے ہیں وہ اس کے معلوم ہی نہیں ہوتے۔ وہ پختہ ہاتھ سے پوری طاقت سے دستخط کیا کرتا تھا، لیکن وصیت پر ہونے والے دستخط کمزور، شکستہ اور مردہ سے ہیں۔

ناول نگار نے مرنے سے پیشتر بہت سے لوگوں سے درخواست کی تھی کہ اسے نیویارک میں دفن کیا جائے جہاں وہ پیدا ہوا تھا، لیکن اس کے برعکس اسے مین مین کے ایک قبرستان میں دفن کیا گیا۔ ایک خبر کا کہنا ہے کہ اس کی لاش کو جلا کر ایک ہانڈی میں رکھی گئی ہے اور وہ ہانڈی کیرین نے اپنے میٹل پیس میں رکھ دی ہے۔ کچھ کا کہنا ہے کہ اس کے دوستوں نے وہ ہانڈی وہاں سے چرا کر کئی شہروں کی سیر کرائی اور اس کے بعد اسے ایک دریا میں پروا ب کر دیا۔

پہلی بیوی میری کے تینوں بچوں کو بھی اس کی جائداد میں سے تھوڑی سی رقم مل گئی ہے جو بعد میں شائع ہونے والے ناولوں کی آمدنی ہے۔ یہ اس کی جائداد کا صرف دہائی

حصہ ہے جسے کیرین ہڑپ نہیں کر سکی۔ اس کی زندگی کی پڑاسرایت سے کیرین پردہ اٹھا سکتی تھی، مگر 10 دسمبر 2008ء کو وہ بھی آنجنابی ہوگئی اور اس سلسلے کے سارے سوالات کے جوابات وہ اپنے ساتھ قبر میں لے گئی۔ یہ وہ نصیب خفہ ناول نگار تھا جس کو ایک عالم رابرٹ لڈلم کے نام سے جانتا ہے۔ اس کی موت کے بعد فوربس میگزین نے اسے دنیا کے سب سے زیادہ آمدنی والے مصنفین میں حیرتوں میں درج کیا ہے۔

رابرٹ لڈلم ایک امریکی مصنف تھا جس کے ایکشن سے بھرپور ناول ساری دنیا میں 29 کروڑ کی تعداد میں فروخت ہوئے۔ تیسرہ کرنے والے کہتے ہیں کہ رابرٹ لڈلم نے اپنا تصنیفی کیریئر بہت دیر سے شروع کیا۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ قارئین کی توجہ ناول کے پہلے صفحے سے آخری صفحے تک مبذول رکھے۔ بلاشبہ وہ اس میں کامیاب ہوا۔ اس کی تکنیک یہ تھی کہ وہ بین الاقوامی سیاست اور حالات کو اپنا موضوع بناتا تھا۔ بعض اوقات اس کے ناول حقیقت سے بہت دور ہوتے تھے، انہیں تصوراتی کہا جاسکتا ہے۔ وہ دنیا کا نفسیاتی طور پر جائزہ لیا کرتا تھا جس میں بین الاقوامی کارپوریشنیں، ملٹری کی طرح کے طاقتور ادارے، حکومتی تنظیمیں دنیا کا سکون اور چین بر باد کر رہی ہیں۔ ہر معاملے کو سیوا تاثر کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اس کے ہیرو سازشوں کے جال میں پھنسے ہوئے ہوتے ہیں اور انہیں اس بات کی تمیز کرنا دشوار ہوتی ہے کہ کون دشمن ہے کون دوست، بہر حال وہ اپنی صلاحیتوں سے ان سازشوں پر قابو پانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اس سرغٹہ کا قصہ چکا۔ دیتے ہیں جو دنیا کو ملپٹ کرنے کی کوششوں میں لگا ہوتا ہے۔

رابرٹ لڈلم 25 مئی 1927ء کو نیویارک شہر میں پیدا ہوا تھا۔ (کہاں اور کس اسپتال میں، یہ لڈلم کو آخری وقت تک معلوم نہ ہو سکا۔ اپنے ناولوں کے ہیرو جیسن بورن کی طرح وہ بھی اپنی شناخت معلوم کرنے کے لیے سرگرداں رہا۔ اس سے کام لینے والوں نے اس کی یادداشت کی پلیٹ صاف کر دی تھی تو ماضی سے اس کا کوئی رشتہ نہیں رہا تھا، لہذا وہ بلاکت خیر مشین بن گیا) اس کا باپ جارج ہارٹ فورڈ لڈلم ایک بزنس مین تھا۔ اس کی ماں مارگریٹ ورڈ سورتھ لڈلم تھی۔ اس کی پیدائش کے بعد اس کا خاندان نیو جرسی کے مضافاتی علاقے میں جا کر بس گیا۔ اس کے باپ کا انتقال 1934ء میں ہو گیا تو اس کے نانا جو ریٹھ کا کامو بار کیا

کرتے تھے، انہوں نے رابرٹ لڈلم کے لیے ایک بڑی رقم مختص کی کہ اسے اعلیٰ تعلیم دلائی جائے۔ رابرٹ نے ابتدائی تعلیم ریکٹری اسکول پمفرٹ، کنکٹی کٹ اور چسائر میں حاصل کی۔ اسے بچپن ہی سے ادکاری کا شوق تھا، اس لیے وہ اسکول کے تھیٹر میں کام کیا کرتا تھا۔ تاہم اسے فٹ بال کھیلنے کا بھی شوق تھا اور وہ کوارٹر بیک کی پوزیشن پر کھیلنے کا متغی تھا۔ فٹ بال میں اسے چانس نہ ملا تو اس نے ڈراموں کی طرف ساری توجہ لگا دی۔

اپنے شوق کو پروان چڑھانے کی خاطر اس نے

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچانہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام۔

☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل فون نمبر

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

نصر عباس

03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگشت

C-63 فی 11 سٹیشن ڈیس ہاؤس اتھارٹی مین کو رگی روڈ، کراچی

جسٹس گروپ

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

براڈوے کا رخ کیا اور ایک مزاحیہ ڈرامے کے کردار کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ اس ڈرامے کا نام 'جوئیز مس' تھا۔ اس وقت اس کی عمر سولہ برس تھی۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو وہ رائل کینیڈین انٹرفورس میں بھرتی کے لیے درخواست دی، لیکن اس کی درخواست قبول نہیں کی گئی، کیونکہ وہ ابھی کم عمر تھا۔ بہر حال اس نے 1945ء تا 47ء امریکا کی میرین کور میں انفنٹری میں کی حیثیت سے کام کیا۔ اس کی ڈیوٹی جنوبی بحر اوقیانوس پر لگائی گئی۔ وہاں اس نے اپنے تجربات پر مشتمل دو سو صفحات کی رپورٹ لکھی۔ جب سان فرانسسکو میں اس کی ڈیوٹی ختم ہوئی تو بد قسمتی سے اس کی وہ رپورٹ کھو گئی۔ اس نے میرین کور میں ذاتی حیثیت میں کام کیا تھا اور جب وہ ریٹائر ہوا تو پرائیویٹ حیثیت سے ہی ہوا۔ چونکہ اس کی تعلیم اچھوری تھی، لہذا اس نے میڈل ٹاؤن کی ویسلیو ان یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اس طرح سے اسے 1951ء میں گریجویشن کی ڈگری ملی۔

1950ء میں اس نے ایچ پر بطور اداکار کام کیا لیکن وہاں اس کی قسمت کا تارہ اس انداز سے نہیں چمکا کہ لوگ راستہ روک کر اس سے آٹوگراف لیتے یا انگلی کے اشارے سے کہتے کہ وہ دیکھو لڈم جا رہا ہے۔ نیو انگلینڈ کے تھیٹر میں اس نے اپنی بیوی کے ساتھ تقریباً دو سو ڈراموں میں کام کیا۔ اسے ویل کا کردار ملتا تھا یا پھر مجرم اور قاتل کا۔ 1954ء میں اس نے اداکاری ترک کر کے پروڈکشن شروع کر دی۔ اس نے شمالی جرسی کے ایک تھیٹر پلے ہاؤس میں اپنے ڈرامے پیش کرنا شروع کر دیے۔ پھر 1960ء میں اس نے ایکٹرز ایکوٹی کے تعاون سے پیراماس مال پر ایک پلے ہاؤس (تھیٹر) قائم کیا۔

تیس برس میں اس نے تقریباً 1370 ڈرامے پیش کیے۔ پھر ٹیلی ویژن کے متعدد ڈراموں میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے، لیکن شہرت کی بلندیوں تک نہ پہنچ سکا۔ جب اس کام سے اکتا گیا تو اس نے 1971ء میں اپنا پہلا ناول 'اسکار لیٹی انہریش' لکھا۔ یہ جرمنوں اور بین الاقوامی صنعت کاروں کے بارے میں تھا۔ اس نے ناول شائع ہونے کے لیے متعدد پبلشروں کو دیا، لیکن کہیں سے کامیابی نہ ہوئی۔ دس پبلشروں نے حوصلہ شکن باتیں کیں۔ تاہم جب ورلڈ پبلشنگ کمپنی نے اسے شائع کیا تو وہ فروخت کے اعتبار سے بیسٹ سیلرز لسٹ میں شامل ہو گیا اور قارئین نے اسے بے حد سراہا۔ اس ناول کی کہانی اس نے الشریڈ لندن نیوز میں شائع ہونے والی دو تصاویر کو دیکھ کر لکھی

تھی۔ یہ بہر حال اس کے تصور کا کمال تھا کہ اس نے محض تصاویر کو مرکزی ستون بنا کر ایک قلعہ تعمیر کر ڈالا۔ اس ناول میں بتایا گیا تھا کہ کچھ مالدار لوگ نازی پارٹی 'تھر ڈرینج' کی معاشی طور پر امداد کر رہے ہیں تاکہ وہ دوبارہ برسرِ اقتدار آجائے۔ یہ ناول 75 ہزار کی تعداد میں فروخت ہوا۔

رابرٹ لڈم کا حوصلہ بڑھ گیا اور اس نے ناول نویسی کی حیثیت سے زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا اور 1973ء میں دوسرا ناول 'اڈسٹر مین ویک اینڈ' لکھا۔ اس ناول پر بعد میں سام پیکپا نے 1983ء میں فلم بنائی۔ اس ناول کی کہانی کچھ اس طرح سے ہے کہ سی آئی اے ایک نیوز ایگزیکٹو سے مل کر سازش تیار کرتی ہے اور وہ نیوز ایگزیکٹو ٹیلی ویژن پر یہ اعلان کرتا ہے کہ اس نے ایک روسی گروہ کا سراغ لگایا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ سب اس کے دوست ہیں۔ اسے دوستوں کو گرفتار کرانے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا۔ لڈم کے کردار کچھ اسی قسم کے ہوتے ہیں کہ ہیرو کے بجائے ویلن معلوم ہوتے ہیں۔ بہت سے ناولوں میں اس کے کردار فریڈ واحد ہیں جو بڑی عظیمیوں سے ٹکر لیتے ہیں، جو دنیا کا امن چین تباہ کرنے پر تکی ہوئی ہیں۔ رابرٹ لڈم کے ناولوں پر مبنی فلموں کا ہیرو میٹ ڈیمون تھا، جس نے اس کے تین ناولوں پر بننے والی فلموں میں کام کر کے اپنا لوہا منوایا۔ پھر بعد میں بھی اس نے کئی فلموں میں کام کیا اور کافی نام کمایا۔

1970ء سے رابرٹ لڈم نے فیصلہ کیا کہ اسے دل لگا کر ناول نویسی ہی کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ یہ مالی اعتبار سے ایک نفع بخش پیشہ ہے۔ جب ناول لکھوں کی تعداد میں فروخت ہونے لگے تھے تو پھر کسی اور ذریعہ معاش کے بارے میں سوچنے کی ضرورت بھی کیا تھی؟ 1978ء میں اس نے ہول کرافٹ کو ویسٹ لکھا اور اس کے بعد اپوکلاپس وائچ، جن پر فلم بنی اور وہ شہرت کے بام عروج پر پہنچ گیا۔

ایک سوال جو ہر کوئی پوچھ بیٹھتا ہے، وہ یہ ہے کہ اداکاری کرتے کرتے لڈم کو اچانک لکھنے کا رجحان کیسے پیدا ہو گیا۔ اس کے علاوہ جب وہ اس کے لوازمات سے آگاہ ہی نہیں تھا تو اس نے بین الاقوامی سازشوں کے پس منظر میں ایسے معرکہ آرا ناول کیسے لکھے لیے؟ حقیقت یہ ہے کہ اس کے بہت سے دوست فارن آفس میں کام کرنے لگے۔ جن کی صحبت میں رہ کر وہ بہت کچھ جان گیا۔ پھر اس کے کچھ واقف کار برطانوی سیکرٹ سروس میں اچھے عہدوں پر فائز ہو گئے، لڈم کو ان کی صحبت سے زرخیزی ملی۔ پھر اس کی بیوی

میری نے بیٹھا گون میں ملازمت کر لی۔ جس سے وہ ایک بڑی عظیمی کی کارستانیوں سے آگاہ ہو گیا۔ اپنے ناولوں کے پس منظر اور تانا بانے کے لیے وہ عجیب نہیں بیٹھتا تھا، بلکہ مسلسل سفر میں رہتا تھا۔ ہر ایک چیز کا مشاہدہ جب تک اپنی آنکھوں سے نہ کر لیتا اسے چین ہی نہ آتا۔ جیسے خاص طور پر اس کا پسندیدہ شہر تھا، جس کا تذکرہ اس کے بہت سے ناولوں میں ملتا ہے۔ اس کے ابتدائی تین ناول جرمنی سے متعلق ہیں اور دوسری جنگ عظیم کے پس منظر میں ان کا تانا بانا گیا ہے۔ اس نے جب ناول لکھنا شروع کیے تو سرد جنگ جاری تھی، اس لیے اس کے ناولوں کے مجرم زیادہ تر کمیونسٹ تھے۔ پھر جب سرد جنگ ختم ہو گئی تو اس نے دہشت گردی کو اپنا موضوع بنا لیا۔ اس کے مشاہدات میں وسعت اور کشادگی اس طرح سے پیدا ہوئی کہ وہ اپنے جیٹ طیارے میں بیٹھ کر اپنی بیوی میری کے ساتھ دنیا کا سفر کرتا رہتا تھا اور ان ملکوں میں قیام کرتا جہاں اسے اپنے تازہ ناول کا پس منظر تیار کرنا ہوتا تھا۔

1980ء میں اس نے 'بورن آئی ڈیشی' لکھا جس میں ایک امریکی ایجنٹ کا کردار تخلیق کیا جس کے مخالف ایک کردار کارلوس تخلیق کیا گیا تھا، جن کا دنیا کے بہت سے ملکوں میں مقابلہ ہوتا ہے۔ کارلوس کا کردار ایک پیدائشی دہشت گرد میرز سانشیر کو دیکھ کر تخلیق کیا تھا، جو 1994ء میں سوڈان میں گرفتار ہوا تھا اور مقدمہ چلانے کی غرض سے بیرس لایا گیا تھا۔ حقیقت کی دنیا کا زندہ جاوید کردار کارلوس دی جیکال کی پشت پناہی ایک زمانے میں صدام حسین بھی کرتے تھے۔ جس نے 1972ء کے اوپیکس میں بہت سے اسرائیلی کھلاڑیوں کو ہلاک کر ڈالا تھا۔ اس کے علاوہ دہشت گردی کے بہت سے واقعات کے پیچھے اسی کا ہاتھ تھا۔ اب وہ جیس کی ایک جیل میں تاحیات قید کی زندگی بسر کر رہا ہے۔

'بورن آئی ڈیشی' کے پہلے منظر میں اس کا ہیرو بے ہوش ہوتا ہے اور جب اس کی آنکھ کھلتی ہے تو اسے یہ یاد نہیں آتا کہ وہ کون ہے اور کہاں رہتا ہے۔ اس کے والدین کون تھے اور وہ کس کاروبار سے منسلک تھا۔ یادداشت کی گریں کھلتی ہیں تو اسے صرف یہ یاد آتا ہے کہ اس کا نام ڈیوڈ ویب ہے اور وہ مشرق وسطیٰ کا اسکار ہے۔ سی آئی اے نے اسے ایک نئی آئی ڈیشی (شناخت) دی ہے کہ وہ جیسن بورن ہے اور اسے کارلوس نامی دہشت گرد کو ہلاک کرنا ہے، لیکن

آگ

خیال ہے کہ سب سے پہلے آگ انسان نے کسی درخت پر چٹکی مرنے سے حاصل کی یا کسی آتش فشاں کے لاوا اگلنے سے پیدا شدہ آگ سے اپنا کام چلایا۔ اس طرح حاصل کی ہوئی آگ کو بڑی احتیاط سے غاروں اور جھونپڑیوں میں محفوظ رکھنا پڑتا تھا۔ مدت بعد رگڑ سے آگ پیدا کرنے کا طریقہ انسان کو سوجھا اور پھر آہستہ آہستہ دو خشک چیزوں کو آپس میں رگڑنے سے آگ حاصل کی جانے لگی۔ چھماق ایک سخت پتھر ہے جس سے شیشہ کاٹنے کا کام لیا جاتا ہے۔ اتفاقاً طور پر کہیں شیشہ کاٹنے کے دوران آگ کی چنگاری نظر آگئی۔ تب سے چھماق کے دو ٹکڑوں کو ایک دوسرے کے ساتھ رگڑ کر آگ حاصل کرنے کا طریقہ رواج پا گیا۔ محدب عدسے میں سورج کی شعاعوں کو ایک مرکز پر جمع کر لینے سے بھی آگ حاصل کی جاتی تھی۔ مشہور سائنس دان ارشمیدس (287 ق م۔ 212 ق م) نے ایک ایسے شیشے ہی کی مدد سے رومن جہاز کو آگ لگا دی تھی۔ صنعتی دنیا میں جدید کیمیائی طریقہ سے آکسیجن کو آگ کا ذریعہ سب سے پہلے فرانس کے مشہور کیمیا دان توآنرز نے بتایا۔ اس نے 1783ء میں آکسیجن کے خواص دریافت کیے اور معلوم کیا کہ جلنے کے لیے آکسیجن لازمی ہے۔ آگ کی زبردست طاقت اور فائدہ رسانی کو دیکھ کر انسان نے اس کی پرستش بھی کی ہے اور زمین پر اس کو سورج دیوتا کا نائب سمجھا ہے۔ قدیم یونان میں اسے چار بنیادی عناصر (عناصر اربعہ) میں سے ایک عنصر سمجھا جاتا تھا۔

مرسلہ: ملک سرفراز، سرگودھا

فلمی فیلڈ

میں حسین آغا کی یادداشتیں



یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتیاں کی یاد
تہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ایسے نادر روزگار خال خال ہی نظر آتے ہیں جو نصف صدی سے علم و ادب، صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل ہوں اور اپنے روزاول کی طرح تازہ دم بھی۔ ان کے ذہن رسا کی پرواز میں کوئی کمی واقع ہو، نہ ان کا قلم کبھی ٹھکن کا شکار نظر آئے۔ آفاقی صاحب ہمارے ایسے ہی جوان فکر و بلند حوصلہ بزرگ ہیں۔ وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے، اپنی نمایاں حیثیت کے نشان اُس کی پیشانی پر ثبت کر دیے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستگی کے دوران میں انہیں اپنے عہد کی ہر قابل ذکر شخصیت سے ملنے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ دید شنید اور میل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابل رشک ہے۔ اپنے ہم بھی ان کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور شخصیات سے ملاقات کریں اور اُس عہد کا نظارہ کریں جو آج خواب معلوم ہوتا ہے۔

ادب و صحافت سے فلمی نیانک دراز ایک داستان در داستان سرگزشت

243

دلیپ کمار کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا رہا ہے، بھارتی صحافیوں، نقادوں اور معروف مبصرین نے ان کے اور ان کے فن کے بارے میں انگریزی زبان میں کتابیں لکھی ہیں اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ ہر پہلو سے ان کی اداکاری اور شخصیت پر روشنی ڈالی جا رہی ہے۔ دلیپ کمار سالہا سال سے اداکاری ترک کر چکے ہیں۔ ان کی سوشل لائف بھی ہمیشہ محدود رہی ہے۔ وہ بہت کم ہی فلمی تقریبات میں شرکت کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کی شخصیت اور

ہے کہ روس اور امریکا مل کر دنیا کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں اور سی آئی اے ایک ایسا ادارہ ہے جو امریکا میں بیٹری خلافت قانون منصوبے تیار کرتا رہتا ہے۔ اسے قانون عملداری کی کوئی پروا نہیں ہے۔

لڈلم کا انتقال 12 مارچ 2001ء میں نیپلز، فلوریڈا میں 73 برس میں ہوا۔ مرنے سے پیشتر وہ ہر وقت نشے میں رہنے لگا تھا۔ چونکہ اس کے پاس بہت دولت تھی، اس لیے اس کی زندگی ایک پلے بوائے کی طرح سے گزرنے لگی جس میں ساحل سمندر کے نزدیک بنے ہوئے مکانات میں رہائش، شرائیں، تیز رفتار اور نئے ماڈل کی کاریں اور ایک عدد پرائیویٹ جیٹ طیارہ شامل تھا، جس پر وہ ملکوں ملکوں سیر کیا کرتا تھا اور اپنے مشاہدات میں اضافہ کرتا رہتا تھا۔ اس کے بچپن کا بیان ہے کہ جب میں فیملی ڈاکٹر حیثیت سے اس کے مکان پر جایا کرتا تھا تو اسے ایک مخصوص دسکی ڈیوار پیتے دیکھتا تھا۔ دسکی پینے کے لیے اس کے پاس ایک مخصوص گلاس ہوا کرتا تھا (جس کے پینے پر شیشم کی لکڑی چپکا کر دیدہ زیب نقوش ابھارے جاتے تھے)۔ اسے سیر سائے کا بہت شوق تھا اور بہماز کے جزیرے کی پسندیدہ جگہ تھی۔ وہ جب بھی موڈ میں ہوتا، مجھ سے کہتا کہ جیٹ تیار ہے، آؤ بہماز چلتے ہیں۔

اس نے اپنی زندگی میں کل 29 ناول لکھے ہیں جو 32 زبانوں میں ترجمہ ہوئے۔ یہ ناول مجموعی طور پر تین کروڑ کی تعداد میں فروخت ہوئے۔ لڈلم نے اپنے اس مخصوص نام کے علاوہ دوسرے ادبی نام جو تاتھن رائڈر کے تحت بھی لکھے ہیں جن میں 'ٹریویان' اور 'کرائی آئی ہیلیڈ ان' شامل ہیں۔ مؤخر الذکر اس نے مزاحیہ انداز میں لکھا ہے۔ مرنے کے بعد اس کا ناول 2000ء میں چھپا جس کا نام 'سگما پروٹوکول' تھا۔ مرتے وقت اس نے بہت سے ناولوں کے ادھرے مسودے، ناولوں کے خاکے چھوڑے ہیں جنہیں دوسرے مصنفین کے ذریعے لکھوائے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

کروڑوں کی تعداد میں فروخت ہونے والا مصنف جب اس دنیا سے گیا تو اس کے دونوں ہاتھ سکندر اعظم کی طرح سے خالی تھے اور خانہ دل بھی خالی تھا۔ اس نے محبت کے نام پر بھیک مانگی لیکن یہ بھیک بھی نہ ملی اور وہ تہی دامال ہو گیا۔ آسمان اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے۔

افسران اسے دھوکا دیتے ہیں اور عین موقع پر اس سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ اس طرح سے ناول میں حیرت انگیز موڑ اور تھیر خیزی پیدا ہو جاتی ہے۔ (وہ ایک طرح سے سی آئی اے کا قاتل تھا) اس ناول کا دوسرا حصہ 'بورن سپر میسی' ہے۔ ہیر و بورن کی شخصیت کے دو حصے ہو چکے ہیں۔ دوسری شخصیت اذیت رساں ہے اور دوسروں کو مصیبت اور آلام میں دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ وہ ہانگ کانگ میں یکے بعد دیگرے کئی لوگوں کو ہلاک کرتا ہے۔ ناول کا تیسرا حصہ 'بورن الٹی میٹم' ہے جس میں وہ اور کارلوس روس میں ترم مقابل ہوتے ہیں۔ ناول کا دوسرا حصہ بے حد پیچیدہ ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ رابرٹ لڈلم خیر سے شر کی طرف جا رہا ہے یا شر سے خیر کی طرف۔ چونکہ ناول میں بے پناہ روانی ہے، اس لیے قاری سوچے سمجھے بغیر اسے پڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس کے ناولوں میں جوڑائی ڈنگا فساد ہے اسے کیا نام دیا جائے، وہ تشدد ہے یا محض ایکشن؟ تبصرہ نگار جب یہ سوال اٹھاتے ہیں تو ان ناولوں کے قارئین یہ کہتے ہیں کہ وہ پلاٹ کی ضرورت تھی۔ ناولوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ رابرٹ لڈلم کی اپنے بارے میں رائے ہے کہ اس نے سسپنس کو نظر رکھتے ہوئے ناول لکھے ہیں اور ان کا انداز ڈرامائی اور تھیریکل ہے، اس لیے کہ وہ دنیا کو شیکسپیر کی طرح سے ایک تھیر سمجھتا ہے۔

اس سلسلے کا چوتھا حصہ 'بورن لگیسی' تھا جسے ایرک فان اسٹ بیڈر نے 2004ء میں لکھا تھا۔ اس میں نت نئے جہانوں کی سیر کرائی گئی ہے اور حکومت کی بددیانتی سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔

ہر چند کہ قارئین اس کو بے پناہ پسند کرتے تھے اور اس کے نئے ناول کا انتظار کرتے تھے، لیکن حیلنکی اعتبار سے تبصرہ نگاروں نے اس کے ناولوں کو پسند نہیں کیا۔ مثال کے طور پر مشہور مصنف جان لی کار نے ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ اس کا انداز تحریر بچکانہ ہے اور وہ بہت چھوٹے چھوٹے جملے لکھتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اسے لکھنا ہی نہیں آتا ہے۔ اس کے ناولوں میں نشان خیر (!) کی بھرمار ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ قارئین کو حیرت زدہ نہیں کر رہا ہے، بلکہ وہ خود اپنے پلاٹ اور تحریر پر حیرت زدہ ہے اور یہ نشان مسلسل لگاتا چلا جا رہا ہے۔ اس کے کردار بہت سادہ ہوتے ہیں اور نفسیاتی اعتبار سے کمزور۔ تاہم اس نے اپنے ناولوں میں یہ انکشاف ضرور کیا



اداکار شوک کمار

نقل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مجھے بتائیے کہ ہندوستان کا کون سا اداکار اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا ہے اس نے دلپ کمار کی نقل کرنے اور ان کی اداکاری سے سیکھنے کی کوشش نہیں کی؟

اس کے برعکس یہ بات بھی ہے کہ دلپ کمار کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اپنے مکالموں اور کرداروں میں تبدیلی کرتے ہیں یا کراتے ہیں اور اس طرح دوسرے اداکاروں کی حق تلفی کرتے رہے ہیں۔ سنجو کمار نے ”سنگھرش“ میں دلپ کمار کے ساتھ کام کیا تھا۔ انہوں نے بھی یہ الزام عائد کیا تھا۔ محبوب خان نے فلم ”مڈرائٹیا“ میں دلپ کمار کو نرس کے بڑے بیٹے کا کردار سونپنے کا فیصلہ کیا تو وہ رضا مند نہیں ہوئے۔ وہ چاہتے تھے کہ اسکرپٹ میں تبدیلی کی جائے اور ”مڈرائٹیا“ میں باپ اور بیٹے کا کردار ایک ہی اداکار کرے تو وہ رضا مند ہو سکتے ہیں مگر محبوب صاحب نہ مانے۔ اے آر کاردار جیسا معروف ہدایت کار یہ شکایت کرتا تھا کہ ان کی فلم ”دل دیا درد لپا“ کے اسکرپٹ میں دلپ کمار نے اتنی تبدیلیاں کیں کہ کہانی کا حلیہ ہی بگڑ کر رہ گیا۔

ہدایت کار اپنی اس فلم کی ناکامی اور اپنی تباہی کا ذمہ دار دلپ کمار کو ٹھہراتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ دلپ کمار ہمیشہ فلم سازوں کی زندگی اجیرن کر دیا کرتے تھے، شکایات اپنی جگہ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ دلپ کمار نے ہندوستان کے کروڑوں لوگوں کو فلموں کے ذریعے ڈھیر ساری خوشیاں اور آنسو دیے ہیں۔ ان کا یہ احسان فلم بین کبھی نہیں اتار سکتے۔

فلم میں کام کرنے کی ہامی بھرتے تھے لیکن کچھ ایسی فلمیں اور کردار بھی تھے جنہیں انہوں نے مسترد کر دیا تھا مگر ایک انٹرویو میں انہوں نے خود اعتراف کیا کہ یہ ان کی غلطی تھی۔ ہالی وڈ کے مایہ ناز ہدایت کار ڈیوڈ لین نے جب فلم ”لارنس آف عربیا“ بنانے کا ارادہ کیا تو اس فلم میں ایک اہم ترین کردار کے لیے دلپ کمار سے رابطہ کیا تھا۔ اس فلم میں شریف علی نام کا ایک کردار تھا۔ مرکزی کردار کے لیے پیٹر اونول کو پہلے سائن کیا جا چکا تھا۔ دلپ کمار نے مطالبہ کیا کہ انہیں لارنس کا مرکزی کردار دیا جائے لیکن ایسا ممکن نہ تھا کیونکہ پیٹر اونول سے پہلے ہی معاہدہ ہو چکا تھا۔ دلپ کمار نے معاون کردار کرنے سے انکار کر دیا ہے حالانکہ اس کے لیے انہیں بہت مقبول معاوضہ پیش کیا گیا تھا اور یہ فلم انہیں ہالی وڈ میں بہت اچھی طرح متعارف کرا سکتی تھی۔ شریف علی کا کردار اس فلم میں بعد میں عمر شریف نے کیا تھا اور اس کردار کی وجہ سے وہ ہالی وڈ میں اتنے مقبول ہوئے کہ پھر چند فلموں میں مرکزی کردار بھی ادا کیے اور بہت شہرت حاصل کی۔ دلپ کمار یہ کردار مسترد کرنے کو اپنی ایک غلطی تسلیم کرتے ہیں۔

اسی طرح گروڈت کی فلم ”پیاسا“ میں مرکزی کردار کے لیے گروڈت انہیں منہ مانگا معاوضہ دینے کو تیار تھے کیونکہ یہ کردار دلپ کمار کو سامنے رکھ کر ہی انہوں نے لکھوایا تھا۔

دلپ کمار بعد میں یہ کردار مسترد کر کے چھٹائے اور انٹرویو میں تسلیم کیا کہ یہ ان کی غلطی تھی، اسی طرح فلم ”بیجو باورا“ میں انہیں مینا کمار کی کے مقابل ہیرو کا کردار پیش کیا گیا تھا مگر وہ رضا مند نہ ہوئے۔ یہ کردار بھارت بھوشن نے ادا کیا تھا۔ یہ بہت اچھا کردار تھا اور یہ فلم بھی بے حد کامیاب ہوئی تھی۔ دلپ کمار نے اعتراف کیا کہ انہیں یہ کردار قبول کر لینا چاہیے تھا لیکن انہوں نے فیصلہ کرنے میں غلطی کی تھی۔

اپنی غلطیوں کا اس طرح کھلا اعتراف ہر کوئی نہیں کر سکتا۔ جہاں تک دلپ کمار کی اداکاری کا تعلق ہے اس کا اعتراف سبھی کرتے ہیں۔ اکتیبا بھنجن نے ایک انٹرویو میں کہا کہ اگر دلپ کمار ہالی وڈ میں ہوتے تو کئی بار آسکر ایوارڈ حاصل کر چکے ہوتے۔ شاہ رخ خان دلپ کمار کو اپنا آئیڈل کہتے ہیں۔ فلم ساز ہدایت کار اور اداکار منوج نے ان کے بارے میں کہا: ”سب کہتے ہیں کہ میں دلپ کمار کی

سناؤں۔ دلپ کمار کو یہ خیال بہت پسند آیا اور انہوں نے اس فلم کو پوری زبان میں بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے صرف خود پوری لہجہ اور تلفظ سیکھا بلکہ دوسرے تمام اداکاروں کو ہیروئن و جنتی مالا، کو بھی پوری بولنے کی تربیت دی گئی۔ زبان کی اس تبدیلی نے فلم کو حد درجہ موثر بنا دیا تھا۔ اس کی کامیابی میں ایک قابل ذکر تبدیلی ثابت ہوئی۔ ”جنا“ میں دلپ کمار اور جنتی مالا کے پوری میں بولے ہوئے مکالمے فلم بینوں کو زبان یاد ہو گئے تھے۔

یوں تو دلپ کمار نے کئی فلموں میں الیمہ کردار کئے تھے لیکن محبوب خان کی فلم ”انداز“ کے کردار سے ان کے الیمہ کرداروں کا آغاز ہوا اور پھر یہ سلسلہ کافی عرصے جاری رہا۔ دیدار، سنگدل، دیوداس، گنگا جینا، پھل، آرزو اور اسی زمانے کی دوسری الیمہ فلموں میں دلپ کمار ڈوب کر اداکاری کی۔ تعریف بھی خوب سمیٹی مگر کرداروں کا تاثر ان کی ذات پر بھی بہت گہرا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ وہ ذہنی اور نفسیاتی مسائل کا شکار ہو گئے تھے جس کے بعد انہوں نے الیمہ کردار ترک کر کے ہلکے پھلکے رومانوی مزاحیہ کرداروں پر زیادہ توجہ دی جس سے ان کا ذہنی بوجھ ہوا۔

دلپ کمار نے اپنے وقت کی تمام نامور ہیروئنوں کے ساتھ کام کیا لیکن وہ سب سے زیادہ جیونت کے معترف تھے۔ نلنی جیونت کے ساتھ انہوں نے صرف دو فلموں ”نکلت“ اور ”انوکھا پیار“ میں کام کیا تھا جس سنجیدگی اور توجہ سے نلنی جیونت کام کرتی تھیں اور جس طرح ہدایت کاروں کی ہدایات پر عمل کرتی تھیں یہ خوب دوسری ہیروئنوں میں نہیں تھیں حالانکہ وہ اداکاری میں نلنی جیونت سے بہتر تھیں۔

ذرا سوچئے کہ دلپ کمار بہت زیادہ کس ہدایت کار کے قائل تھے؟ محبوب خان کے، جن کے ساتھ انہوں نے انداز، امر، آن جیسی فلموں میں کام کیا تھا؟ یا پھر بمل رائے جن کی مدھمتی اور دیوداس جیسی فلموں میں انہیں بہت مقبولیت حاصل ہوئی تھی؟ ان دونوں کے برعکس دلپ کمار ہدایت کار نین بوس کے معترف تھے۔

نین بوس ان کی فلموں دیدار، ملن اور گنگا جینا ہدایت کار تھے۔ دلپ کہتے ہیں کہ میں نے نین بوس سے بہت کچھ سیکھا۔

دلپ کمار اپنے کردار سے مطمئن ہونے کے بعد

لقمان صاحب کہتے ہیں کہ میں یوسف کو لے کر ڈرائنگ روم میں گیا۔ شوکت صاحب ڈرائنگ کے دوسرے سرے پر صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے جب دلپ کمار اندر داخل ہوئے، شوکت صاحب اور دروازے کے درمیان میں کافی فاصلہ تھا۔ دلپ ان کی طرف بڑھا تو شوکت صاحب غور سے جائزہ لیتے رہے۔ دلپ کمار نے پاس جا کر سلام کیا۔ شوکت صاحب نے جواب دے کر انہیں بیٹھنے کے لیے کہا۔ لقمان صاحب کا کہنا تھا کہ جتنی دیر میں دلپ کمار شوکت صاحب کے پاس پہنچے اسی وقت شوکت صاحب نے ان کا انتخاب کر لیا تھا۔ اس کا اندازہ لقمان صاحب کو اس طرح ہوا کہ شوکت صاحب نے ملازم کو چائے لانے کو کہا اور دلپ کمار کو ”جگنو“ میں ان کے کردار کے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔

دلپ کمار راتوں رات مقبول اداکار نہیں بن گئے تھے۔ ان کی ابتدا میں ریلیز ہونے والی تین فلموں میں ان کی اداکاری کو سب سے سراہا گیا لیکن وہ باکس آفس پر ہٹ نہیں ہوئی تھیں۔ اشار دراصل وہ ”جگنو“ کی نمائش کے بعد بنے تھے، ”جگنو“ میں دلپ کمار نے بہترین اداکاری کا مظاہرہ کیا۔ ہلکے پھلکے مناظر ہوں۔ طالب علمی کے مناظر اور شوخیاں ہوں یا ڈرامائی مناظر دلپ کمار نے ہر ایک کے ساتھ مکمل انصاف کیا تھا۔ اس فلم نے دلپ کمار کو سپر اسٹار اور محمد رفیع کو گلوکار کی حیثیت سے مشہور کر دیا تھا۔ اس کے بعد دلپ کمار نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔

دلپ کمار نے اداکاری میں جو معیار قائم کیا نقادوں کا کہنا ہے کہ وہ اس دور کے عظیم ہالی وڈ کے اداکاروں مارلن برانڈو، ہنری فونڈ اور سینٹر ٹریسی کے معیار کی تھی۔

ان کا کہنا ہے کہ اگر وہ ہالی وڈ میں ہوتے تو ان کا شمار بھی اسی پائے کے اداکاروں میں ہوتا۔ خاص طور پر مارلن برانڈو کی طرح وہ بھی کم سے کم مکالمے بولتے تھے اور ان ہی کے انداز میں اداکاری کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ اپنے کرداروں کے ساتھ انصاف کرتے تھے اور ان میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے کسی مشکل کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔

دلپ کمار نے جب اپنی ذاتی فلم ”گنگا جینا“ بنائی تو موسیقار نوشاد نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ جن علاقوں میں فلم کی شوٹنگ کر رہے ہیں ان علاقوں میں عموماً پوری زبان بولی جاتی ہے۔ انہوں نے پوری میں چند مکالمے بھی بول کر



دوہیکا اور اشوک کمار فلم کے ایک سین میں

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ شاہ رخ خان ایک ٹیلی ویژن سیریز ”فوجی“ میں کام کرنے کے بعد فلموں میں آئے تھے۔ ”فوجی“ 1988ء میں ریلیز ہوئی تھی اور اس کو بہت پسند کیا گیا تھا۔ ایک سال بعد جب شاہ رخ کی والدہ کا انتقال ہوا تو انہوں نے دہلی کو خیر باد کہہ دیا اور بمبئی چلے گئے۔ قدرت ان پر مہربان تھی۔ ان کی ڈراما سیریز ”فوجی“ فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے دیکھی اور پسند کی تھی۔ کچھ عرصہ تک انہیں کام کی تلاش میں جدوجہد کرنی پڑی کیونکہ وہ چھوٹے موٹے کردار قبول کر کے اپنا مستقبل خراب نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہیں بالآخر ایک فلم ”دیوانہ“ میں منفی کردار ادا کرنے کا موقع ملا لیکن یہ کردار اہمیت کے لحاظ سے ہیرو کے کردار سے زیادہ اہم تھا اور اس میں اداکاری کے جوہر دکھانے کا زیادہ موقع تھا جس سے شاہ رخ خان نے فائدہ اٹھایا۔ فلم ”دیوانہ“ 1992ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی۔ نہ صرف یہ فلم کامیاب ہوئی بلکہ اس فلم میں شاہ رخ کی اداکاری کو بہت سراہا گیا۔ اس کے بعد شاہ رخ خان نے پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھا۔ وہ ایک کے بعد ایک کامیابی کے زینے چڑھتے رہے۔

نور جہاں نے بتایا کہ اس کے بعد ہم لوگوں کا شاہ رخ سے رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔ بعد میں شاہ رخ خان سے رابطہ تو ہوا لیکن ان کے پاس پاکستان آنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ انہوں نے اپنی کزن کو بمبئی آنے کی دعوت دی۔ شاہ رخ سے رابطہ کرنے اور ان کو فون کرنے کا کوئی ذریعہ نظر نہیں آتا تھا۔ قسمت آزمائی کے لیے میں نے دہلی میں شاہ رخ کے گھر کے نمبر پر فون کیا تو ٹیلی فون شاہ رخ کی بہن لالہ رخ نے

آئیں، میں آپ کو اس مکان تک پہنچا دوں گا لیکن آپ اس گھر والوں کو یہ نہ بتانا کہ میں نے آپ کو گھر دکھایا تھا کیونکہ وہ لوگوں کا اس گھر میں آنا پسند نہیں کرتے۔

مزدور کے ہمراہ کچھ دور چلنے کے بعد میں اس گھر کے سامنے پہنچ گیا جہاں شاہ رخ خان کے والد اور ان کے کزن رہا کرتے تھے۔ یہ چار منزلہ گھر گلی کے آخر میں واقع ہے۔ میں نے گھر کے سامنے رک کر مزدور کا شکریہ ادا کیا جو فوراً غائب ہو گیا۔ میں نے سبز رنگ کے دروازے پر دستک دی۔ کچھ دیر بعد ایک تیس سالہ شخص نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ وہ قمیص نہیں پہنے ہوئے تھا۔ میرے دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ اس کا نام جاوید احمد میر ہے اور وہ شاہ رخ کا کزن ہے۔ میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ میں بہت دور سے شاہ رخ خان کے رشتے داروں سے ملنے آیا ہوں اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے وقت دے دیں۔

جاوید احمد میر نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ ہم تنگ سیڑھیاں چڑھ کر گھر کی پہلی منزل پر پہنچ گئے جہاں جاوید کی بہن نور جہاں عرف منی اور ان کے تین بچوں سے ملاقات ہوئی۔ اسی گھر میں جاوید میر کے دو بھائی منصور احمد اور فاروق احمد بھی رہتے ہیں۔ یہ ایک پرانا گھر ہے جس کی چوتھی منزل پشاور میں دہشت گردوں کے مسلسل دھماکوں کی وجہ سے کمزور ہو گئی ہے اور کسی وقت بھی گر سکتی ہے۔

جب بات چیت شروع ہوئی تو منی نے ہمیں بہت سی پرانی اور دلچسپ باتیں سنائیں۔ منی نے بتایا کہ 1978ء میں شاہ رخ خان اپنے والد کے ساتھ پشاور آئے تھے اور تقریباً 22، 20 دن رہے تھے۔ اس وقت شاہ رخ کی عمر تیرہ سال تھی۔ منی نے بتایا کہ ہم سب بچے کھیلا کرتے تھے۔ لڑتے جھگڑتے تھے۔ ایک دوسرے کو مناتے بھی تھے۔ وہ بہت خوشگوار دن تھے جنہیں ہم کبھی نہیں بھول سکیں گے۔

نور جہاں عرف منی نے بتایا کہ اس وقت میری عمر دس سال تھی۔ اس پہلے دورے کے بعد اگلے سال یعنی 1979ء میں شاہ رخ دوبارہ اپنے والد اور اپنی بہن شاہ ناز لالہ رخ کے ساتھ پشاور آئے تھے۔ اس بار..... شاہ رخ ایک مہینے تک پشاور میں ہمارے پاس رہے تھے۔ اس وقت تک شاہ رخ اداکار نہیں بنے تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ لڑکا ایک دن بالی وڈ کا بادشاہ بنے گا اور ساری دنیا میں مشہور ہو جائے گا۔

اور ان کو تھانے لے جا کر تفتیش اور تحقیقات بھی کرتے رہے تھے۔ ان حالات سے تنگ آ کر تاج محمد ملک کی تقسیم سے پہلے ہی پشاور چھوڑ کر چلے گئے تھے اور دہلی میں انہوں نے رہائش اختیار کر لی تھی تاکہ خفیہ پولیس کی سرگرمیوں سے نجات حاصل کر سکیں۔ تاج محمد ملک کی آزادی کے شدید حامی تھے اور ان لوگوں کے ساتھ تھے جو انگریزوں کو ہندوستان سے نکال کر آزادی کی فضا میں سانس لینے کے خواہش مند تھے۔ ان کے تعلقات سباش چندر بوس کی تحریک آزادی سے تھے اور وہ ان حلقوں میں مقبول بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دہلی میں انہوں نے میجر جنرل شاہ نواز خان کی صاحبزادی لطیف فاطمہ سے شادی کی۔ شاہ نواز خان بھی سباش چندر بوس کی انڈین نیشنل آرمی کے ایک رکن تھے۔

شاہ رخ خان کی پیدائش بھی دہلی میں ہوئی تھی۔ چند سال پہلے ایک پاکستانی صحافی ارشد یوسف زئی نے پشاور میں شاہ رخ خان کے آبائی مکان کے ساتھ ان کے رشتے داروں کو بھی ڈھونڈ نکالا۔ یہ داستان خود یوسف زئی کی زبانی سنئے:

شاہ رخ خان کے آبائی گھر تک پہنچنے کے لیے شاہ ولی قتال کے علاقے سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہاں ایک تنگ گلی میں وہ پرانا گھر آج بھی کھڑا ہوا ہے جہاں ان کے والد رہا کرتے تھے۔ یہ علاقہ دراصل قصہ خوانی کے تاریخی بازار کے عقب میں واقع ہے۔ قصہ خوانی بازار میں پرانے زمانے میں قصہ گو دلچسپ داستانیں سنا کر لوگوں کو تفریح فراہم کرتے تھے۔ اسی وجہ سے اس بازار کا نام قصہ خوانی پڑا جو کہ آج بھی اسی نام سے جانا جاتا ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں لوگ قبوہ خانوں میں گرم گرم قبوے کی چسکیاں لیتے ہوئے قصے کہانیاں سنا کرتے تھے۔ آج کل اس بازار میں قصے کہانیاں سنانے والوں اور قبوہ خانوں کی جگہ مختلف دکانیں ہیں جہاں شوقین خریداروں کا ہجوم رہتا ہے کیونکہ ان دکانوں میں سامان آرائش اور افزائش حسن کے سامان کی دکانیں کافی تعداد میں ہیں۔

قصہ خوانی بازار کے دکاندار شاہ رخ خان کے آبائی مکان کے بارے میں بخوبی جانتے ہیں لیکن صحیح پتا بتانے سے قاصر ہیں لیکن ایک مزدور نے مجھے بتایا کہ مقامی مسجد کے ساتھ جو تنگ و تاریک گلی نظر آرہی ہے وہ شاہ رخ کے گھر کو جاتی ہے۔ مزدور نے پیشکش کی کہ آپ میرے ساتھ

دیو آئند کی وفات کے بعد انڈیا کے ”تین بڑوں“ ولیپ کمار راجپور دیو آئند“ میں سے صرف ولیپ کمار ہی رہ گئے ہیں۔ وہ 90 برس کے ہو چکے ہیں۔ پچھلے دنوں ان کی سالگرہ منائی گئی تو ساری فلمی صنعت (نئے اور پرانے) ان کے گھر پر انہیں مبارک باد دینے کو موجود تھے۔ ولیپ کمار کی صحت ٹھیک نہیں رہتی۔ انہیں بات کرنے میں بھی ہچکچاہٹ ہوتی ہے۔ ان کا حافظہ بھی خراب ہو گیا ہے، خیال ہے کہ شاید وہ الزائمر میں مبتلا ہو گئے ہیں لیکن وہ ان فن کاروں میں سے ہیں جنہیں ہمیشہ یاد رکھا جاتا ہے۔

☆☆☆

شاہ رخ خان کے مکان کے بارے میں آپ کو معلومات فراہم کی گئیں۔ قارئین کی طرف سے ان پرانے فن کاروں کے بارے میں معلومات کو بہت پسند کیا گیا۔ کافی حضرات اور خواتین نے شاہ رخ خان کے خاندان اور آبائی مکان کے بارے میں مزید جاننے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔

شاہ رخ خان نہ صرف برصغیر میں بلکہ ساری دنیا میں ایک جانا پہچانا نام ہے لیکن ان کے خاندان کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ آئیے، اس بارے میں آپ کو کچھ معلومات فراہم کی جا رہی ہیں۔ شاہ رخ خان کے کزن نے اس بارے میں بہت کچھ بتایا ہے جو نہ صرف شاہ رخ خان کے خاندان کے بارے میں اہم ہے بلکہ ان کے قریبی رشتے داروں کی زبانی شاہ رخ اور ان کے خاندان کے بارے میں بھی کافی کارآمد ہے۔

پشاور اس خطے کے قدیم ترین شہروں میں شمار کیا جاتا ہے، لیکن اس شہر کی اس اعتبار سے بھی اہمیت حاصل ہے کہ اس سرزمین نے ایسے فن کار پیدا کیے جنہوں نے سارے برصغیر میں دھوم مچادی اور اپنے کام کے حوالے سے پشاور اور سرحدی علاقے کا نام دنیا بھر میں عام کر دیا۔

شاہ رخ خان کے والد تاج محمد میر کا تعلق بھی پشاور سے ہے۔ وہ پرانے شہر کے علاقے میں رہتے تھے۔ ان کا آبائی مکان آج بھی شاہ ولی قتال کے علاقے میں موجود ہے جسے فلموں کے شائقین اور شاہ رخ کے پرستار دور دور سے دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ شاہ رخ کے والد تاج محمد میر انگریزی دور حکومت میں ایک انقلابی مزاج کے حامل تھے۔ حکومت کو بھی ان کی طرف سے تشویش رہا کرتی تھی۔ خفیہ پولیس کے کارندے ان کے ارد گرد گھومتے پھرتے تھے



اس پرانے بوسیدہ گھر کو دیکھا اور سوچا کہ اگر قدرت مہربان ہو اور انسان محنت کرے تو ایسے گھر میں رہنے والا بھی آسمان کی بلندیوں کو چھو سکتا ہے۔ کہاں یہ گھر جس کی چوٹی منزل کی چھت کسی وقت بھی گر سکتی ہے اور کہاں بمبئی کے مہنگے ترین علاقے میں شاہ رخ خان کا سات

غلام محمد، راگنی اور جایانت فلم شیریں فرہاد میں

کے بعد انہوں نے لندن کی رائل اکیڈمی آف آرٹ میں اداکاری اور رائل اکیڈمی آف میوزک سے موسیقی کی تعلیم حاصل کی چونکہ انہیں ابتدائی عمر ہی سے فنون لطیفہ سے دلچسپی تھی۔ خصوصاً اداکاری اور موسیقی ان کے پسندیدہ شعبے تھے۔ انہوں نے آر کی ٹیگر، ڈیزائننگ اور آرائش کی تربیت بھی حاصل کی۔ دیویکا رانی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور برہمن لڑکی تھیں اس لیے ہر لحاظ سے قابل عزت تھیں۔

دیویکا رانی کا عشق فلم اور اداکاری تھا، ہندوستان واپس آکر انہوں نے فلم ساز اور اداکار ہمنسورائے سے شادی کی۔ یہ شادی 1929ء میں ہوئی تھی۔ ان دونوں نے باہمی صلاح و مشورے سے مشہور فلم ساز ادارے بمبئی ٹاکیز قائم کیا جس نے ہندوستان کی فلمی صنعت کے فروغ اور ترقی میں نمایاں حصہ لیا اور کئی حوالوں سے اس کو ایک تاریخی حیثیت حاصل ہے۔

بمبئی ٹاکیز میں ان دونوں نے بہترین دماغ، ہنرمند اور اداکار اکٹھے کر لیے تھے۔ اسکرین پلے رائٹر نرجن پال جن سے دیویکا رانی کی ملاقات لندن میں ہوئی تھی وہ بہترین اسکرین پلے لکھنے کے لیے مشہور تھے۔ دیویکا رانی نے انہیں بمبئی ٹاکیز سے منسلک کر لیا جہاں بیشتر فلموں کے اسکرپٹ نرجن پال ہی نے لکھے تھے۔ اشوک کمار گنگولی جو لیبارٹری میں کام کرنے کے لیے رکھے گئے تھے ان کو دیویکا رانی کی جو ہر شئاس نظروں نے اداکاری کے لیے موزوں سمجھا اور انہوں نے بمبئی ٹاکیز سے اپنی اداکاری کا آغاز کیا۔ اشوک کمار ہندوستان کے سپر اسٹارز میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے بہت سی یادگار فلموں میں کام کیا۔

منزل محل نما گھر جس میں دنیا کی ہر جدید سہولت موجود ہے۔ خود بڑے بڑے اداکار بھی اس شاندار گھر کو اور اس گھر میں رہنے والے پر رشک کرتے ہیں۔ یہ سب اللہ کی مہربانیاں ہیں۔ انسان ان نعمتوں کا شکر یہ ادا نہیں کر سکتا جو اللہ تعالیٰ نے اس کو عنایت کی ہیں۔ بمبئی کا نام اب ممبئی ہے۔ یہ وہ شہر ہے جہاں لاکھوں انسانوں کے پاس سر چھپانے کو جھونپڑا تک نہیں ہے۔ وہ کھلے آسمان کے نیچے فٹ پاتھوں پر ساری زندگی گزار دیتے ہیں۔ ایسے بد قسمت بھی ہیں جنہیں فٹ پاتھوں پر بھی جگہ نہیں ملتی تو وہ گندے نالوں اور سیوریج کے اندر پناہ لینے پر مجبور ہیں۔

یہ سب قدرت کے کرشمے ہیں۔

☆☆☆

دلیپ کمار کے حوالے سے انہیں دریافت کرنے والی ہستی اداکارہ، اسٹوڈیو اور دیویکا رانی کا تذکرہ بھی آیا ہے۔ دیویکا رانی کے بارے میں کئی بار مختصر بیان کیا جا چکا ہے لیکن تفصیل سے ان کے حالات اور واقعات بیان نہیں کیے گئے۔

ہندوستان کی فلمی صنعت کی ترقی اور اسے روشن خیالی کی راہ پر گامزن کرنے والوں میں دیویکا رانی بھی سرفہرست ہیں۔ ان کا تعلق ہندوستان کی بنگالی زبان کے شاعر اعظم بیگم کے خاندان سے تھا۔ ان کے والد کرل چوہدری پہلے ہندوستانی فوجی سرجن تھے۔ وہ ایک بہت اچھے ڈاکٹر اور سرجن تھے۔ دیویکا رانی جنوبی ہند کے ایک قصبے میں پیدا ہوئی تھیں۔ ان کی پیدائش کا سال 1908ء اور ممبئی مارچ ہے۔ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے

کچھ ہوتا ہے۔ میں انہوں نے یہ شلواری قیص بھی پہنی تھی اور ہر ایک کو بتا رہے تھے کہ یہ تھ میری بہن پشاور سے میرے لیے لائی تھی۔

بمبئی میں نور جہاں اور ان کے شوہر نے بہت اچھے دن گزارے تھے۔ ان کے شوہر تو اداکاروں سے مل کر اچھے خوش ہوئے تھے کہ وہ 1998ء میں دوبارہ بمبئی گئے اور وہاں ایک ماہ سے زیادہ شاہ رخ کے گھر مہمان رہے۔

نور جہاں نے بتایا کہ میں نے اپنے بیٹے کا نام شاہ رخ خان رکھا ہے۔ جب دوسری مرتبہ ہم بمبئی گئے تو شاہ رخ خان جو نیز بھی ہمارے ساتھ جانے کو تیار تھا۔ ماموں کا بہت زبردست ”فین“ ہے۔ لیکن ہم دونوں ملکوں کے مابین ناخوشگوار حالات کی وجہ سے اس کو اپنے ساتھ نہیں لے گئے۔ میرا دوسرا بیٹا شاہریز خان اس وقت چار سال کا تھا۔ اتنے چھوٹے بچے کو ساتھ لے جانا بھی مشکل تھا اس لیے ہم دونوں میاں بیوی ہی بمبئی گئے تھے۔

2008ء میں بمبئی کے حملے کے بعد حالات اتنے خراب ہو گئے کہ ہم نے بمبئی جانے کا ارادہ ہی نہیں کیا۔ پاکستان اور انڈیا کے تعلقات اس زمانے میں بہت خراب ہو گئے تھے۔

شاہ رخ خان جو نیز نے کہا ”میں بمبئی جا کر انکل سے ضرور ملنا چاہتا ہوں۔ میری امی کہتی ہیں کہ ابھی چند سال تک ہم انڈیا نہیں جائیں گے۔ جب حالات ٹھیک ہو جائیں گے تب جائیں گے۔“

شاہ رخ جو نیز سے پوچھا گیا ”کیا تم بڑے ہو کر اداکار بنو گے؟“

اس نے جواب دیا ”مجھے اپنے ماموں سے بہت محبت ہے، میں ان کا زبردست فین ہوں، مجھے ان کی فلمیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ فلم ”رب نے ملائی جوڑی“ مجھے بہت پسند ہے مگر میں خود بڑا ہو کر اداکار نہیں بننا چاہتا۔ میں تو کرکٹر بننا چاہتا ہوں، بوم بوم آفریدی جیسا۔“

”ان کا آج کل صرف ٹیلی فون اور انٹرنیٹ پر ہی رابطہ رہتا ہے۔ شاہ رخ کی بے پناہ مصروفیات کی وجہ سے زیادہ لمبی بات نہیں ہو سکتی۔۔۔۔ میں گھر کے کاموں کے علاوہ پشاور میں کونسلر بھی رہ چکی ہوں جس کی وجہ سے میں بھی مصروف ہوں۔“

ہم لوگوں نے چائے پی کر اجازت چاہی۔ نور جہاں اور ان کے شوہر ہمیں باہر تک چھوڑنے آئے۔ ہم لوگوں نے

افہایا۔ نور جہاں کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ لالہ رخ کے ساتھ خوب باتیں ہوئیں اور لالہ رخ نے انہیں شاہ رخ کے بمبئی والے گھر ”منت“ کا فون نمبر دے دیا۔

”شاہ رخ سے میری بات ہوئی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ ان کی آواز میں پہلے جیسی اپنائیت اور محبت تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ ایک نامور اداکار بن کر بھی وہ پرانے رشتوں اور رشتے داروں کو بھولے نہیں تھے۔

”شاہ رخ خان کو اطلاع دیے بغیر نور جہاں اپنے شوہر کے ساتھ بمبئی پہنچ گئیں۔ وہاں شاہ رخ خان کا بنگلہ تلاش کرنا مشکل نہ تھا۔ عیسیٰ والے کو بتایا کہ ہمیں شاہ رخ خان کے گھر جانا ہے تو وہ خوش خوشی تیار ہو گیا۔ راستے بھر وہ ہم سے سوالات کرتا رہا کہ ہم کون ہیں اور شاہ رخ خان کے گھر کیوں جا رہے ہیں۔“

”جب ہم شاہ رخ کے خوبصورت بنگلے ”منت“ پہنچے تو معلوم ہوا کہ شاہ رخ خان آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لیے گئے ہوئے ہیں۔ شاہ رخ خان رات کو ساڑھے بارہ بجے شوٹنگ سے واپس آئے تو ہم لوگوں کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئے۔“

”ارے منی، تو کب آئی؟“

”ہم لوگ صبح پانچ بجے تک باتیں کرتے رہے۔ اتنے عرصے بعد ملاقات ہوئی تھی۔ اور بہت کچھ کہنے اور سننے کے لیے تھا۔“ یہ واقعہ سناتے ہوئے نور جہاں کی آنکھیں بھر آئیں اور آواز بھی نمناک ہو گئی۔

”شاہ رخ خان ان دنوں فلموں کی شوٹنگ میں مصروف تھے۔ اکثر رات گئے گھر آتے تھے لیکن پھر بھی وہ میرے اور میرے شوہر کے لیے وقت نکال لیتے تھے۔ شاہ رخ خان نے اپنے ساتھ ہمیں بمبئی کی سپر کرائی اور شہر کے مشہور مقامات دکھائے۔ وہ ہمیں اپنی فلم کی شوٹنگ پر بھی اپنے ساتھ لے گئے اور وہاں ہر ایک سے ہمارا تعارف کرایا۔ انہوں نے سب سے یہ کہہ کر ملوایا کہ یہ میری بہن ہے۔ پشاور سے آئی ہے۔ میری فلم ساز ”یش جوہر“ سے ملاقات ہوئی، ان کا بیٹا کرن جوہر بھی سیٹ پر موجود تھا جس سے شاہ رخ نے ہمیں ملوایا۔ سیٹ پر اداکارہ جوہی چاولہ سے بھی ملاقات ہوئی۔ شاہ رخ ان دنوں فلم ”ڈپلی کیٹ“ کی شوٹنگ میں مصروف تھے۔ باتوں باتوں میں نور جہاں نے بتایا کہ فلم ”کل ہونہ ہو“ میں شاہ رخ نے جو پشاور کی چپل پہنی تھی وہ میں نے ہی انہیں تحفہ دی تھی۔ میں ان کے لیے قیص شلواری بھی لے گئی تھی جسے پہن کر وہ بہت خوش ہوئے۔ فلم ”کچھ



فلموں کے سیٹ یعنی ڈیزائن کرتی تھیں۔ لندن کے دوران تعلیم میں وہ ہمنورائے کے ساتھ ایک ایجنٹ کے ذریعے میں کام کرنے کے لیے سوئٹزرلینڈ اور سکنڈے نیویا کے ملکوں کے دورے پر بھی گئی تھیں جہاں انہیں اس ڈرامے پر بہت داد ملی تھی۔ دیویکا رانی نے لندن میں اداکاری کے علاوہ

دلپ کمار، سائرہ بانو، وجنتی مالا اور ان کی نواسی

سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اس تعلیم سے انہوں نے عملی فائدہ بھی اٹھایا اور ہندوستان کی فلمی ترقی کے لیے اپنی تعلیم اور تجربے کو استعمال کیا۔

دیویکا رانی کا ایک کارنامہ بمبئی ٹائیز کا قیام ہے۔ اس زمانے میں کلکتہ میں نیو تھیٹر اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ہنرمند لوگوں کے تعاون سے فلم سازی کر رہی تھی لیکن دیویکا رانی نے بمبئی میں اس پیمانے کی ایک کمپنی قائم کی اور بہت اعلیٰ معیار کی فلمیں بنائیں۔ انہوں نے نیو تھیٹر کی طرح جرمنی اور انگلستان سے کیمرا مین، ہدایت کار اور دوسرے ہنرمندوں کی خدمات بھی حاصل کیں اور ہندوستان کے بہترین تخلیق کاروں اور ہنرمندوں کو بھی بمبئی ٹائیز میں اکٹھا کیا جنہوں نے بہت اعلیٰ معیار کی فلمیں تخلیق کیں۔ ہندوستان کی فلمی صنعت کی ترقی اور فروغ کے لیے دیویکا رانی کی خدمات بھی فراموش نہیں کی جاسکیں گی۔ انہوں نے تعلیم یافتہ اور باصلاحیت افراد کو آگے آنے کے مواقع فراہم کیے۔

دیویکا رانی وقت سے بہت پہلے پیدا ہوئی تھیں۔ لندن میں قیام اور تعلیم نے بھی انہیں ذہنی طور پر روشن خیال اور ترقی پسند بنادیا تھا۔ وہ طبعاً رنگین مزاج تھیں۔ آزاد خیالی نے انہیں پرانی ہندوستانی روایات سے دور کر دیا تھا۔ ہمنورائے سے ان کی ملاقات لندن میں ہوئی تھی۔ دونوں کو اداکاری کا شوق تھا جس نے انہیں ایک رشتے میں باندھ دیا تھا۔ وہ ہمنورائے کے ساتھ یورپ

ایکٹیوی سے سیٹ اور پوسٹ ڈیزائن کرنے کی تربیت اور تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس زمانے میں انہوں نے لندن ایکٹیو آف آرٹ سے میک اپ سیٹ کی سجاوٹ اور دیگر شعبوں میں بھی ڈگری حاصل کی تھی۔ بمبئی ٹائیز کی فلم ”کرما“ میں کام کرنے کے بعد وہ بہترین اداکار تسلیم کی گئی تھیں۔ بی بی سی نے انہیں پہلے ٹی وی ڈرامے میں کام کرنے کا موقع دیا تھا جو کہ ایک اعزاز تھا۔ انہیں ہندوستان کے لیے بی بی سی کے پروگرام نشر کرنے کے آغاز کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ دیویکا رانی ہندوستان کے مختلف آرٹ سے متعلق اداروں کی رکن تھیں۔ انہیں 1989ء میں سوویت یونین نے ”نہرو ایوارڈ“ بھی دیا تھا۔

دیویکا رانی ایک انتہائی معزز اور مشہور خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کی پردادی ٹیگور کی بہن تھیں۔ اس رشتے سے وہ شہرہ آفاق شاعر ٹیگور کی پڑنواسی تھیں۔ ان کے والد ایم این چوہدری بھی بنگال کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

دیویکا رانی کو ہندوستان کی فلمی صنعت میں ہمیشہ ایک نمایاں حیثیت حاصل رہے گی۔ انہوں نے فلم کے فن اور تکنیک کے علاوہ اداکاری، آرکیٹیکچر اور ڈیزائننگ میں بھی لندن ایکٹیو آف آرٹ سے تعلیم حاصل کی تھی۔ اس دور میں جبکہ ہندوستانی لڑکیوں کے لیے اسکول کی تعلیم حاصل کرنے پر بھی پابندی تھی دیویکا رانی نے لندن کی ایکٹیویوں

وابستہ ہو گئے تو دیویکا رانی کو تنہا بمبئی ٹائیز کو چلانے میں بہت مشکل پیش آئی اور اس معروف ادارے کا پہلا جیسا معیار قائم نہ رہ سکا۔ حالات سے تنگ آ کر دیویکا رانی نے 1945ء میں ایک روسی مصور سے شادی کر لی اور بمبئی ٹائیز جیسا ادارہ ختم ہو گیا۔ روسی مصور سے شادی کرنے کے بعد دیویکا رانی نے فلموں سے بھی قطع تعلق کر لیا اور اپنے شوہر کے ساتھ بنگلور میں رہائش اختیار کر لی۔ بنگلور میں کنگ پورہ کے مقام پر ان کا ایک بہت وسیع و عریض اور خوبصورت فارم ہاؤس تھا جہاں یہ دنیا سے الگ تھلگ ہو کر رہتے تھے۔ اپنے روسی شوہر کی وفات کے بعد بھی دیویکا رانی اسی جگہ رہائش پذیر رہیں۔ فلمی دنیا سے ان کا کوئی تعلق اور واسطہ نہیں تھا لیکن فلمی دنیا کے بعض افراد سے ان کا تعلق قائم رہا، ان کی خدمات کے صلے میں بھارتی حکومت نے 1969ء میں دیویکا رانی کو ”پدم شری“ کے خطاب سے نوازا۔ انہیں سب سے پہلے فلموں کا سب سے بڑا اعزاز دادا صاحب پھالکے ایوارڈ بھی دیا گیا تھا۔

1994ء میں دیویکا رانی نے وفات پائی۔ پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ ان کی آخری رسوم ادا کی گئیں۔ ان کی وفات کے بعد ان کی رہائش گاہ کے بارے میں تنازعہ شروع ہو گیا تھا۔ یہ جائیداد ان کی اور ان کے مصور روسی شوہر کی مشترکہ ملکیت تھی۔ روسی حکومت نے روسی مصور کے حصے کی ملکیت کے لیے دعویٰ کر دیا لیکن بھارتی حکومت اسے تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھی معاملہ عدالت تک پہنچا جس نے اس قیمتی جائیداد کی ملکیت کا فیصلہ کیا۔

دیویکا رانی کو ہندوستان کی فلمی صنعت میں کئی حوالوں سے ایک یادگار اور اتمول مقام حاصل رہے گا۔ وہ ہندوستان کی اعلیٰ ترین خاندانی لڑکی کتنی جس نے لندن سے اعلیٰ ترین تعلیم حاصل کی تھی اور اس تعلیم سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندوستانی فلمی صنعت کو بام عروج تک پہنچا دیا تھا۔

دیویکا رانی کو اس لیے بھی یاد رکھا جائے گا کہ انہوں نے دلپ کمار جیسے مایہ ناز اداکار کو دریافت کیا تھا۔ ان کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ تیسویں دہائی سے تعلق رکھنے والی ایک اداکارہ ہونے کے باوجود وہ آج کی ماڈرن اداکاراؤں سے بھی زیادہ روشن خیال اور ترقی پسند تھیں۔ وہ آرکیٹیکچر کی طالبہ تھیں جب لندن میں ان کی ہمنورائے سے ملاقات ہوئی تھی۔ ہمنورائے کے کہنے پر بمبئی ٹائیز کی

یوسف خان کو دریافت کر کے دلپ کمار بنانے میں بھی دیویکا رانی کا ہاتھ تھا۔ مدھوبالا بھی بمبئی ٹائیز میں چائلڈ اشار کی حیثیت سے کام کرتی رہی ہیں۔ بمبئی ٹائیز نے بھی نیو تھیٹر کلکتہ کی طرح غیر ملکی کیمرا مین اور دیگر ہنرمندوں کی خدمات حاصل کیں جن کی وجہ سے اس زمانے میں بھی ان فلم ساز اداروں کی بنائی ہوئی فلموں کا معیار بہت بلند تھا اور ان ہی غیر ملکی ماہرین نے ہندوستانیوں کو بھی تربیت دی تھی۔

بمبئی ٹائیز نے ہندوستان میں فلم سازی کا ایک نیا اور اعلیٰ معیار قائم کیا تھا۔ لاہور کے ایک نوجوان خوبرو اور تعلیم یافتہ اداکار نجم الحسن بمبئی گئے تو انہیں بھی اداکار کی حیثیت سے رکھ لیا۔ دیویکا رانی نجم الحسن کے عشق میں گرفتار ہو گئیں اور ایک دن وہ دونوں فرار ہو گئے۔ ہمنورائے دیویکا رانی کو تو منکر واپس لے آئے مگر نجم الحسن کے لیے بمبئی ٹائیز کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو گئے تھے۔

ہمنورائے نے 1936ء میں فلم اچھوت کینیا بنائی تھی جس نے سارے ملک میں سنسنی پھیلا دی تھی کیونکہ یہ ایک برہمن لڑکے (اشوک کمار) اور اچھوت لڑکی (دیویکا رانی) کی محبت کی کہانی ہے۔ اچھوتوں کو اونچی ذات کے ہندو چھوٹا بھی پسند نہیں کرتے کہیں یہ کہ ایک برہمن لڑکا اچھوت لڑکی سے محبت کرے۔ اس فلم کی نمائش پر کافی شور مچا لیکن اس کو بے حد کامیابی حاصل ہوئی اور آج یہ ایک یادگار فلم بھی جاتی ہے۔ اس زمانے کی فلموں میں بوس و کنار بھی دکھایا جاتا تھا لیکن بمبئی ٹائیز کی فلم ”کرما“ میں ہمنورائے اور دیویکا رانی کا یہ سین چار منٹ طویل ہے جسے دنیا بھر کی فلموں میں ایک ریکارڈ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس فلم اور اس منظر سے یہ اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس قدیم دور میں بمبئی ٹائیز کتنا روشن خیال اور ترقی پسند ادارہ تھا۔ ہندوستان اس زمانے میں تو بہت زیادہ قدامت پسند ملک تھا مگر ایک ہندوستانی فلم میں اس قسم کے مناظر پیش کرنے کے لیے بڑے دل و جگر کی ضرورت تھی۔

1940ء میں ہمنورائے کی وفات کے بعد بمبئی ٹائیز کی ملکیت کا جھگڑا شروع ہو گیا اور ایس مکر جی کو بمبئی ٹائیز کا ایک پارٹنر بنانا پڑا۔ اشوک کمار بھی کمپنی کے حصے دار تھے، تین سال کے بعد ایس مکر جی اور اشوک کمار نے بمبئی ٹائیز چھوڑ کر فلستان کے نام سے ایک نیا ادارہ قائم کر لیا۔ بمبئی ٹائیز کے بہت سے نامور اور کارآمد لوگ فلستان سے



اداکار سدھیر

بنایا کرتے تھے۔ بیک صاحب کے کسرتی جسم کو دیکھ کر انہوں نے ان کو اپنی زیر تحویل فلم ”ہوائی کھولا“ میں ایک اہم کردار سونپ دیا، یہ فلم کامیاب ہوئی جس کے بعد بیک سرحدی نے ہدایت کار اے ایم خان کی چند اور اسٹنٹ فلموں میں کام کیا۔ محبوب خان کی فلم ”انمول گھڑی“ اور سید شوکت حسین رضوی کی مسلم سوشل فلم ”زینت“ میں بھی انہوں نے بہت اچھے کردار کیے۔ بمبئی میں انہوں نے حبیب سرحدی کی فلموں میں بھی کام کیا۔ بیجو باورا، ساقی، آوارہ، داستان اور جادو میں بھی انہیں کام کرنے کا موقع ملا لیکن مرکزی کردار ادا کرنے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ فلم ”شبستان“ کی شوٹنگ کے دوران میں فلم کے ہیرو گھوڑے سے گر کر وفات پا گئے تو باقی فلم میں شyam کا کام بیک سرحدی نے ہی سرانجام دیا تھا کیونکہ قد و قامت اور جتنے کے اعتبار سے وہ شyam سے بہت مشابہت رکھتے تھے۔ فلمستان نے شyam کے بقایا مناظر فلمانے کے لیے بیک سرحدی کو ڈپلی کیٹ کے طور پر استعمال کیا اور فلم دیکھنے والوں کو پتا ہی نہیں چلا کہ شyam کی جگہ کوئی اور اداکاری کر رہا ہے۔ اتفاق یہ ہوا کہ فلم کے آخری مناظر فلماتے ہوئے یہ بھی گھوڑے سے گر کر زخمی ہو گئے اور کافی عرصے تک زیر علاج رہے۔

صحت مند ہونے کے بعد انہوں نے واپس پشاور آنے کا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے بمبئی میں شادی بھی کر لی تھی۔ جب وہ پشاور آنے لگے تو ان کی بیوی نے ان کے ساتھ پشاور آنے سے انکار کر دیا۔ اس شادی سے ان کا ایک بیٹا بھی تھا۔ جب بیوی نے کسی قیمت پر بھی پشاور آنے سے انکار کر دیا تو وہ مجبوراً اپنی بیوی اور بیٹے کو بمبئی میں چھوڑ کر اکیلے ہی واپس وطن آ گئے۔ پشاور واپس آ کر انہوں نے اپنا کاروبار شروع کر دیا اور دوسری شادی کر لی مگر ان کی دوسری بیوی ایک بیٹے کو جنم دے کر وفات پا گئی۔ اس کے بعد

اس کے بعد وہ فلم ساز اداکار اور ہدایت کار نذیر کی کمپنی میں شامل ہو گئے اور ان کے معاون کے طور پر کام کرتے رہے۔

1947ء میں انہوں نے اپنی ذاتی فلمی کمپنی حبیب پروڈکشنز کے نام سے بنائی جس میں گیتا نظامی، گلنار، مجید اور آزاد سانی کام کر رہے تھے لیکن تقسیم ملک کی وجہ سے یہ فلم 1948ء میں بمبئی میں ریلیز ہوئی تھی۔ 1949ء میں انہوں نے بمبئی میں ایک فلم ”دیر رات“ بنائی جس کے اداکاروں میں شانتا، یعقوب اور حبیب نمایاں تھے۔ مسعود اس فلم کے ہیرو تھے۔ 1953ء میں انہوں نے فلم ”فریادی“ بنائی، 1956ء میں وہ اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان آ گئے اور چند دن لاہور میں رہنے کے بعد پشاور چلے گئے اور اپنا فلم ساز ادارہ ”حبیب پروڈکشنز“ قائم کیا۔ وہ فلموں کے تقسیم کار بھی تھے۔ پشاور میں انہوں نے فلم تم نہ مانو، بنائی اس فلم کا ایک گانا ”ڈاچی والیا موڑ مہاروے“ بہت مقبول ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی صحافت بھی کرتے رہے۔ کراچی سے انہوں نے ایک فلمی ہفت روزہ ”گل رخ“ نکالا تھا جو کئی سال تک چلتا رہا۔ کراچی میں انہوں نے فلم ”ارادہ“ کا آغاز کیا تھا لیکن فلم کی تکمیل کے دوران میں ان کے بیٹے مظفر اورک زئی کا انتقال ہو گیا، مظفر اورک زئی ان کی فلموں کے گیت لکھتے رہے تھے اور اپنے والد کے بہت نزدیک تھے۔ بیٹے کے انتقال کے بعد حبیب سرحدی اتنے دل شکستہ ہوئے کہ فلمی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ ان ہی دنوں ان کے دوسرے بیٹے جہانگیر اورک زئی بھی وفات پا گئے جس کے بعد وہ دنیا سے بیزار ہو گئے۔ ان کی صحت نے بھی جواب دے دیا۔ طویل بیماری کے بعد 1990ء میں وہ انتقال کر گئے۔

☆☆☆

پشاور کی سرزمین میں جنم لینے والوں میں نامور موسیقار ظفر خورشید اور اداکار بیک سرحدی بھی شامل ہیں۔ بیک سرحدی رام منج چوک ناصر خان میں پیدا ہوئے تھے۔ خور و اور صحت مند جوان تھے۔ انہیں باڈی بلڈنگ کا بھی شوق تھا۔ پشاور میں ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا تو بیک سرحدی نے بھی اپنی آواز کا ٹیسٹ دیا مگر ناکام رہے۔ ایک روز گھر سے تارخس ہو کر بمبئی روانہ ہو گئے۔ وہاں انہیں فلم ”ایک دن کا سلطان“ میں مختصر کردار مل گیا۔ وہیں ان کی ملاقات ہدایت کار اے ایم خان سے ہوئی۔ وہ جادو کی اور ایکشن فلمیں

کی اس داستان سے وہ کتنے متاثر ہوئے تھے اور کیا وہ واقعی دیوکارانی کے عشق میں گرفتار ہو گئے تھے یا محض وقتی جذبہ تھا۔ البتہ انہوں نے ایک مختتم اور اداکارہ کے طور پر دیوکارانی کی خدمات کا اعتراف کیا اور بس..... پھر خاموش ہو گئے۔

دیوکارانی ہندوستانی فلمی صنعت میں دلیپ کمار کو دریافت کرنے کے حوالے سے بھی یاد رکھی جائیں گی، یہ برصغیر کی فلمی صنعت پر ان کا بہت بڑا احسان ہے۔

☆☆☆

پشاور سے تعلق رکھنے والی ایک اہم اور قابل ذکر شخصیت حبیب سرحدی بھی تھے، حبیب سرحدی فلم ساز، ہدایت کار، شاعر، اداکار، ادیب اور صحافی تھے۔ وہ جولائی 1910ء میں ایک مضافاتی قصبے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا تعلق اورک زئی قبیلے سے تھا جو اپنی بہادری اور جنگجوئی کے حوالے سے بہت مشہور ہے۔

اسلامیہ کالج پشاور سے گریجویشن کرنے کے بعد انہوں نے داغ دہلوی کے ایک شاگرد قاضی محمد عمر کی شاگردی اختیار کی۔ وہ بہت جلد شاعر، ادیب اور افسانہ نگار کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے۔ انہوں نے عملی زندگی کا آغاز ایک کلرک کی حیثیت سے کیا تھا کہ ان کی ملاقات آغا حشر کے ایک شاگرد قمر سرحدی سے ہوئی جن کی وجہ سے ان کا رجحان تھیٹر اور ڈرامے کی طرف ہوا۔ چند ڈراموں میں اداکاری کرنے کے بعد انہوں نے اپنا تھیٹر کلب قائم کر لیا جس کا نام فرنیٹر تھیٹر کمپنی تھا۔ اس زمانے میں ہندوستان بھر کی مشہور تھیٹر یکل کمپنیاں پشاور آ کر ڈرامے پیش کرتی تھیں۔ حبیب سرحدی تمام صوبے میں اپنی تھیٹر کمپنی کے ڈرامے پیش کرتے رہے اور کئی کامیاب ڈرامے پیش کیے جس کے مصنف شاعر اداکار اور ہدایت کار بھی وہ خود ہی تھے۔ ان کا ایک ڈراما پشاور میں کئی ماہ چلتا رہا۔

1942ء میں حبیب سرحدی نے بمبئی جا کر قسمت آزمائی کرنے کا فیصلہ کیا، بمبئی میں ان کی ملاقات فلمی ادارے واڈیا مودی ٹون کے مالک ہومی واڈیا سے ہوئی جو ان سے بہت متاثر ہوئے اور حبیب سرحدی کو اپنی فلم کمپنی میں ملازم رکھ لیا۔ وہاں انہوں نے ایک فلم میں ہومی واڈیا کے معاون کی حیثیت سے کام کیا۔ اس فلم کے موسیقار فیروز نظامی تھے۔ اس کے بعد انہوں نے ہومی واڈیا کے اسٹنٹ کی حیثیت سے تین چار فلموں میں معاونت کی۔

کے مختلف ممالک میں اداکاری کا مظاہرہ بھی کرتی رہیں۔ ہندوستان واپس آ کر ان دونوں نے بمبئی ٹائیز کی بنیاد ڈالی اور اچھوتے موضوعات پر فلمیں بنائیں اور بنوائیں۔ ان کی آزاد خیالی کا اندازہ تو اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس زمانے میں انہوں نے فلم میں طویل بوسے کا ایک ریکارڈ قائم کیا۔ اس کے بعد ہندوستان میں سنسر نے اسکرین پر بوسہ بازی پر پابندی عائد کر دی تھی۔

دیوکارانی بمبئی ٹائیز کے لیے تعلیم یافتہ اور خوبرو افراد کو تلاش کر کے اداکار بنایا کرتی تھیں۔ پنجاب سے جب نجم الحسن بمبئی گئے تو دیوکارانی کی نگاہ انتخاب نے انہیں بھی اداکار کی حیثیت سے منتخب کر لیا۔ نجم الحسن صاحب کو ہم نے اس وقت دیکھا جب وہ پچاس سے زائد عمر کے ہو چکے تھے۔ پاکستان کی چند فلموں میں بھی انہوں نے کام کیا اور ہمیں ان سے ملنے کے مواقع بھی ملے۔ وہ بہت باخبر اور تعلیم یافتہ آدمی تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ان کی شخصیت باوقار، بارعب اور بہت موثر تھی۔

نجم الحسن بمبئی ٹائیز سے وابستہ ہوئے تو دیوکارانی ان کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔ وہ اس وقت بھی ہمنسورائے کی بیگم تھیں لیکن نجم الحسن کی محبت کے سحر میں گرفتار ہونے کے بعد وہ سب کچھ فراموش کر کے ان ہی کی ہو گئیں یہاں تک کہ نجم الحسن کی خاطر گھریار اور شوہر کو چھوڑ کر ان کے ساتھ چلی گئیں۔ ہمنسورائے نے دیوکارانی کو واپس لانے کے لیے بہت کوشش کی کیونکہ وہ ان کے بغیر خود کو نامکمل خیال کرتے تھے مگر دیوکارانی کے سر پر نجم الحسن کی محبت کا بھوت سوار تھا۔ کافی عرصے بعد انہیں سمجھا بجا کر اپنے شوہر کے پاس واپس جانے پر رضامند کیا گیا اور وہ واپس اپنے گھر چلی گئیں۔

نجم الحسن صاحب لاہور کے شاہ نور اسٹوڈیوز میں ایک فلم کی شوٹنگ کر رہے تھے جب ان سے ہمیں ملاقات کا موقع ملا۔ اس عمر میں بھی وہ ایک باوقار، بارعب اور دلکش شخصیت کے مالک تھے۔ دو تین ملاقاتوں کے بعد جب بے تکلفی ہوئی تو ہم نے جھجکتے ہوئے ان سے دیوکارانی اور بمبئی ٹائیز کے بارے میں معلوم کرنا چاہا۔ ان کی نگاہوں میں ایک لمحے کے لیے چمک پیدا ہوئی اور وہ مسکرا کر بولے۔ ”چھوڑیے، پرانی یادوں کو کیا کریدنا۔“ رات گئی، بات گئی۔

ان کے لب و لہجے سے کوئی اندازہ نہیں ہو سکا کہ محبت



فلم قسمت کے پوسٹر کا عکس، حبیب سرمدی کی فلم پکار کا پوسٹر کرتے تھے۔

لالہ جگت نرائن نے ان کا یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا کیونکہ یہ دستور کے خلاف تھا۔ آغا صاحب لالہ جی کے گھر پہنچ گئے۔ لالہ جگت نرائن کا تعلق بھی صوبہ سرحد سے تھا ان کے گھر پر آغا صاحب کی ملاقات جگت نرائن کی والدہ سے ہوئی اور انہوں نے تمام داستان انہیں سنائی۔ لالہ جی کی والدہ سے انہوں نے فارسی اور پشتو میں بات چیت کی۔ وہ بھی دونوں زبانیں جانتی تھیں۔ لالہ جگت نرائن کی والدہ ان سے بہت متاثر ہوئیں۔ انہیں گھر میں لے جا کر کھانا کھلایا اور بہت محبت سے گفتگو کی، لالہ جی کی والدہ ان سے اتنی متاثر ہوئیں کہ انہیں اپنا بیٹا بنالیا۔

لالہ جگت نرائن گھر واپس آئے تو وہاں آغا گل کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ان کی والدہ نے کہا کہ آج سے یہ بھی میرا بیٹا اور تمہارا بھائی ہے۔ اس سے بھائیوں جیسا سلوک کرنا اور کبھی شکایت کا موقع نہ دینا۔ لالہ جگت نرائن نے منہ بولے بھائی کو گلے لگا لیا اور تمام زندگی ان سے بھائیوں جیسا ہی سلوک کیا۔ انہوں نے تمام شمالی علاقے کی ڈسٹری بیوشن کے حقوق آغا گل کو دے دیے۔ آغا گل نے پشاور میں اپنا تقسیم کار ادارہ قائم کیا اور فلموں کے کاروبار سے بہت فائدہ اٹھایا۔ لالہ جگت نرائن بہت بڑے فلم ساز تھے اور بمبئی کی بہترین اور کامیاب فلمیں خرید کر لاتے تھے۔ ان فلموں کو وہ شمالی ہند سرکٹ کے لیے آغا صاحب کو دے دیا کرتے تھے۔ اس طرح آغا گل بہت جلد خوشحال اور کامیاب تقسیم کار بن گئے۔ انہوں نے پشاور میں ایک سینما بھی لے لیا۔ پشاور میں کاروبار چل پڑا تو انہوں نے لاہور کا رخ کیا جو فلمی مرکز تھا۔ لاہور میں دفتر قائم کر کے انہوں نے تقسیم کاری کا کام شروع کر دیا۔ 1946ء میں انہوں نے پشاور میں ایک اور سینما بنایا اور ڈیرہ دون میں بھی ایک سینما خرید لیا۔

دوسرے فلم تقسیم کاروں کی طرح پاکستان میں ہندوستانی فلموں کی درآمد پر پابندی عائد کرنے کے سخت مخالف تھے لیکن جب یہ پابندی عائد ہو گئی تو انہوں نے اپنی تمام توجہ اور وسائل پاکستان میں فلمی صنعت کی ترقی کے لیے وقف کر دیے تھے۔

وہ آغا گل کے نام سے مشہور تھے۔ ان کا پورا نام آغا احمد گل تھا۔ وہ فروری 1913ء کو پشاور میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد لیفٹیننٹ کرنل غلام محی الدین افغانستان کے شاہ امان اللہ کے ذاتی معالج تھے۔ افغانستان میں امان اللہ کی حکمرانی ختم ہونے کے بعد وہ پشاور آ گئے جہاں انہوں نے ادویات کا کاروبار بڑے پیمانے پر شروع کیا اور بیرون ملک بھی ادویات برآمد کرنے لگے، ان کے دو اور بیٹے حکیم جان اور عبدالرحیم جان بھی تھے۔

آغا احمد گل نے پشاور میں تعلیم حاصل کی۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد ان کا رجحان انہیں فلموں کی طرف لے گیا۔ ابتدائی عمر ہی سے وہ گھر والوں سے چوری چوری فلمیں دیکھنے جاتے تھے اور راز کھل جانے پر سزا بھی پاتے تھے مگر فلموں کا بھوت ان کے سر سے نہ اتر سکا۔ جبکہ ان کے دوسرے بھائی تعلیم میں دلچسپی رکھتے تھے اور بڑے عہدوں پر فائز ہوئے۔

گھر والوں کے تعلیم پر زور دینے پر وہ ایک روز پشاور سے دہلی روانہ ہو گئے۔ روایتی سے قبل وہ اپنے والد کی دکان سے کچھ رقم نکالنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ دہلی جا کر انہوں نے فلموں کی تقسیم کاری کے لیے اپنی تمام پونجی لگا کر تین فلمیں خریدیں، والد کے خوف سے راولپنڈی کی بجائے انہوں نے مری میں ان فلموں کی نمائش کی، بد قسمتی سے یہ تین فلمیں فلاب ہو گئیں۔ (ایک انتہائی کامیاب تقسیم کار اور فلم ساز بن جانے کے بعد بھی آغا صاحب کو جو فلم پسند آتی تھی وہ عموماً فیل اور جو نا پسند ہوتی تھی وہ کامیاب ہو جاتی تھی لیکن قسمت کے دھنی تھے۔ جس کام میں بھی ہاتھ ڈالتے تھے دولت ان کے قدم چومتی تھی)

آغا صاحب ان فلموں کی ناکامی کے بعد شدید مالی مشکلات میں گرفتار ہو گئے یہاں تک کہ فاقوں کی نوبت آ گئی مگر انہوں نے ہمت نہ ہاری، بغیر ٹکٹ سفر کے دوبارہ دہلی گئے اور تقسیم کار لالہ جگت نرائن کے دفتر جا کر ان سے اپنی رقم واپس لینے کا مطالبہ کر دیا۔ لالہ جگت نرائن بہت بڑے فلم ڈسٹری بیوٹر تھے جو شمالی ہند کے وسیع علاقے کو فلمیں فراہم

تھیں۔ فلم ”دل“ کے گیت کافی مشہور ہوئے تھے جو نور جہاں کی آواز میں تھے۔ خصوصاً یہ گیت۔

1۔ دے کے مجھے وہ دردِ جگر
بھول گئے کیا بھول گئے
2۔ ندیا کا بہتا پانی
آئی گھڑی سہانی
1947ء میں انہیں فضلی برادرز کی فلم ”راستہ“ کی موسیقی بنانے کا موقع ملا۔ اس فلم کے گانے پسند کیے گئے۔ ایک گانا بہت مقبول ہوا تھا۔
لکھی نصیب میں ہیں ٹھو کریں زمانے کی
تقسیم کے بعد بھی وہ بمبئی میں موسیقار کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

1955ء میں خورشید ظفر پاکستان واپس آ گئے اور انہیں کراچی میں فلم ”ستاروں کی دنیا“ کی موسیقی بنانے کا موقع ملا، ایک اور فلم ”عشق حبیب“ کی موسیقی بھی انہوں نے بنائی تھی۔ اس فلم میں ان کی بنائی ہوئی ایک قوالی بہت پسند کی گئی۔

میرا کوئی نہیں ہے تیرے سوا
میں بن کے سوالی آیا ہوں
”عشق حبیب“ ان کی آخری فلم تھی، ان کا انتقال کراچی میں ہوا۔

☆ ☆ ☆
آغا جی اے گل کا تعلق بھی پشاور سے ہی تھا۔ پاکستان میں فلمی صنعت کے عروج اور اس کو تعلیم یافتہ، ذہین اور ممتاز فن کار، ہنرمند، فلم ساز ہدایت کار مصنف نغمہ نویس فراہم کرنے کے لیے آغا گل کی خدمات کبھی فراموش نہیں کی جاسکیں گی۔ انہوں نے پاکستان کی فلمی صنعت کو وہ تخلیقی ذہن فراہم کرنے میں مدد کی جو ان کی مدد کے بغیر فلم سازی اور ہدایت کاری کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے ایشیا کا خوبصورت ترین اور جدید ترین ایور نیو اسٹوڈیو تعمیر کیا جو پاکستان کے فلمی حلقوں کے لیے ایک اکیڈمی اور فلم کلب کی حیثیت رکھتا تھا۔ انہیں صحیح معنوں میں پاکستان کی فلمی صنعت کے معماروں کی صفِ اول میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر ان کی کاوشیں شامل نہ ہوتیں تو پاکستان کی فلمی صنعت اس عروج سے ہم کنار نہ ہوتی جس کے باعث وہ انڈیا کے مقابلے میں معیاری اور خوبصورت فلمیں بنانے کے قابل ہوئی تھی۔ اگرچہ ایک زمانے میں وہ

انہوں نے تیسری شادی کر لی۔ اس بیوی سے ان کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں۔

1957ء میں حبیب سرحدی نے پاکستان آ کر کراچی میں ایک فلم ”تم نہ مانو“ کا آغاز کیا تو فلم میں ایک کردار کے لیے بیک صاحب کو بھی کراچی بلا لیا۔ ”تم نہ مانو“ میں بہار اور حبیب نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ صابرہ سلطانہ اور نذر بھی اس فلم کے اداکاروں میں شامل تھے۔ فتح علی خان اس فلم کے موسیقار تھے۔ یہ فلم ان کی آخری فلم ثابت ہوئی۔ 1950ء میں پشاور میں انہوں نے وفات پائی۔ بیک صاحب کا پورا نام فرزند پشاور بیک سرحدی تھا۔

☆ ☆ ☆
پشاور میں پیدا ہونے والے موسیقار ظفر خورشید نے بھی موسیقی کے میدان میں کافی نام پیدا کیا۔ موسیقی سے محبت انہیں ورثے میں ملی تھی۔ ان کے والد پشتو کے ایک لوک گلوکار تھے۔ ظفر خورشید کی موسیقی سے دلچسپی دیکھ کر ان کے والد نے انہیں موسیقی کی تربیت دی۔ ان کے والد محبت خان گانوں کی ریکارڈنگ کے لیے اکثر دوسرے شہروں میں جاتے رہتے تھے۔ ظفر خورشید بھی اپنے والد کے ساتھ جایا کرتے تھے اور اس طرح ان کی موسیقاروں اور گلوکاروں سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ انہوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر مختلف موسیقاروں سے استفادہ کیا۔ ظفر خورشید موسیقی کی دنیا میں نام پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انہیں سب سے موزوں شہر بمبئی تھا۔ ظفر خورشید نے بھی بمبئی جا کر قسمت آزمائی کرنے کا فیصلہ کیا۔ بمبئی میں انہیں فلمی ادارے سن رائز پیکر میں کام کرنے کا موقع مل گیا۔ اس زمانے میں سید شوکت حسین رضوی بمبئی میں فلم ”نوکر“ بنا رہے تھے۔ اس فلم کے موسیقار رفیق غزنوی تھے۔ ظفر خورشید نے معاون کے طور پر فلم ”نوکر“ میں رفیق غزنوی کے اسٹنٹ کے طور پر کام کیا۔ ظفر خورشید نے اس فلم کے لیے دو گانے بھی ریکارڈ کرائے جو نور جہاں اور راج کمار کی آوازوں میں صدا بند کیے گئے تھے۔ ”نوکر“ کے بعد انہوں نے ماں باپ، گھر اور جیون چھایا میں موسیقار اے آر قریشی کے معاون کی حیثیت سے کام کیا۔ کچھ عرصے بعد وہ فلم ساز ادارے فضلی برادران سے منسلک ہو گئے۔ فضلی صاحب نے انہیں اپنی فلم ”دل“ کی موسیقی بنانے کی ذمہ داری سونپ دی تو یہ ان کے لیے ایک اہم موقع تھا۔ اس فلم کے ہدایت کار حسین فضلی تھے۔ اس فلم کی ہیروئن نور جہاں



اداکارہ نیلینی جیونت

اسٹوڈیو کی سجاوٹ اور صفائی کا بہترین بندوبست کیا تھا اور ذاتی طور پر بھی دیکھ بھال کرتے رہتے تھے جس کی وجہ سے یہ ایک قابل فخر اسٹوڈیو بن گیا تھا۔ بہترین فلم سازوں کی پہلی ترجیح بنی اسٹوڈیو ہوتا تھا۔ دوسرے ملکوں کے سربراہ پاکستان کا دورہ کرتے تھے تو انہیں ایور نیو اسٹوڈیو میں ڈنر باظہر اندہ ضرور دیا جاتا تھا۔ اسٹوڈیو کی سیر کرائی جاتی تھی اور فلموں کے مناظر بھی دکھائے جاتے تھے۔

آغا صاحب کی فلم سازی کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ انہوں نے پنجابی فلم ”دلا بھٹی“ بنائی جس کے ہدایت کار ایم ایس ڈار اور موسیقار جی اے چشتی تھے۔ یہ فلم بے حد کامیاب ہوئی۔ سدھیر، صبیحہ خانم، ایم اسماعیل، آشا پوسلے اور نذر اس فلم کے نمایاں اداکار تھے۔ فلم ”دلا بھٹی“ کے گانے بھی بہت مقبول ہوئے تھے۔ خصوصاً اس گیت نے تو مقبولیت کے ریکارڈ توڑ دیے تھے۔

سول تینوں رب دی تو جاویں کبوتر

یہ گیت زبیدہ خانم کی آواز میں ریکارڈ کیا گیا تھا اور صبیحہ خانم پر فلما یا گیا تھا۔ فلم سازی کی حیثیت سے آغا گل نے اور بھی کامیاب اور مشہور فلمیں بنائیں جن میں ڈاچی، باغی سردار، پائل کی جھنکار، قیدی، اک تیرا سپارا، جان آرزو، نجمہ شامل ہیں۔ مغربی پاکستان کی پہلی رنگین فلم ”نانیلا“ کے فلم ساز بھی آغا گل ہی تھے۔ ان کی بیشتر فلمیں بے حد کامیاب ہوئیں۔

آغا جی اے گل ایک کامیاب شفیق اور دور اندیش انسان تھے۔ انہوں نے نہ صرف کئی افراد کو ہوتیس اور سرمایہ فراہم کر کے فلم ساز بنادیا بلکہ اپنے عملے کے ذہین ارکان کو بھی فلم ساز بننے کے موقعے فراہم کیے۔ وہ ان لوگوں کی کامیابیوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔ وہ خداترس اور بچ وقت نمازی تھے۔ ہر وقت با وضو رہتے تھے۔ انہوں نے کبھی اپنے کسی ملازم کو نوکری سے نہیں نکالا۔ ان کے خلاف شکایات اور ٹھوس ثبوتوں کے باوجود وہ ان پر وقتی طور پر ناراض تو ہوتے تھے مگر نوکری سے نہیں نکالتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ کسی کو بے روزگار کرنا گناہ ہے، نہ جانے میں کس کی قسمت کا کھار ہا ہوں۔ بڑے سے بڑے نقصان پر بھی وہ ناراض ہو کر متعلقہ عملے کے رکن کو برطرف کر دیا کرتے تھے مگر چند روز بعد دوبارہ رکھ لیتے تھے۔ ہر انسان میں کچھ خامیاں بھی ہوتی ہیں لیکن جس میں خامیاں کم ہوں اور خوبیاں زیادہ اس کو قابل تحریف انسان کہا جاتا ہے۔ آغا

بھٹی سے منگوا کر اس فلم میں شامل کیا تھا۔

آغا گل نے اس دور کے کامیاب ہدایت کار انور کمال پاشا کو بھی سرمایہ فراہم کیا۔ انور کمال پاشا نے آغا صاحب کے لیے کمال پچرز کے سینر تلے ”گمنام“ اور قاتل، بھی بنائی تھیں جو بے حد کامیاب ہوئی تھیں۔ خاص طور پر ان کی موسیقی کی ہندوستان میں بھی دھوم تھی۔ گمنام میں سدھیر اور صبیحہ خانم مرکزی کردار تھے۔ راگنی، ایم اسماعیل اور ایک نیا چہرہ سیمابھی اس فلم کی کاسٹ میں شامل تھے۔ موسیقی ماسٹر عنایت حسین نے بنائی تھی۔ ”گمنام“ کی موسیقی یادگار رہے گی۔ فلم ”قاتل“ میں صبیحہ اور سنتوش کی جوڑی تھی۔ مسرت نذیر نئی نئی فلموں میں آئی تھیں۔ ”قاتل“ میں انہوں نے معاون اداکارہ کا کردار کیا تھا۔ یہ مسرت نذیر کی پہلی اردو فلم تھی۔ ان کی زندگی کی پہلی فلم پنجابی زبان میں تھی۔ اس کا نام ”پتن“ تھا۔ سنتوش کمار اس فلم کے ہیرو تھے۔ ہدایت کار لقمان اور موسیقار جی اے چشتی تھے۔

”قاتل“ کے موسیقار ماسٹر عنایت حسین تھے، ”گمنام“ اور ”قاتل“ دونوں فلموں کے گیت بے حد مقبول ہوئے تھے جو اقبال بانو کی آواز میں صدابند کیے گئے تھے۔ ”گمنام“ کا گیت

”تو لاکھ چلی رے گوری تھم تھم کے
پائل میں گیت ہیں چھم چھم کے
اور فلم ”قاتل“ کا یہ نغمہ

الفت کی نئی منزل کو چلا
تو باہیں ڈال کے باہوں میں
دل توڑنے والے، دیکھ کے چل
ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں

لافانی بن چکے ہیں۔۔۔ گمنام، کے نغمہ نگار سیف الدین سیف اور ”قاتل“ کے نغمہ نویس قلیل شفا کی تھے۔

آغا گل کی ”تقدیر“ حسب معمول ان پر مہربان تھی اور کامیابیاں ان پر نچاؤ کر رہی تھیں۔ اس دوران میں شاہ نور اسٹوڈیو کے ساتھ ہی آغا گل نے جدید ترین فلم اسٹوڈیو نیو ایور نیو اسٹوڈیو کی تعمیر بھی شروع کرادی تھی۔ پنجولی اسٹوڈیو کا معاہدہ ختم ہونے کے بعد اس اسٹوڈیو کا نام ”ایور نیو اسٹوڈیو“ ہو گیا تھا۔ اس اسٹوڈیو کو ایشیا کا خوبصورت ترین اسٹوڈیو کہا جاتا تھا۔ خوبصورت باغ، فوارے، پھولوں کے تختے اور بہترین جدید فلیش جیسے فلمی دفاتر اس اسٹوڈیو کی منفرد پہچان تھے۔ آغا صاحب نے

ان دنوں فلم ”شاہجہاں“ کی بڑی دھوم تھی جو کسی اور سینما والے نے خریدی تھی۔ آغا گل نے لالہ جگت نرائن سے دہلی جا کر مطالبہ کیا کہ ”شاہجہاں“ ان کے سینما میں چلتی چاہیے۔ سیٹھ نے کہا کہ وہ فلم تو میں کسی اور کو دے چکا ہوں مگر آغا صاحب اصرار کرتے رہے۔ لالہ کی والدہ نے اپنے بیٹے سے کہا کہ جو کچھ بھی ہو یہ فلم گل ہی چلائے گا۔ سیٹھ جگت نرائن نے مجبور ہو کر فلم کی نمائش کے حقوق آغا گل کو دے دیے۔ ایسا واقعہ پہلے بھی نہیں ہوا تھا اس لیے وہ بہت پریشان ہوئے۔ انہیں فکر اس بات کی تھی کہ آئندہ بھی لالہ جگت نرائن کی کامیاب فلمیں آغا گل ہی کو دی جائیں گی۔

ڈیرہ دون کے سینما والوں نے مل کر آغا صاحب کا سینما خریدنے کا فیصلہ کیا اور منہ مانگی قیمت پر سینما خرید لیا۔ آغا صاحب نے تمام رقم یکمشت وصول کر لی اور پشاور آگئے۔ اس وقت ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات شروع ہو چکے تھے۔ قسمت مہربان تھی جو آغا صاحب اپنا سینما فروخت کر کے اور تمام رقم وصول کر کے پشاور لے آئے ورنہ تقسیم کے بعد تو وہ سینما ہی سے محروم ہو جاتے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ قسمت آغا صاحب پر کتنی مہربان تھی۔ وہ خود بھی تقدیر کے بہت قائل تھے اور کہا کرتے تھے کہ وہی ہوتا ہے جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے۔ انسان کی کوئی تدبیر تقدیر کے ٹکے کو مٹا نہیں سکتی۔

آغا گل نے لاہور میں مستقل کاروبار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ قیام پاکستان کے وقت وہ پاکستان میں ہندوستانی فلموں کے بہت بڑے ڈسٹری بیوٹر تھے۔ اس زمانے میں ہندوستانی فلموں کے حقوق پاکستان کے لیے پچاس ساٹھ ہزار روپے میں مل جاتے تھے۔

اور یہ فلمیں لاکھوں روپے کا بزنس کرتی تھیں۔ لالہ جگت نرائن سے بھائی بندی کے باعث آغا صاحب بہترین ہندوستانی فلمیں معقول قیمت پر خرید کر لے آتے تھے۔ اس طرح بہت جلد وہ ایک ممتاز تقسیم کار بن گئے۔

آغا گل نے لاہور میں مسلم ٹاؤن کا پنجولی اسٹوڈیو کرائے پر لے کر ایور نیو اسٹوڈیو کے نام سے وہاں فلموں کی شوٹنگ کا آغاز کر دیا۔ وہ پہلے تقسیم کار تھے جنہوں نے فلم سازی شروع کی اور ”سندری“ کے نام سے ایک پنجابی فلم بنائی تھی جس کے اداکاروں میں راگنی، الیاس کاشمیری چارلی، غلام محمد شامل تھے۔ آغا صاحب نے بمبئی کی اس زمانے کی سب سے مقبول فلمی ڈانسر کلکوا ایک ڈانس بھی



آغا جی اے گل

مشہور تھیں۔ راگنی کے ساتھ پہلی ہی فلم میں کام کرنے کا موقع ملنا بھی ایک اہم بات تھی۔ اس فلم کے موسیقار ساگر تھے۔

”فرض“ میں کام کرنے کی ہامی تو شاہ زمان خان نے بھری تھی لیکن وہ ایک سیدھے سادے پنہان تھے۔ جب ان کی شوٹنگ شروع ہوئی تو کافی مشکلات پیش آئیں۔ وہ فلمی طریقوں سے واقف نہیں تھے اور انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ فلم میں جو کچھ دکھایا جاتا ہے وہ محض دکھاوا ہوتا ہے۔ دراصل وہ اس طرح فلمایا جاتا ہے کہ حقیقت معلوم ہو۔ مثال کے طور پر اگر فلم میں طمانچہ یا گھونسا مارتا ہو تو سچ مچ پھٹریا گھونسا نہیں مارا جاتا مگر وہ ابتدائی دنوں میں ایسی غلطیاں کر بیٹھتے تھے جس پر ہدایت کار نذیر بیدی انہیں فلمی طور پر لیتے اور رموز سمجھاتے تھے۔ ایک منظر میں انہیں راگنی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنا تھا۔ سدھیر نے پوری طاقت سے راگنی کی کلائی تھام کر اپنی جانب کھینچا تو راگنی تکلیف برداشت نہ کر سکیں اور کئی روز تک ان کی کلائی میں درد رہا۔ ایک منظر میں انہوں نے ایک اداکار کو سچ مچ کا بھرپور طمانچہ مار دیا جس کی وجہ سے اس کا رخسار دو تین دن تک سو جا رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ فلم سازی کے رموز سیکھتے رہے۔ ابتدائی دنوں میں کئی بار شوٹنگ ملتوی کرنی پڑی۔ ایک بار تنگ آ کر سدھیر نے اداکاری ترک کرنے کا ارادہ کیا اور فلم ساز سے وصول کی ہوئی رقم واپس لوٹانے کا فیصلہ

اسی زمانے میں ان کی دوستی حسین خان سے ہو گئی۔ حسین خان دراصل پولیس کے لیے مخبری کرتا تھا جس کا اسلم خان کو علم نہ تھا۔ حسین خان کی مخبری پر پولیس نے اسلم خان کے گھر پر چھاپا مار کر کافی اسلحہ برآمد کر لیا۔ سردار اسلم خان کو جب معلوم ہوا کہ حسین خان نے دوستی کے پردے میں ان کے ساتھ دشمنی کی ہے تو وہ غصے سے پاگل ہو گئے اور طیش کے عالم میں انہوں نے حسین خان پر گولیوں کی بوچھاڑ کر کے اسے ہلاک کر دیا۔ ان پر قتل کا مقدمہ چلا اور سزائے موت سنائی گئی۔ اسلم خان نے عدالت عظمیٰ اور اس کے بعد لندن کی پریوی کونسل سے رحم کی درخواست کی مگر ان کی سزائے موت بحال رہی اور انہیں پھانسی دے دی گئی۔

اسلم خان کا خاندان لاہور میں رہائش پذیر تھا۔ شاہ زمان کے نانا ”لاہور میں اعلیٰ پولیس افسر تھے۔ نانا نے انہیں اپنی پناہ میں لے لیا اور بہت ناز و نعم سے رکھا۔ شاہ زمان کو اپنے ماموں کے ساتھ بمبئی جانے کا اتفاق ہوا۔ ان کے ماموں انڈین رائیل نیوی میں تھے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی بمبئی جائے اور فلموں کی شوٹنگ نہ دیکھے۔ وہ ایک روز شاہ زمان کو اسٹوڈیو اور فلم کی شوٹنگ دکھانے کے لیے فلم اسٹوڈیو لے کر گئے جہاں فلم ساز و ہدایت کار اے آر کاردار نے انہیں دیکھا، ان کے بارے میں معلومات حاصل کی اور ان کو فلموں میں کام کرنے کی پیشکش کر دی کیونکہ وہ ایک سرخ و سفید چہرے اور مضبوط جسم کے مالک تھے اور اپنی مردانہ وجاہت کے باعث سب کی نگاہوں کا مرکز بن جاتے تھے۔ اے آر کاردار نے انہیں فلموں میں کام کرنے کی پیشکش کی تو شاہ زمان سوچ میں پڑ گئے کیونکہ انہیں فلموں میں کام کرنے کا شوق نہیں تھا، دوسرے یہ کہ خاندانی روایات بھی راہ میں حائل تھیں اس لیے انہوں نے فلموں میں اداکاری سے معذرت کر لی اور لاہور واپس آ گئے۔ لاہور میں بمبئی سے آئے ہوئے ہدایت کار نذیر بیدی کی نظر ان پر پڑی تو انہوں نے بھی شاہ زمان کو فلموں میں اداکاری کی دعوت دی۔ شاہ زمان نے ان سے بھی معذرت کر لی اور وجہ یہ بتائی کہ ان کے خاندان والے ان کا فلموں میں کام کرنا پسند نہیں کریں گے۔ نذیر بیدی نے کہا کہ اگر وہ کوئی فلمی نام اختیار کر کے بمبئی کی فلموں میں کام کریں گے تو ان کے خاندان والوں کو کان بھی خبر نہ ہوگی۔ نذیر بیدی نے ان کا فلمی نام سدھیر تجویز کیا اور انہیں فلم ”فرض“ میں کاسٹ کر لیا۔ اس فلم کی ہیر وئن راگنی تھیں جو اس وقت کافی

پہلے بھی بہت تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے لیکن اس بار ان کے بارے میں کچھ اور معلومات بھی فراہم کی جا رہی ہیں جو شاید آپ کے لیے دلچسپی کا سبب ہوں۔

سدھیر کا اصلی نام شاہ زمان خان تھا۔ جب انہوں نے فلموں میں اداکاری شروع کی تو خاندان کی ناراضگی کے پیش نظر اپنا فلمی نام سدھیر رکھ لیا اور پھر ساری زندگی اسی نام کے ساتھ زندہ رہے یہاں تک کہ لوگ ان کا اصلی نام بھول گئے۔

سدھیر پاکستان میں اداکاروں کی پہلی کھیپ یا پہلی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اور سنتوش کمار پاکستان کے دو ممتاز اور نامور ہیر وئن تھے۔ سنتوش کمار اردو فلموں کے اکلوتے ہیر و کھلاتے تھے۔ سدھیر نے بھی بہت سی اردو فلموں میں کام کیا، شہرت اور مقبولیت حاصل کی لیکن انہوں نے زیادہ کام پنجابی فلموں میں کیا اس لیے انہیں پنجابی فلموں کا ہیر و کہا جاتا ہے۔ اس زمانے میں پنجابی فلمیں بھی بہت اعلیٰ معیار کی بنائی جاتی تھیں جو بہت کامیاب بھی ہوتی تھیں۔ پنجابی اور اردو فلموں کے اداکار مخصوص تھے۔ اگرچہ پنجابی فلموں کے اداکار اردو فلموں میں اور اردو فلموں کے اداکار پنجابی فلموں میں بھی کام کرتے تھے لیکن ان پر ٹیپا پنجابی اور اردو فن کاروں کا ہی لگا ہوا تھا۔ اس لیے سدھیر پنجابی فلموں کے مقبول ترین ہیر و اور سنتوش کمار اردو فلموں کے ممتاز ترین ہیر و تھے۔

شاہ زمان جو بعد میں فلم ساز اور ہدایت کار بھی بن گئے تھے ستمبر 1921ء کو پشاور کے نواحی گاؤں حسن گرجھی میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا تعلق مشہور پٹھان قبیلے مہمند سے تھا۔ ان کا پورا نام شاہ زمان خان تھا۔ شاہ زمان خان کے والد کا نام سردار محمد اسلم خان تھا۔ انہیں بہادر مہمند قبیلے سے تعلق رکھنے پر بہت فخر تھا۔ شاہ زمان کے دادا افغانستان سے پاکستان آ کر پشاور میں آباد ہو گئے تھے۔ شاہ زمان کے دادا کا نام میر عالم خان تھا۔ سردار اسلم خان کچھ عرصے بعد لاہور چلے گئے تھے اور انہوں نے وہیں شادی کر لی تھی لیکن خاندان والوں سے ان کا رابطہ ہمیشہ قائم رہا۔

شاہ زمان پشاور کے قریبی علاقے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا بچپن اور لڑکپن پشاور ہی میں گزرا تھا۔ تعلیم انہوں نے لاہور میں مکمل کی تھی۔ اس زمانے میں انگریزی حکومت کے خلاف تحریک چل رہی تھی۔ اسلم خان بھی اس تحریک میں شامل تھے اور باغیانہ جذبات کے حامل تھے۔

آغا گل کے بارے میں پہلے بھی تفصیل سے بتایا جا چکا ہے لیکن بہت سی تفصیلات بیان کرنے سے رہ گئی تھیں جو کہ اب بیان کر دی گئی ہیں۔

آغا صاحب نے ہمیشہ شاندار زندگی بسر کی۔ وہ ہر چیز بہترین چاہتے تھے۔ ان کا گھر، کوشی، فرنیچر، دفتر، اسٹوڈیو سب اعلیٰ درجے کے تھے۔ وہ خود بھی بہت خوش لباس انسان تھے، عموماً باہر سے لائے ہوئے ملبوسات پہنتے تھے۔ وہ اسٹائل سے رہنے کے عادی تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ہمیشہ شکر ادا کیا کرتے تھے اور صحیح معنوں میں اللہ سے ڈرتے بھی تھے، اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ اپنی کامیابیوں کو وہ اللہ کی مہربانی کہا کرتے تھے۔ کبھی ان کی زبان سے یہ نہیں سنا کہ میں نے یہ سب کچھ کیا ہے۔ کہا کرتے تھے کہ یہ سب اللہ کی دین ہے۔ آغا صاحب کا لندن کے ایک شاندار علاقے میں بھی گھر تھا جہاں وہ چھٹیاں گزارنے جایا کرتے تھے۔ بیمار ہوئے تو علاج کے لیے لندن جا کر اسی فلیٹ میں ٹھہرے تھے جہاں ہماری ان سے اکثر ملاقات ہوتی رہی تھی۔ آخری بار اس وقت ملاقات ہوئی تھی جب ہم کینیڈا سے واپس پاکستان آتے ہوئے لندن میں ٹھہرے تھے، آغا صاحب بہت کمزور ہو گئے تھے۔ لیکن ہمیشہ کی طرح خوش لباس تھے۔ ان کی بیگم نے بتایا کہ کبھی کبھی سوٹ پہن کر اور ٹائی لگا کر کلب بھی چلے جاتے تھے۔ ہم رخصت ہونے لگے تو آغا صاحب گلے لگا کر ملے اور ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ لاہور اور لاہور والوں کو بہت یاد کرتے تھے۔ یہ ان سے ہماری آخری ملاقات تھی۔ 6 ستمبر 1983ء کو لندن میں ان کا انتقال ہو گیا۔ لاہور میں سپرد خاک کیے گئے۔ پشاور کی سرزمین کے اس فرزند کو مٹی لاہور کی ملی جہاں انہوں نے زندگی کا بڑا حصہ گزارا تھا۔ اپنی گونا گوں خوبیوں اور پاکستان کی فلمی صنعت کے لیے خدمات کے حوالے سے آغا صاحب ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

☆☆☆

پشاور کے فن کاروں میں دیگر پاکستانی فن کاروں کا بھی قابل قدر حصہ رہا ہے۔ پاکستان کے ایکشن ہیر و شاہ زمان عرف سدھیر کا تعلق بھی اسی تاریخی شہر سے تھا۔ پاکستان کی فلمی صنعت کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے میں انہوں نے نمایاں حصہ لیا ہے۔ سدھیر کے بارے میں

آغا حسن عابدی (1922-1995ء)

بین الاقوامی شہرت یافتہ بنکار اور بی سی سی آئی کے بانی۔ وہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والدراجا صاحب محمود آباد کے اسٹیٹ منیجر تھے۔ انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری لی، لیکن وکالت کی بجائے بینکاری کو بطور پیشہ اپنایا۔ 1946ء میں حبیب بینک بمبئی میں ملازمت اختیار کر لی۔ پاکستان معرض وجود میں آیا تو حبیب بینک کراچی منتقل ہو گیا۔ آغا صاحب بھی کراچی چلے آئے۔ انہوں نے بنکاری میں اس قدر مہارت حاصل کر لی کہ معروف صنعت کار یوسف سہگل کو یونائیٹڈ بینک کھولنے کا مشورہ دیا۔ اس بینک کو جدید ترین خطوط پر استوار کرنے میں انہوں نے اہم کردار ادا کیا۔ 1966ء میں وہ ابوظہبی گئے اور وہاں شیخ زید بن سلطان النہیان سے ملاقات کی اور ابوظہبی میں یو بی ایل کی شاخ کھولنے کی اجازت حاصل کر لی۔ 1971-72ء میں انہوں نے اپنا بینک کھولنے کا منصوبہ بنایا۔ ان کے دو ساتھی بینکاروں صالح نقوی اور مسیح الرحمن نے بھی ان کا بھرپور ساتھ دیا۔ ابوظہبی کے سلطان نے اس منصوبے کی سرپرستی قبول کر لی۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے بینک آف امریکا کے ایک اعلیٰ آفیسر بی ایم کارلسن کا تعاون بھی حاصل کیا، جس کے نتیجے میں بینک آف امریکا ڈیپازٹریٹ کی سرمایہ کاری کرنے پر رضامند ہو گیا جس میں آغا عابدی کے ادارے کا حصہ صرف 25 فیصد مقرر کیا گیا۔ آغا حسن عابدی نے بینک کے تمام انتظامی اختیارات اپنے پاس رکھے۔ انہوں نے سان فرانسسکو بینک کا تعاون

بھی حاصل کر لیا اور اپنے بینک کا نام بینک آف کریڈٹ اینڈ کامرس انٹرنیشنل رکھ دیا۔ نومبر 1972ء میں انہوں نے یو بی ایل کے صدر کے عہدے سے سبکدوشی اختیار کر لی اور ابوظہبی اور کراچی میں بی سی سی آئی بینک میں کام شروع کر دیا۔ بینک آف امریکا کا ڈیپازٹریٹ شیخ زید اور کمال ادھم جیسے سرمایہ داروں کے سرمائے کے علاوہ 20 ملین ڈالر کا سرمایہ دیگر عرب کھاتہ داروں سے بھی حاصل کیا گیا تھا۔ 1973ء تک بی سی سی آئی نے اپنی پوزیشن بڑی مضبوط کر لی۔ پھر بی سی سی آئی نے لندن میں بھی اپنا دفتر کھول لیا اور 1974ء میں اس کی شاخیں کراچی، اسٹریٹ، سلون اسٹریٹ اور فیشن اسٹریٹ میں قائم ہو گئیں۔ 1976ء میں برطانیہ میں بی سی سی آئی کی شاخیں دو گنی ہو چکی تھیں۔ پھر لکسمبرگ کے مین آف لینڈ میں بھی بینک کی شاخیں قائم کی گئیں۔ امریکا میں بھی اس کی شاخیں قائم ہو چکی تھیں۔ 1977ء کے اواخر تک بی سی سی آئی کے اثاثے 200 ملین ڈالر سے بڑھ کر 202 ملین ڈالر ہو چکے تھے۔ پہلے پانچ ممالک میں اس کی 19 شاخیں تھیں، وہ بھی 32 ممالک میں بڑھ کر 146 ہو گئیں۔ خلیجی ریاستوں کے علاوہ افریقی ممالک، فرانس، مصر، مغربی جرمنی، جینیوا، زیورچ، ہانگ کانگ میں اس کے دفاتر موجود تھے۔ دنیا کے بڑے بڑے بینک آغا حسن عابدی کو اپنے لیے خطرہ محسوس کر رہے تھے، چنانچہ ہر جگہ ان کے کاروبار کو ٹھپ کرنے کی کوششیں کی گئیں جس کے نتیجے میں بینک خسارے میں چلا گیا۔ بالآخر اسے بند کرنا پڑا۔

مرسلہ: نوشین اختر ملک، شیخوپورہ

ان کی زندگی بجائے خود حیرتوں اور نشیب و فراز کی کہانیاں سمیٹے ہوئے ہے۔ اللہ نے زندگی دی اور موقع ملا تو ان کو متعارف کرائیں گے۔ وہ دور، وہ لوگ اب شاید کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے۔

☆☆☆

پشاور سے شوکت رحمان خٹک ایک دلچسپ ذاتی واقعے کے ساتھ آئے ہیں۔ جن لوگوں کو اداکاری کا جنون ہوتا ہے وہ اسی قسم کی حرکتیں کرتے رہتے ہیں، ملاحظہ کیجیے۔ تقریباً ایک سال سے ذیابیطس میں پاؤں کے پتھے کٹنے سے جو تکلیف اٹھا رہا ہوں وہ اب تک قائم ہے۔ رات درد کی کیفیت سے دوچار تھا کہ فون پر اطلاع ملی کہ میرے بچپن کے دوست ارشاد کا انتقال ہو گیا ہے۔ مجھے ان کی وفات کا بے حد صدمہ ہوا اور میرا ذہن ماضی کے درپچوں کی طرف پلٹ گیا۔ فلموں میں کام کرنے کی لاہور روانگی سے قبل میرے دوست ارشاد نے مجھے بتایا کہ اپنے کام میں وسعت پیدا کرنے کے لیے تمہیں اپنا موڈ 24 گھنٹے اداکاری میں رکھنا چاہیے۔ فلمی ڈریس مثلاً پنجابی فلموں کے ولن کے لیے کالی قمیص، لاجا، ایک عدد ڈنڈا، کپھاڑی اور برچھا اپنے پاس رکھا کرو۔ مختلف کرداروں کے لیے بھی

ایک بار لندن میں سدھیر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ علاج کے سلسلے میں وہاں گئے ہوئے تھے۔ واپسی پر اتفاق سے ہم دونوں ایک ہی فلائٹ سے واپس آئے۔ سدھیر صاحب نے درخواست کر کے ہماری برابر کی سیٹ خالی کرالی اور ہم دونوں نے اس سفر میں اتنی باتیں کیں جو ساری زندگی میں نہیں کی تھیں۔ اس سفر میں ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے۔ یہ قربت ان کی زندگی کی آخری سانس تک باقی رہی۔ ہم نے اصلی شاہ زمان کو اس سفر میں جانا تھا۔

سدھیر صاحب کے کسی بیٹے نے اداکاری کی طرف سنجیدگی سے توجہ نہیں دی مگر اب سنا ہے کہ ان کا نواسہ فلموں میں اداکاری کر رہا ہے۔ افسوس کہ نہ ہم اسے جانتے ہیں نہ وہ ہمیں۔ کبھی ملاقات بھی نہ ہوئی۔ مگر سدھیر صاحب کے نواسے کے لیے دعا ہی کر سکتے ہیں کہ اللہ اس کو کامیابی دے۔

سدھیر صاحب کے ساتھ ہی فلمی صنعت کا ایک سنہرا دور ختم ہو گیا جو شاید اب کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ اگر آ بھی گیا تو سدھیر صاحب جیسے لوگ تو پھر بھی نہیں آئیں گے۔

وہ کسی فلم کی آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لیے مری آئے تھے۔ ہمارے بارے میں علم ہوا تو ملنے چلے آئے۔ کافی ہنستے ہنساتے رہے مگر ہم کچھ سہمے ہوئے تھے۔ انہوں نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”بات کیا ہے، آپ اتنے چپ کیوں ہیں؟“

ہم نے کہا۔ ”سدھیر صاحب آپ ہمارا ایک کام کر دیں گے؟“

”کیوں نہیں، آپ بتائیے تو سہی۔“

ہم نے دیواری طرف انگلی کا اشارہ کیا۔ ”وہ بڑی سی مکڑی، آپ اس کا علاج کر سکتے ہیں؟“

”کیوں نہیں“ انہوں نے کہا اور پیر سے جوتا اتار کر مکڑی کو مار دیا۔ ہم نے اطمینان کی سانس لی اور کہا ”آپ تو فرشتہ بن کر اچانک آ گئے ورنہ ہم ساری رات ڈرتے رہتے اور سو بھی نہیں سکتے۔“

وہ ہنسنے لگے۔ وہی بے ساختہ اور خوبصورت مسکراہٹ جس میں ان کے موتیوں جیسے دانت چمکتے نظر آتے تھے۔ کچھ دیر گپ شپ کر کے وہ چلے گئے اور ہم نے اطمینان کی سانس لی۔ دوسرے دن رانی بیگم اور چند دوسرے اداکار بھی ملاقات کے لیے آئے۔

مہمان رہ گئے تھے۔ ہوٹل انتظامیہ اور پیرے ہم سے بخوبی واقف تھے۔ ہوٹل کا بیشتر عملہ چھٹی پر جا چکا تھا مگر جو لوگ باقی رہ گئے تھے وہ ہماری بہت دیکھ بھال کرتے تھے۔

ہماری یہ بیماری بھی عجیب تھی۔ رات کو نوبے کے قریب ہمیں بہت تیز بخار ہو جاتا تھا جو بڑھتا ہی رہتا تھا۔ صبح ہوتے ہی پسینا آتا اور ہم پسینے میں نہا جاتے۔ صبح اٹھتے تو بالکل تندرست اور چاق و چوبند۔ محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ رات کو ہم شدید بخار میں مبتلا تھے۔ نہا کر لباس پہن کر ناشتے کے لیے جاتے پھر کام شروع کرتے ویران مال روڈ پر ٹہلتے اور ڈنر کے وقت ہوٹل پہنچ جاتے۔ اس وقت تک جاڑوں میں مری جانے کا ”فیشن“ شروع نہیں ہوا تھا اس لیے مری بیوہ کے سہاگ کی طرح ویران اور اجاڑ ہو جایا کرتا تھا۔ نہ مال روڈ پر ٹہلنے والے ہوتے نہ ریسٹوران میں معزز مہمان۔ ایک رات جب ہمیں بخار چڑھنے والا تھا کہ اچانک ہماری نظر پڑی تو ہٹ کی دیوار پر ایک بہت بڑا سا مکڑا چمٹا ہوا نظر آیا۔ ہم حشرات الارض سے خوف کھاتے ہیں یا گھن کھاتے ہیں۔ لال بیگ، مکڑی اور چمچر تک کو مار نہیں سکتے۔ ہم خوفزدہ نظروں سے مکڑے کو دیکھتے رہے جو اپنی جگہ چھپا ہوا تھا۔ اچانک سدھیر صاحب آئے تو یوں لگا جیسے بہار آ گئی۔



خاموش فلموں کے دور میں پشاور کو یہ فخر حاصل تھا کہ اس دور کا سپراسٹار اسی علاقے کا تھا اور اس نے یہ مقام اپنی محنت اور صلاحیت سے حاصل کیا تھا۔ اس دور میں لوگ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے پاگل ہوا کرتے تھے لیکن جب وہ شہرت کی بلندی پر پہنچا تو زندگی نے دغا دے دی۔

برصغیر کے پہلے سپراسٹار کی داستانِ زیست

کلکتہ کا مشہور فلمی اخبار دی ورلڈ سینٹر ویکلی کا شمارہ دسمبر 1935ء میرے سامنے ہے۔ اس خاص نمبر میں اس دور کے سب سے کامیاب فلمی اداکار کی خود نوشت ہے۔ اس اداکار کا تعلق ہمارے پشاور سے ہے۔ اس کا خاندان آج بھی یہاں موجود ہے۔ یہ نایاب شمارہ بھی ان کے بھتیجے نے صندوق سے نکال کر دیا ہے۔ میں اس شمارے کے اس خاص مضمون کو پڑھنے لگا۔ وہ لکھتے ہیں۔

”1929ء میں لاہور کے مرکزی حصے میں کانگریس

ظالم نے میرا گیت اپ اتنا خطرناک بنایا تھا کہ آئینہ دیکھنے پر میں خود بھی ڈر گیا تھا۔ میں نے بھرپور غصے میں لڑکے کے باپ کو جواب دیا کہ برات لے جانے سے پہلے تمہیں میری لاش پر سے گزرنے ہوا۔ لڑکی کا باپ اپنی کرسی سے اٹھا اور کچھ کہنے سے پہلے گھبراہٹ میں اس کی پگڑی اس کے سر سے زمین پر گر گئی۔ میری آواز دوبارہ فضا میں گونج اٹھی۔ ”پگڑی سنبھال جتا۔ زمین زمیندار دی ماں ہوندی اے۔“ میں نے جب ارشاد پر نظر ڈالی تو وہ اپنے غضب ناک چہرے سے مجھے یہ تاثر دے رہا تھا کہ میں پٹری سے اتر چکا ہوں۔ میں نے دوبارہ اردو ٹریک سنبھالا۔ ”ارادے سچے ہوں تو انسان سمندر کی تہ سے موتی بھی نکال سکتا ہے۔“ لڑکی کے بھائی نے غصے میں کہا میں تمہیں گولی مار دوں گا۔ میں نے گرجدار آواز میں کہا ”گر جو گے بھی یا برسو گے بھی؟“ میں نے آخری مکالمہ اتنی زور سے کہا کہ میری نقلی مونچھ زمین پر گر پڑی اور میرا بھید کھل گیا۔ لوگوں نے مجھے بے تحاشا مارنا شروع کر دیا۔ ارشاد پر نظر دوڑائی لیکن وہ وہاں سے رفو چکر ہو چکا تھا۔ دوسرے دن میں نے ارشاد سے گلہ کیا۔ ارشاد نے جواباً کہا کہ تم میں ایک بڑے اداکار کی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔ تم فوراً لاہور پہنچو، وہاں فلموں میں کام تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ مجھے اپنی کیریئر کی پہلی فلم ”جاگیردار“ (پنجابی) میں کام کرنے کا موقع ملا۔ میں نے اپنا کردار بڑی مہارت سے نبھایا۔ پشاور آکر میں نے اپنے تمام دوستوں، عزیزوں کو آگاہ کر دیا کہ میری پہلی پنجابی فلم ”جاگیردار“ اگلے ماہ ریلیز ہو رہی ہے۔ یہ فلم دیکھنا نہ بھولے کیونکہ میرا رول بہت ٹریجک قسم کا ہے۔ وہ دن بھی آن پہنچا، جن لوگوں نے میری فلم دیکھی وہ ملاقات میں مجھ سے بہت ناراض ہوئے کہ تم نے ہمیں بے وقوف بنادیا۔ فلم میں تمہارا نام و نشان ہی نہ تھا۔ مجھے بے حد غصہ آیا کہ اتنا شاندار کام کرنے پر بھی ان لوگوں میں حسد و بغض پایا جاتا ہے اور ان سے یہ برداشت نہ ہو سکا کہ میں نے اتنا بڑا کردار بھرپور طریقے سے کیسے نبھایا۔ میں نے ان سب سے پوچھا کہ اس فلم میں جنازے کا سین تھا؟ سب نے بیک وقت جواب دیا کہ ہاں اس فلم میں جنازے کا سین ہے۔ میں نے کہا ”جنازے میں مردے کا رول میں نے ہی ادا کیا تھا، نظر اس لیے نہیں آیا کہ مجھ پر چادر پڑی تھی اور میں پھولوں میں لدا تھا۔“

جاری ہے

لباس بناؤ، چونکہ میں کھاتے پیتے گھرانے سے تھا میں نے آسانی سے یہ سب کام نبھایا۔ ارشاد کا مکان میرے مکان کے قریب واقع تھا۔ ٹی وی کی مشہور مزاحیہ سیریل الفنون کے نام سے مشہور ہے جس میں کمال احمد رضوی نے چالاک شخص کا کردار اور ننھا نے اس کا کردار کیا تھا۔ ارشاد کی مثال کمال احمد رضوی جیسی تھی اور میں ننھا کی دوسری کاپی تھا اور ارشاد کے ہاتھوں کھلونا بنا ہوا تھا حالانکہ میں اسے اپنا سچا اور ہمدرد ساتھی سمجھ کر اس کا کہا مانتا تھا۔ میرے ساتھ والے مکان میں لاہور کی ایک فیملی بطور کرایہ دار رہائش پذیر ہوئی۔ چند دنوں بعد ان کی ایک لڑکی کی شادی ہوئی، مجھے ارشاد نے آکر سارے پروگرام سے آگاہ کر دیا اور مجھے خوشخبری دی کہ تمہیں بہترین ولن کا کردار کرنے کا بھرپور موقع ہے۔ میں نے ارشاد کو کہا کہ یہ پٹھانوں کی سرزمین ہے یہاں تو عزت کے نام پر قتل ہوتے ہیں۔ میں اتنا بڑا کام کیسے کر سکتا ہوں۔ ارشاد نے کہا کہ میں تم سے قتل کرانا نہیں چاہتا اور نہ ہی تم کو کسی سے قتل کرانا مقصود ہے۔ میں تو تمہیں با اختیار ولن بنانا چاہتا ہوں کہ تم ریڈی میڈ ولن بن جاؤ، تاکہ لاہور جا کر فلم انڈسٹری میں تمہارا اتنا نام ہو جائے کہ اداکار مظہر شاہ اور اداکار ساون کو گھر بھاگ دو، میری گھبراہٹ دیکھ کر اس نے مجھے نیولین بونا پارٹ کی مثال دی کہ اس نے لنگڑا ہوتے ہوئے بھی حکمرانی کی، طارق بن زیاد نے اپنی کشتیاں جلا کر دشمن پر غلبہ حاصل کیا۔ آخر کار میں ارشاد کی چکنی چڑی باتوں میں آ گیا۔ ارشاد نے مجھ سے وعدہ کیا کہ میں بھی اس جگہ پر تمہارے سامنے بیٹھ کر تمہیں ڈائریکشن دوں گا تاکہ تمہاری حوصلہ افزائی ہوتی رہے۔ مگر اردو ڈائلاگ بولتے وقت پنجابی ڈائلاگ استعمال نہ کرنا۔ پٹری سے نیچے بھی نہ اترنا۔ میں نے ارشاد کے کہنے کے مطابق ولن کے کردار کے لیے ہائی بھری۔ کالی قمیص اور رنگین لاچازیب تن کیا، گھر کے جھاڑن سے ڈنڈا نکال کر اور ہاتھ میں کلہاڑی لے کر شادی والے گھر پہنچا، ارشاد پہلے سے وہاں موجود تھا۔ لڑکے کا نکاح پڑھانے کے لیے مولوی صاحب موجود تھے، لڑکے اور لڑکی کے والد اور دو لہا موجود تھے، جونہی مولوی صاحب نے بسم اللہ پڑھ کر نکاح کا آغاز کیا میری آواز فضا میں بلند ہوئی ”رک جاؤ ایہ شادی نہیں ہو سکتی۔“ محفل میں ایسی خاموشی طاری ہوئی جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ لڑکے کے باپ نے بہت عاجزی سے کہا۔ ”بیٹے یہ کیا کہہ رہے ہو؟“ دراصل ارشاد



دیوکی بوس سنہرا سنسار کے ہدایت کار

سٹر میر خوش اخلاقی اور پرتپاک انداز سے ملے اور میری ہمت بندھائی۔ یہ سٹر میر ہی تھے جنہوں نے اس دور کی مشہور فلم ”نور جہاں“ کی اداکارہ مس و ملا سے میرا تعارف کروایا۔ اس لڑکی سے میں درجنوں بار ملا ہوں لیکن ہر بار ملنے پر اس نے اجنبیت کا اظہار کیا تاہم ایک بار سٹر میر نے مجھے بمبئی میں بننے والی ایک مشہور فلم ”زیرینہ“ میں کام کرنے کی پیش کش کر دی کہ میں اس فلم میں شمولیت اختیار کر لوں۔ لیکن یہ ایک مختصر اور غیر اہم کردار تھا۔ میں نے اس فلم میں کام کرنے سے معذرت کر لی بعد میں سٹر میر نے بھی میرے ساتھ اتفاق کیا اور کہا کہ چھوٹے چھوٹے کرداروں کے لیے بار بار بمبئی جانے سے بہتر ہے کہ یہیں اچھے کردار کا انتظار کیا جائے۔ سٹر کاردار ان دنوں بمبئی میں تھے۔ اچانک ایک دن ان کا ٹیلی گرام مجھے موصول ہوا کہ کلکتہ آ رہے ہیں۔ وہاں سے لاہور جائیں گے جہاں وہ ایک مشکل فلم بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ کلکتہ سے لاہور جاتے وقت وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لاہور لے گئے۔ جہاں ان کے ادارے ”پلے آرٹ فوٹوٹون“ نے لاہور کی پہلی بولی فلم حور پنجاب عرف ہیرا رانجھا بنانے کا اعلان کیا۔ اس فلم میں پہلی بار میں

بارے میں تجربہ کیا گیا تھا۔ اس وقت کے دی ورائٹرز کے ایڈیٹر کا بیٹ منون رہوں گا۔ یہاں یہ کہنا ہے جانہ ہوگا کہ یہی بڑی وجہ تھی کہ جس نے ورائٹرز کے لیے مجھے یہ مضمون لکھنے پر مجبور کیا۔ 1931ء کا سال میری زندگی کا مشکل ترین سال تھا۔ مجھے ایک مشکل اداکار بننے کے لیے سخت جدوجہد کرنا پڑی۔ ناامیدی ہر جگہ میرا راستہ روکے کھڑی تھی۔ دل برداشتہ ہو کر میں نے سٹر بی سی لینڈ جو کہ اس وقت آئی جی پولیس لاہور تھے کو خط لکھا کہ وہ مجھے دوبارہ کلکتہ پولیس میں میری سابقہ ملازمت پر بحال کر دیں۔ سٹر لینڈ نہایت مہربان، عالی ہمت اور فیاض انسان تھے۔ انہوں نے



گل جمید سلطانہ بانو فلم بدروچی (باغی)

جواب میں لکھا کہ وہ مجھے میری موجودہ اختیار کردہ لائن میں کامیاب دیکھنا پسند کریں گے۔ ان مشکل حالات میں اپنے روزمرہ کے اخراجات پورے کرنے کے لیے مجھے ایک سٹریٹس کی گراؤنڈ نیجری بھی کرنا پڑی۔ ایک دن میرے صحافی دوست ٹی۔ کے طارق مجھے ایڑے دایم کے پاس لے گئے اور مجھے ان سے متعارف کروایا۔

میں نے اور آہستہ آہستہ قصہ پارینہ بن گئے۔ فلم کمپنیوں کی تعداد بھی بے حد محدود تھی۔ کلکتہ میں میڈن اور نیوٹھیٹرز اور بمبئی میں چند فلم کمپنیاں تھیں جہاں دن رات کام ہوتا تھا اور مختلف زبانوں کی فلموں کی عکس بندی ہوتی تھی۔ خاموش فلموں کا دور ختم ہونے کے بعد میں کچھ عرصہ بے روزگاری کا شکار رہا اور کلکتہ ہی میں فلم کمپنی میں اپنی قسمت آزمانے کی کوشش میں لگا رہا۔ دراصل میرے اندر ”نیوٹھیٹرز“ کے لیے ابتداء ہی سے ایک خاص کشش تھی۔ چنانچہ میں سید حانیوٹھیٹرز کے نیجنگ ڈائریکٹر سٹر بی۔ این سرکار سے ملنے چلا گیا۔ وہ مجھ سے نہایت اچھی طرح سے ملے پھر انہوں نے مجھے اپنی کمپنی کے نیجنگ ”حافظ جی“ کے پاس ان ہدایات کے ساتھ بھیج دیا کہ وہ میری آواز کا ٹیسٹ لے لیں۔

میں حافظ جی کے پاس پہنچا۔ نہ جانے کیوں حافظ جی کا رویہ شروع دن سے ہی میرے ساتھ کچھ مناسب نہیں تھا۔

انہوں نے میری آواز کا ٹیسٹ کیسے لیا؟ پہلے میرے چہرے پر کچھ لائٹ ڈالی اور پھر مانگ پر میری آواز چیک کیے بغیر ہی فوراً اپنی رائے دے دی اور کہا کہ تمہاری آواز مانیکرفون کے لیے موزوں نہیں ہے۔ میں نے بھی غصے میں انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تم دیکھو گے کہ ایک دن میں غیر مشکل فلموں کی طرح مشکل فلموں کا بھی کامیاب فنکار بنوں گا۔

یہاں میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ جس وقت میرے چہرے پر روشنی پھینک کر میری آواز کا امتحان لینے کا دنیا کا عجیب و غریب واقعہ وقوع پزیر ہوا تھا اس وقت ایک شریف اور معزز شخص بھی وہاں موجود تھے اور خاموشی سے اس تمام واقعہ کا جائزہ لے رہے تھے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ مشہور فلم میگزین ”The Varieties“ کے ایڈیٹر تھے۔ وہ میرے ساتھ انتہائی خوش اخلاقی سے پیش آئے۔ وہ میرا مقصد سمجھ گئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ اپنے میگزین میں اس واقعہ کے بارے میں ضرور لکھیں گے۔ میرے منع کرنے کے باوجود انہوں نے اپنے خصوصی شمارے ٹیگور نمبر میں ”فن برائے فن“ (Art For Art's Sake) کے عنوان سے میرے بارے میں لکھ دیا۔ یہ میری زندگی کا پہلا موقع تھا کہ جب کسی میگزین میں میرے فوٹو کے ساتھ میرے

کا اجلاس منعقد ہوا تھا۔ فرنیچر پولیس نے خصوصی طور پر مجھے اس ڈیوٹی پر تعینات کیا تھا کہ میں کانگریس کی تمام کارروائی پر نظر رکھوں۔ دن بھر کی تھکن کے بعد ذہن کی تفریح کا سلاشی رہتا ہے۔ اسی غرض سے میرا ایک دوست مجھے سینما لے گیا۔ جہاں اس وقت ڈائریکٹر اے آر کاردار کی فلم ”Mysterious Eagle“ عرف ”حسن کا ڈاکو“ زیر نمائش تھی۔ اسے اتفاق کیسے کہ وہاں میری ملاقات سٹر کاردار سے ہوئی۔ انہوں نے مجھے فلم میں کام کرنے کی پیش کش کی اور 24 دسمبر 1929ء کو میں نے کاردار صاحب کی فلم کمپنی یونا یٹڈ پلیٹرز کارپوریشن میں شمولیت اختیار کر لی۔ مجھے ”صنوبر جنگ“ میں بطور معاون اداکار متعارف کروایا گیا اور 40 روپے ماہوار تنخواہ دی جانے لگی جو کہ اس سستے دور میں اچھی خاصی رقم تھی۔ میری دوسری فلم ”Brave Hearts“ عرف ”سرفروش“ تھی جو 1930ء میں بنی تھی۔ اس فلم میں مجھے نسبتاً بہتر یعنی ولن کا کردار دیا گیا تھا۔ میری تیسری فلم ”Golden Dagger“ عرف ”قاتل کٹار“ تھی۔ اس فلم میں مجھے ہیرو کا کردار دیا گیا۔ مس گلزار میری ہیروئن تھیں۔ پھر میری زندگی کا سب سے شاندار لمحہ آ گیا۔ ”wandering Dancer“ عرف ”آوارہ رقاصہ“ میں مجھے فلم کا سب سے بڑا کردار یعنی ولن کا کردار ملا۔ لیکن نجانے کیوں میں نے یہ کردار ادا کرنے سے انکار کر دیا اور ولن کی بجائے فلم میں ہیرو کا کردار ادا کرنے پر اصرار کیا اور کاردار صاحب نے میری بات مان لی۔

فلم وانڈرنگ ڈانسر عرف آوارہ رقاصہ میں مجھے ہیرو کا کردار دیا گیا تھا جبکہ ہیروئن کے کردار کے لیے کلکتہ سے رقیہ خاتون کو خاص طور پر بلوایا گیا تھا۔ یہاں میں آپ کو بتاتا چلوں کہ آج تک میں جتنی لڑکیوں سے بھی ملا ہوں مس رقیہ خاتون ان سب سے زیادہ پرکشش تھیں۔ وہ نہایت شرمیلی سادہ اور معصوم طبیعت کی لڑکی تھیں بعد میں معلوم ہوا کہ مشکل فلموں (بولی فلموں) کے لیے اس کی آواز کو مناسب نہیں سمجھا گیا جس کی وجہ اس کی آواز کی لرنش اور شرمیلانہ پن تھا۔ فلمی دنیا سے مایوسی کے بعد رقیہ خاتون نے ایک مہارانی کے ہاں بطور گورنس ملازمت اختیار کر لی اور اس کے بعد سے پھر فلمی دنیا میں اس کے بارے میں کچھ نہیں سنا گیا۔ مشکل فلموں (Talkies) کی آمد سے غیر مشکل (خاموش) فلموں کے بہت سے مشہور فنکار بے روزگار ہو

گل حمید کی خاموش فلمیں

نمبر شمار	فلم	ریلیز	ہدایت کار	کمپنی	کاسٹ
1	سندر جنگ	1930	اے۔ آر۔ کاردار	یونائیٹڈ پلیرز کارپوریشن لاہور	ہیرالال، عنایتی سناری
2	برہم ہارٹ	1930	اے۔ آر۔ کاردار	یونائیٹڈ پلیرز کارپوریشن لاہور	غلام قادر، گلزار، ایم ظہور، رفیق غزنوی، گل حمید
3	شیر ڈنگ	1930	اے۔ آر۔ کاردار	یونائیٹڈ پلیرز کارپوریشن لاہور	ایم اسماعیل، گلزار بیگم، فقل شاہ، حسن دین، گل حمید
4	گولڈن ڈیگر	1930	اے۔ آر۔ کاردار	یونائیٹڈ پلیرز کارپوریشن لاہور	گل حمید، گلزار بیگم، حسن دین، رفیق غزنوی
5	آوارہ رقصہ	1931	جے۔ کے۔ نندہ	یونائیٹڈ پلیرز کارپوریشن لاہور	گل حمید، رقیہ خاتون، حسن دین، ہیرالال
6	میسٹر لیس بینڈ	1931	اے۔ آر۔ کاردار	یونائیٹڈ پلیرز کارپوریشن لاہور	نذیر، گلزار بیگم، اسماعیل، گل حمید
7	سوئٹ ہارٹ	1931	جے۔ کے۔ نندہ	یونائیٹڈ پلیرز کارپوریشن لاہور	اے۔ آر۔ کاردار، بہارا خیر، سردار اختر، ایم ظہور، حسن دین، گل حمید (ریلیز نہ ہوئی)

دو مرکزی کرداروں میں سے کوئی ایک کریکٹر رول دیا جائے۔ انہوں نے مجھے انتظار کے لیے کہا اور میں انتظار کرنے لگا۔ اس دوران مسٹر یوس نے تین یا چار افراد کو "دکٹمن" کا کردار کرنے کے لیے آزمایا۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی مسٹر یوس کے معیار پر پورا نہ اترتا۔ تب مجھے "دکٹمن" کا کردار ادا کرنے کے لیے بلوایا۔ فلم سینا میں میرے ساتھ پرتھوی راج کپور اور مس ڈرگا کھولے تھے۔

1933ء کے اواخر میں مسٹر کاردار نے ایٹ انڈیا فلم کمپنی کے لیے "سلطانہ" بنانے کا اعلان کیا جو کہ ان کی کامیاب خاموش فلم "Wandering" "Dancer" کا بولتا روپ تھی۔ مجھے ہیرو کے رول کی پیش کش کی گئی۔ اس بار "مس زرینہ خاتون" میری ہیروئن تھی۔ مس زرینہ بہت سیدھی سادی اور بے حد بصورت تھی۔ وہ سیٹ پر ہر قسم کی چوہن میں خود کو ڈھالنا جانتی تھی۔

یہاں میں کھلے دل سے تسلیم کروں گا کہ "سلطانہ" ہی وہ فلم ہے جس نے مجھے میرے موجودہ مقام تک پہنچایا اس فلم کی بے پناہ کامیابی اور مقبولیت کی وجہ سے ہندوستان

خوابوں کی ہیروئن مس سیتا دیوی سے ہوئی۔ میری دلی خواہش تھی کہ میں اس سے ملوں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار جب میری اس سے ملاقات ہوئی تو میں نے یونہی اس سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ بھی فلم "چندر گپت" میں کوئی کردار کرے۔ میری بات کے جواب میں اس نے کہا تھا کہ وہ ابھی اتنی بڑی اشار نہیں ہے کہ وہ اتنا اہم رول ادا کر سکے۔ لیکن بالآخر اسے "چھایا" کے کردار میں کاسٹ کر لیا گیا اور اس طرح میرے خوابوں کی ہیروئن میری فلم کی ہیروئن بن گئی۔

"چندر گپت" کے بعد میری فلمیں "ممتاز بیگم" اور "عورت کا پیار" آئیں یہ دونوں فلمیں بھی ایٹ انڈیا کمپنی نے بنائی تھیں۔ ان فلموں میں مجھے کریکٹر رول دیے گئے تھے۔ اس دوران مجھے "رادھا فلم کمپنی" کے مسٹر چھارورائے نے اپنی فلموں میں کام کرنے کی دعوت دی۔ مگر ڈائریکٹر دیو کی یوس کی فلم "سیتا" نے مجھے رادھا فلم کمپنی میں شمولیت سے روک دیا۔

میں نے مسٹر یوس سے اصرار کیا کہ مجھے فلم کے

نذیر کا انتخاب چاہیے کے کردار کے لیے کیا گیا۔ اس بعد میں گزر گئے۔ لیکن فلم کی شوٹنگ شروع ہونے میں آ رہی تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ اسٹوڈیوز میں میری زبان اور لہجہ کے بارے میں عدم تسلی کا اظہار ہو رہا ہے۔ حالانکہ اس تمام عرصے میں جبکہ میں بے روزگاری کے دور سے گزر رہا تھا میرا زیادہ تر وقت زبان کی درستگی اور مکالموں کی اور بہترین ادائیگی میں صرف ہوتا تھا۔ خاموش فلموں میں صرف اچھی اداکاری اور چہرے کے بہترین تاثرات سے کام چل جاتا تھا۔ وہاں زبان کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ لیکن بولنے فلموں کے لیے لہجہ اور مکالموں کی درست ادائیگی بھی ضروری ہوتی ہے۔ مجھے مشکل فلموں کی آمد کے ساتھ ہی اس بات کا احساس ہو گیا تھا اور فارغ اوقات میں، میں اپنی اس کمزوری کو دور کرنے کی بھرپور کوششوں میں لگا رہتا تھا اور اب میں اس قابل ہو گیا تھا کہ درست لہجہ میں اپنی فلموں کے مکالمے ادا کر سکوں۔ اداکاری کرنا اب میرے لیے کوئی مشکل مسئلہ نہ تھا۔ کیونکہ باڈی لینگویج اور چہرے پر ہر قسم کے تاثرات دینا میں پہلے ہی جانتا تھا۔ یہاں خاموش فلموں کا تجربہ بہت کام آیا۔ میری اداکاری کو زبان مل جانے کے باعث اب مشکل فلموں میں کامیابی حاصل کرنا میرے لیے مشکل مرحلہ نہ تھا۔

میں نے کاردار صاحب تک اپنی بات پہنچائی کہ میری زبان اور اداکارانہ صلاحیتوں کو جانچنے کے لیے ایک ریل کی آزمائشی فلم بنا کر اسے دیکھا جائے۔ میری بات کاردار صاحب اور ایٹ انڈیا فلم کمپنی کے مالکان کو پسند آئی اور فلم کے لیے بنائے گئے میرے کاسٹیوم میں فلم چندر گپت کے بعض انتہائی مشکل اور ڈرامائی سین فلمائے گئے۔ اپنی اس ایک ریل کی فلم میں میں نے اپنی پوری فنکارانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر کارکردگی کا کھل کر مظاہرہ کیا کیونکہ اس ایک ریل کی فلم سے ہی میری آئندہ کی فلمی زندگی کامیابی کا راز وابستہ تھا۔ چنانچہ اس ایک ریل کی آزمائشی فلم کو بنا کر پروجیکٹر پر دیکھا گیا۔ کمپنی مالکان کاردار صاحب اور اسٹاف کے دیگر ممبران نے بھی میری موجودگی میں یہ فلم دیکھی اور سب کو میری اداکاری اور مکالمے بولنے کا انداز پسند آیا۔ کمپنی مالکان نے مجھے وہاں قیام کرنے کی اجازت دے دی۔

فلم چندر گپت میرے لیے اس لحاظ سے بھی نہایت اہمیت کی حامل ہے کیونکہ اس فلم میں میری ملاقات میرے

نے مائیکروفون کا سامنا کیا اور خدا کی مہربانی سے اس امتحان میں کامیاب رہا اور میری آواز کو مائیک کے لیے موزوں سمجھا گیا۔ میں نے مذکورہ فلم میں "راجہ عدلی" کا مختصر مگر اہم کردار ادا کیا۔ یہ ایک لحاظ سے مشکل (بولتی) فلموں کے لیے میری آواز کی اہلیت جانچنے کا ٹیسٹ بھی تھا۔ لیکن مجھے نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ لاہور کی پہلی مشکل فلم بری طرح ناکام ہو گئی اور اس ناکامی کی اصلی وجہ فلم کی ناقص فوٹو گرافی تھی۔ فلم کے اکثر مناظر آؤٹ آف فوکس تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ شخص یعنی فلم کا عکاس باقاعدہ کمرہ میں بھی نہ تھا۔ لاہور کی پہلی بولتی فلم کا یہ حشر ہوا جس کا کاردار صاحب اور فلم کے تمام یونٹ کو بے حد صدمہ پہنچا اور یہ سب کچھ ہوا صرف ایک شخص کی ناقص کارکردگی کے باعث۔ کاردار صاحب اس صدمے سے بیمار ہو گئے۔ پہلے لاہور میں علاج کرواتے رہے پھر بہتر علاج کے لیے کلکتہ چلے گئے۔

1932ء کے اوائل میں مجھے "گوپی چند" نامی فلم میں مرکزی کردار کے لیے منتخب کیا گیا۔ میں اس کردار کے لیے ریہرسل بھی مکمل کر چکا تھا۔ لیکن بعد میں فلم کے پروڈیوسرز اور ہدایتکار نے اپنا ارادہ تبدیل کر لیا۔ ان کے مطابق چونکہ یہ ہندوؤں کا ایک مذہبی واقعے سے متعلق کردار تھا اور ہندو مذہب سے تعلق رکھنے والے ایک مسلمان کا انتخاب جذبات کو ٹھیس پہنچانے کا باعث ہو سکتا تھا اور بڑے ہنگاموں کا اندیشہ تھا۔ چنانچہ مجھے یہ کردار چھوڑنا پڑا حالانکہ میری بعد میں آنے والی کئی کامیاب فلموں میں میں نے ایسے کردار ادا کیے اور کسی نے بھی ان پر اعتراض نہیں کیا۔ بلکہ ایسے کرداروں میں مجھے بے حد پسند کیا گیا۔

یہ 1933ء کا ذکر ہے۔ میں فلم حور پنجاب عرف ہیرا رنجھا کی نمائش کے بعد سے ابھی تک لاہور ہی میں قیام پذیر تھا۔ کاردار صاحب علاج کے سلسلے میں کلکتہ جا چکے تھے۔ مستحیاب ہونے کے بعد انہوں نے کلکتہ کی مشہور فلم کمپنی "ایٹ انڈیا فلم کمپنی" میں بطور ہدایتکار ملازمت اختیار کر لی تھی۔

ایٹ انڈیا فلم کمپنی نے انہیں ایک تاریخی فلم "چندر گپت" بنانے کا کام سونپا۔ مسٹر کاردار، چندر گپت کے مرکزی کردار کے لیے کسی مناسب چہرے کی تلاش میں تھے۔ انہوں نے مجھے اور اداکار نذیر کو کلکتہ سے بلوایا۔ ہم دونوں کلکتہ سے روانہ ہو گئے۔ میرا انتخاب چندر گپت اور

بھر سے میرے پرستاروں اور مداحوں کے خطوط میں اضافہ ہوا جن میں سے زیادہ تعداد لڑکیوں کے خطوط پر مشتمل ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ وہ جنون کی حد تک مجھے چاہتی ہیں اور میرے آٹو گراف شدہ فوٹو کی مجھ سے طلب گاریں۔ بعض مجبوریوں کے باعث اپنے تمام تر خلوص کے باوجود میں ان کی خواہشات پوری نہ کر سکا۔ کیونکہ ہندوستان کی فلم انڈسٹری کے فنکار اتنے امیر نہیں اور نہ انہیں اس قدر خطیر معاوضہ ملتا ہے جیسا کہ دوسرے ملک کے فنکاروں کو ملتا ہے۔ (یہ ہندوستان کی فلم نگری کی 1930ء کی دہائی کی بات ہے جب ملک کے دیگر محکموں کی طرح فلم انڈسٹری سے وابستہ افراد بھی ماہوار تنخواہ پر ملازم ہوا کرتے تھے اور ایک مہینے کی تنخواہ میں وہ اپنے قیام و طعام کا بندوبست کرتے تھے اور اپنے اپنے خاندانوں کی کفالت بھی ان کے ہی ذمے ہوتی تھی)

1934ء کا ذکر ہے جب ڈائریکٹر مسٹر ڈی جی (دھیرن گنگولی) نے "Night Bird" عرف "رات کا راجا" کے نام سے ایک حیران کن جاسوسی فلم بنانے کا آغاز کیا۔ اس بار مس انوری نے میرے مقابل ہیر وٹن کا کردار ادا کیا۔ میں اس لڑکی کو اس وقت سے جانتا ہوں جب یہ میری پہلی مشکل فلم "حور پنجاب" عرف "ہیر رانجھا" میں ہیر وٹن آئی تھی۔ مس انوری کے بارے میں اس کے سوا کچھ نہیں کہوں گا کہ "وہ جیسی تھی ویسی ہی ہے۔" یہاں میں صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ فلم کے سیٹ سے باہر میرا اس کا کوئی تعلق نہیں رہا۔

اب آتے ہیں ہدایتکار "مدھوبوس" کی دھوم مچاتی کامیاب فلم "سلیمہ" کی طرف۔ اس فلم میں میرے مقابل مس مادھوی ہیر وٹن تھی۔ مجھے اس سے متعلق ایک واقعہ یاد آ رہا۔ جب ایک بار میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے غضبناک نظروں سے مجھے دیکھا اور بے حد ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس کے کندھوں سے ہاتھ ہٹالوں۔ لیکن گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ وہ "معصوم لڑکی" ان باتوں سے مانوس ہوتی چلی گئی اور یہاں تک کہ فلموں میں وہ بڑی بے باکی سے بوسے کے مناظر بھی فلمبند کروانے لگی۔

رواں سال 1935ء میں "ڈائریکٹر دھیرن گنگولی" کی ہدایت میں بننے والی فلم "بدروہی" عرف "باغی راجپوت سوار" کا ذکر کرتے ہیں۔ اس فلم میں "مس

سلطانہ" (بہمنی والی) میری ہیر وٹن تھی۔ مس سلطانہ محاط اور لوگوں میں زیادہ گھٹنے ملنے والی لڑکی نہیں تھی۔ ہمیشہ اپنی حیثیت کا زعم رہتا۔ وہ واقعی دل فریب حسن کی مالک تھی۔ اس کے بعد جو ہیر وٹن مجھے پسند آئی وہ مس رانا تھی۔ "سہراب جی کیر والا" کی فلم "Step Mother" عرف "سوتیلی ماں" میں مس رادھا میری ہیر وٹن تھی۔ وہ ایک بہت صاف گو بہادر اور آزاد خیال لڑکی تھی۔ "Victim or Murderer" مظلوم یا قاتل عرف "خونی" مسر جی آر سیٹھی ہدایت کار تھے اور مس للیتا دیوی میرے مقابل ہیر وٹن کا کردار کر رہی تھی۔

اس کے بعد میں نے اپنی ہدایتکاری میں "خیبر پاس" شروع کی۔ اس فلم کی کہانی اور منظر نامہ میرا ہی لکھا ہوا تھا۔ یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مجھے کبھی ہدایتکاری کا شوق نہیں رہا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ ایک وقت میں ہدایتکاری واداکاری دونوں کام نبھانے میں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسی لیے پہلے پہل میں نے "خیبر پاس" کی ہدایتکاری سے انکار کر دیا تھا۔ مگر ایسا انڈیا فلم کمپنی کے مالک مسر بی ایل کھیم کا بے حد اصرار کے باعث انتہائی جھجک کے ساتھ میں نے اس فلم کی ہدایتکاری قبول کر لی کہ اپنی ہی لکھی ہوئی کہانی کو اس کی اصل لوکیشن پر جا کر فلمبند کروں۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ اس فلم میں خوش قسمتی سے مس پیشنس گویر بطور ہیر وٹن کام کر رہی تھیں۔ مس گویر اس قدر مقبول تھیں کہ ان کی تعریف میں جو کچھ بھی میں کہوں وہ بہت کم ہوگا۔

مس گویر تک آکر مضمون ختم ہو گیا تھا مگر جذبہ شوق بھڑک چکا تھا۔ میں نے اپنے طور پر معلومات اکٹھا کر شروع کی تو معلوم ہوا کہ گل حمید نے خیبر پاس کی کامیابی کے بعد مزید دو بے حد کامیاب فلم باغی سپاہی اور سنہرا سنہار میں بھی بطور ہیرو کام کیا تھا۔ خاص طور پر ڈائریکٹر آریہ کاردار کی ہدایتکاری میں بننے والی فلم باغی سپاہی نے کامیابی اور مقبولیت کے تمام ریکارڈ توڑ دیے تھے۔ یہ فلم گل حمید کی شہرت اور مقبولیت کی بلند چوٹی پر لے گئی۔ اس فلم میں ان کے ساتھ اس دور کے مشہور فنکاروں نے کام کیا تھا۔ جن میں محمد اسحاق، بملا کماری، پیشنس گویر، مظہر خان، حسن دین، چوہدری گل زمان اور اکبر پشاوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ باغی سپاہی کی بے پناہ کامیابی پر ہندوستان

پھر اپنی فلم کے مالک مسر کھیم کا کو اطلاع دی کہ میں بیماری کے باعث کمپنی کی کسی اور فلم میں کام نہ کر سکوں گا لہذا سنہرا سنہار کی تکمیل کے ساتھ ہی کمپنی سے کیا ہوا معاہدہ منسوخ کر دیا جائے کیونکہ مجھے جلد از جلد اپنے گاؤں واپس پہنچنا ہے۔ مسر کھیم کا یہ سن کر بے حد پریشان ہو گئے اور گل حمید کو ان کی رہائش گاہ پر آکر تسلی دی اور پھر کلکتہ کے سب سے بڑے ڈاکٹر کو بلوا کر گل حمید کا معائنہ کروایا۔ ڈاکٹر نے تمام کیفیت کا یہ غور معائنہ کیا اور پھر مسر کھیم کا کو لے کر کمرے سے باہر چلے گئے۔ ڈاکٹر اور مسر کھیم کا کے جانے کے بعد گل حمید نے



باغی سپاہی میں بملا کماری کے ساتھ

گل حمید کے نام ہزاروں مبارک باد کے خطوط پہنچ رہے تھے جن میں گل حمید کے پرستاروں، دوستوں اور فلمی دنیا کے دیگر فنکاروں نے گل حمید کی شاندار کارکردگی میں خوش قسمتی سے مس پیشنس گویر بطور ہیر وٹن کام کر رہی تھیں۔ مس گویر اس قدر مقبول تھیں کہ ان کی تعریف میں جو کچھ بھی میں کہوں وہ بہت کم ہوگا۔

"سنہرا سنہار" جسے مشہور کلاسک ڈائریکٹر مسر بوس ڈائریکٹ کر رہے تھے۔ وہ فلم گل حمید کے کیریئر کی آخری فلم ثابت ہوئی۔ اسی فلم کی تکمیل کے دوران گل حمید کے گلے پر ایک کیے بعد دیگرے کئی گھٹیاں نمودار ہو گئیں پہلے تو گل حمید نے توجہ نہ دی پھر جب درد کی شدت میں اضافہ ہونے لگا تو اسے طور پر اس نے ڈاکٹروں سے رجوع کیا۔ ان کی دوائی دوا میں کھاتے رہے اور کام کرتے رہے۔ دواؤں سے کچھ افادہ نہ ہوا بلکہ سر درد اور بخار بھی رہنے لگا جس سے ان کی کارکردگی بھی متاثر ہونے لگی۔ گل حمید نے پہلے تو اپنی بیماری کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی لیکن



زرینہ خاتون، گل حمید، فلم سلطانہ میں

اپنے ساتھی فنکار حسن دین سے کہا کہ حسن دین تم جانتے ہو کہ ڈاکٹر مسر کھیم کا سے کیا کہے گا۔ حسن دین حیرت سے ان کی جانب دیکھنے لگا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد گل حمید نے کہا "ڈاکٹر مسر کھیم کا سے کہے گا کہ گل حمید لا علاج ہو چکا ہے۔" حسن دین نے گل حمید کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "ایسا نہ کہو دوست مایوسی کفر ہے۔ تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے اور ہم پھر ایک ساتھ بہت سی فلموں کام کریں گے۔"



گل حمید کی پسندیدہ ہیروئن پیشنس کو پر

میں سوار ہو کر انہیں الوداع کہنے کے لیے اسٹیشن تک ساتھ آئے۔ فریڈرک میل کچھ دیر میں روانہ ہونے والی تھی۔ گل حمید ریلوے پلیٹ فارم پر اپنے دوستوں کے ساتھ الوداعی ملاقات کر کے گاڑی میں سوار ہو گئے۔ ان کی سیٹ کھڑکی کے ساتھ تھی۔ گاڑی آہستہ آہستہ روانہ ہوئی تو گل حمید نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ تمام دوست ابھی تک پلیٹ فارم پر کھڑے اداس نظروں سے گاڑی کو روانہ ہوتے دیکھ رہے تھے۔ سب کی آنکھیں رُخم تھیں۔

پیشنس کو پر کی آنکھوں سے برسات کی جھڑی لگی تھی۔ آخری بار دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ گل حمید نے زخمی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی جانب دیکھا اور ہاتھ ہلا کر الوداع کہا اور پھر اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گئے۔

گل حمید سوچوں میں غم اپنی سیٹ پر بیٹھے کھڑکی سے باہر کی جانب دیکھ رہے تھے۔ گاڑی اب پوری رفتار سے اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی اور اس سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ گل حمید کے ذہن کے پردے پر تمام گزرے واقعات کسی فلم کی طرح چل رہے تھے۔ وہ تمام چہرے جن کے ساتھ اچھے اور برے دنوں کی یادیں وابستہ تھیں ایک

جلی آ رہی ہے۔ بس میں اس انتظار میں رہتی ہوں کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔

مجھے امید ہے اور میں بار بار تمہارے لیے دعا کر رہی ہوں کہ تم جلد مستجاب ہو جاؤ اور فوراً میرے پاس چلے آؤ۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ پیارے سرتاج! اب تم مجھے بھی بھی چھوڑ کر نہیں جاؤ گے نا۔ میں اس قدر تنہا ہوں۔ میرا دل اور دنیا اندھیر ہوئی ہے۔ میرے دل میں تمہاری جتنی چاہت ہے وہ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی۔

جان سے زیادہ عزیز میں نے بھی سوچا بھی نہ تھا کہ میرے دل میں تمہاری چاہت اتنی زیادہ ہو جائے گی۔ میں ایک ایک دن گن گن کر گزار رہی ہوں کہ کب ایک بار پھر میں تمہاری آغوش محبت میں ہوں گی۔

میری جان تم جلد اور ضرور واپس آ جاؤ اور میری خوشیاں مجھے لو نا دو۔

مسٹر رام کرشن نے اپنی فلم شروع کر دی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ فلم میڈن اسٹوڈیوز میں مسٹر کاردار ڈائریکٹ کریں گے۔ معلوم نہیں اس فلم کا ہیرو کون ہوگا اور کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں۔ یہاں کے حالات کچھ اچھے نہیں ہیں۔

میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ میں آپ سے کس قدر محبت کرتی ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ مجھے معلوم نہ تھا میں اس قدر تمہارے پیار میں گھو جاؤں گی مجھے ایک طویل اور پیارا سا خط جلد تحریر کریں اور اپنی صحت کا حال بھی ضرور لکھیں کہ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے اور کیا علاج ہو رہا ہے۔ اور سارا دن تمہاری کیا مصروفیات رہتی ہیں؟ کیا اب بھی تم سنسپرین (دوا) استعمال کرتے ہو۔ اور یہ بھی لکھنا کہ وہاں کا موسم کیسا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ تمہیں چوم لوں۔ خدا تم پر اپنا فضل کرے اور تمہاری حفاظت کرے اور پیارے تمہاری اپنی پیشنس کو پر

کیا تم جبکہ اب اپنے گھر میں ہو کچھ افاقہ محسوس کرتے ہو؟ کیا درد میں کچھ کمی ہوئی ہے اور کیا بخار کم ہوا ہے۔ میرا سارا دن بستر پر کروٹیں بدلتے اور یہ سوچتے ہوئے گزرتا ہے کہ میں اب کیا کروں گی اور میرا اب کیا بنے گا؟

پیشنس کو پر کا خط گل حمید کے نام

میرے پیارے سرتاج

مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ جب آپ کا تار مجھے کے لیے میں آپ کی بے حد مشکور ہوں۔ لیکن آپ نے اس وقت تار کیوں نہ بھجوا یا جب آپ لکھنؤ سے جا رہے اگر آپ کی روانگی کا علم ہوتا تو خطوط اور تار لکھنؤ کے نہ بھجواتی۔ میں اس قدر پریشان تھی کہ اسی پریشانی میں کو ایک ہی دن میں دو عدد تار بھجوا دیے۔ نواب نے آپ کو خط لکھا تھا جو کہ میں نے اس کے لیے تحریر کیا تھا۔ ان خطوط اور ڈائریوں کا کیا بنے گا؟ کیا وہ واپس مل جائیں گی؟

حقیقتاً یہ جان کر مجھے بے حد رنج ہوا کہ تم ابھی شدید بیمار ہو اور تمہیں سخت درد کی شکایت ہے۔ جان کیا لکھنؤ میں حکیم آپ کے لیے کچھ نہ کر سکے۔ وہاں آپ نے زیادہ قیام نہیں کیا اور پھر اچانک چھوڑ کر اپنے گاؤں چلے گئے۔ جبکہ لکھنؤ میں آپ کا تو ایک ہفتہ ٹھہرنے کا ارادہ تھا۔

میری جان، میرے سرتاج! اب تم کیا کر رہے ہو گھر میں تمہارا کیا علاج ہو رہا ہے۔ میں تمہارے لیے دعا کرتی ہوں اور امید کرتی ہوں کہ گھر میں تمہیں کچھ آرام ملے اگر دس پندرہ یوم تک تمہیں کسی قسم کا افاقہ نہ ہو تو پھر پیارے فوراً کلکتہ واپس آ جاؤ۔ اور اس بار مجھے موقع دو تاکہ تمہارے لیے کچھ کر سکوں۔ پیارے آپ کے علاقے ان دنوں شدید سردی ہوگی، لیکن یہاں موسم کافی گرم ہے گزشتہ روز سے بارش ہو رہی ہے جس کی وجہ سے موسم حد تک خوشگوار ہو گیا ہے۔ لیکن کچھ زیادہ ہی سردی ہے یا زیادہ محسوس ہو رہی ہے شاید میری طبیعت کچھ ناساز ہے۔ میں ایک بار پھر بے روزگار ہو گئی ہوں۔ کسی نے سے کہہ دیا کہ میں کام نہیں کرنا چاہتی لہذا مجھ سے تعذر کیے بغیر کمپنی نے اپنے منبر کو میرے گھر بھیج دیا جو اپنے ساتھ فروری کے 10 روز کی تنخواہ بھی لایا جو کہ اس نے مجھے کر دی۔ میرا خیال ہے کہ کوئی بھی اس بات سے انکار کر سکتا۔ اسے قسمت کہتے ہیں۔ لیکن میں نہیں جانتی کہ تقدیر نے اس قدر جلد میری قسمت میں اتنی زیادہ بد نصیبی کیوں دی۔ گزشتہ چھ ماہ سے یکے بعد دیگرے مصیبتیں ہیں

گل حمید نے ایک اداس مسکراہٹ کے ساتھ اپنے دوست کو دیکھا اور پھر کہا کہ تم ابھی جاؤ اور مسٹر بوس سے کہو کہ وہ جلد از جلد سنہرا سنسار کو مکمل کریں یا میرا کام مکمل کر لیں تاکہ میں جلد از جلد اپنے گاؤں جا سکوں۔

غرض سنہرا سنسار تیزی سے تکمیل کی جانب اور اپنے وقت کا سپر شارموت کی وادیوں کی طرف بڑھتا رہا۔ گل حمید نے دن رات کام کر کے فلم مکمل کروا دی اور فلم کی نمائش کا انتظار کیے بغیر اپنے گاؤں واپس جانے کی تیاری کرنے لگا۔ کاردار صاحب اور مسٹر کھدکا نے انہیں کلکتہ میں رہ کر علاج کروانے پر زور دیا لیکن گل حمید کسی بھی طرح راضی نہ ہوئے۔ مجبوراً انہیں جانے کی اجازت دے دی گئی اور اگر اجازت نہ بھی ملتی تو وہ کب رکنے والے تھے۔ اسی دوران کسی نے کاردار صاحب اور گل حمید کو بتایا کہ لکھنؤ کے ایک حکیم صاحب گلیوں کے علاج کے سلسلے میں بے حد مشہور ہیں کیوں نہ پشاور جاتے ہوئے لکھنؤ میں کچھ دن رک کر حکیم صاحب سے بھی مشورہ کر لیا جائے۔ کاردار صاحب کے بے حد اصرار پر گل حمید نے لکھنؤ والے حکیم صاحب سے مشورے کی ہامی بھری۔

گل حمید نے لکھنؤ رکنے کا وعدہ تو کر لیا تھا لیکن اب انہیں گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ چنانچہ فریڈرک میل سے پشاور کی سیٹ بک کروالی۔ کاردار صاحب نے اپنے پونٹ کے ایک اداکار لالہ یعقوب کو سفر میں گل حمید کی دیکھ بھال کے لیے ساتھ بھجوا دیا۔ چلتے وقت گل حمید اپنے تمام دوستوں اور اسٹوڈیوز کے تمام چھوٹے بڑے ملازمین سے فرداً فرداً ملے۔ سب ہی گل حمید کے اس طرح رخصت ہونے کی وجہ سے اداس تھے، اختر نواز، لالہ یعقوب اور پیشنس کو پر کار میں بیٹھ چکے تھے۔ گل حمید بھی سب سے ملنے کے بعد کار کی طرف روانہ ہوئے۔ کار میں بیٹھنے سے قبل گل حمید نے مڑ کر ایسٹ انڈیا فلم کمپنی اور اس سے منسلک اپنی رہائش گاہ کی جانب ایک نظر دیکھا جہاں انہوں نے اپنی زندگی کے بہترین لمحات گزارے تھے۔ جہاں متکلم فلموں میں کامیابی کے حصول کے لیے بے پناہ جدوجہد کی تھی اور پھر شہرہ آفاق کامیابی، عزت، شہرت اور مقبولیت کی چوٹی تک پہنچنے کے واقعات ان کی نظروں کے سامنے گزر گئے۔ اور کس سے پہلے کہ کوئی ان کی دلی کیفیت کا راز ان کے چہرے سے پڑھ لیتا وہ فوراً کار میں بیٹھ گئے اور کار کلکتہ ریلوے اسٹیشن کی جانب روانہ ہو گئی۔ کچھ دوست بھی اسٹوڈیوز کی گاڑی

گل حمید کی بولتی فلمیں

نمبر شمار	فلم	ریلیز	ہدایت کار	کمپنی	کاسٹ
1	ہیرا رانجھا	1932	اے۔ آر۔ کاردار	پلے آرٹ فوٹو فون، لاہور	مس انوری، رفیق خرم، لالہ یعقوب، گل حمید
2	عورت کا پیار	1933	اے۔ آر۔ کاردار	ایسٹ انڈیا فلم کمپنی، کلکتہ	گل حمید، مختار بیگم، مظہر خان
3	ممتاز بیگم	1934	اختر نواز	ایسٹ انڈیا فلم کمپنی، کلکتہ	مس اختر، مظہر خان، علی، اے۔ آر۔ پہلوان، گل حمید
4	چندر گپت	1934	اے۔ آر۔ کاردار	ایسٹ انڈیا فلم کمپنی، کلکتہ	گل حمید، سیتا دیوی، مظہر خان، حسن دین
5	سلطانہ	1934	اے۔ آر۔ کاردار	ایسٹ انڈیا فلم کمپنی، کلکتہ	گل حمید، زریں خاتون، طلحہ محمد، اکبر پشاوری
6	سیتا	1934	دیو کی بوس	ایسٹ انڈیا فلم کمپنی، کلکتہ	درگا کھوٹے، پرتھوی، کپور، گل حمید
7	نامیٹ برڈ	1934	دھیرن گنگولی	ایسٹ انڈیا فلم کمپنی، کلکتہ	گل حمید، مس انوری، طلحہ محمد، مظہر خان
8	سلیہ	1935	مادھو بوس	ایسٹ انڈیا فلم کمپنی، کلکتہ	گل حمید، مس مادھوری، علی، مظہر خان
9	اسٹیپ مدر	1935	ایس۔ کیراوالہ	ایسٹ انڈیا فلم کمپنی، کلکتہ	گل حمید، رادھابائی، اے۔ آر۔ پہلوان، مظہر خان
10	بدروہی	1935	دھیرن گنگولی	ایسٹ انڈیا فلم کمپنی، کلکتہ	گل حمید، مس سلطانہ، حسن دین، مظہر خان
11	مرڈر	1935	جی۔ آر۔ سیٹھی	ایسٹ انڈیا فلم کمپنی، کلکتہ	گل حمید، للیتا دیوی، پیشنس کوپر، مظہر خان
12	خیبر پاس	1936	گل حمید	ایسٹ انڈیا فلم کمپنی، کلکتہ	گل حمید، پیشنس کوپر، محمد، اکبر پشاوری
13	باغی سپاہی	1936	اے۔ آر۔ کاردار	ایسٹ انڈیا فلم کمپنی، کلکتہ	گل حمید، بسلا کماری، محمد، اسحاق، مظہر خان
14	سنہرا سنسار	1936	دیو کی بوس	ایسٹ انڈیا فلم کمپنی، کلکتہ	گل حمید، رام پیاری، وجے کمار، مظہر خان



سنہرا سنسار میں ہیرا رانجھا کی پیاری کے ساتھ

کھڑکی سے باہر کے تمام مناظر پیچھے کی جانب بھاگتے نظر آ رہے تھے۔ گل حمید کی نگاہیں بھی پیچھے کہیں دور اپنے ماضی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ یہ وہی فرنیئر میل تھی جس سے گل حمید نے کئی بار پشاور، لاہور کی جانب سفر کیا تھا صرف کامیابی کی منزل کی تلاش میں اور اب جبکہ وہ اپنی منزل پا چکا تھا اور شہرت اور کامیابی کی بلند ترین چوٹی پر براجمان ہو چکا تھا تو یہی فرنیئر میل اسے لیے ہوئے کامیابی کی منزلوں سے دور موت کی انجان وادیوں کی جانب گامزن تھی۔ کسی آئینہ پر جب گاڑی رکتی تو مسافر اور خواہنے والوں کی آوازوں سے یادوں کا سلسلہ تھوڑی دیر کے لیے منقطع ہو جاتا۔ گاڑی کے چلتے ہی پھر وہی یادیں وہی ماضی غرض یادوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔

لکھنؤ کے آئینہ پر جب گاڑی رکی تو لالہ یعقوب نے اسے ماضی کی یادوں سے جگایا۔ گل حمید نے آنکھیں کھول کر ان کی جانب دیکھا۔ لالہ یعقوب نے کہا کہ لکھنؤ آ گیا ہے۔ یہاں ہمیں ان حکیم صاحب سے ملنا ہے جن کے بارے میں کاردار صاحب اور دیگر دوستوں نے تاکید کی تھی۔ لالہ یعقوب کی منتوں پر جب گل حمید نہیں مانے تو لالہ

اداس چہرہ لیے ایک جانب بیٹھ گئے۔ کسی کی دل آزاری خصوصاً دوستوں کی ناراضی گل حمید کا شیدہ نہیں تھا۔ اپنی دل فریب مسکراہٹ کے ساتھ لالہ یعقوب کے روٹھے چہرے کی جانب دیکھا۔ لالہ نے منہ موڑ لیا اور دوسری جانب دیکھنے لگے۔ گل حمید نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ چلو اٹھو اب زیادہ ایکٹنگ کی ضرورت نہیں ہے تم کوئی مجھ سے بڑے ایکٹر نہیں ہو۔ لالہ اس بات پر مسکرا دیے اور جلدی سے سامان اتار کر پلیٹ فارم پر رکھ دیا کہ کہیں گل حمید کا ارادہ بدل نہ جائے۔ گل حمید بھی گاڑی سے نیچے اتر آئے۔ اس وقت انہوں نے اپنا چہرہ مفلر سے ڈھانپ رکھا تھا تاکہ کوئی پہچان نہ لے۔ دونوں دوست ایک تانگے میں سوار ہو کر حضرت گنج میں واقع گل حمید کے دوست مسٹر اے حفیظ کے گھر کی جانب روانہ ہو گئے۔ گل حمید نے ہوٹل میں ٹھہرنے کی بجائے دوست کے ہاں ٹھہرنا



پروڈیوسر بی ایل کیسہ کا جی

مناسب سمجھا کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اگر ہوٹل میں ٹھہرے تو ان کی آمد کی خبر پورے لکھنؤ میں پھیل جائے گی اور اس شدید تکلیف کی حالت میں وہ کسی ہجوم کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ تاہم جب اے حفیظ کے گھر

ایک کر کے..... یاد آ رہے تھے اور ان کے خوبصورت چہرے پر کبھی ایک اداس مسکراہٹ اور کبھی غم کی پرچھائیاں لہرانے لگتیں۔ لالہ یعقوب نے ان سے بات کرنے کی



گل حمید کی آخری آرام گاہ

پہنچا تو مسٹر حفیظ گل حمید کی یوں اچانک آمد پر حیران بھی ہوئے اور خوش بھی۔ انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ گل حمید نے اپنی مشہور زندہ دلی سے مسکراتے ہوئے کہا کہ اب حیران ہی ہوتے رہو گے یا ہمیں اندر آنے کے لیے بھی کہو گے حفیظ شرمندہ ہو کر آگے بڑھے اور گل حمید سے اور لالہ یعقوب سے گلے ملے اور انہیں مہمان خانے میں لے آئے جو کہ مکان کی اوپر والی منزل پر تھا۔ یہ مکان بازار کے بچوں بچہ تھا جس کی ایک بڑی کھڑکی بازار کی طرف کھلتی تھی جہاں سے دور تک بازار کا منظر دیکھا جاسکتا تھا۔

اے حفیظ نے جلدی جلدی مہمانوں کی تواضع مشروبات اور کھانے سے کی۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد گل حمید اور لالہ یعقوب نے حکیم صاحب کے پاس چلنے کے لیے کہا۔ حفیظ نے جواب دیا کہ آپ آرام کیجئے میں حکیم صاحب کے مطب جا کر اوقات کار کے بارے میں معلومات حاصل کرتا ہوں۔

کچھ دیر بعد حفیظ واپس ہوئے اور کہا کہ جس حکیم صاحب سے ملنے آپ تشریف لائے ہیں وہ چند روز قبل فریضہ حج کے لیے لکھنؤ سے مکہ معظمہ جا چکے ہیں۔ البتہ ایک

اور مشہور حکیم صاحب عبدالحسیب جو کہ شفاء الملک کے نام سے مشہور ہیں ان سے میں بات کر آیا ہوں۔ میں نے ان سے آپ کی تمام کیفیت بیان کر دی ہے۔ انہوں نے شام میں آپ کو بلایا ہے۔

گل حمید نے لالہ یعقوب سے کہا کہ میرا خیال ہے رات کی گاڑی سے پشاور کے لیے روانہ ہو جائیں لیکن لالہ یعقوب اور حفیظ کے اصرار پر گل حمید حکیم صاحب سے ملنے کے لیے راضی ہو گئے لیکن شرط رکھی کہ صبح کی فرنیئر میل سے ہر حالت میں روانہ ہونا ہے۔ بہر حال شام کو گل حمید لالہ یعقوب اور اے حفیظ، حکیم صاحب کے مطب پہنچے۔ حکیم صاحب کو حفیظ کے ذریعے گل حمید کی شخصیت، مقام اور شہرت کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ انہوں نے گل حمید سے ان کی بیماری کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی اور آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ گل حمید چند دن کے لیے دواخانے کی اوپر منزل میں رہائش اختیار کریں تاکہ وہ دائمی نگرانی میں ان کا علاج کر سکیں لیکن گل حمید اس کے لیے تیار نہ ہوئے اور حکیم صاحب سے دوائیں اور ان کے استعمال سے متعلق نسخے لے کر واپس حفیظ کے مہمان خانے



گل حمید کے چھوٹے بھائی سید جمال خان

میں آگئے اور اپنے لیے مخصوص کمرے میں آرام کی غرض سے لیٹ گئے۔ اب رات ہو چکی تھی لیکن گل حمید کی قسمت میں آرام کہاں۔ لالہ یعقوب کو آواز دے کر بلوایا اور ان سے کہا کہ لالہ صبح ہر صورت میں فرنیئر میل کے لکھنؤ پہنچنے سے قبل ہمیں ریلوے اسٹیشن پہنچانا ہے۔ اب تم بھی آرام کرو اور میں بھی سونے کی کوشش کرتا ہوں۔

لکھنؤ کی وہ رات گل حمید پر بہت سخت گزری۔ ایک تو سر کا درد شدت اختیار کر گیا دوسرے بازار کا شور اس قدر تھا کہ گل حمید ایک لمحہ بھی آرام سے سونہ سکے۔ یہ لکھنؤ شہر تھا جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ عام حالات میں گل حمید بھی شاید اس رونق سے لطف اندوز ہوتے لیکن اس تکلیف کے عالم میں ایک رات کاٹنی بھی کسی عذاب سے کم نہ تھی۔

صبح ہوتے ہی گل حمید اور لالہ یعقوب اے حفیظ کے ہمراہ اسٹیشن پہنچے۔ گاڑی آچکی تھی گل حمید اور لالہ یعقوب گاڑی میں سوار ہو گئے۔ گاڑی کے چلنے تک اے حفیظ کھڑکی کے قریب کھڑے گل حمید سے باتیں کرتے رہے۔

اب پھر وہی فرنیئر میل تھی گل حمید تھے اور یادوں کی

برسات لاہور پہنچی تو گل حمید نے ایک بار پھر چہرے کو مفلر سے ڈھانپ لیا کہ کوئی پہچان نہ لے۔ گل حمید لاہور کے پلیٹ فارم پر گھومتے رہے۔ لاہور کے اسٹیشن پر ہمیشہ سے گاڑی کافی دیر تک رکتی ہے۔ وہ پلیٹ فارم پر کافی دیر چہل قدمی کرتے رہے۔ یہ وہی لاہور تھا جہاں سے انہوں نے اپنے فلمی کیریئر کی ابتدا کی تھی۔ جہاں ان کے بہت سے فلمی اور غیر فلمی دوست تھے۔ ایک لمحہ کو ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ چند لمحے اپنے لاہور کے دوستوں کے پاس گزارے جائیں لیکن پھر یہ سوچ کر اپنا ارادہ بدل دیا کہ اگر ایک بار لاہور ٹھہر گئے تو پھر دوستوں کی محبت پاؤں کی زنجیر بن جائے گی۔ وقت ان کے پاس بہت کم رہ گیا تھا



گل حمید کا ایک انداز

پھر اچانک انہیں خیال آیا کہ کلکتہ سے روانگی کے وقت انہوں نے اپنے گھر والوں کو تو اپنی آمد کی اطلاع ہی نہیں دی کہیں یوں غیر متوقع اور اچانک آمد سے سب گھر والے پریشان نہ ہو جائیں۔ یہ سوچ کر گل حمید فوراً اسٹیشن پر موجود تار گھر پہنچے اور اپنے چھوٹے بھائی سید جمال خان جو کہ اس وقت نوشہرہ کے اسلامیہ ہائی اسکول میں زیر تعلیم تھا اس کے نام ایک مختصر ساٹیلی گرام تحریر کیا۔

تلاش مرقد

مختار آزاد

قلو پترا، ایک ایسا نام، ایک ایسا کردار جو صدیوں سے ذہنوں میں تازہ ہے اور منفی مانا جاتا ہے۔ کیا وہ واقعی منفی کردار کی حامل تھی۔ کیا وہ واقعی حیوانی جبلت کی حامل تھی؟ ایک ایسا تحقیقی مضمون جو آپ پر سوچ کے دروا کر دے گا۔



انتہائی تلاش و جستجو کے بعد تریب دی گئی جامع تحریر

ارے کہاں..... اوہ قلو پترا..... کہاں ہے وہ؟
حیرانی کی ضرورت نہیں، دیکھنے نکلے تو وہ بہت ساری جگہوں پر نظر آجائے گی۔ وہ خود تو دنیا میں نہ رہی مگر موت کو دو ہزار سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود اس کا نام اور تذکرہ، تاریخ اور عوام، دونوں میں اب تک زندہ ہے۔ دنیا کے بازار میں دریائے نیل والے مصر کی اس آخری فرعون کے نام کا سکہ اب بھی چلتا ہے۔ ادب، تاریخ، فلم اور موسیقی سے لے کر بازار میں بکنے والی جس شے پر قلو

”طبیعت ناساز ہے آج کی فرنیچر میل سے پہنچ رہا ہوں۔ گل حمید۔“

10 فروری 1937ء کو ٹرین اپنے مقرر وقت پر نوشہرہ پہنچ گئی جہاں سے ان کا گاؤں پیر پائی نزدیک تھا۔ سید جمال خان گاڑی کے ساتھ اسٹیشن پر موجود تھا۔ لہذا گل حمید اور لالہ یعقوب اس کے ہمراہ پیر پائی کے لیے روانہ ہو گئے۔ گاؤں پہنچ کر گل حمید نے لالہ یعقوب کو اپنے ذاتی حجرے میں ٹھہرایا۔ اور بھائی سے کہا لالہ یعقوب کی خاطر تواضع میں کسی قسم کی کمی نہ آنے پائے اور پھر خود اپنے آبائی گھر اپنی والدہ کے پاس پہنچ گئے گھر والوں کو اطلاع ملی چلی گئی۔ گل حمید فردا فرائز سب سے ملے اور ان کی خیریت دریافت کی۔ اس اچانک آمد پر سب ہی خوش ہوئے اس خوشی میں کسی کو یہ دھیان نہ رہا کہ گل حمید کی کمزوری کس قدر بڑھ چکی ہے، خود گل حمید نے بھی کسی کو کچھ نہ بتایا کہ وہ بیماری کے کس عذاب سے دوچار ہیں لیکن ان کی والدہ سے بیٹے کی حالت چھپی نہ رہ سکی۔ گل حمید سب سے مل کر اپنے کمرے میں یہ کہہ کر چلے گئے کہ مجھے سفر کی تھکاوٹ ہے۔ ذرا آرام کرنا چاہتا ہوں۔ لالہ یعقوب چند دن تک مہمان کی حیثیت سے ان کے حجرے میں مقیم رہے اور پھر گل حمید سے اجازت لے کر کلکتہ لوٹ گیا۔

گل حمید کے چند قریبی دوستوں کے علاوہ کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ اپنے وقت کا سپر اسٹار بھرا میلہ چھوڑ کر انتہائی خاموشی سے اپنے گاؤں پہنچ گیا ہے۔ دوسرے شہروں میں رہنے والے اس کے دوستوں اور برستاروں کے خطوط اب بڑی تعداد میں ایسٹ انڈیا فلم کمپنی کلکتہ کے پتے پر پہنچ رہے تھے جہاں سے اسٹوڈیو کا عملہ تمام ڈاک گل حمید کے گاؤں کے پتے پر روانہ کر دیتا تھا۔ گاؤں میں گل حمید کی اب کوئی مصروفیت نہ تھی سوائے اس کے کہ ماں کے زانو پر سر رکھے ان سے باتیں کرتے رہتے یا کمپنی کی معرفت آئے ہوئے خطوط کا مطالعہ کرتے رہتے۔

گھر والوں اور دیگر رشتے داروں کے مجبور کرنے اور ان کا دل رکھنے کی خاطر ایک بار پشاور کے مشہور لیڈی ریڈنگ ہسپتال بھی گئے۔ ڈاکٹر نے معائنہ کیا اور آپریشن کی تجویز پیش کی لیکن گل حمید راضی نہ ہوئے اور واپس گاؤں لوٹ گئے گل حمید کو اب صرف موت کا انتظار تھا موت جو کہ ایک اٹل حقیقت ہے۔

دن تیزی سے گزرتے رہے اور وقت کا سپر اسٹار موت کی جانب بڑھتا رہا اور آخر ایک دن موت کا وار چل

ماہنامہ سچ

گیا۔ گل حمید اپنی والدہ کے زانو... پر سر رکھے لیٹے ہوئے تھے۔ گھر والے جاگ رہے تھے۔ آج درد بھی کچھ سوات گل حمید سب سے اپنی تکلیف چھپانا چاہتے تھے کیونکہ ایک کامیاب اداکار تھے اور اپنے جذبات کو چھپانے کا جانتے تھے لیکن ماں ایک ایسی ہستی ہے جو اپنی اولاد کی فخر اور غم کو ہر حال میں جان لیتی ہے۔ کوئی کتنا بھی اداکاریوں نہ ہو اپنی ماں سے اپنے اوپر گزرنے کی کیفیت نہیں چھپا سکتا۔ گل حمید کی ماں بھی اپنے بیٹے کی تکلیف سے پوری طرح آگاہ تھیں۔

یہ 18 اپریل 1937ء کی رات تھی۔ شام سے ہی گل حمید کی تکلیف میں شدت آگئی تھی۔ گل حمید کی بے چینی بڑھتی چلی جاتی تھی۔ والدہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ دیگر اہل خانہ بھی اشکبار تھے لیکن فرشتہ اجل کو کب کے آنسوؤں کی پروا تھی۔ وہ آیا اور گل حمید کی روح کو مان لے کر آسمان کی بلندیوں کی جانب مجبور پرواز ہو گیا۔ گھر میں سب ہی کے دل غم سے بوجھل تھے اور آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات تھی جو تھمنے میں نہیں آ رہی تھی۔ دوسرے دن گل حمید اپنے والد محترم سیف اللہ خان کے پہلو میں بے شمار اشک آنکھوں کے ساتھ سپرد خاک کر دیا گیا۔ امان گڑھ اور ہیڈ ہاؤس کے قریب جی ٹی روڈ کے کنارے اپنے آبائی قبرستان میں گل حمید ابدی نیند سو رہے ہیں۔ ان کی قبر پر لگے سنگ مرمر کے کتبے پر یہ عبارت کندہ ہے۔

ستارہ ہند

جواں مرگ گل حمید

تاریخ وفات 18 اپریل 1937ء

ہائے گل چھین اجل کیا تجھ سے نادانی ہوئی پھول وہ توڑا کہ گلشن بھر میں ویرانی ہوئی گل حمید کی موت کی خبر پورے ہندوستان میں جنگ کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ اسٹوڈیوز میں ہر قسم کی فلم بندی کا کام روک دیا گیا۔ سب دوست احباب اور اسٹوڈیوز کے ورکرز کا ردار صاحب کے گرد جمع ہو گئے ایسٹ انڈیا فلم کمپنی کے مالک بی۔ ایل۔ کھیم کا صاحب بھی وہیں چلے آئے۔ اس اندوہ ناک خبر سے سب ہی نڈھال تھے۔ گل حمید کے بے تکلیف دوست تھے سب کی آنکھوں میں گل حمید کا پھولوں کی طرح شکفتہ اور مسکراتا ہوا چہرہ تھا جو کہ اب ان سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا تھا۔

پطرہ کے نام کی مہر لگی ہو تو کامیابی کے لیے صرف یہی ایک نام کافی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بورڈ گیمز، ڈرائی کلینر، فحش رقاصاؤں، آکس کریم پارلر، فلم، کتاب، تھیٹر، بیلے رقص حتیٰ کہ بحیرہ روم کی آلودگی پر قابو پانے کے لیے شروع کیے گئے پراجیکٹ تک کا نام قلو پطرہ کے نام پر رکھی نہ رکھا جاتا۔ صرف اس پر ہی موقوف کیا، اس نام نے فلک پر نظریں جمائے تحقیق میں مصروف ماہرین فلکیات کو بھی اپنے حسن بلا خیز کی گرفت میں جکڑ رکھا ہے۔ ماہرین فلکیات نے بہت پہلے ایک سیارچہ دریافت کیا جو سورج اور مریخ کے درمیان موجود ہے۔ اس کا مدار سورج ہے۔ ماہرین فلکیات نے اس سیارچے کو نام دیا 216 قلو پطرہ۔

قلو پطرہ کا غسل خوشبو مشہور تھا۔ اس مناسبت سے مغرب کے ایک مشہور خوشبو ساز ادارے نے اپنے بہت مہنگے پرفیوم کا نام قلو پطرہ رکھا۔ فرامین کے مصر کی آخری حکمران ملکہ زہر کی شوقین تھی۔ وہ بت نئے اقسام کے سم قاتل کی ہلاکت خیزی کا پتا چلانے کے لیے قیدیوں پر تجربہ کیا کرتی تھی۔ قیدیوں کو زہر پلا کر، زہریلے سانپوں سے ڈسوا کر، بڑے انسانی وجود کے ٹھنڈا پڑنے کے دورانیے سے اُسے تجربے کی کامیابی کا یقین ہو جاتا تھا۔ قلو پطرہ کے اُس شوق کی مناسبت سے مشرق وسطیٰ کے ایک مشہور سگریٹ کا نام رکھا گیا۔ نام بھی چلتا ہے اور موت کی نسبت بھی برقرار ہے۔ قلو پطرہ کا زہر اب بھی پیا جاتا ہے۔ اب یہ کام زہریلے سانپ نہیں، اُس کے نام پر بکنے والی سگریٹ کر رہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ملکہ کا زہر سریع الاثر تھا، سگریٹ کا دھواں ست روموت لاتا ہے مگر کام دونوں کا ایک ہی ہے۔

دنیا کی مختلف زبانوں میں قلو پطرہ پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ حال ہی میں امریکا میں اس پر ایک کتاب شائع ہوئی ہے جسے 'بیٹ سکر' قرار دیا گیا۔ کتاب کا نام ہے 'قلو پطرہ: 1540 سے 1905'۔ کتاب میں قلو پطرہ کے نام کی اسی حکومت کا جائزہ ہے، جس کا ذکر ہم کر چکے۔

کتاب کے مطابق گزشتہ ساڑھے تین صدیوں کے دوران قلو پطرہ کے نام کو استعمال کر کے جہاں اور بہت سی چیزوں نے شہرت اور دولت پائی، وہیں اس کے افسانوی کردار پر پانچ بیلے رقص کے نام رکھے گئے، اس کی زندگی پر 177 سچے ڈرامے پیش ہوئے۔ قلو پطرہ کے مرکزی خیال پر امریکا میں دنیا کی سات مشہور فلمیں بن چکی ہیں۔ آٹھویں

فلم تیاری کے مراحل میں ہے۔ جس میں امریکا کی مشہور خوبرو اداکارہ انجلینا جولی قلو پطرہ کے کردار میں جلوہ گر ہوگی۔ مصنف نے امریکا کا جائزہ پیش کیا مگر قلو پطرہ کی شہرت دنیا کے ہر براعظم کے فلک پر جگمگا رہی ہے۔ معروف امریکی نقاد ہیرلڈ بلوم کے سہرے لفظ اس ختم ہونے والی بحث کا اختتام ہے، اُن کا فقرہ ہے: "قلو پطرہ دنیا کی پہلی سلیبرٹی عورت تھی۔ یہ اعزاز اب بھی اس کے پاس ہے اور آنے والے ہر دور میں سلیبرٹی ہی رہے گی۔"

فلیکسٹر کے الفاظ میں ذرا سا رد و بدل کر کے کہیں تو یوں کہا جاسکتا ہے کہ گرتا رنچ ایک اسچ ہے تو پھر اس چھوٹے وراثت اداکارہ آج تک اس اسچ پر نہیں آئی وہ بادشاہ کی بیٹی تھی، بادشاہ کی ماں تھی، بادشاہ کی بہن تھی..... اُس کی رگوں میں جرنیلی خون تھا۔ وہ سچے معنوں میں جرنیلی خون اور 'شاہی مزاج' کی منفرد عورت تھی۔ اس کا ہر رشتہ، ہر شہرت، ہر سلطنت سے جڑا تھا اور ہر انداز تخت شاہی کا عکاس تھا۔ اس کا ہر حکم جرنیلوں جیسے اہل لہجہ کا عکاس تھا۔

قلو پطرہ کی شہرت کا ڈنکا آج بھی چار سو بچے ہے..... وہ دنیا میں ہوگی تو اس کے حسن کا چرچا اشرافیہ کی محفلوں کی جان ہوگا، اُس سے ملنا زندگی کا یادگار لمحہ تصور ہوتا ہوگا۔ اُس کی ہیبت اور حسن فسون خیز دلوں کو گرما دیتا ہوگا۔ وہ نہ رہی تب بھی اُس کے تذکرے چٹخارے لے لے کر بڑھے جاتے ہیں۔ تاریخ کو خشک موضوع خیال کیا جاتا ہے مگر تاریخ کی جن کتابوں کے صفحات پر قلو پطرہ کا نام لکھا ہے وہاں دُور تک رنگینیاں بکھری ہیں۔ قلو پطرہ کے جلوہ حسن کی طرح اس کے رومانوی قصے آج بھی رنگین مزاجوں کے چشم تصور کو گرما دیتے ہیں۔

قلو پطرہ تاریخ کی وہ ملکہ ہے جو فرعون کہلاتی۔ سلطنت مصر کی بادشاہ تھی اور خود اپنی ملکہ بھی۔ کہتے ہیں کہ اُس کی ذات سے فرعونیت کے وہ تمام معنی و مطالب نکلتے تھے جو اردو میں لفظ 'فرعون' سے وابستہ ہیں۔ اُس کے نام سے تاریخ میں اُن گنت قصے منسوب ہیں۔ اُس کا نام بدنامی ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ ممکن ہے کہیں کہیں زہر دار داستان بڑھانے کے لیے مورخوں اور مصنفوں نے قلو پطرہ کی آمیزیاں کی ہوں ہیں مگر انہیں حذف بھی کر دیا جائے۔ اب بھی اُس کا نام ہی سب کچھ بیان کر دینے کے لیے کافی ہے۔ یہ نام لیتے ہی تخیل میں سرو قامت دلڑا کا پری چہرہ اور

ریشم کے حریری لبادے میں لپٹا حسیں سراپا چشم تصور کے زور و ابھرتا ہے۔ "قلو پطرہ واقعی اپنی زندگی میں بہت خوش نصیب عورت تھی مگر زندگی کے انجام... اور تاریخ کے سفر میں بد نصیب ثابت ہوئی۔" یہ رائے تھی امریکی ادیب اور قلو پطرہ کی سوانح کو ایک نئے اسلوب سے لکھنے والے مائیکل گرانٹ کی۔ وہ مزید کہتے ہیں۔ "اس کے نام سے ہوس جڑی ہے۔ اس کا ذکر افسانوی داستانوں اور دشنام طرازی کی دھند میں کھو گیا ہے۔ یہ دھند اتنی دبیز ہے کہ اس کے پردے میں قلو پطرہ کی شخصیت کا اصل رنگ اور اس کے ارد گرد کی پوری دنیا ہی تاریخ میں دھندلا کر رہ گئی ہے۔ وہ کہیں نہیں، اس کے مقبرے کا نام و نشان اور محلات کے آثار بھی نہیں ملتے۔ وہ دو ہزار برس سے بھی بہت پہلے اس دنیا سے جا چکی مگر اب بھی نہ ہونے کے باوجود ہر جگہ موجود ہے۔ اُس کے ساتھ جتنی ہوس کی داستانیں منسوب ہیں اور ان افسانوی داستانوں نے طرح طرح کے ایسے چہرے تراشنے کی کوشش کی ہے کہ جن کے ہر زاویے سے ہوس نکلتی نظر آئے۔ قلم، رقص، تاریخ یا پھر ادب..... قلو پطرہ کی شخصیت صرف مجسم ہیکر ہوس نظر آتی ہے۔ اس کے اصل خد و خال کیا ایسے ہی تھے، کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ایک نام، شاید تھوڑی سی حقیقت اور بڑی مقدار میں افسانوی داستانوں کا نام قلو پطرہ ہے۔ اس کے جٹ پٹے قصوں کو پڑھ کر ہر تخیل یہ سوچنے میں آزاد ہے کہ قلو پطرہ ایسی ہی ہوگی۔ فنون لطیفہ کے اس تخیل نے ایسے ایسے چہرے اس حسین ملکہ کے نام پر تراشے کہ تقابلی جائزہ لو تو اُن میں رتی بھر مشابہت نظر نہیں آتی۔ نظر بھی آئے تو کیوں، ایسی کوئی پینٹنگ یا مجسمہ اب تک دنیا کی نگاہوں کے سامنے نہیں آیا، جس کی طرف اُننگی اٹھا کر ہم کہہ سکیں ارے! ایسی نظر آتی تھی ملکہ قلو پطرہ۔"

مائیکل گرانٹ ٹھیک کہتے ہیں مگر اب صورت حال بدل رہی ہے۔

کچھ عرصے پہلے بحیرہ روم کے سمندر کی تہ سے ماہرین آثار قدیمہ نے تیس فٹ اونچا سنگی مجسمہ دریافت کیا ہے جو سمندر دؤنڈرینائی مندر میں تھا اور اب عجائب گھر میں رکھا ہے۔ سنگ مرمر سے بنے اس مجسمے کی اصل حقیقت تو اب تک پردے میں ہے لیکن نہایت واضح اور بالکل درست حالت میں بے چہرہ مجسمے کے باقی خطوط صاف کہتے

ہیں کہ یہ اپنے دور کی کسی عظیم عورت کا ہوگا۔ کچھ کا کہنا ہے کہ یہ قلو پطرہ کا مجسمہ ہے۔ بات اب تک ثابت تو نہیں ہو سکی مگر تحقیق جاری ہے۔ اگر یہ خیال سچ ثابت ہوا تو شاید مائیکل گرانٹ کو اپنی رائے بدلتی پڑے گی۔ لوگ اُس مجسمے کو دیکھ کر یہ ضرور کہہ سکیں گے "ارے ایسی نظر آتی تھی حسن کی دیوی ملکہ قلو پطرہ۔"

قدیم مصری اور اطالوی مورخین نے بھی قلو پطرہ کے ذکر پر اُس کے حسن فسون خیز اور جنسی کشش کو ہی واضح کیا ہے، اس کے چہرے کے خد و خال کا کہیں ذکر نہیں ملتا کہ جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکے کہ صدیوں تک سمندر کی تہ میں روپوش مجسمہ کیا واقعی قلو پطرہ کا ہو سکتا ہے۔ سکر حقیقت تو یہ ہے کہ مجسمے کے خطوط، لباس، زیر آب مجسمے سے کچھ فاصلے پر ملنے والے شکستہ سنگی سر پہ بندھا ہیر بینڈ جیسا اسکارف اور اس کے چہرے کے خد و خال اس بات کی بڑی حد تک دلیل پیش کرتے ہیں کہ وہ عورت بھی بہت ناز و اداؤں، تمکنت اور طنطنے والی۔ سنگی چہرے پر بیک وقت معصومیت، چالاکي، شاہی رعونت اور جرنیلوں جیسا توجہ سب کچھ نظر صاف آتا ہے۔

قلو پطرہ اپنے عہد کی عظیم ترین رومن تہذیب کے دو طاقت ور مردوں کے دلوں پر حکمرانی کرتی تھی۔ وہ دونوں مرد جن کے اشارہ ابرو پر سب کچھ ممکن تھا مگر وہ اس کے آگے بے بس تھے۔ ان دونوں میں سے ایک تھا جولیس سیزر جس کے ایک بیٹے نے قلو پطرہ کے بطن سے جنم لیا۔ دوسرا تھا مارک انتونی جو ایک دہائی تک اس کا محبوب رہا اور قلو پطرہ کے بطن سے اُس کی تین اولادوں نے جنم لیا۔ دونوں اس کی نگاہوں کے سامنے مارے گئے یا یوں کہیں کہ اُس کی ادا پر اپنی جان نچھاور کر کے دنیا سے رخصت ہوئے۔ وہ حسن فسون خیز..... قدیم یونانی مورخ پلوٹارک کے الفاظ میں پڑھے:

"وہ نہایت حسین و جمیل تھی۔ شاید ہی اتنی حسین عورت اُس وقت دنیا میں کوئی اور ہو۔ اُس کی چال میں تمکنت، سراپا میں وقار اور آنکھوں میں غرور تھا۔ وہ بڑی شان سے کنیزوں کے جلو میں محل کی راہ داریوں میں چلتی تھی۔ اس کے ریشمی لبادے کو تمام کر پیچھے پیچھے درجنوں کنیزیں چلا کرتی تھیں راہ داری کے کسی موڑ پہ مڑتی تو اس کی کمر ہلکے سے جھک جاتی تھی۔ جب وہ اپنے عہد کے بڑے بڑے امرا کو معاملات سلطنت پر گفتگو کے لیے بلاتی

تو اس کے حسن کی تاب نہ لاتے ہوئے اُن جری مردوں کے پتے پانی ہونے لگتے تھے۔ آدابِ شہرت گفتگو کا سلیقہ اور تھکانہ لہجہ اس کا شاہی ورثہ تھا مگر وہ اسے برتنا بھی خوب جانتی تھی۔ وہ جوانی میں ملکہ اور بچپن میں شہزادی تھی۔ غرور، تکبر اور حکم اُس کے خون میں شامل تھا۔ اُس کی آواز بھی اُس کی طرح نہایت خوبصورت اور لہجہ غنائیت بھرا تھا۔ جب وہ اپنی دلکش آواز میں بولتی تو ایسا لگتا تھا کہ ساز کے سارے تار ماہر موسیقار کی انگلی کی جنبش سے ایک ساتھ تھر تھرا اٹھتے ہوں۔ اُس کی آواز سے محل کے درو دیوار میں جلتنگ بجتے محسوس ہوتے تھے۔“

تاریخ میں پلوٹارک کے انداز میں جہاں اور بہت کچھ مواد ملتا ہے وہیں ابہام بھی باقی ہے۔ ابہام جسے دور کرنے کے لیے اکیسویں صدی میں ماہرین آثارِ قدیمہ کی کوششیں اپنے عروج پر ہیں۔ شاید ابہام کی دھند چھٹنے میں کچھ ہی وقت رہ گیا ہے۔

☆☆☆

قلوپطرہ نسلِ یونانی تھی۔ اس کی رگوں میں جرنیلی خون شامل تھا۔ اُس کے انداز میں نذرین اسی خون کا نتیجہ تھا۔ وہ بطلمیوس لاگس کی اولادوں میں سے تھی۔ بطلمیوس سکندر اعظم کی فوج کا ایک جی دار جرنیل تھا۔ سکندر نے 332 قبل مسیح میں سلطنتِ مصر کو فتح کیا اور پھر اس کا انتقام اسی جرنیل کے سپرد کر کے جہاں داری کی مہم سر کرنے کے لیے آگے بڑھ گیا۔ 323 قبل مسیح میں سکندر کی موت ہوئی، جس کے بعد بطلمیوس نے خود کو فرعون قرار دے کے آزاد حاکمیت کا تاج اپنے سر پہ جایا اور مصری فرعونوں کا تخت جہاں داری سنبھال لیا۔ یہاں سے اُس عہد کا آغاز ہوا جو آج بھی تاریخ میں ’بطلمیوسی عہد‘ کہلاتا ہے۔

بطلمیوس ملکہ قلوپطرہ کے جدِ امجد تھے۔ اُس سے پہلے بطلمیوسی شاہی خاندان میں چھ قلوپطرائیں گزر چکی تھیں۔ 69 قبل مسیح میں جنم لینے والی پچی کو قلوپطرہ ہفتم، کا نام ملا۔ 51 قبل مسیح میں جب وہ تختِ فرعون پہ بیٹھ کر سلطنتِ مصر کے سیاہ و سفید کی یا لک بنی، اُس وقت قلوپطرہ ہفتم کی عمر صرف اٹھارہ سال تھی۔ اُس وقت شاید ہی کسی کو یہ خیال آیا ہو کہ کم عمر و شیزہ تاریخ پہ کیا قیامت ڈھائے گی۔

47 قبل مسیح میں اُس کے بطن سے جولیس سیزر کے بیٹے نے جنم لیا۔ یہ قلوپطرہ کی پہلی اولاد تھی۔

40 قبل مسیح میں اُس کے محبوب مارک انتونی کے

جزواں بیٹوں نے ملکہِ مصر کے بطن سے جنم لیا۔ 36 قبل مسیح میں قلوپطرہ نے مارک انتونی کے ایک اور اپنے چوتھے بیٹے کو جنم دیا۔

فرعون قلوپطرہ جہاں ایک عورت، محبوبہ اور ماں تھی، وہیں اسے سلطنت کے تاج و تخت کی بھی پاسداری تھی۔ مارک انتونی اس کا صرف محبوب اور اس کے بچوں کا باپ ہی نہیں تھا، وہ یونانی اس کی مصری فوج کا کمان دار بھی تھا۔ قلوپطرہ کی اداؤں کو رومانوی ادب میں ’نشتر‘ اور ’تیر و تفنگ‘ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ شاعرانہ استعارے اپنی جگہ وہ حقیقی تلوار سے جنگ و جدل کرنا اور کروانا بھی جانتی تھی۔

31 قبل از مسیح میں مارک انتونی کی سپاہِ اعظم کی لڑائی میں رومی اوکٹاویں کی فوج کے ہاتھوں شکست کھا گئی۔ فتح کے نشے میں سرشار جرنیلی خون والی مصری فرعون اور اس کے عسکری کمان دار کو شکست بھلائے نہ بھولی۔ ہار کا یہ احساس 30 قبل از مسیح میں، ماہِ اگست کے ایک روز اُس وقت ختم ہوا جب قلوپطرہ کے مارک انتونی نے تلوار گھونپ کر خودکشی کر لی۔ زخمی محبوب کو محبوبہ کے دربار پہنچایا گیا، جہاں اُس نے قلوپطرہ کی پاتھوں میں آخری سانسیں لی تھیں۔

یہ وقت زوال کا منطقی انجام تھا! قلوپطرہ کے ہاتھوں سے مصری سلطنت نکل چکی تھی۔ اُس کے خاندان کے تین سو سالہ عہد کا خاتمہ اور رومن دور کا آغاز ہونے والا تھا۔ قلوپطرہ کی وسیع و عریض سلطنت کا سورج ڈوب چکا تھا۔ بحیرہ روم میں ڈوبنے والے بطلمیوسی سورج کی سرخی صرف اسکندریہ پر چمک رہی تھیں۔ یہ بھی پل دوپل کی بات تھی۔ وہ قلوپطرہ کی زندگی کا کھن وقت تھا۔ وہ زندگی کے سب سے بڑے امتحان سے گزر رہی تھی۔ شکست، محبوب اور فوج کے کمان دار کی خودکشی، رومن کے ہاتھوں ممکنہ گرفتاری اور آنے والا تاریک دور غلامی..... جب تک اسکندریہ آزاد تھا، تب تک وہ فرعون مصر تھی مگر صرف چند روز یا چند ہفتے..... وہ آنے والے وقت کا بہت اچھی طرح ادراک کر چکی تھی۔

مارک انتونی کی موت کے لگ بھگ ہفتہ دس دن بعد احساسِ شکست سے دوچار اور محبوب کی موت کے صدمے سے نڈھال ہارے ہوئے مصر کی فرعون نے بھی موت کو گلے لگا لیا۔ اُس کی رگوں میں جرنیلی خون دوڑتا تھا۔ حکمرانی اُس کے لبو میں صدیوں سے شامل تھی۔ وہ ہمیشہ سر بلند رہی تھی۔ حاکمیت اس کے جذباتوں پر ہمیشہ حاوی رہی۔ اس نے چند

روز کی..... آزادی اور شان و شوکت کو غنیمت جانا اور اپنی پسند کی موت منتخب کر کے بطور فرعون اس دنیا سے رخصت ہونے کا فیصلہ کیا۔

قلوپطرہ کو زہر اور سانپ پسند تھے۔ اُس نے ایک نہایت زہریلے سانپ سے خود کو ڈسوا لیا۔ زہر سے موت کا کھیل دیکھنے والی ملکہ ڈسے جانے کے بعد تڑپنے کے بجائے سکون سے بستر پر لیٹ گئی اور زندگی کا خاتمہ کر لیا۔

شاہی انداز سے آخری رسومات کی تکمیل کے بعد اس کی تدفین بھی اسی مقبرے میں ہوئی جہاں اس کا محبوب انتونی آسودۂ خاک تھا۔ دونوں مرکز بھی اکٹھے رہے۔ موت کے وقت اُس حشرِ سامان ہاری ہوئی فرعون کی عمر صرف اکتالیس برس تھی۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ جنگ بار جانے والی فرعون موت کے وقت بھی تخت و تاج کی مالک تھی۔ یہ اور بات کی بطلمیوس لاگس کی وسیع و عریض مصری سلطنت صرف اسکندریہ تک محدود رہ گئی تھی۔

ملکہ اور محبوب ملکہ کی موت کے ساتھ ہی مصر کی سلطنت رومن کے ہاتھوں مکمل طور پر فتح ہو گئی۔ قلوپطرہ کو ورثے میں بطلمیوس کی وہ مصری سلطنت..... ملی تھی جو لگ بھگ تین سو برس سے قائم تھی مگر قلوپطرہ کی موت کے ساتھ ہی تاریخ کے بطلمیوسی عہد کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

قلوپطرہ کی زندگی افسانوی تھی تو اُس کا انجام بھی افسانوی تھا۔ اُس کی موت کے بعد بھی افسانے کی تفصیلی ختم نہیں ہوئی تھی۔

☆☆☆

یونانی اور رومی مورخین کے ہاں ملکہ اور جرنیل کی موت کا تذکرہ تفصیل سے ملتا ہے۔ اُن کی تدفین بھی صراحت سے بیان کی جاتی ہے۔ قلوپطرہ کے انجام کو بھی وضاحت سے بیان کیا گیا۔ یہ بھی بتایا جاتا کہ اُن کی تدفین ایک ہی مقبرے میں ہوئی تھی۔

قلوپطرہ نے خودکشی کی تو موت کے بعد اُس کے بستر مرگ کا بھی بیان موجود ہے۔ خود پلوٹارک کے الفاظ میں:

”بعد از مرگ نہ وقار ملکہ قلوپطرہ سونے سے بنے اور نہ بھرے جڑے تخت پر لیٹی تھی۔ سونے کا وہ تخت جس پر ملکہ کا جسدِ خاکی تھا، وہ بہت خوبصورت اور دلکش تھا۔ اُس تخت پر مصری انداز کی کندہ کاری کے دلکش نمونے کندہ تھے۔“

تاریخ کے صفحات پر یہ سب کچھ تفصیل سے لکھا ہوا ملتا ہے مگر یہ نشاندہی کہیں نہیں کی گئی کہ قلوپطرہ کا مقبرہ کس جگہ

واقع تھا۔ شیکسپیر نے سولہویں صدی میں کہا تھا: ”زمین پر کوئی ایسی قبر نہیں کہ جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہم کہہ سکیں یہ اُس مشہورے جوڑے کی ہے۔“

شیکسپیر کے یہ الفاظ دعویٰ نہیں حقیقت تھے۔ ان میں راز تھا اور وہ راز اُس کے گزر جانے کے کئی صدیوں بعد آشکار ہونے والا تھا۔ اپنے وقت کا جدید ساحلی شہر اسکندریہ مصر کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے لیکن اُس سے زیادہ مال دار باب تاریخ مصر کے صحرا میں بکھرے ہوئے تھے۔ غزہ اور لکسر کے صحراؤں میں مصری فرعونوں کے اہرام تلاشِ خزانہ میں سرگرداں لیروں کے لیے زیادہ پرکشش تھے۔ اس لیے کئی صدیوں تک کسی کو یہ خیال نہ آیا کہ قلوپطرہ اور اس کے محبوب کا مقبرہ کہاں ہے؟ سب کی نظریں غزہ اور لکسر کے اہراموں پر مرکوز تھیں۔ اس میں حیرت کی کوئی بات بھی نہیں، سونے چاندی نے ہمیشہ انسانوں کی نگاہوں کو خیرہ کیے رکھا ہے۔

زلزلے، سمندری موجیں، سمندر کی سطح میں اونچائی، ریت کے طوفان، خانہ جنگی، مقامی تنازعات، قدیم عمارات سے غیر جذباتی وابستگی کے سبب شکستہ پتھر ملی عمارتوں کا انہدام اور ان کے پتھروں کا دوبارہ استعمال..... کئی سو سال کی کشمکش حیات کے سبب اُس مقام کے تمام آثارِ صفحہ ہستی سے مٹنے چلے گئے، جہاں تین سو سال تک قلوپطرہ کے اجداد نے زندگی بسر کی تھی یعنی فرعون کا جزیرہ اور اس کا ملحقہ اسکندریہ۔ سب سے بڑی حیرت کی بات یہ ہے کہ موسیٰ جبر کے باعث قلوپطرہ کے زمانے کا اسکندریہ پہلے زیرِ آب آیا اور پھر اُس کی عمارتیں منہدم ہو کر لمبے کی صورت نہ آب منتشر ہوتی چلی گئیں۔

برصغیر میں اُردو، فارسی شاعری کے شہنشاہ مرزا غالب نے کیا خوب کہا تھا:

ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کہیں جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا
قلوپطرہ واقعی مرنے کے بعد تاریخ میں بہت رسوا ہوئی۔ اسے مرنے کے بعد غرقِ دریا نہیں، زمین کی کوکھ میں سپردِ خاک کیا گیا تھا مگر شیکسپیر کا خیال چوٹ کا دینے والا تھا۔ شیکسپیر کے الفاظ میں اُس مشہور جوڑے کی قبر زمین پر کہیں نہیں تو پھر کیا وہ پانی میں ہے؟ قدیم اسکندریہ نہ آب ہے۔ اس پر سب کو یقین ہے۔ کہیں اسکندریہ کے ساتھ قلوپطرہ کا مقبرہ بھی تو نہ آب نہیں..... یہ تلاش اور تحقیق کا نکتہ

آغاز تھا۔

نیز آب اسکندر یہ میں قلو پطرہ کے مقبرے کی تلاش دودھانی پہلے شروع ہوئی تھی۔ مقبرے کی تلاش کی یہ پہلی سنجیدہ کوشش تھی جس کا آغاز پانی کی تہ سے شروع ہونے والا تھا۔

زیر آب آثار قلو پطرہ کی تلاش کا آغاز 1992ء میں فریج ماہر آثار قدیمہ فریک گوڈیو کی سربراہی میں شروع ہوا۔ منصوبہ فریک کے ادارے "یورپین انسٹیٹیوٹ آف انڈروائٹر کیا لوجی" کے توسط سے شروع ہوا تھا۔ جس کا مقصد پانیوں میں دفن قدیم اسکندر یہ کا ایک نقشہ تیار کرنا تھا۔ یہی وہ علاقہ ہے جہاں کبھی قلو پطرہ کا شاہی محل واقع تھا۔ زیر آب تحقیق کرنے والے ماہرین آثار نے جو کچھ دریافت کیا وہ اسے سطح زمین پر لاتے رہے۔ بڑے بڑے ستون، لائم اسٹون کے بڑے بڑے ہلاک اور اسی طرح کی دوسری تعمیراتی اشیاء پانی سے نکال کر خشکی پر لائی گئیں۔ ان سب کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل نہیں تھا کہ جو کچھ ملا وہ یقیناً قلو پطرہ کے محل کی باقیات ہی تھیں۔

"میرا خواب تھا کہ قلو پطرہ کا مجسمہ تلاش کیا جائے تاکہ اس کے اصلی خدو خال دنیا کے سامنے آسکیں۔" فریک نے بتایا۔..... زیر آب اسکندر یہ کے آثار میں کسی بھی ایسے مقام کا پتا چلانے میں ناکام رہے جو قلو پطرہ کا مقبرہ ہو سکتا تھا۔ قلو پطرہ کے نام پر صرف ایک ہی شے دریافت ہوئی، وہ "قلو پطرہ سگریٹ" کی خالی ڈبیاں تھیں۔

یہ تو ہم ناکام ہوئی مگر حال ہی میں قدیم اسکندر یہ کی حدود سے کچھ میلوں کی دوری پر ایک مندر کے بارے میں سراغ ملا ہے جو ریت کے ڈھیر میں دفن ہونے کے سبب اب تک ہر قسم کی انسانی دست برد سے محفوظ تھا۔ اس مقام کی اطلاع ملنے کے بعد یہ سوچ کر ماہرین آثار نے اپنی تحقیق کا رخ اس پر مرکوز کر دیا کہ ممکن ہو کہ یہی قلو پطرہ اور انتونی کا مرقد ہو۔ ممکن ہے کہ ان کی حنوط شدہ لاشیں وہیں موجود ہوں۔ ماہرین کا خیال اور ان کی کوششیں اپنی جگہ مگر یہ ایک اتفاق تھا۔ حیرت انگیز اتفاق..... ایک فون کال اور پھر کئی برس کی محنت کے بعد گم نام مقام کو جدید مصر کی تاریخ آثاریات میں اہم مقام ملنے والا تھا جس کے پیچھے ایک نوجوان لڑکی کا دماغ کارفرما تھا۔

☆☆☆

یہ نومبر 2006ء کی بات ہے۔ عالمی شہرت یافتہ ماہر

آثار قدیمہ اور مصر کی سپریم کونسل برائے نوادرات کے سربراہ ڈاکٹر زاہی حواس قاہرہ میں واقع اپنے دفتر میں بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے نیل بلٹن کی بنائی ہوئی اسٹیشری کی بڑی سی ڈیٹ پھیلی ہوئی تھی جس پر ایک سائٹ کا نقشہ بنا ہوا تھا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں چند سال قبل تک ماہرین کی ایک ٹیم آثار کی تلاش میں کھدائی کر رہی تھی۔

"ہم قلو پطرہ کا مقبرہ تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اسی سلسلے میں کھدائی کی جا رہی تھی۔" ڈاکٹر زاہی حواس نے بتایا۔ "یہ پہلا موقع تھا قلو پطرہ کے مقبرے کی تلاش کا۔ اس سے پہلے مصر کی ملکہ کا مقبرہ تلاش کرنے کے لیے باضابطہ طور پر کوئی کوشش نہیں کی گئی تھی۔"

ڈاکٹر زاہی حواس بارے بتا رہے تھے، وہ تلاش ایک فون کال کے نتیجے میں شروع ہوئی۔ ہوا یہ کہ ڈومینک ریپلین کی ایک نوجوان لڑکی لیٹھلن مارٹیز نے 2004ء میں ڈاکٹر حواس سے رابطہ کیا اور پھر ان سے ملنے کے لیے مصر پہنچی۔ وہ قلو پطرہ کے مقبرے کے بارے میں ایک تصویر لے کر ان سے ملنے آئی تھی مگر وہ اس کے بارے میں کچھ کہنے سے کتر رہی تھی۔

لیٹھلن کا خیال تھا کہ قلو پطرہ کو ایک خستہ حال معبد میں دفن کیا گیا تھا جو اسکندر یہ سے اٹھائیس میل دور مغرب میں واقع ساحلی اور صحرائی قصبے تپوسیرس گمنا میں واقع تھا۔ یہ مقام آج ابوسر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ تپوسیرس گمنا بحیرہ روم اور بحیرہ مار پورٹ کے درمیان واقع ہے۔ قلو پطرہ کے عہد میں یہ معروف بندرگاہ تھی۔ یہاں پر پھلوں سے شراب کشید کی جاتی تھی جس کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔

اسٹریبو دور قبل مسیح کا معروف جغرافیہ داں گزرا ہے۔ 25 قبل مسیح میں وہ مصر میں تھا۔ اس نے اپنے روزنامے میں تپوسیرس گمنا کے روز و شب کا احوال تفصیل سے تحریر کیا ہے۔ جس میں اس نے ایک مذہبی اجتماع کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ اجتماع ابوسیرس دیوتا کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے منعقد ہوتا ہے، جس کا مندر پتھر لیے ساحل کے قریب واقع ہے۔ اس بارے میں وہ لکھتا ہے:

"یہاں ہر سال بڑی تعداد میں لوگ جمع ہو کر دیوتا کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ اس اجتماع میں شامل ہونے والوں کے لیے یہ لمحہ زندگی کا سب سے اہم لمحہ ہوتا ہے۔"

زاہی حواس کہتے ہیں "کھدائی شروع کروانے سے پہلے میں نے سوچا کہ جس مقبرے میں مبینہ طور پر اسے دفن کیا گیا ہوگا، اس کا سامنے کا رخ اسکندر یہ میں واقع قلو پطرہ سے ملے اور شاہی قبرستان کی طرف ہوگا مگر کھدائی سے قبل لیٹھلن نے ایک اور چونکا دینے والی تصویر پیش کی۔ "یہ کہہ کر وہ ر کے اور ڈیٹ پر بنے سائٹ کے نقشے کی طرف دیکھ کر کہنے لگے۔" اس نے میری سوچ سے اتفاق نہیں کیا۔ اس کی دلیل میں وزن تھا۔ لیٹھلن کا کہنا تھا کہ قلو پطرہ بہت چالاک اور شاطر تھی۔ اس نے انتونی اور اپنی تدفین کو نہ صرف خفیہ رکھا ہوگا بلکہ ایسا انتظام کیا ہوگا کہ تدفین کے بعد کوئی دشمن ان کی لاشوں تک نہ پہنچ سکے۔ اسے بعد از مرگ روم کی دشمن سپاہ کے ہاتھوں اپنی لاش کی بے حرمتی کا خوف تھا۔" یہ کہہ کر انہوں نے میری طرف دیکھا اور کہا۔ "اس کی بات درست تھی۔ دشمن سپاہ ایسا کر سکتی تھی۔"

لیٹھلن مارٹیز بلا کی ذہین اور جنوبی شخصیت کی مالک ہے۔ اس نے انیس سال کی عمر میں قانون کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی اور اس کے بعد سانتو ڈومینگو یونیورسٹی کے شعبہ آرکیالوجی میں پڑھانے لگی۔ اسے آثاریات سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ یہ مضمون پڑھا رہی تھی مگر اس سے پہلے نہ تو وہ کبھی مصر آئی اور نہ ہی اس نے کسی کھدائی میں حصہ لیا تھا۔

اس نے تو بھی سائٹ پر کھرنی تک نہیں چلائی تھی۔ قلو پطرہ کے مقبرے سے اس کی دلچسپی بھی بذات خود بہت دلچسپ واقع ہے۔ یہ دلچسپی شروع ہوئی ایک دلیل سے جو اس نے چوبیس سال کی عمر میں اپنے والد سے گفتگو کرتے ہوئے 1990ء میں پیش کی تھی۔ لیٹھلن کے والد فاسٹو مارٹیز پروفیسر ہیں اور قانون پڑھاتے ہیں۔

ہوا یہ تھا کہ ایک دن وہ ان کی نجی لائبریری میں ٹیپسیرس کی کتاب "انتونی اور قلو پطرہ" تلاش کر رہی تھی۔ اس نے فلیٹ سے کتاب نکالی اور ان کے سامنے بیٹھ کر پڑھنے لگی۔ بس! بس! بس! دو دنوں میں مکالمہ شروع ہوا جس نے کچھ دور میں بحث کی شکل اختیار کر لی۔ قلو پطرہ کے بارے میں لیٹھلن کے باپ کی رائے وہی تھی جو زمانے بھر کی ہے۔ سرعاش، شاطر، مکار، اور بے کردار ملکہ۔

لیٹھلن کو اپنے والد کی رائے سے بالکل اتفاق نہیں تھا۔ وہ کھٹا بھر بحث کرتے رہے اور پھر لیٹھلن نے مدلل انداز میں کہا۔ "یہ سب اس کی کردار کشی کے لیے گھڑی من گھڑت باتیں ہیں۔" وہ خاصی جذباتی ہو رہی تھی۔ "یہ

سب تاریخ کا ابہام ہے جو جان بوجھ کر پھیلایا گیا۔ اس کی کردار کشی اس کے دشمنوں کی چال تھی اور وہ اس میں کامیاب رہے۔ وہ کامیاب فرعون تھی۔ وہ ذہین حکمران تھی۔ اس نے مصر کی جغرافیائی حدود کو وسعت بخشی۔ انتونی نے اس کی مشورے پر مصر کی سلطنت کی سرحدیں دور دراز علاقوں تک پھیلانیں۔ انہیں وسعت بخشی۔ ان سب کے پیچھے قلو پطرہ کا ذہن کارفرما تھا۔ ایک عورت حکمران اور اتنی ذہین اور کامیاب..... اسی لیے تاریخ میں اس کے مخالف رومنوں نے ابہام پیدا کیا۔ آج تاریخ میں قلو پطرہ کے لیے جو کچھ یاد لکھا ہوا ہے، وہ رومنوں کا پراپیگنڈا تھا اور اب تک موجود ہے۔"

طویل بحث بے نتیجہ رہی۔ لیٹھلن اپنے پروفیسر باپ کی رائے بدل نہ سکی اور نہ وہ ان کی دلیل کے آگے سرنگوں ہوئی مگر وہ ایک فیصلے تک پہنچ چکی تھی۔ لیٹھلن نے فیصلہ کیا کہ تاریخ میں موجود قلو پطرہ سے متعلق ابہام دور کرنے کی کوشش کرے گی۔ قلو پطرہ سے متعلق سب سے بڑا راز اس کا مقبرہ ہے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ مقبرہ تلاش کرنا چاہیے۔ اسے یقین تھا کہ قلو پطرہ کا مقبرہ تلاش کرنے کے لیے ماہرین آثار نے متعدد اہم شواہد اور سراغ نظر انداز کیے ہیں، جس کی بنا پر یہ اب تک راز کے پردے میں اٹھا ہے۔

لیٹھلن نے اپنے طور پر مقبرے کی تلاش شروع کر دی۔ اس نے تمام قدیم تحریروں کا مطالعہ شروع کیا۔ "آپ قدیم مخطوطات اور تحریروں سے اس بارے میں کوئی سراغ نہیں پاسکتے کہ قلو پطرہ کا مقبرہ کس مقام پر واقع تھا۔" طویل مطالعے کے بعد اس نے اپنی نوٹ بک میں لکھا:

"اس نے جہاں اپنے جینے کے لیے شاندار اقدامات کیے تھے، وہیں اس نے مرنے کے بعد اپنی مستقل سکونت کا بھی بندوبست ضرور کیا ہوگا۔ حالات کے باعث اس کی تدفین ضرور خفیہ انداز میں کی گئی ہوگی مگر جس مقبرے میں وہ دفن ہوئی، وہ اس نے خود تعمیر کروایا ہوگا اپنی زندگی میں، اپنی شخصیت کے شایان شان یا پھر وہ ایسے کسی مقدس مقام پر دفن ہوئی ہوگی جو اس کے مذہبی عقیدے کا محور ہوگا۔ قلو پطرہ سے اس بات کی توقع ہی نہیں کی جاسکتی کہ اس نے ایسا نہیں کیا ہوگا۔ جو شاندار طرز زندگی بسر کر رہی ہو، مرنے کے بعد رہنے کے لیے اس نے کچھ نہ کیا ہو، ممکن ہی نہیں۔ البتہ یہ اور بات کہ رومن کے ہاتھوں شکست کے بعد مصر کی ملکہ کے

حالات بدل گئے ہوں گے۔ اگر اس نے اپنی زندگی میں اپنا مقبرہ بنوایا تھا تو ممکن ہے کہ اُس وقت لوگ جانتے ہوں کہ یہ مقبرہ قلو پطرہ نے اپنے لیے بنوایا ہے مگر تدفین کو راز رکھنے کے لیے اس نے اپنے معتمدین کو وصیت کر کے خود مشہور کروادیا ہو کہ وہ اس مقبرے میں دفن نہیں ہوئی۔ میں سمجھتی ہوں کہ وقتی حالات کے سبب اس نے اپنی لاش کو خفیہ رکھنے کی کوشش کی ہوگی مگر وہ یہ بھی جانتی ہوگی کہ حالات ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہیں گے۔ وہ بھی یہ چاہتی ہوگی کہ حالات سازگار ہوں تو اس کا مقبرہ لوگوں کی نظروں میں آجائے۔ وہ خود چاہتی ہوگی کہ لوگ اس کی آخری آرام گاہ کو دریافت کریں۔ اس کی ستائش کریں..... مرنے والے ہر بادشاہ کی یہ خواہش ہوتی ہے اور وہ تو تھی فرعون مصر کی عظیم الشان سلطنت مصر کی فرعون۔“

اپنے طور پر لگ بھگ پندرہ برس تحقیق کرنے کے بعد کیتھلن نے 2004 میں ڈاکٹر زاہی ہواس سے رابطہ کیا۔ اس نے انہیں ایک ای میل بھیجا مگر اسے جواب نہیں ملا۔ کچھ عرصے کے بعد اس نے ایک اور تفصیلی ای میل بھیجا۔ اس بار بھی جواب نہ دارورہا۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ زاہی سے جواب نہیں ملے گا۔ اس نے مصر جانے کی ٹھانی اور پہنچ گئی۔ اب اسے اتفاق کہیں کہ لکسر کے اہراموں میں گھومتے ہوئے اس کی ملاقات اچانک اُس وقت ڈاکٹر زاہی ہواس سے ہوئی، جب وہ ایک مقام پر کھدائی کی نگرانی کر رہے تھے۔ کیتھلن سیاحوں کے گروپ میں تھی اور گائیڈ انہیں اہراموں کے بارے میں بتا رہا تھا مگر وہ لپک کر ڈاکٹر زاہی کے پاس پہنچی۔ رکھی کلمات کے بعد اس نے ملاقات کی خواہش ظاہر کی اور انہوں نے اسے ملنے کا وقت دے دیا۔ اس وقت وہ مصر کی سپریم کونسل برائے نوادرات کے سربراہ بھی تھے۔

”تم کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتی ہو؟“ ڈاکٹر زاہی نے کیتھلن سے اپنے دفتر میں ملاقات کے موقع پر سوال کیا۔ ”میں چاہتی ہوں کہ مصر کے اُن مقبروں کا دورہ کروں جو اب تک نہیں کھولے جا سکے اور نہ ہی عام لوگ اس کے بارے میں جانتے ہیں۔“ کیتھلن نے جان بوجھ کر یہ بتانے سے گریز کیا کہ وہ دراصل قلو پطرہ کا مقبرہ تلاش کرنے کی جستجو کر رہی ہے۔

ڈاکٹر زاہی ہواس نے آرکیالوجی کی اس نوجوان استاد کو اسکندریہ، غزہ اور قاہرہ کے اُن مقامات کے دورے کی

اجازت دے دی جواب تک سربستہ راز تھے۔ وہاں اب تک نہ تو قابل ذکر کھدائی کی گئی تھی اور نہ ہی ان مقامات کے نقشے تیار کیے گئے تھے۔

کیتھلن کے لیے یہ بڑی کامیابی تھی۔ وہ سیاح کے ویزے پر مصر آئی تھی اور اس نے ضروری تیاریاں بھی نہیں کی تھیں۔ وہ زاہی ہواس سے معاملات طے کر کے واپس چلی گئی اور پھر اگلے سال مارچ 2005ء میں دوبارہ مصر آئی۔ اس نے ڈاکٹر زاہی ہواس کو فون کر کے بتایا کہ اس کے ملک ڈومینیکن ری پبلکن نے اُسے ”سفیر ثقافت“ مقرر کر دیا ہے۔

یہ سن کر ڈاکٹر زاہی ہواس نے اور کہا ”تم ابھی اتنی چھوٹی ہو اور سفیر ثقافت۔“ انہیں کیتھلن کی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا مگر یہ سچ تھا۔

کیتھلن نے ڈاکٹر زاہی کو بتایا کہ پچھلے سال مصر کے دورے کے دوران وہ قدیم اسکندریہ کے علاقے تپو سیرز گمنا گئی تھی۔ اب وہ دوبارہ وہاں جانا چاہتی ہے۔ وہاں ایک قبلی کلیسا کے آثار ہیں اور میرا ملک تاریخ عیسائیت میں دلچسپی رکھتا ہے۔ اسی لیے میں اس کلیسا کے بارے میں تاریخی معلومات حاصل کرنا چاہتی ہوں۔“ کیتھلن نے اس کی تسلی کے لیے دورے کا جواز بتایا۔ اس بار بھی وہ جان بوجھ کر قلو پطرہ کے مقبرے کی تلاش والی بات گول کر گئی تھی جو اس کی ساری بھاگ دوڑ کا محور تھی۔

کیتھلن نے وہاں جانے کی ٹھوس وجہ بیان کی تھی۔ اس بار بھی ڈاکٹر زاہی ہواس کا جواب تھا ”ہاں..... تم وہاں جا سکتی ہو۔“

کیتھلن تپو سیرز گمنا کے مقام پر گھوم رہی تھی اور بغور مشاہدے کے ساتھ وہ فوٹو گرافی میں مصروف تھی۔ یہیں سے اس نے ڈاکٹر زاہی ہواس کو فون کیا۔ ”دومنٹ ہوں گے آپ کے پاس؟“ ڈاکٹر زاہی کے فون اٹھاتے ہی اس نے فوراً پوچھا۔

”ہاں، ہاں..... تم بولو، کیا بات ہے؟“ ”میں تپو سیرز کے مقام پر کھدائی کروانا چاہتی ہوں۔ اس کے لیے میرے پاس ایک میموری ہے۔“ جس بات کو وہ اب تک ڈاکٹر زاہی سے چھپائے ہوئے تھی، اُس پر پڑا پردہ اٹھانے کا وقت آ گیا تھا۔

کچھ دیر تک دونوں کے درمیان اس موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔ آخر کیتھلن نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”مجھے یقین

ہے کہ اس مقام پر قلو پطرہ کا مقبرہ ریت میں دفن ہے۔“ ”کیا.....“ ڈاکٹر زاہی نے چونکتے ہوئے کہا۔ یہ سن کر انہیں شدید جھٹکا لگا تھا۔ وہ سخت حیرت زدہ تھے کہ یہ نوجوان لڑکی کیا کہہ رہی ہے۔ جس وقت کیتھلن یہ کہہ رہی تھی، اُس سے چند ہفتوں پہلے ہی ہنگری کے ماہرین آثاریات نے تپو سیرز کے مقام پر اپنی کھدائی مکمل کی تھی۔ اُس وقت بھی فریج ماہرین کا ایک گروہ رومن باتھ کی تلاش میں معبد کی بیرونی دیوار کے ساتھ کھدائی رہا تھا۔ ”مجھے صرف دو مہینے چاہئیں۔“ کیتھلن نے پُر یقین لہجے میں جواب دیا۔ ”مجھے یقین ہے کہ میں اُسے تلاش کر لوں گی۔“

☆☆☆

اسکندر یونان کی فتح سے شروع ہونے والے بطلیموسی عہد میں سر بیلند مصر کو مزید سر بیلندی حاصل ہوئی۔ اس کی جغرافیائی حدود میں وسعت ہوئی۔ تعمیرات میں جدت آئی اور شہرت چہار سو پھیلی۔ ایک وقت میں یہ دنیا کی مشہور ترین اور جدید شہروں والی سلطنت بھی کہلائی۔ بطلیموسی عہد کی تین سو سالہ تاریخ میں یہاں یونانی طرز تعمیر پر مشتمل، بڑے پیمانے پر شاندار تعمیرات ہوئیں۔

تاریخ کا دعویٰ ہے کہ اُس دور میں اسکندر یہ مثالی، جدید ساحلی شہر تھا۔ قدیم یونانی اور رومن مورخین کے مطابق اسکندریہ کا مرکزی ایونیوسفٹ چوڑا تھا جس کے دونوں طرف لائم اسٹون اور دوسرے قیمتی پتھروں سے بنے، اونچے اونچے ستونوں والے محلات تھے۔ اسکندریہ کی بندرگاہ پر بہت بلند ”لائٹ ہاؤس“ تھا جس کی وجہ سے یہ اُس وقت کی قدیم دنیا کے سات عجوبوں میں سے ایک سمجھا جاتا تھا۔ دہیں فرعون کا جزیرہ تھا جس پر اس کا پریش و سیج و عریض محل واقع تھا۔ اسکندریہ اُس وقت کی دنیا کا کثیر التوجہ اور آج کے معنوں میں سمجھیں تو جدید کاسموپولیشن ساحلی شہر تھا۔ یہاں بسنے والوں میں یہودی، یونانی اور رومن بھی شامل تھے۔ اسکندریہ کی گلیاں مختلف نسلوں کی مسکین و جمیل دو شیرازوں کے دم قدم سے آباد تھیں۔ خوش حالی اس شہر کے ذرود دیوار سے چپتی تھی۔

اسکندریہ میں ہی دنیا کی پہلی جدید درس گاہ اور اس شہر کا عظیم ترین کتب خانہ قائم کیا گیا تھا۔ یہیں پہلی بار بائبل کے مہرانی نسخے کو یونانی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ زمین سمیت نظام شمسی کے سارے سیارے سورج کے گرد گھومتے

ہیں۔ یہ نظریہ تسلیم کیے جانے سے اٹھارہ صدیوں پہلے اسکندریہ کی اسی درس گاہ میں پیش کیا گیا تھا۔

اسکندریہ ہی وہ شہر ہے جہاں وقت کے ایک فرعون نے اظہار رائے کی آزادی کی حدود متعین کی تھیں۔ یہاں اپنے عہد کے معروف یونانی شاعر سوتاویس کو موت کی سزا دی گئی۔ اس پر تشنگاری اور فحاشی پھیلانے کا الزام تھا، جس کی پاداش میں اس کے سینے میں لوہے کی چھ موٹی موٹی نوکدار سلاخیں گھونپ کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ شاعر کا جرم یہ تھا کہ اس نے فرعون مصر طالے دوم کی اپنی سگی بہن سے شادی کے موقع پر احتجاجاً ایک نظم لکھی تھی جسے عوام میں بہت پذیرائی حاصل ہوئی۔ شاعر جسے غلط سمجھتا تھا، اُسے غلط کہہ گیا اور ستم یہ کہ عوام نے اسے درست سمجھا بھی اور وہ درست تھا بھی۔ بادشاہ کے مطابق اس کی شاعری فحش نگاری کے علاوہ اظہار رائے کی آزادی سے تجاوز کے زمرے میں آتی تھی۔ مصر کے یونانی النسل فرعون نے شاعر کو سزا دے کر اظہار رائے کی آزادی کی نئی حدود متعین کر دی تھی۔ فرعون کا ”جمہوری فیصلہ“ اسکندریہ کے تاریخی شہر میں ہی ہوا تھا۔

اسکندریہ وہی شہر ہے جہاں 280 قبل مسیح میں طالے سلسلہ فرعونیت کا پہلا تاسیسی جشن منایا گیا تھا۔ مورخین کہتے ہیں کہ اس موقع پر اسکندریہ کی سڑکوں پر رنگ برنگے طائفے گزر رہے تھے۔ زرد جواہر اور منوں سونا لٹایا گیا تھا۔ شراب پانی کی طرح بھی اور بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے اور شکم سیری کے لیے عوام کو کھلی چھوٹ تھی۔ اسکندریہ کی تاریخ کے اس سب سے منفرد جشن کی عکاسی یونانی مورخین نے جزییات کے ساتھ بیان کی ہیں۔ آج کے ماہرین معیشت کی رائے میں اگر اُس وقت جشن پہ خرچ کی گئی دولت کا آج کے امریکی ڈالر سے تقابلی موازنہ کیا جائے تو نہایت محتاط تجزیوں کے بعد بھی وہ کئی ملین ڈالر سے تجاوز کرتی ہے۔

بحیرہ روم کے کنارے واقع یہ بندرگاہی شہر اپنی جدت اور ترقی کے باعث اُس وقت کی پوری دنیا میں مثالی سمجھا جاتا تھا۔ طالے فرعونیت کے تقریباً دو سو برس تک تو سلطنت بر عروج رہا مگر رفتہ رفتہ اسے زوال کی ہولناکیاں شروع ہوئی۔ تین سو سالہ دور فرعونیت کا اختتام رومن کی فتح اور قلو پطرہ کی موت پر ہوا۔ قلو پطرہ ہفتم نے جب 51 قبل مسیح میں طالے سلطنت کی نئی فرعون کا تاج اپنے سر پر رکھا تھا، اُس وقت نازک اندام فرعون کی عمر صرف اٹھارہ برس تھی۔ جب اس کا

دور آیا تو طالع سلطنت کی شکست و ریخت کا عمل خاصا تیز ہو چکا تھا۔ سائرس، سائرس (جو آج کے لیبیا میں واقع ہے) طالع فرعون کے ہاتھوں سے نکل چکے تھے۔ روی فوج کے بحری بیڑے بہت جلد اسکندریہ کے قریب فوجی اڈے بنانے والے تھے۔ خط اور غذائی قلت کے سبب سلطنت میں خانہ جنگی کی کیفیت تھی۔

قلو پطرہ کو احساس تھا کہ سلطنت کی اب وہ شان باقی نہیں رہی جو اس کے اجداد کے زمانے میں تھی۔ اس نے حالات کو قابو میں کرنے کے لیے متعدد اہم فیصلے کیے۔ قلعہ کے سبب غذائی قلت کو دور کر کے عوامی بے چینی کو کم کرنے کے لیے بحری راستوں سے ہمسائی ریاستوں سے اجناس درآمد کیں۔ سلطنت کی شان و شوکت لوٹانے کے لیے اس نے ہمسائیوں سے روابط بڑھانے کا فیصلہ کیا۔ روم کے مشہور جنرل جولیس سیزر کو اپنی نجی زندگی میں شامل کیا، جس کی یادگار اُس کا پہلا بیٹا سیزر ہے۔ روم سے تعلق بڑھانے کے لیے اس نے روی رسم و رواج کو فروغ دینا شروع کیا۔ جس کی وجہ سے وہ مصری تہذیب و ثقافت سے دور ہوتی چلی گئی۔ کہتے ہیں کہ یہ مصر کی پہلی طالع فرعون تھی جو مصری زبان سیکھنے اور بولنے سے گریزاں تھی۔ طالع مصری مذہبی عقائد کے پیروکار تھے لیکن غیر مصریوں بالخصوص رومن قوم سے سیاسی مصلحتوں کی بنا پر قلو پطرہ کی بڑھنے والی قربت کا اثر مصر کے سرکاری مذہب پر بھی پڑا۔ وہ قدیم مصری مذہبی عقائد سے دور اور رومن دیوی دیوتاؤں کے قریب ہوتی چلی گئی۔

جولیس کے دنیا سے اٹھ جانے یا اٹھا دیے جانے کے بعد مارک انتونی اس کی زندگی میں آیا۔ وہ اوسیرس دیوتا کو ماننے والا تھا۔ قلو پطرہ بھی اس کی مذہبی ہم نوا تھی۔ وہ دو قدم اور آگے بڑھی۔ اس نے خود کو آئزس دیوی کے روپ میں پیش کیا۔ اوسیرس اور آئزس میاں بیوی تھے قلو پطرہ نے رعایا پر دھاک بٹھانے کے لیے روپ دھارا اور دیوی ماں کے روپ میں سامنے آئی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ قلو پطرہ کو اپنا آپ اور اپنی سلطنت، دنیا کی ہر شے سے پیاری تھی مگر اس کی بد قسمتی کہ سلطنت مٹھی میں بند ریت کے مانند پر لچہ اُس کی دسترس سے غیر محسوس انداز میں سرکتی جا رہی تھی۔ 37 قبل مسیح میں اس کا سب سے بڑا مقصد اپنی سلطنت کی وسعتوں میں اضافہ کرنا ہی رہ گیا تھا۔ وہ ہر قیمت پر وہ علاقے دوبارہ اپنی سلطنت میں

شامل کرنا چاہتی تھی جو اس سے علیحدہ ہوئے یا چھین گئے تھے۔ وہ اپنی اولاد کو مستحکم طالع سلطنت دینا چاہتی تھی۔ اسے احساس تھا کہ اس کی عمر بڑھ رہی ہے۔ اسے نئے طالع فرعون کے لیے مصر کو مستحکم اور وسیع سلطنت میں تبدیل کرنا تھا جس کے لیے اُس کی کوششوں میں تیزی آگئی تھی۔ مارک انتونی، قلو پطرہ کی سپاہ کا جرنیل تھا۔ اس کی کوششوں سے قلو پطرہ کی سلطنت کے کئی علاقے واکزار ہوئے۔

34 قبل مسیح میں انتونی جنگ آرمینیا سے کامیاب لوٹا تو قلو پطرہ کو اس کی کامیابی میں اپنے مقاصد پورے ہوتے نظر آئے۔ یہ وقتی فتح تھی مگر وہ نہیں جانتی تھی۔ اس نے انتونی کے لوٹنے پر اسکندریہ میں شاندار جشن کا اہتمام کیا۔ اس جشن میں وہ اوسیرس آئزس مندر سے دیوی آئزس کا روپ دھار کر عوام کے سامنے آئی۔ یہ انتونی کی خود کشی سے چار سال پہلے کی بات ہے۔

”یہ قلو پطرہ کی زندگی کا بہت شاندار پہلو ہے۔“ کیٹھلن نے کہا۔ ”وہ مصری سلطنت میں توسیع اور استحکام کے ساتھ ساتھ عوامی شخص قائم کرنے کے لیے دیوی آئزس کے روپ میں سامنے آرہی تھی۔ یہ اس کے عوامی تصور کو بہتر بنانے کا سیاسی حربہ بھی ہو سکتا ہے مگر یہ روپ بہت خوب تھا۔ اُس وقت اس کی سلطنت مختلف مسائل سے دوچار تھی۔ ایسے میں یہ روپ اس کی عوام کے لیے حوصلہ افزا تھا۔ مصری عوام کی بڑی تعداد بھی اس دیوی دیوتا کی عبادت کرتی تھی۔ آئزس اُن کے لیے شفقت مادری، خوشحالی اور جادو کی دیوی تھی۔ ایک طرف قلو پطرہ فرعون تھی اور ایک بادشاہ کی طرح امور مملکت چلا رہی تھی۔ دوسری طرف وہ دیوی کے روپ میں لوگوں کے سامنے آرہی تھی۔ ایک طرف انتونی اس کے لیے علاقوں پہ علاقے فتح کرنے کی کوشش کر رہا تھا تو دوسری طرف وہ لوگوں کے دلوں کو فتح کرنے کی جستجو کر رہی تھی۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمحے کے لیے رکی اور کچھ سوچنے لگی۔ ”افسوس کہ ان سب کوششوں کے باوجود نہ تو اس کی سلطنت بچی، نہ زندگی اور نہ ہی کردار..... اگر وہ واقعی ایک دیوی ہوتی تو شاید تاریخ میں اس سے زیادہ بدنام کوئی اور دیوی نہ ہوتی۔ بدنام دیوی، شاطر ملکہ یا عیاش عورت..... کچھ کہنا مشکل ہے۔“

چند لمحوں کے توقف کے بعد کیٹھلن نے میری طرف دیکھا اور کہنے لگی۔ ”کتنی عجیب بات ہے۔ اس کی ذات پر ہر طرح کا الزام لگانے والے خود اس کی ذات اور اُس سے

منسوب قصوں میں دلچسپی لیتے ہیں خاص طور پر مرد طبقہ۔“ وہ رومانی میں بولے جا رہی تھی۔ ”قلو پطرہ کے نام کا لیبل معنویات پہ چسپاں کر کے طوائف کے وجود کی طرح بیچا جاتا ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ اُس کے نام کو بیچ کر جو لوگ دولت کما رہے ہیں، وہی اپنی نجی محفلوں میں قلو پطرہ کا تذکرہ جنسی لطف اندوزی کے لیے کرتے ہیں۔ قلو پطرہ نے ذات سے بچنے کے لیے موت کو گلے لگایا۔ بے حرمتی کے خوف سے اپنا مقبرہ خفیہ رکھا مگر بدنامی دو ہزار برس سے اُس کے نام سے چسپی ہوئی ہے۔“ اُس نے نہایت افسردگی سے بات مکمل کی اور خاموش ہو کر چھت کو گھورنے لگی۔ ”کیٹھلن مارٹینز صرف قلو پطرہ کا مقبرہ تلاش نہیں کرنا چاہتی، وہ اُس کی ذات سے منسوب بدنامی کا ہر قصہ منادینا چاہتی ہے۔“

”تم کامیاب ہو سکتی ہو مگر مقبرے کی تلاش میں۔“ میں نے کہا تو اس نے میرے چہرے کی طرف نظر گھمائی۔ یہ من کر اس کی آنکھوں میں خوشی کی چمک نظر آئی تھی۔ ”مگر تاریخ کے لگے داغوں کو دھونا مقبرے کی تلاش سے زیادہ مشکل کام ہے۔“ میں نے اپنی بات مکمل کی۔ یہ سن کر اس کی خوشی افسردگی میں ڈھل گئی تھی۔ میں سمجھ نہیں سکا کہ اس کے لیے بڑی بات کیا ہے، مقبرے کی تلاش یا پھر تاریخ کے داغ جسے وہ قلو پطرہ کے خلاف روی فاتحین کا پراپیگنڈا کہتی ہے۔ کیٹھلن نے اسٹریو کے بیان کا سہارا لیا تھا۔ اس نے عہد قلو پطرہ کے مصر کو سمجھنے اور پھر اس کی مدد سے نقشہ تیار کر کے مقبرے کے آثار کی تلاش شروع کی۔ اسٹریو قلو پطرہ کی زندگی کے دوران مصر میں تھا اور اس نے اسکندریہ کا احوال تفصیل سے اپنی یادداشتوں میں رقم کیا ہے۔

مصر میں اوسیرس دیوتا اور آئزس دیوی سے منسوب 14 مندروں کی موجودگی تاریخی حوالوں سے ثابت ہوتی ہے۔ تپو سیرز گمنا میں واقع مدفون مندر ممکن طور پر انہی میں سے ایک تھا جس کے متعلق کیٹھلن کو یقین تھا کہ وہی قلو پطرہ کا دفن ہو سکتا ہے۔

اوسیرس دیوتا اور آئزس دیوی مصر کے قدیم دور کے معروف دیوی دیوتا تھے۔ قدیم مصری تاریخ میں اُن دونوں سے منسوب افسانوی داستان کے مطابق یہ دونوں دیوی دیوتا بہن بھائی تھے۔ اوسیرس نے جوان ہونے پر اپنی بہن سے شادی کی تھی۔ داستان کے مطابق اوسیرس کو اس کے ایک بھائی سینٹھ نے قتل کر کے اس کی لاش کے کئی ٹکڑے کیے

اور انہیں ملک کے دور دراز حصوں میں بچکوا دیا۔ ان ٹکڑوں کو دیوتاؤں کے حکم پر اٹھا اٹھا کر دفن کیا گیا اور ان قبروں کے اوپر مندر بنادے گئے۔ یہ کل چودہ ٹکڑے تھے۔ ان ہی میں سے ایک ٹکڑا تپو سیرز گمنا میں دفن تھا۔ اوسیرس اُس وقت کے رومن اور مصریوں کا مقدس دیوتا تھا۔ تپو سیرز گمنا میں اس کے مرقد سے منسوب جگہ پر مندر تعمیر ہوا تھا جو بعد میں بہت مقدس سمجھا گیا۔ اُس کے تقدس سے کسی بھی بیروکار کے لیے انکار ممکن نہیں تھا۔ جہاں دیوتا کے مقدس جسم کا کوئی حصہ دفن ہو، وہاں پھر اُس کے بعد، اُس مندر میں کوئی فرعون ہی دفن ہو سکتا تھا۔

”بس! یہی وجہ تھی جس کے باعث مجھے یقین تھا کہ انتونی اور قلو پطرہ وہیں دفن کیے گئے ہوں۔“ کیٹھلن نے یقین سے کہا جو سرگرمی سے اوسیرس دیوتا کے مندر کے آثار کی تلاش کر رہی تھی۔ اُس کا کہنا تھا۔

”تپو سیرز گمنا میں قلو پطرہ کا مقبرہ ہونے کے اس ٹھوس یقین کی کئی وجوہات تھیں، ایک وجہ یہ تھی کہ قلو پطرہ خود اس دیوتا کی پوجا کرتی تھی۔ تاریخی حوالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کی آخری رسومات مکمل مذہبی طریقے سے ادا کی گئی تھیں۔ پلوٹارک نے بھی سونے سے بنے نقش تخت پر اس کی لاش رکھے جانے کا واقعہ بیان کیا ہے۔ اہم بات یہ کہ وہ اپنی زندگی میں خود کو دیوی آئزس کا اوتار بتاتی تھی۔ وہ اس کا روپ بھرتی تھی۔ اس کا مکمل اسکندریہ کے جزیرہ فرعون پہ تھا اور تپو سیرز گمنا اپنے مقدس معبد کے باعث اہم اور مشہور تھا۔ وہ خود یہاں مذہبی رسومات کی ادائیگی کے لیے بھی آتی تھی۔ ویسے بھی مصریوں کے ہاں موت کے بعد دوبارہ زندگی کا تصور تھا۔ اس لیے اُس نے اوسیرس اور آئزس کے معبد میں دفن ہونا پسند کیا ہوگا کہ وہ دوبارہ ملکہ یا دیوی کے روپ میں جنم لے۔ قلو پطرہ کی موت کے وقت اسکندریہ کے سوا سارا علاقہ رومن نے فتح کر لیا تھا۔ اس لیے یہ بات یقینی ہے کہ اس کے پاس تپو سیرز گمنا کے مقدس معبد میں تدفین کے سوا کوئی اور مقام نہیں بچا ہوگا اور اگر ہوگا تو اسکندریہ کے باہر اس کی رسائی مسدود ہو چکی تھی۔“

تپو سیرز گمنا میں کافی تلاش کے باوجود اسے کوئی خاص کامیابی نہیں ملی تھی مگر اس کے باوجود وہ اپنے مضبوط ارادے کے سبب کوششیں جاری رکھے ہوئے تھی۔ تپو سیرز گمنا میں تقریباً درجن بھر مندروں کے آثار پر تحقیق کرنے کے بعد اس نے مغرب میں اسکندریہ کا رخ

کیا۔ آگے بڑھنے کے لیے اس نے بحیرہ روم کی ساحلی پٹی کے ساتھ ساتھ تعمیر کی گئی قدیم پتھریلی دیوار کے ساتھ سفر شروع کیا تھا۔ اس نے اب تک جتنے مندروں کے آثار کا تجزیہ کیا تھا، ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ طالع دوم کے عہد سے متعلق تھے۔ اسے مزید قدیم مندروں کے تجزیے کی ضرورت تھی تاکہ وہ قلو پطرہ کے مرقد کو تلاش کر کے اپنی تیوری درست ثابت کر سکے۔

وہ آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کے سیدھے ہاتھ پر بحیرہ روم اور اُلے پر جھیل میریوٹر واقع تھی۔ یہی وہ قدیم راستہ تھا، جسے قلو پطرہ تپو سیرز مگنا آنے جانے کے لیے استعمال کرتی تھی۔ جب یہ تھکن آگے بڑھ رہی تھی تو یہ سوچ رہی تھی کہ قلو پطرہ نے اسی راستے پر واقع اوپیرس دیوتا کے مندر کو اپنی تدفین کے لیے چنا ہوگا۔ اس یقین کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ مقدس مقام تھا، دوسرا یہ کہ قلو پطرہ کی سلطنت کے آخری ایام میں موت سے پہلے وہ جس آزاد مملکت کی فرعون تھی، وہ اسکندریہ کا یہی جغرافیائی علاقہ تھا۔ وہ زیر آب قدیم اسکندریہ کے مقام سے کچھ فاصلے پر تھی کہ ایک ویرانے میں وہ ٹھہر گئی۔ دور دور تک لائٹ اسٹون کے بڑے بڑے ٹوٹے ہلاک ادھر ادھر بکھرے تھے۔ کہیں پرستون زمیں بوس تھے تو کہیں اور اسی طرح کی دوسری چیزیں۔ آثار بتا رہے تھے کہ کچھ خاص ہوا کرتا تھا اُس جگہ پر۔ وہ گاڑی سے اتری اور تیزی سے اُس مقام کی طرف بڑھی۔

”انہیں دیکھ کر میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ آثار تھے کسی عظیم عمارت کے، ممکن ہے کہ وہ آثار ہوں قلو پطرہ کے بے نشان مرقد کے۔“ اپنے دل کی بات بتاتے ہوئے یہ تھکن خاصی جذباتی ہو رہی تھی۔ ”میں ہاتھ لگا کر اُن پتھروں کو محسوس کر رہی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ ممکن ہے وہ یہیں کہیں ریت میں دفن ہو۔ ممکن ہے کہ یہی اس کے مقبرے کے آثار ہوں۔“

1935ء میں برطانوی سیاح انتھونی ڈی کون بھی اُس مقام پر پہنچا تھا جہاں تھکن پتھر کے ٹوٹے ہلاکوں کو چھو کر محسوس کر رہی تھی۔ تپو سیرز مگنا کے حوالے سے اس مقام کا مختصر تذکرہ انتھونی نے اپنی سفری یادداشتوں میں کچھ یوں کیا ہے:

”ہم اہراموں کو اپنے پیچھے، مغرب میں چھوڑ کر آگے بڑھ آئے ہیں۔ اس وقت ہمارے دائیں جانب نفیس اور

قدیم تاریخی یادگاریں موجود ہیں۔“

یہ تھکن کہتی ہیں ”انتھونی کا بیان حیران کر دینے والا ہے۔ مصری آثاریات کے اس اہم ترین مقام پر اتنا بھی کام نہیں ہوا تھا کہ یہاں آنے والا سیاح اس مقام کے بارے میں کچھ اور بھی تفصیل سے بیان کر سکے۔“

1905ء میں تپو سیرز مگنا کے اس مقام پر معروف اطالوی ماہر آثار قدیمہ اور ستوریشیانے چوتھی صدی عیسوی کے ایک قبطی کلیسا کے آثار کی چار دیواری کے قریب کھدائی شروع کی تھی، جہاں پر اُس نے رومن ہاتھ کے آثار دریافت کیے تھے۔

1998ء میں اسی مقام پر ہنگری سے تعلق رکھنے والے ماہرین آثاریات کی ایک ٹیم نے ڈاکٹر گیوزو روز کی سربراہی میں رومن ہاتھ کے قریب کھدائی شروع کی۔ کھدائی کے بعد ملنے والے آثار کی روشنی میں وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اُس مقام پر کبھی آئرس دیوی کا مندر واقع تھا۔ ڈاکٹر گیوزو نے اس پراجیکٹ کی تکمیل کے بعد ایک کتاب لکھی، جس کا نام ہے ”تپو سیرز مگنا“۔ یہ کتاب 2004ء میں شائع ہوئی۔ مصنف نے اس کتاب میں تفصیل سے بیان کیا ہے:

”میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اُس مقام پر دریافت شدہ آثار کو تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں، ان میں پہلا طالع سنگی ہے دوسرا حصہ رومن قلعے کے آثار پر مشتمل ہے، تیسرا حصہ قبطی کلیسا کا ہے۔“

تو کیا یہ ساری کہانی یونہی تھی اور بس صرف یہی کچھ تھا؟ ڈاکٹر گیوزو کو مندر کے آثار سے سیاہ گرینائٹ کے ٹکڑے ملے تھے۔ زانی حواس ڈاکٹر گیوزو کی تحقیق اور اس کے دریافت کردہ آثار کے حوالے سے ایک اور خیال پیش کرتے ہیں۔

”سیاہ گرینائٹ کے ٹوٹے ٹکڑے کسی مجسمے کے چہرے کے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ قلو پطرہ کے مجسمے کا چہرہ ہو۔ گیوزو آئرس مندر کی تصدیق کرتا ہے۔ قلو پطرہ آئرس دیوی کے روپ میں لوگوں کے سامنے آئی تھی۔ ممکن ہے کہ اس کا قبہ آدم مجسمہ وہاں لگا ہوا اور گیوزو کو جو ٹکڑے ملے ہیں، وہ اسی مجسمے کے ہوں۔ گیوزو کے مطابق وہ ٹکڑے مجسمے کے چہرے کے ہیں..... میرے خیال میں سیاہ گرینائٹ کے وہ چند ٹکڑے قلو پطرہ کے ہی چہرے کا سنگی عکس ہو سکتے ہیں۔“

گیوزو نے اپنے کتاب میں تفصیل سے بیان کیا ہے

کہ اسے تحقیق کے دوران اُس مقام سے جو اُس کے خیال میں آئرس دیوی کا مندر تھا، وہاں سے سیاہ گرینائٹ کے کچھ ایسے ٹکڑے ملے ہیں، جن کے بغور تجزیے سے پتا چلتا ہے کہ وہ مجسمے کا چہرہ تھا مگر افسوس کہ وہ مکمل ٹکڑے نہیں تھے کہ جنہیں جوڑ کر شکل دی جاسکے۔ البتہ یہ ضرور واضح ہے کہ وہ چہرے کے ہی ٹکڑے ہیں۔

جس مقام پر آئرس دیوی کے مندر کی موجودگی کا خیال پیش کیا گیا تھا، وہاں پر اکتوبر 2005ء میں کھدائی شروع کر دی گئی تھی۔

☆☆☆

یہ اکتوبر 2010ء کی بات ہے۔ آسمان صاف تھا اور چمکتے سورج کی روشنی میں فل آستیوں کی شرٹ پہنے، سر پہ لبرکاف باندھے اور ہاتھوں پر اوئی دستانے چڑھائے یہ تھکن مارٹینز آئرس دیوی کے مہینہ مندر کی جگہ پر کھڑی تھیں۔ کھدائی میں مصروف تھی۔ ”عجیب بات ہے۔ میں جب بھی یہاں کام کرتی ہوں، مجھے شدید ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے۔ اتنی ٹھنڈک کہ چمکتے سورج اور اچھے خاصے گرم دن کے باوجود میں ٹھنڈ سے کپکپانے لگتی ہو۔ سردی سے میری انگلیاں اکڑنے لگتی ہیں۔ مجھے آج تک اس کی وجہ سمجھ نہیں آئی۔“

یہ سن کر مجھے حیرت ہوئی۔ اس احساس کے باوجود وہ بدستور اُس جگہ کھدائی کے کام میں ڈٹی ہوئی تھی۔

تھکن نے کھدائی کر کے قلو پطرہ کے مدفون مقبرے کی تلاش کے لیے ابتدائی طور پر دو ماہ کی مہلت مانگی تھی۔ کچھ ہی دن میں اس نے درخواست کی کہ یہ مدت تین ماہ تک بڑھادی جائے اور اب اُس کے تین ماہ پانچ برسوں کے ساتھ مہینوں پر پھیل چکے ہیں مگر تحقیق اور تلاش بدستور جاری ہے۔ نہ کھدائی مکمل ہوئی ہے اور نہ ہی تھکن کا حوصلہ کمزور ہوا۔ اس کھدائی کے دوران تھکن نے کئی اور دریافتیں کر لی ہیں مگر اُس کے لیے یہ سب کچھ غیر اہم ہے مگر سب کے لیے جنہیں۔ ڈاکٹر زانی حواس وہاں سے ملنے والے نوادرات کو بہت اہم قرار دیتے ہیں مگر اُس کے لیے تو سب سے اہم چیز قلو پطرہ کا مرقد ہے۔

تپو سیرز مگنا میں کھدائی کے دوران، اس مقام سے صرف چند انچ آگے جہاں پر ہنگری کے ماہرین نے اپنی کھدائی روک دی تھی، زیر زمین ایک اور مندر اور کئی سرنگوں کے آثار ملے ہیں۔ مندر کے حوالے سے ڈاکٹر زانی حواس

آئین (دستور)

ان ضابطوں اور اصولوں کے مجموعے کا نام جن پر کسی ملک کے تمام قوانین اور اختیارات کی بنیاد رکھی جاتی ہے اور جن کی رو سے حاکم اور محکوم کے باہمی تعلق کا تعین کیا جاتا ہے۔ دستور اساسی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کون کون سے کام کرنے کی مجاز ہے اور شہری کن کن باتوں کا مطالبہ حکومت سے کر سکتے ہیں اور ان کے حقوق کیا ہیں۔ حکومت کے ہر فرد کے حقوق کیا ہیں۔ حکمرانی کے اختیارات کن کن لوگوں کے ہاتھوں میں دیے جائیں گے؟ حکومت کی طرف سے باشندگان مملکت کے تحفظ کی ضمانت کیا ہوگی؟ اور کون کون سے آئینی ذرائع سے وہ اپنے اپنے حقوق منوا سکتے ہیں یا ان کی حفاظت کر سکتے ہیں؟

بعض ملکوں میں ایسا دستور کسی حد تک باقاعدہ تحریر میں لایا گیا ہے جس کا فائدہ یہ ہے کہ شک و شبہ، اختلاف و نزاع کی صورت میں تحریر کی جانب رجوع کیا جاسکتا ہے کیونکہ اس میں رد و بدل کی گنجائش نہیں ہوتی، لیکن زیادہ تر ملکوں میں یہ دستور دستاویزی صورت میں محفوظ نہیں رکھا جاتا بلکہ اس مملکت کے عام اور مسلمہ اصولوں اور رسم و رواج کے مطابق ضوابط وضع کر لیے جاتے ہیں۔ جن ملکوں میں دستور غیر تحریری صورت میں ہوتا ہے وہاں بھی کچھ حصہ تحریر میں لایا جاتا ہے۔ مثلاً انگلستان میں منشور اعظم، درخواست حقوق، مسودہ قوانین، اصلاحات پارلیمان وغیرہ کتاب آئین میں درج ہیں۔ موجودہ زمانے میں لوگ غیر تحریری دستور پر تحریری دستور کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ اس طرح ان کو اپنے حقوق کے پامال ہونے کا خدشہ کم ہوتا ہے اور شک و شبہ کی شکل میں وہ تحریری دستاویز کی جانب رجوع کر سکتے ہیں۔

پاکستان کا پہلا آئین 1956ء میں نافذ ہوا جو اکتوبر 1958ء میں مارشل لاء کے نفاذ کے بعد منسوخ کر دیا گیا۔ دوسرا آئین 1962ء میں نافذ ہوا، اور یہ بھی مارچ 1969ء میں مارشل لاء لگنے کے بعد کالعدم قرار دے دیا گیا۔ تیسرا آئین 14 اگست 1973ء کو نافذ ہوا، لیکن جولائی 1977ء میں، مارشل لاء کے نفاذ کے بعد اسے بحال رکھا گیا، گو اس کی چند دفعات معطل کر دی گئیں۔ اس میں 1999ء تک پندرہ ترامیم کی جا چکی ہیں۔

مرسلہ: نزہت افشاں، ملتان

اور کیتھن متفق ہیں کہ وہ دیوتا اوسیرس کا مندر ہے۔ ڈاکٹر
سواس کا کہنا ہے یہ مندر طائے چہارم کے دور کا تعمیر کیا ہوا
لگتا ہے۔ طائے چہارم نے قلو پطرہ سے پہلے ڈیڑھ سو سال
تک مصر پر بطور فرعون حکومت کی تھی۔ مندر کے مقام پر
دریافت ہوا اسرار سرنگوں کی اب تک انہیں سمجھ نہیں آئی ہے۔

ان سرنگوں کی دریافت بھی بہت دلچسپ واقعہ ہے۔
کھدائی کے پہلے سال ہی کیتھن کو مبینہ مندر کے مقام
پر ایک چینی نمائندگی جو زمین میں گہرائی تک جارہی
تھی۔ جب اس نے مزید تحقیق کی تو پتا چلا کہ نیچے تو سرنگوں کا
ایک جال ہے، ممکن ہے کہ یہ ان سرنگوں میں تازہ ہوا کی
فراہمی کا ذریعہ ہو۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک سرنگ میں سے ایک عورت
اور بچے کا ڈھانچا ملا ہے۔ بچہ دوران ولادت ہی انتقال
کر گیا تھا اور عورت بھی دروازہ کے باعث زچگی کے دوران
ہی چل بسی تھی۔ دوران پیدائش مرجانے والے بچے کی
ہڈیاں بھی حکیم مادر کے زیریں حصے کے نہایت قریب سے ملی
ہیں۔ عورت کا جڑا اتنا ہوا تھا جبکہ اس کی پچھی ہوئی ٹھنڈی میں
ایک سفید ماربل کا ٹکڑا دبا ہوا تھا۔

کیتھن کا کہنا ہے ”میرے لیے عورت اور اس بچے کا
ڈھانچا ملنا معما ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آیا کہ اس حالت میں وہ
وہاں کیسے اور کیوں پہنچی؟ وہ کون تھی؟..... مقدس مندر کے
ساتھ بنی ان سرنگوں میں اس حالت سے دو چار عورت.....
کچھ بات سمجھ نہیں آتی۔“

کیتھن نے ابتدائی تحقیق کے بعد تابوت بنوایا اور
مال بچے کی ہڈیوں کو کفن میں لپیٹ کر احترام سے دفن کر دیا۔
کیتھن سے قبل تپو سیرز گمنا کے اس تاریخی مقام پر
دو تین چھوٹی چھوٹی اور غیر اہم کھدائی کو چھوڑ کر کوئی بڑی
کھدائی نہیں کی گئی تھی۔ اس ضمن میں کیتھن سے قبل سب
سے بڑا کام ہنگری کے ڈاکٹر گیوزو نے کیا تھا مگر جب سے
کیتھن نے اس مقام پر کام شروع کیا، تب سے وہ مقام
پورے مصر میں مشہور ہونے لگا۔ تپو سیرز گمنا کے مقام پر
کیتھن کی نگرانی میں گزشتہ چھ سال سے کھدائی اور
دریافت کا سلسلہ جاری ہے۔ اب تک اس مقام سے ایک
ہزار سے زائد نوادرات دریافت ہو چکے ہیں، جن میں سے
دو سو سے زائد نوادرات کو ماہرین نہایت اہم قرار دے
رہے ہیں۔ اس دریافت سے مصری تاریخ کے اس گم گشتہ
مقام کی اہمیت واضح ہوتی جارہی ہے۔ اب تک دریافت

شدہ نوادرات میں برتن، سکے، سونے کے زیورات، سنگ
مرمر سے بنے مجسموں کے ٹوٹے ہوئے چہرے شامل ہیں۔
ماہرین آثار کا خیال ہے کہ اشاعت عیسائیت کے ابتدائی
دور میں کٹر عیسائیوں نے مجسموں کو غیر شرعی قرار دیتے
ہوئے ان کے چہرے توڑ ڈالے ہوں گے۔

تپو سیرز گمنا کے اس مقام پر اب تک دریافت شدہ
آثار میں سب سے اہم دریافت قبرستان کو قرار دیا جا رہا
ہے۔ ممکنہ مندر کی بیرونی دیوار کے ساتھ ایک قبرستان ملا ہے
کیتھن کا کہنا ہے کہ یہ ان پجاریوں کا قبرستان ہوگا جو مندر
میں ہی رہتے ہوں گے۔ موت کے بعد بھی وہ مندر اور
فرائین کے شاہی قبرستان کے قریب دفن ہونے کی خواہش
رکھتے ہوں گے۔ مقدس مذہبی حیثیت کے باعث ان کی
خواہش پوری کر دی گئی ہوگی۔

☆☆☆

کیتھن مارٹینز کی پرجوش کوششیں جاری ہیں۔ ڈاکٹر
زاہی سواس بھی بہت پُر امید ہیں مگر کئی سالوں کی کھدائی اور
متعدد اہم دریافتوں کے باوجود اب تک قلو پطرہ اور انتونی
کے مرقعہ کا کچھ نہیں پتا چل سکا۔ ایک مندر کی تلاش ہو چکی
ہے مگر کیتھن کا کہنا ہے کہ وہ اس کی منزل نہیں۔ ڈاکٹر زاہی
سواس کا بھی خیال ہے کہ وہ مندر دیوی آئزس کا نہیں۔

کیا مصر کی آخری فرعون کا مقبرہ بھی دریافت ہو پائے
گا!!!

اگر یہ مقبرہ مل گیا تو تاریخ کی ایک بہت بڑی دریافت
ہوگا۔ پھر دریافت اپنے وقت کی سب سے بڑی خبر بن جائے
گی مگر فی الحال اس حوالے سے قطعی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے
کہ یہ خبر کب آئے گی۔

مقبرہ دریافت نہ ہوا تو.....

ابھی مقبرے کی تلاش میں کامیابی اور ناکامی کے
بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے، البتہ ایک بات سو فیصد یقین
سے کہی جاسکتی ہے کہ قلو پطرہ کے مقبرے کی تلاش کے لیے
سب سے اہم اور بڑی کوشش ہے جس کا سہرا صرف
کیتھن مارٹینز کے سر ہے۔

قلو پطرہ کے مقبرے کی دریافت کے لیے کیتھن کی
تھیوری کو ڈاکٹر سواس جیسے بڑے ماہرین مصری آثاریات
نے تسلیم کیا۔ کیتھن کی کوششوں کے باعث تپو سیرز گمنا کا
گمنا علاقہ سیاحوں اور ماہرین آثاریات کی توجہ کا مرکز
بن گیا۔ ان سب باتوں کے باوجود جہاں اس کے بے شمار طرف

دار ہیں، وہیں اس پر تنقید کرنے والے بھی موجود ہیں۔
ڈوآن رولر ”کیتھن تھیوری“ کے ناقدین میں سے
ایک ہیں۔ وہ قلو پطرہ پر لکھی گئی کئی کتابوں کے مصنف ہیں
اور وہ اس کی شخصیت پر مستند ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ وہ کہتے
ہیں کہ ”آثاریات کے شعبے میں یہ بہت ہی نادر بات ہے کہ
کوئی اٹھ کر تھیوری پیش کرے اور کہے کہ اب وہ اسے تلاش
کرنے جا رہا ہے اور پھر حقیقت میں وہ ایسا کرنے میں
کامیاب بھی ہو جائے۔“

ڈوآن مزید کہتے ہیں۔ ”اس بات پر یقین کرنا بہت
مشکل ہے کہ آکٹاوین کے خوف سے قلو پطرہ کے مقبرے
کو خفیہ رکھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کے جسد خاکی کو
مہانے اور پھر اس کی تدفین میں شامل کئی لوگ تھے۔ اُن
کی گواہی موجود ہے کہ قلو پطرہ کو اُس کے اجداد کے مقابر
کے ساتھ دفن کیا گیا تھا۔ ان کے ذریعے رومن دشمن
جائے تدفین یا آسانی معلوم کر سکتے تھے۔ ایک اور بات
یہ ہے کہ جس معنی خیز مواد کی بنا پر اس کی تدفین یا مقبرے
کا تعلق تپو سیرز گمنا سے جوڑا جا رہا ہے، وہ مصر میں کئی اور
جگہ بھی موجود ہو سکتا ہے۔“

”میں اتفاق کرتی ہوں کہ آکٹاوین قلو پطرہ کے
مقبرے کے بارے میں جانتا تھا۔ جس مقام پر اسے دفن کیا
گیا، اس کی اجازت آکٹاوین نے ہی دی تھی۔“ کیتھن
نے ناقدین کی رائے تسلیم کرتے ہوئے جواب دیا مگر اُس کا
اگلا جملہ چونکا دینے والا تھا۔ ”جہاں تک میرے یقین کا
تعلق ہے تو ایسا شاید نہیں ہوا تھا مگر یہ میری ایک تھیوری
ہے۔ میرا خیال ہے کہ جب انتونی اور قلو پطرہ کی لاشوں کو
مہانے جانے کا عمل مکمل ہو گیا ہوگا تب تپو سیرز گمنا کے
پجاریوں اور پروہتوں نے اُن دونوں کی لاشوں کو رومن
مکبرانوں سے پوچھے یا اجازت لیے بنا الگ الگ خفیہ طور
پر دفن کر دیا ہوگا۔ ممکن ہے کہ اُن دونوں کو معبد کے احاطے
میں، کئی خفیہ جگہ پر دفن کیا گیا ہو۔“

اگر کبھی یہ انکشاف ہوا کہ قلو پطرہ کا مقبرہ تو بہت پہلے
عمارت یافت ہو چکا تھا تو اس بات پر پردہ ڈالنے کے جرم میں
جس سستی پر سب سے زیادہ لعن طعن ہو سکتی ہے، وہ ہیں ہاورڈ
کارٹر، جنہوں نے 1922ء میں مصری بادشاہ ٹٹ کا مقبرہ
دریافت کیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس نے قلو پطرہ کا مقبرہ یا
اس کی مٹی دریافت کی تھی؟ اگر ایسا تھا تو وہ کیسے کہہ سکتا تھا کہ
وہ مقبرہ یا مٹی مصری فرعون قلو پطرہ کی ہے یا کسی اور کی۔ اس کا

جواز یہ بھی ہے کہ قلو پطرہ کے مقبرے یا اس کے حوالے سے
ٹھوس شواہد نہیں ملے۔ گزشتہ ایک سو سال کے دوران مصری
آثار قدیمہ کے بارے میں جو بھی نئی دریافتیں ریکارڈ کا
حصہ بنی ہیں، اُن میں صرف ایک شکستہ کاغذ پر ہاتھ سے لکھی
تحریر سامنے آئی ہے، جس کا تعلق قلو پطرہ سے ثابت ہوا
ہے۔ قلو پطرہ کی یہ تحریر نباتاتی کاغذ Papyrus پر لکھی
ایک مختصر عبارت ہے جو اُس نے مصر کے ایک رومن شہری کو
محصولات کی ادائیگی سے چھوٹ دینے کے لیے 33 قبل مسیح
میں اپنے ہاتھ سے لکھ کر دی تھی۔

ٹیکسیپیئر نے لکھا تھا ”وہ لامحدود جہتوں کی مالک تھی۔“
ممکن ہے کہ اس کا مقبرہ بھی اُس کی لائق ادا جہتوں میں شامل
ہو جس کی بنا پر اب تک ممکن ہے کہ کئی ماہرین آثار اس تک
پہنچے ہوں مگر شناخت نہیں کر پائے اور اُسے بوں کا ٹوں چھوڑ
کر آگے بڑھ گئے۔ ویسے ہی جیسے قلو پطرہ سے کئی صدیوں
پہلے کے وہ مقامی مصری فرعون کہ جن میں سے بعض کے
مقابر کو ہاتھ تک نہیں لگایا گیا اور ان میں سے بھی کئی ایسے
ہیں جو کھولے گئے مگر ماہرین سمجھ نہ پائے کہ ان میں مدفون
شخصیات کون ہیں؟ اور پھر وہ اسے ویسے ہی بند کر کے آگے
بڑھ گئے۔

قلو پطرہ کی ملنے والی صرف ایک تحریر کے انداز سے
اس کی شخصیت کے بارے میں کچھ کہنا ناممکن ہے۔ قدیم
مؤرخین سے لے کر جدید محققین تک، سب اس بات پر متفق
ہیں کہ وہ نہایت ذہین اور متنوع شخصیت کی مالک تھی۔ تاریخ
اور نوادرات کی دنیا میں اس سے زیادہ مشہور اور متنوع
شخصیت کی مالک کوئی اور ہستی نہیں۔ کتنی عجیب بات ہے کہ
دو ہزار برس سے کچھ زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود اس
کی شخصیت کے سحر نے اب تک تاریخ، نقاد اور جدید عہد کو
اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے، وہ بھی صرف تذکروں اور قصوں کی
بنیاد پر، حالانکہ آثار قدیمہ کے حوالے سے شخصیت کا تاثر
دریافت پر قائم ہوتا مگر قلو پطرہ کے معاملے میں صورت حال
بالکل الٹ ہے۔ اس سے منسوب اب تک صرف ایک کاغذ
کا ٹکڑا ٹھوس حقیقت بن کر سامنے آسکا ہے، اس کے علاوہ
کوئی مستند شے نہیں جو تاریخ کی اس ساحرہ سے نسبت ثابت
کر سکے مگر پھر بھی وہ زندہ ہے۔ یہ جاننے کے باوجود کہ اس
کی موت کے وقت اس کی ریاست صرف اسکندریہ کے
چھوٹے سے علاقے تک محدود ہو گئی تھی مگر اس کے باوجود
کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کہاں دفن ہے۔ اس کی لاش کو مٹی

لازوال محبتیں

منزہ قادری عطاری

عشق ازل سے لازوال مانا جاتا ہے۔ جس نے بھی بحر عشق میں غوطہ لگایا وہ جاویداں ٹھہرا۔ برصغیر میں لاتعداد عشق و محبت کے قصوں نے جنم لیا۔ ان میں سے چند حکایتیں، چند قصے۔

محبت کے حقیقی کرداروں کا تذکرہ



محبت کی اس لازوال داستان کا تعلق برصغیر (سندھ) سے ہے۔ تاک داستان ہے۔ اس تاریخی محبت بھری کہانی کا تعلق دور یاستوں یا صوبوں سے ہے۔ یعنی سندھ اور بلوچستان، یہ ایک عورت کی ایسی داستان ہے جو وفا کی پتی تھی اور جس کے لیے اس کا اور بار بار دہرائی جاتی ہے۔ یہ ایک خوبصورت لیکن الم

مزید تیزی سے آگے بڑھانے کے لیے عربی زبان کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ وہ مصر آئی تو جوان جہان لڑکی تھی مگر اب وہ عمر کی پانچویں دہائی کے نصف کے قریب ہے۔ مصر کے صحرائیں مارے مارے پھرتے رہنے میں اس کی جوانی کب ڈھلی، اسے یہ سوچنے کی بھی مہلت نہیں ملی۔ اس کی زندگی پہ صرف ایک سوچ غالب ہے..... قلو پطرہ کا مقبرہ۔

2011ء کے مصری انقلاب کے دوران چند مشتعل مصری مظاہرین نے اس پر بھی اپنا غصہ اتارنے کی کوشش کی تھی۔ ایک دن وہ اپنی سائٹ پر کام کر رہی تھی کہ حسنی مبارک کے خلاف احتجاج کرنے والے کچھ مشتعل نوجوانوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ ساتھیوں کی مداخلت سے وہ بچ گئی مگر اس کے باوجود خوف زدہ نہیں ہے۔ وہ اب بھی تنہی سے تپو سیرزمینا کے مقام آثار قدیمہ پر پورا دن کام میں گزارتی ہے!

”مجھے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں۔“ اس نے کام سے وقفے کے دوران چائے پیتے ہوئے کہا۔ ”میں نہ مصر سے خوف زدہ ہوں نہ وقتی طور پر مشتعل مصریوں سے..... مجھے اپنا کام پورا کرنا ہے۔ میری زندگی کا مقصد صرف قلو پطرہ کے مقبرے کی تلاش ہے۔ مجھے کوئی فکر نہیں کہ اس کام میں بوڑھی ہو جاؤں گی۔ مجھے اپنی کامیابی کا یقین ہے۔“ اس نے اُنکی سے اُس جگہ کی طرف اشارہ کیا، جہاں وہ کچھ دیر پہلے ایک گڑھے میں بیٹھی کھرنی سے مٹی نکال رہی تھی۔ ”مجھے مقبرے کی تلاش میں بھی کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں۔ یقین ہے جس شے کی مجھے تلاش ہے وہ یہیں کہیں پر ہے۔ آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں.....“ یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکی اور میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہنے لگی!

”میں قلو پطرہ کی مٹی اور اس کے مقبرے کو دنیا کے سامنے لاؤں گی اور اس کے حوالے سے تاریخ مجھے بھی ہمیشہ زندہ رکھے گی۔“

مجھے یقین ہو گیا کہ تاریخ میں جگہ پانے والے ضرور سر پھرے اور اُن کی لگن سو فیصد خالص ہوتی ہوگی ورنہ تو عیش کی زندگی گزار کر گناہ مر جانے والوں سے قبرستان بھرے پڑے ہیں۔ تاریخ میں زندہ رہنے کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ شاید تھکن بھی وہی قیمت ادا کر رہی ہے۔

بنانے کے عمل سے گزارنے والے کئی لوگ ہوں گے، اس کی تدفین میں بھی کچھ لوگوں نے تو ضرور شرکت کی ہوگی مگر کسی نے تاریخ میں یہ نشاندہی نہیں چھوڑی کہ اسے کس مقام پر ابدی نیند سونے کے لیے لٹایا گیا تھا۔ جیسی سچ در سچ اُس کی شخصیت تھی، اتنی ہی سچ دار وہ مرنے کے بعد ثابت ہوئی کہ کسی کو اس کے مقام آخر کا علم نہیں۔

قلو پطرہ اپنی زندگی میں جتنی خوش لباس ہوگی، مرنے کے بعد بھی اس کا نام آج کی جدید فیشن کی صنعت میں پرکشش ہے..... وہ جتنی نازک اندام ہوگی، اُس کے نام پر اتنی ہی نفیس خوشبوئیں نہایت مہنگے دامنوں دنیا بھر کے مہنگے ترین بازاروں میں بیچی جا رہی ہیں..... وہ زندہ ہوگی تو کنیزیں اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہوں گی، آج اس کے نقش آخر کی تلاش میں تھکن اور اس کے کئی ساتھی ماہرین آثاریات سرگرداں ہیں..... کل اُس کا حسن اُمرا کے دلوں کو تڑپاتا ہوگا، آج بھی اُس کے قصے جواں دلوں کو گریہ دیتے ہیں..... واقعی وہ ہمہ جہت اور متنوع شخصیت کی مالک تھی۔

قلو پطرہ حقیقت تھی لیکن اُس کی شہرت ایک افسانوی خیال بن کر ابھری اور خوشبو بن کر پھیل گئی۔ تھکن سے پہلے کسی نے بھی اتنی تنہی سے اُس کے مرقد کی تلاش نہیں کی تھی۔ لوگوں کا تو اس طرف خیال ہی نہیں گیا۔ شاید وہ کپڑے کی بیٹیوں میں لپٹی، سوکھی چوڑی، کھلے منہ اور کھلی آنکھوں والی خوفناک مٹی کی تصاویر کے بجائے اُس کے حسن آفریں تصور کو ہی فوقیت دیتے ہیں..... قلو پطرہ، لاتعداد جہتوں کی مالک، مصر کی فرعون اور اب تھکن کا جنون.....

مقبرے کی تلاش لگ بھگ بائیس تیس برس پہلے ایک بحث سے شروع ہوئی تھی مگر اب وہ تھکن کا جنون بن چکا ہے۔ شوق سے جنون بننے والی اس تلاش کی بہت بڑی قیمت ادا کر رہی ہے۔ وہ دن دن بھر سائٹ پر کھدائی میں مصروف رہتی ہے اور راتوں کو بیٹھ کر تحقیق کو لکھنے میں مصروف رہتی ہے۔ وہ سینتو ڈوینکو کے کالج میں بڑھاتی تھی، وہ نوکری کب کی چھوٹ چکی۔ وہ لاء گریجویٹ تھی اور اپنے ملک میں وکالت بھی کرتی تھی مگر اب مدت ہوئی کہ یہ ساتھ بھی چھوٹ چکا۔ اس نے جو کچھ پس انداز کیا تھا، اُس کا بڑا حصہ اس جستجو پر صرف کر چکی۔ وہ اپنے خاندان اور دوستوں سے بہت دور ہو چکی ہے۔ تھکن گزشتہ کئی برسوں سے مستقل طور پر مصر میں مقیم ہے۔ اس نے اسکندریہ میں ایک اپارٹمنٹ کرائے پر لے رکھا ہے۔ اب وہ اپنے کام کو

محبوب ہی سب کچھ تھا۔ وہ یہ گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ کسی غیر کے ہاتھ اس کے بدن کو چھو سکیں۔
دوسری طرف یہ ایک ایسے مرد کی بھی کہانی ہے جو اتنا ہی وفادار تھا جتنی وفاداری اس کے محبوب نے دکھائی تھی۔
اس کہانی میں یہ بھی شامل ہے کہ کس طرح خود قدرت سچا پیار کرنے والوں کو اپنی آغوش میں پناہ دے دیتی ہے۔

سسی

سسی سندھ کے شہر بھنجور کے راجا بھنجور کی بیٹی تھی۔ لیکن یہ وہ بیٹی تھی جس کو ابتدا ہی سے آفتوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔
جس کے دکھوں کی ابتدا اس کی پیدائش کے ساتھ ہی ہو گئی تھی۔ اس کی پیدائش پر جشن بھی منایا گیا۔ لیکن یہ خوشی اس وقت خاک میں مل گئی جب نجومیوں نے اس کا زائچہ دیکھنے کے بعد اعلان کر دیا کہ یہ لڑکی پورے خاندان کے لیے تباہی اور بربادی کا سبب بن جائے گی۔
اس کی وجہ سے تمہارے خاندان کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ اور خود راجا کی زندگی کو خطرہ ہے۔ راجا یہ سن کر پریشان ہو گیا۔

ایک ترکیب اس کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے حکم دیا کہ اس بچی کو لکڑی کے صندوق میں بند کر کے دریا میں بہا دیا جائے۔ پھر اس کی قسمت کہ دریا کی لہریں اسے اپنے ساتھ جہاں لے جائیں۔
اس کے حکم کی تعمیل ہوئی اور منہی سسی کو لکڑی کے صندوق میں بٹھا کر دریائے سندھ میں چھوڑ دیا گیا۔ لیکن قدرت کو اس کی موت منظور نہیں تھی۔

آگے چل کر اس بچی کو محبت کا ایک ناقابل فراموش داستان کا مرکزی کردار بننا تھا۔ اس لیے گھاٹ پر کپڑا دھونے والے ایک دھوبی نے اس صندوق کو دیکھ لیا۔
وہ اس صندوق کو کنارے پر لے آیا۔ بے اولاد دھوبی نے جب اس صندوق میں ایک چاندی بچی دیکھی تو خدا کا شکر ادا کرنے لگا۔

قدرت نے اسے دریائے سندھ کے ذریعے ایک اولاد سے نوازا دیا تھا جو اتنی خوبصورت تھی کہ دھوبی اسے دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔
اس کا خیال تھا کہ قدرت نے اسے ایک بہت بڑے تحفے سے نوازا دیا ہے اور یہ بچی اس کے لیے خوشیاں لے کر

اس کے پاس آئی ہے۔

وہ اسے اپنے گھر لے آیا۔ اس کی بیوی بھی اس بچی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ دونوں نے اس کا نام سسی رکھ دیا اور اس طرح دھوبی کے گھر میں سسی کی پرورش ہونے لگی۔
جب سسی جوان ہوئی تو اس کے حسن کے چرچے پھیل گئے۔ وہ آسمانوں سے اتری ہوئی پری کی طرح حسین تھی جو دیکھتا حیران ہو کر رہ جاتا۔

کسی کو یقین ہی نہیں آتا تھا کہ ایک دھوبی کی لڑکی اتنی خوبصورت بھی ہو سکتی ہے۔ اس کے حسن کی داستان پنوں تک پہنچ گئی اور وہ اسے دیکھنے کے لیے بے تاب ہو گیا۔

پنوں بھی ایک خوبصورت تو جوان تھا۔

وہ بلوچستان کے علاقے مکران کا شہزادہ تھا۔ وہ کسی کو بتائے بغیر بھنجور کی طرف چل پڑا۔ عشق کی شدت ایسی تھی کہ وہ سسی سے بن دیکھے کا سودا کر بیٹھا تھا۔

ہو سکتا تھا کہ اس نے سسی کے حسن کی جو داستانیں سنی تھیں، وہ ویسی نہ ہوں۔ اس کے باوجود کوئی کشش اسے سسی کے شہر کی طرف کھینچنے لیے جارہی تھی۔

کئی دنوں کے دشوار ترین سفر کے بعد بالآخر وہ بھنجور پہنچ ہی گیا۔ اس نے ایک سرے میں قیام کیا تھا۔ ابھی فکر یہ تھی کہ سسی کا دیدار کیسے کیا جائے۔

اس نے اپنے کچھ کپڑے دھوبی کے پاس دھونے کے لیے بھیج دیے۔ تاکہ کپڑے واپس لینے کے بہانے وہ سسی کو دیکھ سکے۔

اس کی ترکیب کامیاب رہی۔ وہ جب کپڑے واپس لینے پہنچا تو سسی اس کے سامنے آگئی۔ دونوں کے لیے پہلی جھلک ہی کافی تھی۔ ایک دوسرے کو دیکھتے ہی دونوں ایک دوسرے کے ہو گئے تھے۔

یہ محبت تو اسی طرح ہوا کرتی ہے۔

ایک دوسرے کا ہونے کے لیے مہینوں یا برسوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بس ایک نگاہ کافی ہوتی ہے۔ چھاپ تلک سب چھین لی مو سے نیناں ملا کے۔

نیناں مل گئے تو پھر کسی اور بات کا یارا نہیں رہا۔ دونوں ایک دوسرے سے ملنے لگے۔ یہ ملاقات پہلے سے زیادہ محبت بھری ہوا کرتی۔ ہر ملاقات میں یہ آگ تیز اور تیز اور تیز ہو جایا کرتی۔

سسی کا دھوبی باپ سسی کی شادی کسی دھوبی ہی سے کرنا چاہتا تھا۔ اب یہ پنوں درمیان میں آ گیا تھا۔ اس نے

دیکھ لیا تھا کہ سسی پنوں کی محبت میں پاگل ہوتی جا رہی ہے۔ اس نے پنوں کے سامنے ایک شرط رکھ دی اور شرط یہ تھی کہ پنوں کپڑے دھو کر دکھائے کہ آیا وہ اس کی برادری میں شامل ہونے کے قابل ہے یا نہیں۔

محبت کے مارے ہوئے پنوں نے یہ شرط مان لی۔ اسے ڈھیر سے کپڑے دے کر دریا کی طرف بھیج دیا۔ پنوں کے لیے یہ بالکل نیا تجربہ تھا۔

وہ شہزادہ تھا۔ اس نے کبھی ایسے کام نہیں کیے تھے۔ لیکن محبت اسے اس مقام تک لے آئی تھی۔ اس نے کپڑے دھونے کی کوشش تو کی۔ لیکن بات نہیں بنی۔ اس سے کپڑے نہیں دھوئے گئے۔ اس نے غصے میں آ کر سارے کپڑے پھاڑ دیے۔ لیکن ہر کپڑے میں اس نے سونے کا ایک ایک سکہ رکھ دیا۔

اس کی ترکیب کام آگئی تھی۔ دھوبی پنوں کی شادی سسی سے کرنے کے لیے رضا مند ہو گیا تھا۔

دوسری طرف پنوں کے باپ کو جب یہ پتا چلا کہ پنوں ایک دھوبی کی بیٹی سے شادی کرنے والا ہے تو اس پر قیامت ٹوٹ پڑی۔

پنوں اس کا بیٹا تھا۔ ایک راجا کا بیٹا تھا۔ وہ یہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ پنوں کی شادی دھوبی گھرانے میں ہو۔ اس نے پنوں کے بھائیوں کو یہ حکم دیا کہ کسی طرح بھی ہو، بھنجور چا کر یہ شادی رکواؤ۔

پنوں کے بھائی تیز رفتاری سے سفر کرتے ہوئے پنوں تک پہنچ گئے۔ انہوں نے پہلے تو پنوں کو سمجھانے کی کوشش کی۔ پھر دھمکیاں دینے لگے۔ لیکن یہ وہ نشہ نہیں جسے ترش اتار دے۔

پنوں نے اپنے بھائیوں کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ پھر انہوں نے ایک چال چلی۔ انہوں نے پنوں سے کہہ دیا کہ وہ سب پنوں کی محبت سے متاثر ہو گئے ہیں۔ اس لیے پنوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ پنوں کے لیے یہ بہت بڑی بات تھی کہ اس کے ناراض بھائی اس کا ساتھ دے رہے ہیں۔

بھائیوں نے شادی والے دن اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنا دیا۔ کسی مشروب میں بے ہوشی کی دوا شامل کر کے پنوں کو پلا دی گئی اور جب وہ دوا کے اثر سے بے ہوش ہو گیا تو اسے راتوں رات اٹھا کر اس کے آبائی شہر لے آئے۔

سرگزشت کا ایک اور معرکہ الہ آباد کا خاص شمارہ

بینا نابینا نمبر

بے بصارتی کے اندھیرے میں روشن ستارہ بن کر چمکنے والوں کی داستانیں۔ وہ نابینا تھا لیکن مظاہر فطرت کی تصاویر ایسے بناتا ہے کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے ہیں۔ وہ اندھا ضرور تھا لیکن اس کی بنائی ہوئی دھنیں ہندو پاک میں مقبولیت پاتیں۔ وہ پیدائشی نابینا ہیں لیکن ان سے امریکا بھی ڈرتا ہے۔ ایسے بہت سارے دل کو دکھا دینے والے قصے سچ بیتیاں حقیقی واقعات

ایک ایسا خاص شمارہ جسے آپ مجلد کر کر رکھیں گے

بہت جلد پیش کیا جا رہا ہے آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر اپنا شمارہ بک کرائیں

دوسری صبح جب کسی کو ہوش آیا تو اسے احساس ہو گیا کہ ان دونوں کے ساتھ بہت بڑا دھوکا ہوا ہے۔ پنوں کے بھائیوں نے وہ مشروب سستی کو بھی پلوادیا تھا۔

صورتحال کا اندازہ ہوتے ہی سستی پر ایک جنونی کیفیت ماری ہو گئی۔ اس کے محبوب کو اس سے دور کر دیا گیا تھا۔ یہ سانحہ اس کے لیے موت سے کم نہیں تھا۔ وہ اندازہ لگا سکتی تھی کہ پنوں کے بھائی پنوں کو کہاں لے جاسکتے ہیں۔ اس نے جنونی حالت میں کچھ مکران کی طرف دوڑ لگا دی جو وہاں سے کوسوں دور تھا اور راستے میں بے رحم ریگستان بھی تھا۔ ایک طرف سندھ، دوسری طرف بلوچستان۔

ایک نازک سی لڑکی، جس کے پاؤں لہولہان ہوتے جا رہے تھے لیکن وہ ایک جنونی کیفیت میں پنوں پنوں پکارتی ہوئی دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ صحرا کی تیز دھوپ نے اسے جھلسا کر رکھ دیا تھا۔ اس کے ہونٹ پیاس کی شدت سے ترخ گئے تھے، حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے۔

موت اس کے سامنے تھی۔ اس وقت ایک چرواہا اس طرف آٹھا۔ اس نے سستی کو پانی بھی پلایا اور بکری کا دودھ بھی پینے کو دیا۔

سستی کے چہرے کی تازگی واپس آ گئی تھی۔ اس نے چرواہے کا شکریہ ادا کیا۔ وہ وہاں سے آگے جانے ہی والی تھی کہ چرواہے کی نیت بدل گئی۔

سستی جیسا حسن اس کے سامنے تھا۔ اس کی دسترس میں تھا۔ ذرا سی جرات اسے سرشار کر سکتی تھی۔ اس نے سستی کو پکڑنا چاہا۔

سستی اس کا ارادہ بھانپ چکی تھی۔ اس نے ایک دفعہ پھر دوڑ لگا دی۔ اور ساتھ ہی خدا سے دعا مانگتی جا رہی تھی کہ اے خدا، تو میری عزت بچالے۔ اور اگر مرنا ہی ہے تو عزت بھری موت دے۔

قدرت کو اس پر رحم آ گیا۔ اسی وقت زمین نے ایک کروٹ لی اور سستی پھٹی ہوئی زمین میں سماتی چلی گئی۔ وہ چرواہا یہ دیکھ کر سکتے کے عالم میں کھڑا رہ گیا تھا۔

دوسری طرف پنوں کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اسے جب ہوش آیا تو اس نے خود کو اپنے ابائی گھر میں دیکھا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کے بھائی اس کے ساتھ دھوکا کر کے اسے یہاں اٹھا کر لے آئے ہیں۔

اس پر بھی جنونی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس نے ہم جنون کے عالم میں سستی سستی پکارتے ہوئے ریگستان کی طرف دوڑ لگا دی۔

شہزادہ بھی تنگے پاؤں اپنی منزل، اپنی محبت کی طرف دوڑا چلا جا رہا تھا۔ اس کے پاؤں بھی لہولہان ہو گئے تھے۔ وہ ٹھیک اس وقت اس جگہ پہنچا جہاں زمین نے سستی کی عزت محفوظ کر کے اسے اپنی آغوش میں چھپالیا تھا اور وہ چرواہا حیران و پریشان کھڑا ہوا تھا۔

اس نے پنوں کو صورت حال بتادی کہ ایک لڑکی اس طرف سے پنوں پنوں پکارتی ہوئی چلی جا رہی تھی کہ مجھ بدبخت کی نیت بدل گئی۔ میں نے اس پر بھرمانہ حملہ کرنا چاہا لیکن اس نے خدا سے دعا مانگی اور اسی وقت زمین پھٹی اور اس کی نگاہوں کے سامنے وہ اس زمین میں سما گئی ہے۔

پنوں نے ایک چیخ ماری، اور خدا سے وہی دعا کی جو سستی کی دعا تھی۔ قدرت نے ان دونوں کو قیامت تک کے لیے ایک کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسی لیے ایک بار پھر زمین پھٹی اور پنوں اس میں سماتا چلا گیا۔

ان دونوں کی محبت کی داستان آج بھی زندہ ہے۔ ان کی قبریں آج بھی اس وادی میں موجود ہیں۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے محبت کی اس لازوال داستان کو بہت موثر انداز میں اپنی شاعری میں بیان کیا ہے۔

☆☆☆

سوہنی مہینوال

محبت کی دکھ بھری کہانیوں میں سے ایک سوہنی مہینوال بھی ہے۔

یہ ایک ایسی کہانی ہے جو ضرب المثل بن کر رہ گئی ہے اور جس کا انجام آنکھوں میں آنسو لے آتا ہے۔

سوہنی اور مہینوال کی محبت کی داستان کا آغاز رومان کی سرزمین گجرات سے ہے۔ اس مٹی نے کیسے کیسے دہلی واقعات پروان چڑھائے ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ آج بھی کسی گھر میں سوہنی موجود ہو۔ کوئی مہینوال اس کے لیے بھنگ رہا ہو۔ محبت تو ہر دور میں زندہ رہتی ہے۔

اس کے روپ مختلف ہو سکتے ہیں۔ لیکن جذبہ وہی ہے۔ یہ کہانی اٹھارہویں صدی کی ہے۔ یہ زمانہ مغل سلطنت کا تھا۔ سوہنی کی پیدائش ایک کہان

تولا کے گھر میں ہوئی تھی۔ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ لوگ گجرات کے رہنے والے تھے۔ دریائے چناب کے کنارے آباد اس شہر کی اس زمانے میں بہت اہمیت تھی۔ کیونکہ شہر بخارا سے نکلنے والے تاجروں کے قافلے گزرتے ہوئے وہیں ٹھہر کر رہتے تھے۔

ان قافلوں کا قیام گجرات ہی میں ہوا کرتا تھا۔ جہاں انکی مدد سرائے بنی ہوئی تھیں۔ یہ قافلے دو چار دن گجرات میں آرام کر کے دہلی کی طرف نکل جاتے۔

سوہنی کے ہاتھوں میں قدرت نے بہت ہنر دیا تھا۔ اس کا باپ جب گھڑے اور صراحیوں وغیرہ بنا کر لاتا تو سوہنی اپنے خوبصورت ہاتھوں سے ان پر خوبصورت نقش و نگار بنا دیا کرتی تھی۔

بازار میں یہ بہت اچھی قیمت پر فروخت ہو جاتے۔ سوہنی کا باپ اپنی بیٹی کے اس ہنر سے بہت خوش ہوا کرتا تھا۔ شہزادہ عزت بیگ بخارا (ازبکستان) کا ایک تاجر تھا۔

اس کا گزر عام طور پر ان ہی راستوں سے ہوا کرتا۔ اس کا قافلہ گجرات میں کچھ دن رک کر دہلی کی طرف کوچ کر جاتا تھا۔

لیکن اس بار کا سفر بہت مختلف تھا کیونکہ اس بار اس کی محبت اسے اس طرف لے آئی تھی۔ یہ سفر تاریخ کا یادگار سفر بننے جا رہا تھا۔ اس لیے عزت بیگ کے پاؤں گجرات میں آکر رک گئے۔ اس کی محبت اسے پہنچ کر... یہاں لے آئی تھی۔ اس نے جب تولا کی دکان میں سوہنی کو دیکھا تو اس کے پاؤں جم گئے۔ مرکوز ہو کر رہ گئیں ان پر نگاہ شوق۔

عزت بیگ دیوانہ ہو کر رہ گیا۔ اسے کچھ لینا نہ تھا۔ مگر یہ چیزیں اس کے کس کام آئیں لیکن اس نے ایک صراحتی خرید لی اور سوہنی کو سونے کا ایک سکہ دے دیا۔

دوسری طرف سوہنی کا بھی یہی حال ہو گیا تھا۔ یہ انوکھا گاہک نگاہوں کے راستے اس کے دل میں اتر گیا تھا۔ ایسا بانٹا چھپایا... جوان پورے گجرات میں کوئی نہیں ہوگا۔

عزت بیگ دوسری شام پھر سوہنی کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے پھر ایک صراحتی خرید لی۔ مقصد تو سوہنی کو دیکھنا تھا۔ اس سے دو چار باتیں کرنی تھیں اور اپنے آتش شوق کو ہوا دینا تھا۔

عزت بیگ سونے کے سکے لے کر جاتا اور واپسی

آیوڈین

ایک کالا، چمک دار اور ٹھوس عنصر۔ آزاد حالت میں نہیں بلکہ مرکبات کی شکل میں پایا جاتا ہے۔ اسے سب سے پہلے ایک کیمیا دان برنارڈ کروٹوائس نے 1811ء میں دریافت کیا تھا۔ سمندر کے پانی، پودوں، سمندری جڑی بوٹیوں، آئینہ وغیرہ میں تھوڑی تھوڑی مقدار آیوڈین کی ہوتی ہے۔ کاڈمچھلی کے جگر کے تیل اور چلی سالٹ پیئر میں بھی آیوڈین کی کچھ مقدار ہوتی ہے۔ تجربہ گاہ میں میگنیز ڈائی آکسائیڈ، پوٹاشیم آیوڈائیڈ اور تیز سلفیورک ایسڈ کو ملا کر گرم کرنے سے تیار کی جاتی ہے۔ بڑے پیمانے پر صنعتی مقاصد کے لیے سمندری جڑی بوٹیوں کو سکھانے کے بعد جلا کر حاصل شدہ راکھ (جسے کیلپ کہتے ہیں) سے تیار کرتے ہیں یا چلی سالٹ پیئر سے حاصل کرتے ہیں۔ یہ چمک دار کالے رنگ کا قلمی ٹھوس ہوتا ہے جو 114.2 درجے سینٹی گریڈ پر پگھلتا ہے۔ گرم کرنے سے اس میں سے بنفشی رنگ کے کلورین کی سی بو دینے والے بخارات نکلتے ہیں۔ پانی میں کم حل ہوتی ہے، البتہ پوٹاشیم آیوڈائیڈ کے محلول میں بہت جلد حل ہوتی ہے۔ الکحل، ایٹھر، کلوروفارم، ہینزائن اور کاربن ڈائی سلفائیڈ میں بھی حل ہو جاتی ہے۔ عناصر کے ساتھ مل کر ان کے آیوڈائیڈ اور نائٹرک ایسڈ میں حل ہو کر ایوڈک ایسڈ بناتی ہے۔ ادویات میں استعمال ہوتی ہے۔ رنگ سازی اور فوٹو گرافی میں بھی کام آتی ہے۔ انسانی جسم کے ایک اہم غدود Thyroid Gland کو تھائی رائکسن ہارمون بنانے کے لیے اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ سمندر کی مچھلی، کیڑے اور قدرتی پانی وغیرہ میں یہ عنصر موجود ہوتا ہے۔ اس کی کمی سے گلٹر (Goitre) کا مرض لاحق ہو جاتا ہے۔

مرسلہ: ضیاء الدین اشرفی، فیصل آباد

میں اس کے ساتھ اس کی محبت ہوتی۔ اسی طرح سوہنی بھی مٹی کے برتنوں پر خوبصورت نقش و نگار بنانا بھول چکی تھی۔ اب وہ مٹی سے محبت کے گھر وندے بنارہی تھی۔

ان میں سے ہر گھر وندے میں اس نے اپنے محبوب عزت بیگ کو بیٹھا رکھا تھا۔

اب قافلے کے کوچ کرنے کا وقت آگیا تھا لیکن عزت بیگ کہاں جاسکتا تھا۔ اس کے قدم سوہنی کی دکان کے سامنے آکر جم گئے تھے۔ اس کا ظاہری سفر تو ختم ہو چکا تھا۔

اس کی منزل سوہنی کی صورت میں اس کے سامنے تھی۔ وہ اپنی منزل کو چھوڑ کر کہاں جاسکتا تھا۔ دوسری طرف اس کے پاس سکے بھی ختم ہو چکے تھے۔

اس نے دہلی یا بخارا جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور وہیں گجرات میں رہائش اختیار کر لی۔ سوہنی کے باپ نے سوہنی کے کہنے پر اسے اپنی دکان میں ملازمت دے دی تھی۔ محبت بھی کیسے کیسے تماشے دکھایا کرتی ہے۔ کہاں بخارا کے ایک امیر خاندان کا تاجر شہزادہ اور کہاں ایک کھار کی نوکری جو اس سے مٹی کے برتن بھی بنوایا کرتا اور اپنے موسیقی بھی عزت بیگ کے حوالے کر دیتا کہ وہ انہیں چراگاہ میں لے جایا کرے۔

عزت بیگ یہیں سے مہریا مہینوال کے طور پر مشہور ہو گیا۔

سوہنی اور مہینوال ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ ان کی محبت روز بروز پروان چڑھتی گئی۔ پھر جب ان کے پیار کے چرچے عام ہو گئے تو کھار برادری میں ایک کھلی سی جھگڑائی ہو گئی۔

یہ بات ان کی برداشت سے باہر تھی کہ کوئی غیر کھار ان کی برادری کی کسی لڑکی سے پیار کرے۔ یا اس سے شادی کر لے۔ ان کے یہاں ایسی کسی بات کا تصور ہی نہیں تھا۔ اور وہ بھی انجانے دیس سے آیا ہوا کوئی غیر ملکی۔

سوہنی کے باپ نے بہت خاموشی کے ساتھ سوہنی کا رشتہ کسی سے طے کر دیا۔ سوہنی بے چاری کو اس وقت خبر ہوئی جب اس کی برات اس کے دروازے تک آچکی تھی۔

وہ بے بسی سے تڑپ اٹھی۔ لیکن اس کے بس میں کچھ نہیں تھا۔ اسے زبردستی دہن بنا کر ڈولی میں بیٹھا کر شوہر کے گھر بھیج دیا گیا۔

سوہنی کی جدائی نے مہینوال کو پاگل بنا دیا۔ اس کے

لے زندگی میں اب کچھ نہیں رہا تھا۔ اس کی ساری خوشیاں ہو چکی تھیں۔ اس نے اپنی نیند، اپنا آرام سب کچھ ترک کر دیا۔

وہ فقیر بن گیا۔ کھانے پینے کا اسے ہوش ہی نہیں تھا۔ وہ جوگی بن کر بھٹکتا رہتا۔ اس نے اپنی رہائش دریا کے کنارے کے جنگلوں میں کر لی تھی۔

وہ روزانہ دریا عبور کر کے سوہنی کے گاؤں جایا کرتا۔ کیونکہ وہی جگہ تھی جہاں سے اس نے محبت حاصل کی تھی جہاں کے چپے چپے پر اس کی محبت سوہنی کے قدموں کے نشانات ثبت تھے۔ جہاں کی فضا میں سوہنی کی خوشبو سے آراستہ تھیں۔ جہاں ہر طرف سوہنی کی یادیں بکھری ہوئی تھیں۔ اس دوران اسے پتا چل گیا کہ سوہنی بیاہ کر گئی ہے۔

اب مہینوال نے وہاں کے چکر لگانے شروع کر دیے۔ اسے کسی کی پرواہ نہیں تھی۔ ایک دیوانے کے طور پر اس کا محبوب ہی سب کچھ ہوا کرتا ہے۔

اس آوارہ گردی کے دوران سوہنی سے پھر ملاقات ہو گئی۔ دونوں ایک بار پھر ایک دوسرے سے مل گئے۔ قدرت نے انہیں ایک رہنے کے لیے پیدا کیا تھا۔ ان کے درمیان یہ جدائی تو عارضی تھی۔

پھر سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اب یہ ملاقاتیں رات میں ہوا کرتیں۔ مہینوال دریا میں تیرتا ہوا سوہنی کے پاس آجاتا اور دونوں کہیں بیٹھ جاتے۔ دوسری طرف سوہنی بھی کبھی کبھی گھرے کا سہارا لے کر دریا عبور کر کے مہینوال کے پاس پہنچ جاتی۔ مہینوال اس کے لیے روز پھلی پکڑ کر رکھتا اور اسے پھلی کھلایا کرتا۔

کہتے ہیں کہ جب ایک بار دریا زوروں پر تھا اور ان رات مہینوال کو کوئی مچھلی نہیں مل سکی تو اس نے اپنی ران سے گوشت کا ایک ٹکڑا کاٹ کر سوہنی کو کھلا دیا تھا۔

دوسری رات جب وہ سوہنی کے پاس پہنچ نہیں سکا تو سوہنی اس گھرے کا سہارا لے کر مہینوال کے پاس پہنچ گئی۔ اس موقع کے لیے اس نے جو گھرے رکھا ہوا تھا وہ اسے گھر سے کچھ فاصلے پر چھپا دیا کرتی تھی۔ اس نے جب مہینوال کو دیکھا تو تڑپ اٹھی۔

مہینوال کے ران کا زخم اسے بہت تکلیف دینے لگا تھا۔ اس نے جب مہینوال کو اپنی قسم دی تو مہینوال چھپا ہوا سکا، اس نے بتا دیا کہ یہ زخم کیسا ہے۔

سوہنی ساری رات روتی رہی تھی۔ اس کے محبوب نے اس کے لیے مٹی بڑی قربانی دی تھی۔

اس کے بعد وہ ہر رات مہینوال سے ملنے جانے لگی۔ دریا عبور کرنے کا اس کے پاس ایک ہی ذریعہ تھا۔ وہی مٹی۔ اس کی نیند کو ایک رات اس پر شک ہو گیا۔

اس نے خاموشی سے سوہنی کا تعاقب کیا اور اسے پتا چل گیا کہ سوہنی ہر رات کس سے ملنے جایا کرتی ہے۔ اس عورت نے وہ گھر تبدیل کر کے اس کی جگہ ایک کچا گھرا رکھا تھا۔

دوسری رات سوہنی جب گھر اُلے کر دریا کے پاس پہنچی تو اس رات دریا چڑھا ہوا تھا لیکن اسے اس کی پرواہ نہیں تھی۔ اس کا محبوب دوسرے کنارے اس کے انتظار میں تھا۔ اس نے اپنا گھرا دریا میں ڈال دیا۔

کچھ دیر بعد ہی مٹی پانی میں گلنے لگی۔ دوسرے کنارے کھڑے ہوئے مہینوال نے بھی اسے ڈوبتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

سوہنی اس کی آنکھوں کے سامنے ڈوب چکی تھی۔

اب خود اس کے زندہ رہنے کا کیا جواز ہو سکتا تھا۔ اس نے بھی دریا میں چھلانگ لگا دی اور کچھ دیر بعد دونوں محبت کرنے والے دریا کی تہ میں کہیں گم ہو چکے تھے۔ سوہنی تو کچھ گھرے سے دریا عبور نہیں کر سکی لیکن اس نے قیامت تک کے لیے محبت کے سمندر کو عبور کر لیا ہے اور یہ مقام کسی کسی کو ملتا ہے۔

کچھ گھرے نے جیت لی عذری چڑھی ہوئی، مضبوط کشتیوں کو کنارہ نہیں ملا۔

☆☆☆

عمر ماروی

یہ ایک مختلف قسم کی داستان ہے۔ یہ داستان عشق کی تو ہے لیکن اس میں عشق کا انداز بالکل مختلف ہے۔

عمر ماروی کی داستان عشق میں ناکامی کی داستان نہیں ہے۔ بلکہ خوبصورت جذبے اور رسم و رواج کی داستان ہے۔

وہ وفا جو کسی شخص کو اپنی زمین اور اپنی مٹی سے ہو سکتی ہے۔

ماروی، قہر پار کر کے علاقے کھور کی رہنے والی تھی۔

آ کو پچھر

چمن کا چار ہزار سالہ قدیم طریق علاج، اب اس طریق علاج نے مغرب کو بھی بڑی حد تک متاثر کیا ہے۔ اس میں ٹھنڈی یا گرم سوئی کو جلد کے نیچے بافت میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ یہ سوئی عموماً اسٹیل کی بنی ہوئی ہوتی ہے اور اس کی لمبائی چند سینٹی میٹر ہوتی ہے۔ یہ جسم کے اس حصے میں جلد کے نیچے بافت میں داخل کی جاتی ہے جو حصہ بیمار ہو۔ آ کو پچھر سے کون کون سے جسمانی اعضا درست ہوتے ہیں، واضح طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ تاہم اعصابی درد، دمہ، کسی جوڑ میں موج آنا اور ایسی ہی کئی دیگر بیماریوں کے لیے آ کو پچھر طریق علاج بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ مشرق بعید میں اعصابی درد کی جگہ آپریشن کے لیے سوئیوں کا استعمال کیا جا رہا ہے۔ یہ دراصل ہر قسم کے دردوں کے لیے بہترین طریق علاج ہے۔ یہ دماغ کی طرف جانے والے ان اشاروں کو بھی روکتا ہے، جن کے سبب جسم کے کسی حصے میں درد ہوتا ہے۔

آ کو پچھر کے ذریعے چمن میں تو درختوں اور پودوں کی بیماریوں تک کا علاج کیا جا رہا ہے۔ ایک ایسا ہی تجربہ مکئی پر بھی کیا گیا، جس کی مدد سے وقت سے بہت پہلے مکئی کی نسبتاً زیادہ میٹھی فصل حاصل کی گئی۔ اس قسم کے آ کو پچھر کے لیے کسی دھاتی سوئی کی نہیں بلکہ صرف ایک تنکے کی مدد کافی ہوتی ہے۔ جب مکئی کا چھلکا سبز ہوتا ہے اس وقت تنکے کو بھٹے کے ڈنٹھل میں اس جگہ سے قدرے اوپر کی جانب پرودیتے ہیں، جہاں سے بھٹا پودے سے منسلک ہوتا ہے۔ چونکہ پودے بھی انسانوں کی طرح سانس لیتے اور غذا حاصل کرتے ہیں لہذا پودا اس زخم کی تکلیف محسوس کرتا ہے اور زخم بھرنے کی غرض سے فوری طور پر اضافی شکر اس سمت روانہ کر دیتا ہے، جس سے مکئی کہیں زیادہ خوش ذائقہ اور میٹھی ہو جاتی ہے۔

پاکستان میں اس کی تدریس کا آغاز پاکستان کالج آف آ کو پچھر سائنس میں کیا گیا، یہاں سے دو سالہ ڈپلوما کورس کرایا جاتا ہے۔ چمن کی حکومت نے 29 جولائی 1986ء کو اس کالج سے حاصل کردہ ڈپلومے کو اپنے ڈپلومے کے برابر قرار دیا تھا۔

مرسلہ: زہاد بشیر، لاہور

وہ صحرا میں کھلنے والا ایک لاجواب اور خوبصورت ترین پھول تھی۔

ماروی شروع ہی سے دوسروں کے دکھ درد میں کام آنے والی لڑکی تھی۔ اس کے دل میں صحرا میں بسنے والوں کے لیے بے پناہ پیار تھا۔ وہ ان کے دکھ درد میں کام آیا کرتی۔ اس کی ان خوبیوں نے اسے ہر دل عزیز بنا دیا تھا۔ کیت نام کے ایک نوجوان نے اسے دیکھا اور اسے اپنی روح میں بسالیا۔

دونوں ایک دوسرے سے ٹوٹ کر محبت کرنے لگے۔ دونوں کے لیے زندگی کا ایک ہی مقصد تھا۔ پیار، پیار، اور پیار۔ ایک دوسرے سے پیار۔ ایک دوسرے کی باتوں میں زندگی گزارنے کا خوبصورت خواب۔ اسی دوران ان کا ایک رقیب بھی پیدا ہو گیا۔ جس کا نام پھوگی تھا۔ وہ بھی ماروی کو بے تحاشہ پسند کرتا تھا۔ لیکن ماروی نے اپنی ساری محبتیں، ساری وفا میں اپنے محبوب کیت کے لیے وقف کر رکھی تھیں۔

اس کے لیے کیت سے بڑھ کر کوئی بھی نہیں تھا۔ پھوگی نے اسے حاصل کرنے کی بہت کوششیں کیں لیکن ماروی نے اس کی ہر کوشش ناکام بنا دی۔

ہر طرح سے ناکامی کے بعد پھوگی کے دل میں انتقام اور غصے کی آگ دہک اٹھی۔ اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ ماروی کو کسی بھی صورت کیت کی نہیں ہونے دے گا۔

وہ عمر کوٹ کے راجا عمر کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے ماروی کے حسن کی ایسی داستانیں بیان کیں کہ عمر ماروی کو دیکھنے کے لیے بے تاب ہو گیا۔

وہ خود ماروی کے گاؤں اسے دیکھنے کے لیے پہنچ گیا۔ اس نے ماروی کے باپ کو ماروی سے شادی کی پیشکش کر دی۔

ماروی کے باپ کے لیے اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی تھی۔

اس نے ماروی کے احتجاج کے باوجود ماروی کی شادی عمر سے کر دی۔ عمر ماروی کو لے کر عمر کوٹ آ گیا۔ یہاں سے عمر کی شریف انفسی کی کہانی شروع ہوتی ہے۔

اس نے ماروی پر کوئی جبر نہیں کیا۔ ماروی نے اسے اپنے قریب تک آنے نہیں دیا۔ لیکن عمر اس کی دل جوئی میں لگا رہا۔

اس نے ماروی کو بتایا کہ رانی بن جانے کی صورت

میں وہ اس کی زندگی کس طرح بدل سکتا ہے۔ اس کے سونے کے زیورات ہوں گے، محل ہوں گے، نوکر چاکر ہوں گے لیکن ماروی کو ان باتوں کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ وہ اپنے گاؤں، اپنی مٹی اور اپنی محبت کے لیے تڑپتی رہی۔

اور ایک دن اس نے عمر کو بتا دیا کہ وہ کیت سے محبت کرتی ہے۔ یہ سنتے ہی عمر نے اسے طلاق دے دی۔ بہت عزت اور احترام کے ساتھ مال و دولت دے کر اس کے گاؤں واپس بھجوا دیا۔

روایت ہے کہ عمر نے اس کے ساتھ بھائی سلوک کیا تھا۔ اپنے گاؤں پہنچ کر جب ماروی کو اپنی فضا اپنا ماحول ملا تو صحرا کا یہ پھول پھر سے کھل اٹھا۔ ماروی کی شادی کیت سے ہو گئی تھی۔

یہ تھی ایک ایسی محبت کی کہانی جس میں ناکامی وغیرہ تو کوئی تصور نہیں ہے لیکن یہ کہانی وفاداری اور ایثار کی مثل کہانی ہے۔

وفاداری ماروی کی اور ایثار عمر کا۔ اس لیے یہ کہانی ماروی کی کہانی کے نام سے ہماری تاریخ اور ہمارے لوگوں کی گیتوں کا سرمایہ بن چکی ہے۔

نوری جام تماچی

سرزمین سندھ کی ایک اور پیار کی داستان۔ جام تماچی ٹھٹھہ کے ایک علاقے سما کا حکمران تھا۔ جبکہ نوری ایک چھپھرے کی بیٹی تھی۔

اس علاقے میں دو جھیلیں مل کر ایک بڑی جمیل کھجور میں تبدیل ہو جاتی تھیں۔ کھجور کے کنارے آج بھی یادگاریں موجود ہیں جو جام تماچی نے نوری کے لیے بنوائی تھیں۔

نوری ایک غریب لڑکی تھی اور جام تماچی ایک شہزادہ تھا۔ اس کے باوجود دونوں کے درمیان پیار کا رشتہ قائم ہو گیا تھا کیونکہ یہ رشتہ مفلسی اور امیری کو نہیں دیکھتا۔ اس کا اپنا مسلک ہوا کرتا ہے۔

جام نے نوری سے شادی کر لی تھی۔

شادی کے بعد دونوں مرتے دم تک ایک دوسرے کے وفادار رہے تھے۔ پوری ریاست میں ان کی محبت کی مثالیں دی جاتی تھیں جو آج بھی دی جاتی ہیں۔

افریقا اور افریقا

الطاف شیخ

ترجمہ: ابراہیم جمالی



پراسراریت کی سرزمین افریقا جہاں قدرت کی فیاضی قدم قدم پر منتظر ہے، جہاں ہرے بھرے انتہائی گھنے جنگل ہیں تو خونخوار درندے بھی۔ جہاں معصوم صفت لوگ ہیں تو آدم خور قبائل بھی مگر کئی شہر ترقی یافتہ اتنے ہیں کہ ان پر یورپ و امریکی شہروں کا دھوکا ہو جائے۔ عام طور پر افریقا کے سفرناموں میں صرف اور صرف جنگل کا ذکر نظر آتا ہے لیکن یہ الطاف شیخ کا کمال ہے کہ وہ روداد سفر سناتے وقت سب سے الگ زاویہ سامنے لاتے ہیں۔ زیر نظر سفرنامے میں آپ کو افریقا کا ایک نیا رخ نظر آئے گا۔

افریقا پہنچ کر ماضی کے کئی واقعات یاد آ رہے ہیں۔ جہاں یہاں کے مختلف ملکوں میں پیش آئے۔ یہ قصہ بھی ابتدائی دنوں کا ہے۔ تب ہم صحیح معنوں میں سمندری زندگی سے واقف بھی نہیں تھے۔ ہم دنیا کی تمام بندرگاہوں کو ایک میں لاء اینڈ آرڈر کی صورت حال بہتر ہے۔

ان دنوں ہمارا جہاز سلیم، فرانس، انگلینڈ اور جرمنی جیسے ترقی یافتہ ملکوں کی بندرگاہوں سے مال اٹھا کر جنوب میں افریقا کے مغربی کنارے والے ممالک سیرنگال، گنی بساؤ، لیبیا، نائجر یا اوریمبیا وغیرہ جانے والا تھا۔ ہم افریقا کے ان ممالک کی بندرگاہوں میں بھی دن رات ایسے بے فکر ہو کر گھومتے رہتے تھے جیسے لندن، مانچسٹر، بمبئی، اینٹورپ اور رائڈم وغیرہ ہیں۔ جیسے ہی ہماری ڈیوٹی ختم ہوتی ہم جہاز کی سیرگی اتر کر بندرگاہ سے باہر نکل جاتے تھے اور سوچے سمجھے بغیر منہ اٹھائے کہیں بھی چل دیتے تھے۔ ہمیں یہ خیال بھی نہ آتا کہ اس ملک کے حالات کیا ہیں۔ کوئی ایمر جیسی یا ہنگامہ تو نہیں۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ تک پہنچنے کے لیے بس سروس ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو یہ سہولت رات میں بھی دستیاب ہوگی یا واپسی پر پیدل مارچ کرنا پڑے گا۔ یہی نقشہ یا ایڈریس اپنے ساتھ نہیں رکھتے تھے۔ بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ ملک کے سماجی اور سیاسی حالات کی خبر تک نہ رکھتے۔ حالانکہ وہ ایسے دن تھے جب افریقی ملکوں میں آزادی کی تحریکیں زور روں پر تھیں۔ یہ ساٹھ کے عشرے کے آخری سال کی بات ہے۔

کئی ملکوں میں مقامی لوگ گوروں سے سخت نفرت کرتے تھے۔ کئی علاقوں میں ہم ایشین، خاص طور پر برصغیر کے لوگ قابل نفرت تھے۔ جو ملک آزاد ہو چکے تھے وہاں سیاسی چپقلش عروج پر تھی اور حصول اقتدار کے لیے مقامی لوگ آپس میں برسر پیکار تھے۔ بدامنی، اغواء، چوری، ڈکیتی کی وارداتیں عام تھیں۔ لیکن ہمارے لیے دنیا صرف دو خانوں میں بنی ہوئی تھی۔ ایک جہاز کی دنیا، جو قید و بند کی علامت تھی یعنی ہم جہاز چلانے والوں کے لیے۔ دوسری جہاز سے باہر کی دنیا جو آزادی، سیر و تفریح اور رنگینوں سے آراستہ تھی۔

ابتدائی دنوں میں ہمیں یہ خیال تک نہ آتا کہ افریقا وہ جگہ ہے۔ جہاں سانپ، بچھو اور جنگلی جانور پائے جاتے ہیں۔ ٹیڑھی جیسی زہریلی کھیاں اور دوسرے رینگنے والے جانور والے حشرات ہیں جن کا کائنات زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ ایسی جگہ پر سادہ پانی مل جائے تو وہ بھی بڑی عیاشی ہے۔ فلٹرڈ یا ابلے ہوئے پانی کا تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ جہاں دریاؤں کے رواں پانی میں ”بجارتلیا“ جیسی بیماریاں اور اس میں چھپے ہوئے مگر چھپے ہیں جن سے خود کو محفوظ رکھنا ضروری ہے۔ لیکن ہم تھے کہ بے فکرانہ طور پر شہروں اور قصبوں کی گلیوں میں آوارہ گردی کرتے رہتے۔ بس ہمارے لیے

ایک بات اہم تھی اور وہ یہ کہ ہم کسی طرح بھی اپنے جہاز کی آہنی چار دیواری سے دور رہیں۔ ان ہی دنوں ہمارا جہاز گنی بساؤ کی بندرگاہ میں کھانسی انداز ہوا۔ بندرگاہ کیا تھی، بس یوں سمجھیں کہ جیسے ہم نے ذرات سے بچنے کے لیے چہرے ڈھانپ رکھے ہوں۔ کے کسی دور دراز کے گاؤں میں آگئے ہوں۔ وہاں کی حالت ان کے لباس اور کلائی پر بندھی جدید فیشن کی عمارتیں گارے مٹی کی تھیں۔ تاحدنگاہ ریت کا سمندر تھا۔ کچھ کراندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی خوش حال ملک سے کہیں کہیں کے گھر نظر آتے تھے۔ جن کی چھتیں گھاس پر بنی ہوئی تھیں۔ اور تنکوں کی چھتیں۔ چاروں طرف تپتی دھوپ، پانی کی گھاس اور خشک سالی کا عالم تھا۔ ہر جانب عجیب و غریب بو تھی۔ بندرگاہ کے قریب کچھ پختہ عمارتیں ضرور تھیں۔ برتگالیوں کے دفاتر کے طور پر زبرد استعمال تھیں۔ یہ ملک ”گنی بساؤ“ تھی پٹی کی طرح دوسرے ملک سیرنگال اور گنی میں اندر تک جا رہا تھا۔ اس ملک کی سڑکیں اور دوسرے ملک سے گزرتے تھے۔ جس طرح کراچی حیدر آباد جاتے ہوئے سپر ہائی وے دو مقامات پر ٹھہرے۔ دادوا اضلاع کی حدود سے گزرتا ہے۔

میں نے نیا نیا جہاز جوائن کیا تھا۔ ایک دن شام وقت میں جہاز کے تھرڈ انجینئر کے ساتھ شہر گھومنے کے بندرگاہ سے باہر آیا۔ کوئی طے شدہ پروگرام نہیں تھا۔ ڈیوٹی مکمل کر کے جہاز کی سیرگی کے پاس کھڑا تھا۔ ایسے ہی تھرڈ انجینئر صاحب بھی سیرگی اتر کر وہاں آگئے۔ ”کہاں کی تیاری ہے تین صاحب؟“ (تھرڈ انجینئر صاحب) میں نے پوچھا۔ ”کہیں نہیں..... بس ایسے ہی بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ ”بندرگاہ کا چکر لگا آؤں..... چلنا ہے تو آجاؤ۔“

میں نے ان کی دعوت فوراً قبول کی اور انجن روم میں چھپ چوتوں ہی میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ ہم ٹھہری اور تھانہ خان شہر جیسی واحد اور ویران مارکیٹ میں ادھر ادھر بھٹکے۔ بعد ایک ہوٹل میں آ بیٹھے جس کی دیواریں مٹی اور گورے بنی ہوئی تھیں۔ ایک سیاہ فام اور بھدے نقوش والے بیرے نے ہمارے سامنے کافی لاکر رکھی جو اس کی ریت سے بچھ کرتی ہوئی کالی اور کسلی تھی۔ کسی قریبی شہر یا ملک ایک قافلہ وہاں پہنچا تھا جس کے مسافر ہوٹل کے چاروں طرف نظر آ رہے تھے۔ فضا میں اونٹوں کے گھلے میں گھنٹیوں کی آواز، ہوٹل میں بچنے والے افریقی بچوں کا شور اور اونٹ، گدھوں کی مخصوص بو پھیلی ہوئی تھی۔ قافلے مسافر مسلمان تھے کیونکہ عورتوں کے چہرے کا لے رنگ کے

”سواری کے نام پر ہم کوئی گدھا گاڑی یا اونٹ ہار کر سکتے ہیں۔“ میں نے کہا کیونکہ ہم ایسی ہی سواری افریقا کر سکتے تھے۔

”یہاں بس سروس بھی تو چلتی ہوگی۔“ انہوں نے میری بات کا برا منائے بغیر کہا اور اسی وقت دور سے مینڈک جیسے منہ والی کھٹارا بس کھڑکھڑاتی ہوئی آتی نظر آئی۔ ایسی بسیں ڈیپلو، عمر کوٹ، مٹی اور چھاپھر روٹ پر آج بھی چلتی ہیں جنہیں ڈرائیور اور کنڈکٹر ”راکٹ“ کہتے ہیں۔ اسے دیکھ کر تھکاوٹ کا احساس ہوا۔ وہ بس جیسے ہی قریب آئی ہم نے اسے ہاتھوں کے اشاروں سے اور چیخ چیخ کر روک دیا۔ دوڑ کر اس میں سوار ہو گئے۔ کیونکہ وہ کافی آگے جا کر رہی تھی۔ شاید اس کے بریک ٹھیک کام نہیں کر رہے تھے۔ ڈرائیور نے مالک کو کچھ مالی فائدہ پہنچانے کے لیے مزید دو مینجر، یعنی ہمیں بٹھانے کے لیے بس گوروک لیا تھا۔ ویسے بھی اس کا رکنا ضروری تھا۔ کیونکہ ہمارے سوار ہونے اور آخری اسٹاپ کا کرایہ دینے کے بعد بھی بس کافی دیر تک وہیں رکی رہی۔ ڈرائیور اور کنڈکٹر بس کے ریڈی ایٹر کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اس میں پانی ڈالتے رہے۔ ہر ایک میل چلنے کے بعد یہ مشق دہرائی جاتی رہی۔ یہاں تک کہ پانی کا آخری ڈبا بھی خالی ہو گیا۔ پانی کے ڈبوں کے لیے ڈرائیور کے پیچھے والی پوری سیٹ وقف تھی۔ بس میں موجود پانچ کنگ سائز سیاہ فام عورتوں میں سے ایک اپنے اکلوتے شوہر کے ساتھ، دو اپنے نصف درجن بچوں میں گھری ہوئی اور باقی دو اپنے مشترکہ میاں کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ یعنی اس کی دو بیویاں تھیں۔

ارد گرد کا نظارہ دلکش ہرگز نہیں تھا۔ بس کے اندرونی ماحول سے نظر چرا کر کھڑکی سے باہر دیکھتے تو وہاں ریت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور منظر تھا جسے ہم گویا ایکشن ری پلے کے طور پر بار بار دیکھ رہے تھے اور وہ تھا بس کارکنا، کنڈکٹر کا پانی کا ڈبا اٹھا کر نیچے جانا اور اسے ریڈی ایٹر میں ڈالنا۔

”آخری ڈبا ختم ہونے کے بعد کیا ہوگا؟“ تھرڈ انجینئر نے خدشہ ظاہر کیا۔ ”بس میں کوئی FWE (فریش وائر اپو ریٹر) تو ہے نہیں جو پانی بنائے۔“ میں خاموش رہا۔ اس قسم کا مذاق ایک انجانا سا خوف پیدا کرنے لگا تھا۔ ہم نے سوچا تھا کہ آخری اسٹاپ پر پہنچ کر اسی بس میں یا اس روٹ کی دوسری بس کے ذریعے

کچھ مردوں نے بھی اپنے چہرے کے گوشے سے ڈھانپ رکھے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ ان ہی دنوں ہمارا جہاز گنی بساؤ کی بندرگاہ میں کھانسی انداز ہوا۔ بندرگاہ کیا تھی، بس یوں سمجھیں کہ جیسے ہم نے ذرات سے بچنے کے لیے چہرے ڈھانپ رکھے ہوں۔ کے کسی دور دراز کے گاؤں میں آگئے ہوں۔ وہاں کی حالت ان کے لباس اور کلائی پر بندھی جدید فیشن کی عمارتیں گارے مٹی کی تھیں۔ تاحدنگاہ ریت کا سمندر تھا۔ کچھ کراندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی خوش حال ملک سے کہیں کہیں کے گھر نظر آتے تھے۔ جن کی چھتیں گھاس پر بنی ہوئی تھیں۔ اور تنکوں کی چھتیں۔ چاروں طرف تپتی دھوپ، پانی کی گھاس اور خشک سالی کا عالم تھا۔ ہر جانب عجیب و غریب بو تھی۔ بندرگاہ کے قریب کچھ پختہ عمارتیں ضرور تھیں۔ برتگالیوں کے دفاتر کے طور پر زبرد استعمال تھیں۔ یہ ملک ”گنی بساؤ“ تھی پٹی کی طرح دوسرے ملک سیرنگال اور گنی میں اندر تک جا رہا تھا۔ اس ملک کی سڑکیں اور دوسرے ملک سے گزرتے تھے۔ جس طرح کراچی حیدر آباد جاتے ہوئے سپر ہائی وے دو مقامات پر ٹھہرے۔ دادوا اضلاع کی حدود سے گزرتا ہے۔

میں نے نیا نیا جہاز جوائن کیا تھا۔ ایک دن شام وقت میں جہاز کے تھرڈ انجینئر کے ساتھ شہر گھومنے کے بندرگاہ سے باہر آیا۔ کوئی طے شدہ پروگرام نہیں تھا۔ ڈیوٹی مکمل کر کے جہاز کی سیرگی کے پاس کھڑا تھا۔ ایسے ہی تھرڈ انجینئر صاحب بھی سیرگی اتر کر وہاں آگئے۔ ”کہاں کی تیاری ہے تین صاحب؟“ (تھرڈ انجینئر صاحب) میں نے پوچھا۔ ”کہیں نہیں..... بس ایسے ہی بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ ”بندرگاہ کا چکر لگا آؤں..... چلنا ہے تو آجاؤ۔“

میں نے ان کی دعوت فوراً قبول کی اور انجن روم میں چھپ چوتوں ہی میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ ہم ٹھہری اور تھانہ خان شہر جیسی واحد اور ویران مارکیٹ میں ادھر ادھر بھٹکے۔ بعد ایک ہوٹل میں آ بیٹھے جس کی دیواریں مٹی اور گورے بنی ہوئی تھیں۔ ایک سیاہ فام اور بھدے نقوش والے بیرے نے ہمارے سامنے کافی لاکر رکھی جو اس کی ریت سے بچھ کرتی ہوئی کالی اور کسلی تھی۔ کسی قریبی شہر یا ملک ایک قافلہ وہاں پہنچا تھا جس کے مسافر ہوٹل کے چاروں طرف نظر آ رہے تھے۔ فضا میں اونٹوں کے گھلے میں گھنٹیوں کی آواز، ہوٹل میں بچنے والے افریقی بچوں کا شور اور اونٹ، گدھوں کی مخصوص بو پھیلی ہوئی تھی۔ قافلے مسافر مسلمان تھے کیونکہ عورتوں کے چہرے کا لے رنگ کے

واپس بندرگاہ آجائیں گے۔ یورپ یا انگلینڈ میں ہم ایسا ہی کرتے تھے۔ ہم اس طرح کم خرچ میں کافی سیر کر لیتے تھے۔ لیکن یہاں ایک تو دیکھنے کے لیے کوئی رومانٹک منظر یا چیز نظر نہیں آتی تھی۔ چاروں طرف ریت ہی ریت تھی۔ دوسرے انجانے خوف نے پریشان کر رکھا تھا۔ آخر کار وہی ہوا جس کا ہمیں خدشہ تھا۔ تقریباً سات کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد بس ساتویں مرتبہ رکی تو پھر چلنے کا نام نہیں لیا۔ ڈرائیور نے بہت کوشش کی لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ ہوتی بھی کیسے اس کا ریڈی ایٹر پھٹ چکا تھا جو پہلے ہی درست حالت میں نہیں تھا اور اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے پانی کی ایک بوند بھی باقی نہیں رہی تھی۔

ہم اس وقت حیران رہ گئے جب بس کے مسافر نیچے اتر کر ادھر ادھر غائب ہو گئے۔ شاید وہ قریبی گاؤں اور جنگلی بستیوں کے باسی تھے۔ انہوں نے کنڈکٹر کو کرایہ بھی نہیں دیا۔ جو مسافر ہماری طرح کرایہ دے چکے تھے، ڈرائیور نے ان کا نصف کرایہ ضبط کر کے جنرل ایوریج ڈکلیئر کر دیا۔ اس کے بعد ہمیں گائیڈ کیا گیا کہ ہم دو میل مزید آگے جائیں گے تو وہاں سے پڑوسی ملک کی ایک سڑک گزرتی ہے۔ جہاں ہمیں کوئی نہ کوئی سواری ضرور مل جائے گی۔

”یہاں سے کوئی بس واپس بندرگاہ کی طرف جاتی ہے؟“ ہم نے کنڈکٹر سے پوچھا۔

”یہی تو ایک بس ہے جسے کل واپس آنا تھا“ اس نے جواب دیا۔ اب یہ خراب ہو چکی ہے۔ اس کے ٹھیک ہونے میں تین چار دن تو لگ ہی جائیں گے۔

”اچھا یہ بتائیں.....“ ہم نے دریافت کیا۔ ”آگے جانے پر ہمیں کون سی سواری ملے گی؟“

”اے کیمل.....!“ کنڈکٹر نے مختصر جواب دیا جو شروع سے گردن بیڑھی کر کے انگریزی میں گفتگو کر رہا تھا۔ کیونکہ اس نے دو سال گھانا میں کسی انگریز سپاہی کے گھوڑے کی مالش کرتے ہوئے انگریزی سیکھی تھی۔

یعنی سواری کے لیے ہمیں اونٹ مل سکتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں یہاں کے شیڈول پر کوئی بس یا ریل گاڑی نہیں چلتی۔ یہ جان کر ہمیں اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا۔ ہم اچھے بھلے جہاز کے محفوظ اور انرکنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھے ہوئے تھے، خواجواہ گرمی اور بیابان میں نکل آئے۔ اس وقت ہمارے ساتھی جہاز کے عرشے پر آرام دہ کرسیوں پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف ہوں گے اور چائے، کافی سے

لطف اندوز ہو رہے ہوں گے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے ان کے دو جہازی اپنے کیمپ میں موجود ہونے کی بجائے بندرگاہ سے سات آٹھ کلومیٹر دور بیابان میں پورے کھڑے ہیں اور انہیں واپسی کا کوئی بندوبست اور رات نہیں آرہی۔

”کبھی کبھی انسان بہت بڑی غلطی کر بیٹھتا ہے۔“

تھرڈ انجینئر نے الفاظ چباتے ہوئے کہا۔

”اور یہ غلطی بڑے نامناسب وقت پر ہوتی ہے۔“

میں نے انہیں یاد دلایا۔ ”اب رات کا اندھیرا چھانے لگا ہے اور کل ہی ہمارے جہاز کو یہاں سے روانہ ہونا ہے۔“

تھرڈ انجینئر صاحب نے عقل کے گھوڑے دوڑا دیے۔ ”ہوئے فیصلہ صادر کیا کہ ہمیں مزید آگے چلنے کی بجائے واپس کا رخ اختیار کرنا چاہیے۔“

”سعید منزل اور کیمڑی کے درمیان بسوں میں کرتے کرتے مجھے اتنا آئیڈ یا ہو گیا ہے کہ ہم یہ جو فاصلے طے کر کے یہاں پہنچے ہیں، وہ کوئی چھ سات کلومیٹر سے زیادہ نہیں ہوگا۔ یہ زیادہ سے زیادہ صدر سے ٹاور جتنا ہے۔ ہم ہمت سے کام لیں تو یہ فاصلہ پیدل طے کر سکتے ہیں۔“

میں بھلا کیا اعتراض کر سکتا تھا۔ وہ میرے اصرار پر باس تھے، مجھے ان کے ساتھ سمندر پر دن اور رات کے سارے چار بجے تک جہاز چلانا پڑتا تھا۔ جہازی دنیا میں

بوجھ چکا تھا۔ اب رات کی تاریکی بھی چھانے والی تھی۔ ہر ریت کے میدانوں میں چلتے رہے۔ سخت پیاس کی وجہ سے ہماری حالت خراب تھی لیکن ہم آگے بڑھتے رہے۔ اب جہاز سے زیادہ کسی آبادی کی تلاش تھی جہاں ہم سیر کرنے کے لیے پانی مل جائے۔ ہماری نظریں کسی جنگلی یا مکان کی تلاش میں دور دور تک بھٹکتی رہیں۔ ایسے میں ہم نے دیکھا کہ سامنے سے ایک زبردست بگولے کی طرح کوئی ریت اڑتا ہوا آرہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کئی گھڑ سوار ملٹی اڑاتے چلے آرہے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہوا کہ چار پانچ شطرنج جیسے جانور تھے جو ہمارے قریب سے گزر رہے تھے۔

”Antelope نسل کے جانور ہیں جو افریقا کے ایسے ریگستانی علاقوں میں عام پائے جاتے ہیں۔“ تھرڈ انجینئر صاحب نے ان کے بارے میں معلومات فراہم کی۔ بہر حال ان کی روشنی اور اڑتی ریت میں ہم انہیں غور سے نہیں دیکھ سکے۔ اگرچہ وہ خطرناک یا خواجواہ جانور نہیں تھے لیکن ہم خوفزدہ ضرور ہو گئے تھے۔ ہمیں شدت سے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ یہ افریقا کا وہ حصہ ہے جہاں لوگ اب تک آزاد نہیں ہوئے۔ یہاں کے باشندے اپنے یورپی حاکموں کے ساتھ ایشین سے بھی نفرت کرتے ہیں جو ملک کی اکانومی کے ایک حصے پر قابض تھے۔

اندھیرا بڑھنے لگا تھا۔ دن کی بقی ہوئی ریت کے ذرات سانس کے ذریعے حلق میں اٹک کر جھین پیدا کر رہے تھے۔ لیکن سب سے زیادہ اذیت کا باعث پیاس تھی۔ چلتے چلتے اچانک سامنے چند گھروندے نظر آئے اور ہماری جان میں جان آئی۔ ہمیں یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئی کہ زندگی کے آثار تو نظر آئے۔ جھوپڑیوں میں لائین کی روشنی نظر آرہی تھی۔ ہم تیز قدم اٹھاتے بستی کے قریب پہنچ گئے۔ کچے مکانات کے سامنے پھولے ہوئے پیٹ والے کمزور بچے اور آوارہ کتے کھڑے تھے۔ کچھ بڑی عمر کے بچے بھی تھے اور انہوں نے ڈنڈے اٹھائے ہوئے تھے۔ یہ بھی تقریباً ہمیں سے محروم تھے اور گیلی مٹی ان کے گھٹنوں اور بازوؤں کی کیمپوں تک لگی ہوئی تھی۔ شاید یہ کیمپوں میں کھیتے رہے تھے۔ ہم دیکھ کر ایک دو کتوں نے بھونکنا شروع کر دیا۔ اس دوران کوٹنے والے مکان سے ایک سیاہ فام عورت باہر آئی اور اس نے کتوں کو بھڑکار کر بھاگ دیا۔ گھر کا کوئی دروازہ نہیں تھا۔ بس دیوار میں قہر آدم خلا سا تھا جس پر کپڑا لٹک

رہا تھا۔ وہ سیاہ فام عورت جسامت، شکل صورت اور آواز سے مرد معلوم ہوتی تھی۔ اس کے چہرے پر آڑے ترچھے زخموں کے نشانات تھے جیسے نائی گرامی چوروں اور ڈاکوؤں کے چہرے پر بچے ہوتے ہیں۔ بعد میں تھرڈ انجینئر نے بتایا کہ یہ نشانات بچپن میں بنائے جاتے ہیں اور اس سے قبیلے کی پہچان ہوتی ہے۔

ہم نے سیدھے ہاتھ سے اوک بنا کر اشارہ کرتے ہوئے سیاہ فام عورت کو بتایا کہ ہمیں پانی چاہیے۔ اس نے اپنی زبان میں کچھ کہتے ہوئے ہمیں گھر میں آنے کا اشارہ کیا۔ ہم اندر جانے سے گھبرا رہے تھے۔ میں اس مرد نما عورت کا چہرہ غور سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے وہ کچے کے علاقے کے کسی ڈاکو کا چہرہ لگ رہا تھا۔ اس نے دوبارہ انگلی سے اشارہ کیا۔ میں تذبذب کے عالم میں اندر جانے یا نہ جانے کا سوچ رہا تھا۔ اتنے میں تھرڈ انجینئر نے میرے پاؤں کی طرف اشارہ کر کے زوردار چیخ ماری۔ میں کانپ کر رہ گیا اور نیچے دیکھا۔ دھندلی سی ہلکی روشنی میں ایک انسانی ہاتھ کے پنجے کے برابر کالے رنگ کا بچھو میرے جوتے پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید اس کی ٹانگ میرے جوتے کے نیچے آگئی تھی اور وہ اپنی جان بچانے کے لیے اوپر نیچے بھدک رہا تھا۔ بہر حال اس وقت ایک خوفناک اور جسیم بچھو کو دیکھ کر میں بھی اپنی چیخ پر قابو نہ پاسکا۔

ہماری اس حرکت پر دائیں بائیں گھڑے نیچے ہنس کر دہرے ہو گئے۔ ایک نے دور بیٹھے ہوئے بچے کو پکارا جس کے ہاتھ میں کالج کی کھلے منہ والی بوتل اور دوسرے ہاتھ میں لمبا سوا تھا۔ اس نے سوے کی نوک بچھو کے جسم میں پروئی اور اسے اٹھا کر بوتل کے اندر ڈال دیا۔ اس میں پہلے ہی پانچ چھ پیلے اور براؤن رنگ کے بچھو موجود تھے۔ ان میں کالا بچھو بھی ایک تھا۔ وہ بچہ ہمیں ڈرانے یا مذاق کرنے..... یا شدید یونہی داد وصول کرنے کے لیے بچھوؤں والی بوتل ہمارے چہرے کے سامنے ہلانے لگا۔ اس کے ساتھی بچے دوبارہ قہقہے لگانے لگے۔ ہم دونوں خوفزدہ ہو کر ڈاکو کے ساتھ کچے کے علاقے میں چلے گئے۔ یعنی اس سیاہ فام مرد نما عورت کے گھر میں گھس گئے۔ ہم نے گویا اپنے آپ کو بچھوؤں سے بچا کر آدم خور ٹائپ عورت کے حوالے کر دیا۔

گھر کے اندر دیوار میں بنے ہوئے ایک کھانچے میں مٹی کا دیا جل رہا تھا۔ دروازے کے قریب ایک اور مونی

اور بھاری بھر کم عورت کھڑی تھی جو جلاؤ قسم کی کالی مائی سے خاصی کم عمر تھی۔ شاید وہ اس کی بیٹی یا بہو تھی۔ وہ بھی مختصر لباس میں تھی۔ یعنی صرف اپنے درمیانی حصے کو تو لیے نما کپڑے سے ڈھانپا ہوا تھا۔ بالائی حصہ کپڑوں سے بے نیاز تھا۔ وہ اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ میں نے اس سے قبل اس قسم کی افریقی عورتیں دھان صاف کرتی یا ایک دوسرے کے سروں سے جوئیں نکالتی ہوئی صرف جو گرافک میگزین کی تصویروں میں دیکھی تھیں۔

گھر کے ایک کونے میں کوئی تازہ ذبح کیا ہوا جانور لٹک رہا تھا جس کی کھال اتری ہوئی تھی۔ ہوسکتا ہے وہ کوئی بکری یا گائے بھینس کا پھڑا ہو۔ گدھ یا خچر بھی ہوسکتا تھا۔ ہم اس لیے بھی اسے شناخت نہیں کر سکے کہ اس کی کھال کے ساتھ سر بھی غائب تھا۔ اس کے جسم کے مختلف حصوں سے گوشت کاٹ کر نکال لیا گیا تھا۔ تازہ ذبح کیا ہوا اس لیے کہا جاسکتا تھا کہ اب تک اس کے خون کے قطرے زمین پر ٹپک رہے تھے۔ قریب ہی ایک مٹی کا برتن خون سے بھرا ہوا تھا۔ ایک چھوٹا دریا چیز بار بار آکر اس برتن سے خون پینے کی کوشش کر رہی تھی۔ جسے جوان عورت زمین پر پاؤں مار کر بھگارتی تھی۔ بچوں سے صبر نہ ہوسکا اور وہ بھی تھوڑی دیر کے بعد اندر کھس آئے۔ وہ لٹکے ہوئے جانور کی طرف اشارہ کر کے ہمیں کچھ بتانے کی کوشش کرنے لگے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کوئی اہم بات ہوئی ہے بلکہ بہت بڑا سانحہ ہو چکا ہے جسے ہم کوشش کے باوجود سمجھنے سے قاصر تھے۔ ہوسکتا ہے وہ جانور شکار کیا گیا ہو یا کوئی خاص دن منانے کے لیے قربانی دی گئی ہو۔ بہر حال عجیب ڈراؤنا سا ماحول تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم نے ڈرتے ڈرتے دوبارہ اس طرح پانی کی بات کی جیسے کسی کا رشتہ مانگ رہے ہوں جس کے انکار کا اندیشہ ہو۔ بڑی عمر کی عورت نے ایک رسی اور پلاسٹک کی بالٹی اٹھائی۔ پھر اس نے تھرڈ انجینئر کو اپنے ساتھ چلنے اور مجھے وہیں رکھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے جاتے ہوئے تھرڈ انجینئر کا بازو مضبوطی کے ساتھ پکڑتے ہوئے التجا کی۔ ”میں بھی ساتھ چلوں گا۔۔۔۔۔ اس لٹکے ہوئے جانور! نو جوان نیم برہنہ عورت اور ان شرارتی بچوں کو دیکھ کر میں انتقال فرما جاؤں گا۔“

بہر حال یہ ہنسی مذاق کی باتیں اب سوجھ رہی ہیں۔ جبکہ اس وقت ہم دونوں نے لرزتے ہوئے اشاروں ہی

اشاروں میں اس مفہوم کا پیغام ایک دوسرے کو ٹرانسمیٹ کیا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے، ہمیں ساتھ رہنا ہے۔ تھرڈ انجینئر کے ساتھ جانے کے لیے پلٹا، پلٹا پلانے والی سیاہ فام عورت زور سے چیخی اور میں میرے پاؤں وہیں جم گئے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے گھما کر اس کی طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کے کانسانہ میں نہیں بلکہ وہ کینٹ چھوٹ رہی جو بار بار ہمارے موجود خون پینے کے لیے لپک رہی تھی میرے رے کے قدم پھراٹھنے لگے۔

تھوڑی ہی دور ایک غار نما کنواں تھا۔ جس میں کا پانی جمع تھا۔ اس میں موجود درجنوں مینڈکوں کی آواز دور تک سنی جاسکتی تھی۔ ڈاکو جیسی کالی مائی کے ذریعے پانی کی بالٹی بھردی۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں پانی اتنا ہائی جینک نہیں تھا۔ لیکن شدید پیاس کے بار پانی بہت بھلا لگا۔

پانی پی کر جب ہوش ٹھکانے پر آئے تو ہم اشاروں سے اور بعد میں ریت پر جہاز بنا کر سیاہ فام کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ہم یہاں جانا چاہتے ہیں۔ بتاؤ۔ ہم نے اس مدد کے عوض کچھ رقم دینے کا لالچ بھی دیا۔ تھرڈ انجینئر پانی پی کر کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گئے۔ انہوں نے اپنی گھڑی دینے کی پیشکش بھی کر دی۔ میں نے انہیں خبردار کیا کہ وہ ایسی حماقت ہرگز نہ کریں۔ جہاز چلانے کے دوران ہم آدمی رات کو بار بار کس وقت دریافت کریں گے۔ دوسری بات یہ کہ گھڑی عورت کے کس کام آئے گی۔ اسے کون سا آفس جانا ہوئی جہاز اڑانا ہے جس کی خاطر ٹائم کی فکر کرے۔

بہر حال ہم اپنی بات سیاہ فام عورت کو سمجھانے کا میاب ہو گئے۔ وہ دوبارہ ہمیں اپنے گھر لے آئی۔ موجودہ بچے ایک دفعہ پھر اس ذبح کیے ہوئے جانور کی اشارے کرنے لگے۔ لیکن آخر تک ہمیں اس کا راتے نہیں چل سکا کہ یہ کیوں کاٹا گیا ہے اور کون سا جانور عورت ہمیں گھر میں چھوڑ کر خود باہر چلی گئی۔ وہ تھوڑے کے بعد لوٹی اور ہمیں باہر آنے کا اشارہ کیا۔

وہاں سفید بالوں والا بوڑھا سیاہ فام اور مریل سے خچروں کے ساتھ کھڑا تھا۔ ہمارے سواری کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ ایک پر بھرا اور دوسرے پر میں بیٹھا۔ دونوں خچر کچھ اپنے پاؤں

کے سنبھلنے اور ڈنڈے مارنے پر آگے بڑھتے رہے۔ آدھے گھنٹے کی تک دو دو کے بعد ہم ایک نیم پختہ شہر پر جا پہنچے جہاں پٹرول پمپ بھی تھا۔ رات کے دس بجے تھے لیکن افریقا کی گرم ہوائیں اب بھی جھلسا رہی تھیں۔ چاندنی رات تھی اس لیے کچھ نہ کچھ دکھائی دے رہا تھا۔ پٹرول پمپ پر ایک ٹیکسی کھڑی تھی جو شاید اس پٹرول گاہ والے شہر کی واحد ٹیکسی تھی۔ ڈرائیور کچھ زیادہ پیسوں کی ڈیمانڈ کر کے چلنے پر آمادہ ہو گیا۔ پٹرول پمپ پر ریڈیو آن تھا اور پاکستان کے کسی بین الاقوامی ریڈیو اسٹیشن سے گانے گھر رہے تھے۔ ان دنوں رادولپنڈی، ڈھاکا (جو کہ ایٹ پاکستان کا شہر تھا) اور تہران، زہدان کے ریڈیو اسٹیشن دور دور تک سنے جاتے تھے۔ ہم نے یہ ریڈیو اسٹیشن رد مانے اور بلغاریہ میں بھی سنے۔ ان اسٹیشنوں سے پاکستانی ہندوستانی گانے سنائے جاتے تھے۔ اس وقت بھی اس اسٹیشن سے نور جہاں کا کوئی پنجابی گانا چل رہا تھا۔ پٹرول پمپ کے مالک نے اس گانے کی طرف متوجہ کرتے ہوئے ہم سے پوچھا کہ کیا آپ اس ملک سے تعلق رکھتے ہیں؟ ”نہیں بلکہ غرور سے ہماری گردنیں اونچی ہو گئیں۔ تھوڑی دیر بعد والا خوف ہوا ہو چکا تھا۔ ہم خود کو ہشاش بشاش اور مطمئن محسوس کر رہے تھے۔

جب تک ٹیکسی ڈرائیور قبوہ پیتا رہا، ہم اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرتے ہوئے افریقین صحرائیں نور جہاں کے گانے کو انجوائے کرتے رہے۔ ہم اس طرح پرسکون ہو گئے تھے جیسے چند گھنٹے خوار و خراب ہونے والے ہم نہیں بلکہ کوئی اور تھے۔ بہر حال ٹیکسی ڈرائیور سیٹ پر بیٹھا تو حکم صادر کیا۔ ”دھکا لگاؤ۔“

”کیا بکواس کرتا ہے۔“ تھرڈ انجینئر کا پارا چڑھ گیا۔ میں نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے ان کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

”فصیحہ نہ کریں باس! اگر اس کالے نے غصے میں آکر چلنے سے انکار کر دیا تو یہاں ہمیں خچر بھی نہیں ملیں گے۔“

بہر حال ہم نے ٹیکسی کو دھکا لگانا شروع کیا۔ کافی دیر تک دوڑانے کے بعد ڈرائیور جیسے ہی کچھ چھوڑتا، ٹیکسی پھر اسی کا دورہ پڑ جاتا لیکن اشارت نہ ہوتی۔ پھر یہ پریکٹس دہرائی جاتی۔

یہ بد بخت ہمیں اس طرح تو بندرگاہ تک پہنچانے کا ارادہ نہیں رکھتا؟“ تھرڈ انجینئر نے دھکا لگاتے

ہوئے کہا۔ وہ بری طرح ہانپ رہے تھے۔

”شاید اس کی ٹیکسی خراب ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اسے بھی شہر جانا ہوگا اور یہ ہم سے دھکا لگوا کر ٹیکسی وہاں تک لے جانا چاہتا ہے۔“

اسی دوران خدا خدا کر کے ٹیکسی اشارت ہو گئی۔ ہم ہانپتے کانپتے اس میں سوار ہو گئے۔ چاروں طرف ریت کے انبار تھے اور شہر کی وہ حالت تھی جو یونس آباد سے منورہ جانے والی شہر کی جولائی اگست میں ہوتی ہے۔ یعنی پوری شہر ریت سے ڈھکی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں ایک فٹ چوڑی پٹی کی طرح شہر نظر آرہی تھی۔ ایسی شہر پر ڈرائیور کس طرح ٹیکسی چلا رہا تھا، یہ اس کا دردِ سر تھا۔ اس نے کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد ہمیں اپنے جہاز کے سامنے لا کھڑا کیا۔

زندگی میں پہلی بار جہاز ہمیں بہت پیارا لگا۔

☆☆☆

آپ کو افریقا کے ان مشرقی کنارے کے ملکوں خاص طور پر کینیا، زیمبیا اور بوٹانڈا میں برصغیر کے کئی لوگ ملیں گے کیونکہ افریقا کے ان ملکوں پر بھی انگریزوں کی حکومت رہی ہے۔ ان میں زیادہ تعداد گجرات کے ہندوؤں کی ہے۔ دوسرے نمبر پر انڈیا کے مختلف سمندری کناروں والے شہروں کے آغا خانی، بوہری، سکھ، سندھی، ہندو، کاٹھیا واڑی، سیمین اور دوسرے لوگ شامل ہیں۔ انگریزوں کا ملایا (آج کے ملائیشیا)، سنگاپور اور افریقا کے جن ملکوں میں بھی راج رہا، ان کی خواہش تھی کہ وہاں دفاتر، فیکٹریاں، دکانیں، ریلوے ڈیپارٹمنٹ وغیرہ قائم کیے جائیں۔ ان کی نظر میں ان کاموں کے لیے برصغیر کے لوگ موزوں تھے۔ کیونکہ وہ عقل مند، ہنرمند، تعلیم یافتہ اور سلجھے ہوئے لوگ تھے۔ اس خیال کے تحت انگریزوں نے ان کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ اپنا وطن چھوڑ کر مختلف ملکوں میں کمانے کی غرض سے نکلیں۔

انگریزوں نے انہیں تحفظ اور امن وامان کی یقین دہانی کرائی۔ پھر کئی لوگوں نے انگریزوں کے قبضے میں آنے والے ملکوں میں کام کرنا شروع کر دیا۔ جس طرح انگریزوں نے سنگاپور میں ریلوے کے کام کے لیے جنوبی ہندوستان کے تامل باشندوں کو بلوایا تھا، اسی طرح انہوں نے 1860ء میں ممبا ساسے کہا لائیک جنگل صاف کر کے ریلوے لائنیں بچھانے کی غرض سے برصغیر کے تیس ہزار افراد کو تین سال کے معاہدے پر افریقا بلوایا۔ ان میں

سکھوں کی تعداد زیادہ تھی۔ جن میں سے کئی لوگ مرکپ گئے اور کچھ وطن واپس چلے گئے۔ معاہدہ ختم ہونے کے بعد تقریباً سات ہزار ہندوستانیوں نے افریقا کے شہروں ہی میں رہنا پسند کیا۔ ان کے ساتھ کئی گجراتی ہندو اور مسلمانوں نے بھی تجارت کی غرض سے ممبایا، زینزبار، کمپالا، نیروبی، دارالسلام میں سکونت اختیار کر لی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ انڈین، جن میں پنجاب اور سندھ کے بھوپاری بھی شامل تھے، خوشحال ہوتے چلے گئے۔ اس وقت پاکستان وجود میں نہیں آیا تھا۔ اس لیے یہ تمام لوگ انڈین کہلاتے تھے۔ خواہ ان میں بڑودا کا گجراتی ہو یا امرتسر کا سکھ۔ لاہور کا پنجابی ہو یا شکار پور کا سندھی، سب انڈین تھے۔ ان کی اولاد آج بھی خود کو انڈین کہلاتی ہے۔ حالانکہ نیروبی، ممبایا اور کمپالا کی گلیوں میں آپ کو کئی ایسے آغا خانی بوہری اور سندھی ہندو ملیں گے جن کے عزیز اور خاندان کے لوگ حیدرآباد، سکھر اور تلہار میں رہتے ہیں۔ انگریزوں کے دور میں یہاں آنے والے آغا خانی، بوہری، سندھی ہندو، گجراتی دکاندار اور سوداگر تھے۔ ان کے علاوہ محنت مزدوری کے لیے آنے والے لوگ بھی یہیں رہ گئے۔ لیکن بعد میں مزدوروں کی دوسری اور تیسری نسل نے تعلیم حاصل کر کے سرکاری اداروں میں ملازمتیں حاصل کر لیں۔ کئی لوگوں نے رقم جمع کر کے چھوٹے موٹے کاروبار کا آغاز کر دیا اور کچھ لوگ امپورٹ ایکسپورٹ کے بزنس کی طرف چلے گئے۔ انگریز ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ کیونکہ انہیں مقامی سیاہ فاموں پر کنٹرول حاصل کرنے اور دفاتر کے کام چلانے کے لیے ان انڈین کلرکوں، چھڑاسیوں اور چھاپیوں کے افسروں کی ضرورت تھی۔ یہ لوگ بے چوں و چرا حکم کی تعمیل کرنے والے اور سخت محنتی تھے۔

ایسا ہرگز نہیں ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کو افریقا لانے والے انگریز ہی تھے۔ انگریز خود انڈیا اور افریقا بہت بعد میں پہنچے تھے۔ ان سے بہت پہلے ہندوستان کے مغربی کنارے، یعنی آج کے کراچی، گوادر، پسنی، چاہ بہار (ایران) اور عمان کے باشندوں کی افریقا آمد و رفت جاری رہتی تھی۔ اگر آپ بحر ہند کے نقشے پر نظر ڈالیں تو آپ کو حیرت بالکل نہیں ہوگی کہ عرب ملکوں، مشرقی افریقا اور مغربی انڈیا کے کنارے والی بندرگاہوں کے درمیان تجارت عام تھی جس کی نشانیاں دو ہزار سال پرانی ہیں۔ انگریزوں کو تو ان سمندروں کی خبر ہی نہیں تھی۔ انگریزوں سے پہلے

پرنگالی ملاح اور Explorer واسکو ڈی گاما 1497 میں موزمبیق، ممبایا اور لنڈی پہنچا تو وہ وہاں بڑی تعداد میں عربوں اور ہندوستانیوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ واسکو ڈی گاما، براعظم افریقا کے کپ آف گڈ سے ہوتا ہوا شمالی کنارے پر اس لیے پہنچا کہ کسی طرح کے ذریعے انڈیا تک پہنچنے کا راستہ تلاش کیا جاسکے۔ راستے یورپین اور انگریزوں کو چھین جاتے ہوئے معلوم ہو چکا تھا اور وہ زمینی راستے سے آگاہ ہو چکے تھے۔ لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آبی گزرگاہ سے ہونے والے کس طرح انڈیا تک رسائی حاصل کی جائے۔ یورپین میں واسکو ڈی گاما پہلا شخص تھا جو ہندوستان جنوبی کنارے پر پہنچا۔ اگر اس سلسلے میں کاغذی مالم ہندوستانی نے اس کی مدد نہ کی ہوتی تو وہ شاید اس کامیاب نہ ہوتا۔ کاغذی مالم افریقا میں رہتا تھا اور واسکو گاما کی رہنمائی کے لیے اس کے ساتھ ہولیا تھا۔

واسکو ڈی گاما جب افریقا پہنچا تو وہاں اس نے عرب ملکوں کی خوبصورت بادبانی کشتیاں افریقا کے آس پاس اور مسافروں اور تجارتی سامان کو اٹھا کر عرب ملکوں کی جہازوں میں تجارتی سامان میں عاج (ہاتھی دانت) مسالے، سیاہ فام سفر کر رہی ہیں۔ اس کے مشاہدے میں آیا کہ افریقا غلام، کپڑا اور کمپاس وغیرہ ہوتا تھا۔ کنارے والے شہروں میں کئی عرب مسلمان آباد تھے اور انہوں نے ان شہروں میں مساجد بھی تعمیر کر لی ہیں۔ انڈین زیادہ تر عارضی طور پر مقیم تھے۔ وہ چوماسی کی ہوائی کشتیاں پر سفر کرتے تھے اور موافق ہوا کے چلتے ہی انڈیا یا زینزبار جزیرے پر منتقل کر دیا۔ یہ 1832ء کا ذکر ہے۔ ہو جاتے تھے۔ ان ایام میں انجن ایجاد نہیں ہوئے تھے زینزبار آج کل تنزانیہ کا حصہ ہے جبکہ اس زمانے میں سمندری سفر بادبان کے ذریعے ہوتا تھا۔ چھوٹی بڑی کشتیاں میں ایک سے زیادہ بادبان بھی ہوتے تھے جو موٹے کپڑوں کے بنے ہوتے تھے۔ وہ چوبی کشتیاں اور چھوٹے جہازوں کے دوش پر سفر کرتے تھے۔ ہوشیار اور تجربہ کار ناخدا بادبانوں کا رخ قدرے تبدیل کر کے اپنی کشتیوں کو تھوڑا سا دائیں بائیں موڑ سکتے تھے۔ لیکن پیچھے کی جانب، یعنی ہوا کی مخالف سمت میں سفر نہیں کر سکتے تھے۔ ہوا کے بند ہوتے ہی جہاز وہیں رک جاتا تھا یا لہروں کے رحم و کرم پر بے سمت چلتا رہتا تھا۔ ایسے مواقع پر کناروں پر چھپے ہوئے چوراہی چوڑی والی کشتیوں کے ذریعے ان جہازوں پر پہنچ کر لوٹ مار کر اور فرار ہو جاتے تھے۔ اس زمانے کے ناخدا ہماری طرح کھلے سمندر میں جہاز نہیں چلا سکتے تھے۔ وہ کنارے کے ساتھ سفر کرتے تھے اور سمندری ڈاکوؤں (قزاقوں) کا آگاہ

بہر حال ہم کچھلے زمانے کے ہندوستان کا ذکر کر رہے ہیں۔ جب بادبانی کشتیوں کے ذریعے سفر کیا جاتا تھا۔ جن کا دارومدار صرف اور صرف ہواؤں کے رخ پر ہوتا تھا۔ سردیوں کی چوماسی، یعنی دسمبر اور فروری کی درمیانی مدت میں ہند کے مختلف علاقوں سے سندھی ہندو، گجراتی مسلمان، آغا خانی، انا مشری، بوہری اور کچھ دیگر اپنی کشتیوں کے ذریعے افریقا تک جا پہنچتے تھے۔ وہاں تین چار ماہ تک اپنا تجارتی سامان فروخت کر کے اور نیا مال خرید کر موسم گرما کی چوماسی یعنی جون سون کی ہواؤں کا انتظار کرتے تھے۔ پھر یہی موافق اور مطلوبہ ہوا چلنے لگتی وہ افریقا کے ساحل چھوڑ کر اپنے وطن انڈیا کی جانب روانہ ہوتے تھے۔ اس زمانے اور مسافروں اور تجارتی سامان کو اٹھا کر عرب ملکوں کی جہازوں میں تجارتی سامان میں عاج (ہاتھی دانت) مسالے، سیاہ فام سفر کر رہی ہیں۔ اس کے مشاہدے میں آیا کہ افریقا غلام، کپڑا اور کمپاس وغیرہ ہوتا تھا۔ کنارے والے شہروں میں کئی عرب مسلمان آباد تھے اور انہوں نے ان شہروں میں مساجد بھی تعمیر کر لی ہیں۔ انڈین زیادہ تر عارضی طور پر مقیم تھے۔ وہ چوماسی کی ہوائی کشتیاں پر سفر کرتے تھے اور موافق ہوا کے چلتے ہی انڈیا یا زینزبار جزیرے پر منتقل کر دیا۔ یہ 1832ء کا ذکر ہے۔ ہو جاتے تھے۔ ان ایام میں انجن ایجاد نہیں ہوئے تھے زینزبار آج کل تنزانیہ کا حصہ ہے جبکہ اس زمانے میں سمندری سفر بادبان کے ذریعے ہوتا تھا۔ چھوٹی بڑی کشتیاں میں ایک سے زیادہ بادبان بھی ہوتے تھے جو موٹے کپڑوں کے بنے ہوتے تھے۔ وہ چوبی کشتیاں اور چھوٹے جہازوں کے دوش پر سفر کرتے تھے۔ ہوشیار اور تجربہ کار ناخدا بادبانوں کا رخ قدرے تبدیل کر کے اپنی کشتیوں کو تھوڑا سا دائیں بائیں موڑ سکتے تھے۔ لیکن پیچھے کی جانب، یعنی ہوا کی مخالف سمت میں سفر نہیں کر سکتے تھے۔ ہوا کے بند ہوتے ہی جہاز وہیں رک جاتا تھا یا لہروں کے رحم و کرم پر بے سمت چلتا رہتا تھا۔ ایسے مواقع پر کناروں پر چھپے ہوئے چوراہی چوڑی والی کشتیوں کے ذریعے ان جہازوں پر پہنچ کر لوٹ مار کر اور فرار ہو جاتے تھے۔ اس زمانے کے ناخدا ہماری طرح کھلے سمندر میں جہاز نہیں چلا سکتے تھے۔ وہ کنارے کے ساتھ سفر کرتے تھے اور سمندری ڈاکوؤں (قزاقوں) کا آگاہ

بہر حال میں یہاں یہ بھی لکھتا چلوں کہ شروع میں ہندوستان افریقا آنے والوں میں زیادہ تعداد مسلمانوں کی تھی۔ آگے والے ہندوؤں میں سندھی ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ دوسری اہم بات یہ کہ اس زمانے میں خشکی کے راستے

کئی گجراتی ہندو سیام اور ملایا کی طرف..... دوسری جانب چین اور عربستان کی سمت جا پہنچتے تھے۔ لیکن ہندو سمندر میں سفر کرنے کو Taboo (نجس) سمجھتے تھے۔ لیکن سندھی ہندوؤں کا معاملہ مختلف تھا۔ وہ ساہو بیلہ اور اڈریوالال کے بیروکار تھے۔ ان کے لیے پانی خوف اور نفرت کی علامت نہیں بلکہ پاک اور پوتر حیثیت رکھتا تھا۔ وہ نہ صرف خشکی کے راستے بلکہ سمندر کے ذریعے بھی افریقی ملکوں کے علاوہ دور دراز کے جزیروں تک جا پہنچتے تھے۔

سترکی دہائی میں جب میرا جہاز لاس پاماس، برمودا اور ٹرینیڈاڈ جیسے جزیروں پر پہنچا تو مجھے وہاں سندھی ہندوؤں کی دوسری اور تیسری نسل نظر آئی۔ برمودا جزیرے پر ملنے والی ایک سندھی ہندو فیملی کے متعلق میں آج سے چالیس برس قبل اپنے ایک سفر نامے میں تحریر کر چکا ہوں کہ نو جوان نے اپنے والد سے پوچھا کہ اجرک کیا ہے؟ اس کے والد کی بجائے دادا نے جواب دیا کہ یہ ایک سرخ پھولدار چادر ہوتی ہے جو سندھ میں جاہل مسلمان اوڑھتے ہیں۔

بہر حال وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ برصغیر سے نہ صرف بوہری، خوجہ، کاٹھیاواڑی میمن اور ہندو سندھی کی افریقا آمد و رفت شروع ہو گئی بلکہ بتدریج ہندو، ملباری اور کوئی وغیرہ بھی وہاں کارخ کرنے لگے۔ لیکن ہندو برہمنوں نے ہندو عورتوں کو سمندر میں سفر کرنے سے سختی سے منع کر دیا تھا۔ اس کے نتیجے میں وہ افریقا میں دو تین سال کمانے کے بعد انڈیا لوٹ آتے تھے۔ جب سید پارکش زینزبار کا سلطان بنا تو اس نے ہندوؤں کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ اپنی بیویوں کو بھی وہاں لے آئیں۔ اس حد تک کہ جب پہلی ہندو خاتون زینزبار آنے پر آمادہ ہوئی تو سلطان نے اس کے لیے اپنا ذاتی جہاز روانہ کیا اور اسے انعام کے طور پر 250 شلنگ بھی دیے گئے۔ اس نے ہندو عورتوں کی رہائش کے لیے زینزبار کا پرانا قلعہ دینے کا بھی وعدہ کیا جس کے پانی کے پائپوں میں چاندی کے ٹل لگے ہوئے تھے۔ اس دوران میں ہجرات کی ہندو عورتوں نے برہمنوں کے خلاف بغاوت کی آواز بلند کی اور وہ کامیاب رہیں۔ پھر وہ اپنے شوہروں کے ساتھ افریقا روانہ ہونے لگیں۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جہاں انڈیا کے مختلف قومیت اور مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے افریقا پہنچ کر خوب کمایا اور اپنے لیے خوشحالی حاصل کی، وہیں انہوں نے انگریزوں کے کسٹم کو بہتر انداز میں چلانے کے

سلسلے میں بھی مدد دی۔ اس کے علاوہ یہ لوگ مقامی باشندوں کی بہتری کا سبب بھی بنے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ چند انڈیز کی عاقبت نااندیشی اور بے انتہائی کنجوسی کے ساتھ ساتھ احساس برتری کے اظہار کے باعث کئی خرابیاں پیدا ہوئیں۔ وہ مقامی لوگوں کو اپنے سے کمتر سمجھنے لگے تھے۔ جس کی وجہ سے مقامی باشندے ان سے نفرت کرنے لگے۔

ہم نے ساٹھ کی دہائی سے افریقا کی مختلف بسندہ گاہوں میں جانا شروع کیا تھا۔ اس زمانے میں انگریز، پرتگالی اور فرینچ حاکموں نے کئی ملکوں کو آزادی بخشی تھی اور بعض ملکوں کو خود مختاری ملنے والی تھی۔ بہر حال کینیا، یوگنڈا، موزمبیق، سیریکال جیسے ملکوں سے انگریزوں اور یورپین کے نکل جانے کے بعد بھی انڈین وہیں مقیم رہے۔ وہ نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ ملک کا معاشی نظام چلا رہے تھے۔ لیکن بعد میں ہم نے دیکھا کہ ان کے خلاف مقامی لوگوں کی نفرت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ وہ یہ سوچنے لگے تھے کہ انگریزوں اور یورپین سے جان چھوٹی تو اب یہ انڈین حاکم بن کر بیٹھ گئے ہیں۔ پورے ملک کا کاروبار ان کے ہاتھوں میں ہے اور مقامی لوگ بدستور غربت کی چکی میں پس رہے ہیں۔ اس نفرت کو عیدی امین جیسے لیڈروں نے ہوا دی۔ آخر کار عیدی امین نے انڈین لوگوں کو اپنے ملک سے نکال دیا۔

14 اگست 1972ء کو یوگنڈا کے صدر عیدی امین نے ملک میں موجود ہندوستانیوں کو ملک چھوڑنے کا حکم دے دیا۔ یوگنڈا میں مقیم انڈیز میں نوے فی صد گجراتی تھے۔ عیدی امین نے ملک چھوڑنے کے لیے 90 دن کی مہلت یا ڈیڈ لائن دی۔ اس نے تقریر کے دوران یہ حکم سناتے ہوئے کہا تھا۔ ”مجھے خواب میں خدا نے حکم دیا کہ میں اپنے ملک سے انڈیز کو نکال دوں۔“

آخر کار تمام گجراتی یوگنڈا سے نکل گئے۔ کچھ پاکستان اور انڈیا چلے گئے اور کچھ لوگوں نے امریکا، کینڈا، کارخ کیا۔ بعض لوگ انگلینڈ چلے گئے۔ کیونکہ وہ برٹش پاسپورٹ رکھتے تھے۔ یوگنڈا کی فوج اور مقامی غنڈوں نے ہجرت کر جانے والے انڈیز کی دکانوں اور گھروں میں خوب لوٹ مار کی۔ انڈیز جو کاروبار اور ملازمت کرتے تھے، وہ مقامی لوگوں کے ہاتھ میں ضرور آگئیں۔ لیکن وہ نہ تو ہنرمند تھے اور نہ انڈیز کی طرح تعلیم یافتہ اور بزنس کے آرٹ سے واقف تھے۔ اس کے نتیجے میں چند ہی برس میں یوگنڈا کی اکانومی اونڈھے منہ گر گئی۔ اس کے علاوہ عیدی امین نے بھی ملک کو تباہ

کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ آخر کار وہ اپنا بہ

سعودی عرب فرار ہو گیا۔

گجراتیوں کو دوبارہ یوگنڈا میں آنے کی دعوت دی گئی۔ انہیں کاروبار اور رہائش کے لیے سہولیات کی گئی۔ کچھ گجراتی لوٹ کر واپس آ گئے اور بعض سے معذرت کر لی..... لوٹ کر آنے والوں میں میری ڈاکٹر جتی کے والدین بھی تھے۔

عیدی امین کی پیچیدہ شخصیت اور اس کے خاص طور پر برسوں سے آباد انڈیز کو ملک بدر کر کہانی پر کئی فلمیں بنائی اور بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ انڈیز کو یوگنڈا سے ملک بدر کرنے کی بہترین ”دی لاسٹ کنگ آف اسکاٹ لینڈ“ میں کی گئی ہے۔ ناول پر مبنی فلم 2006ء میں بنی تھی۔ اسی موضوع پر 1991ء میں بننے والی فلم ”مسیحی مسالا“ میں بھی انڈیز کے ساتھ ہونے والی زیادتی کو نمایاں کیا ہے۔ شہناز نان جی کے ناول Wild of Dandelions میں بھی اس جبری ہجرت کا ذکر کیا ہے۔

یوگنڈا میں ہونے والی اس ”ملک بدری“ کے علمبردار مغرب کے لوگوں کو سب سے پہلے ویسٹ انڈیز میں انڈین ناول نویس وی۔ ایس۔ نانپال نے اپنے ناول bend in the River کے ذریعے آگاہ کیا۔

☆☆☆

شاید کچھ لوگوں کی سوچ ہو کہ افریقی طلباء بالکل گزرے اور نالائق ہیں۔ پوسٹ گریجویشن سے پہلے ہی بھی یہی سوچ تھی۔ لیکن جب مجھے سویڈن کی یونیورسٹی مالمو میں ایم ایس سی کرنے کا موقع ملا تو افریقا کے مختلف ملکوں کے سیاہ فام طلباء کی ذہانت اور سوچ کو دیکھ کر بہت حیرت ہوئی۔ میں نے اس بات کا اپنے اسکیئنڈے نیویا کے سفر ناموں میں بھی کیا ہے۔

ہمارے 200 طلباء کے گروپ میں تقریباً طالب علم براعظم افریقا کے ملکوں سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن پھر کے بعد اہم اور پرمغز سوالات کرتے تھے۔ لیکن غرض سننے اور امتحانات میں اچھے نمبر حاصل کرتے تھے۔ ان طلباء میں بیس خواتین تھیں جو کپالا، نیروبی، دارالسلام یونیورسٹیوں سے گریجویشن کر کے آئی تھیں۔

اور آج میں ان یونیورسٹیوں کی سرزمین

افریقا) پہنچ کر عجیب سامحوس کر رہا ہوں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ نیروبی کی یونیورسٹیاں ممبئی، کلکتہ اور لاہور کی یونیورسٹیوں کی طرح بہت قدیم نہیں ہیں۔ جب نیروبی جیسا شہر ہی محض ایک سو برس پرانا ہو تو اس شہر کی یونیورسٹیاں کتنی قدیم ہوں گی! کینیا کی سب سے پرانی یونیورسٹی ”دی یونیورسٹی آف نیروبی“ ہے جو 1956ء میں وجود میں آئی اور یونیورسٹی آف افریقا کا ایک حصہ رہی۔ اس کے باقی حصے کمپالا اور دارالسلام میں واقع یونیورسٹیاں تھیں۔ بہر حال اس یونیورسٹی کو 1970ء میں خود مختار حیثیت حاصل ہوئی۔ اس حساب سے جام شورو کی مہران یونیورسٹی اس سے زیادہ قدیم ہے۔ بہر حال اس میں 22000 طلبا تعلیم حاصل کرتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یونیورسٹی میں سخت ڈسپلن نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ طالب علم وقت کے پابند، معلم اعلیٰ تعلیم یافتہ، تجربہ کار اور قابل نظر آتے ہیں۔

نیروبی کی ایک اور یونیورسٹی ”کینیا یونیورسٹی“ ہے جو ”یونیورسٹی آف نیروبی“ کے بعد دوسرے نمبر پر بڑی درس گاہ ہے۔ یہ یونیورسٹی شہر کے مرکزی علاقے سے 20 کلومیٹر دور ”نیروبی، تھیریکا“ روڈ پر کاہا دانامی علاقے میں واقع ہے۔ 1965ء میں انگریزوں کے ”میمپلر“ فوجی بیرکس میں کینیا کا کالج نامی ایک نیچر ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کھولا گیا۔ اس کے بعد 1985ء میں اس کالج کا نام تبدیل کر کے کینیا یونیورسٹی رکھا گیا۔

کینیا کی ایک دوسری یونیورسٹی ”کما تھی یونیورسٹی کالج آف ٹیکنالوجی“ (KUCT) ہے جو نائیری شہر میں موقع ہے۔ یہ درس گاہ بھی خاصی شہرت رکھتی ہے۔ کینیا میں دیگر یونیورسٹیوں اور کالجوں کے علاوہ آغا خان یونیورسٹی بھی ہے۔ آغا خان یونیورسٹیاں دنیا کے تین براعظموں کے آٹھ ملکوں میں موجود ہیں۔ ان میں سب سے بڑی اور قدیم یونیورسٹی کراچی میں ہے۔ دوسرے نمبر پر بڑی یونیورسٹی یہاں کینیا میں واقع ہے۔ آج کل تنزانیہ کے شہر اروشا میں بھی ایک آغا خان یونیورسٹی تعمیر کی جا رہی ہے۔ آغا خان یونیورسٹی کے میڈیکل کالج اکثر ”Harvard of the East“ کہلاتے ہیں۔

میں جس دن ممباسا کے ”پولی ٹیکنک یونیورسٹی کالج“ پہنچا اس روز کینیا کے تمام کالج، یونیورسٹیاں اور دفاتر بند تھے۔ معلوم ہوا کہ اسی دن بارک اوباما امریکا کے

صدر بنے تھے۔ اس لیے کینیا میں اس دن عام تعطیل ہوتی ہے۔ گزشتہ سال بھی اسی تاریخ کو قومی دن قرار دے کر چھٹی منائی گئی تھی اور اس سال بھی یہ دن چھٹی کے طور پر منایا گیا ہے۔ مجھے اس بات پر بہت حیرت ہوئی تھی۔ ہم جیسے کئی ملکوں، جن پر دنیا امریکا کا چھبے ہونے کا الزام لگاتی ہے، نے امریکا کو خوش کرنے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا؟ لیکن اس دن کینیا میں عام تعطیل انتہا ہے! وہ جس ملک (امریکا) کے صدر ہیں، اگر وہاں چھٹی کی جانی تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ اگلے دن ”میپلر جی“ کے پروفیسر طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ ”ہمارے ملک کو یہ فخر حاصل ہے کہ اوباما ہمارے ملک کے ایک سیاہ فام کے بیٹے ہیں۔“

”خوب!“ میں نے کہا۔ ”گویا اوباما کا اصل وطن کینیا ہے! واقعی، یہ میرے لیے حیرت اور خوشی کی بات ہے کہ کینیا کا ایک سیاہ فام شخص امریکا جیسے امیر اور طاقتور ملک کو چلا رہا ہے۔“

”جناب! اصل بات یہ ہے کہ ہم اسی بات پر مسرور رہتے ہیں کہ اوباما ہمارے ہیں۔“ انہوں نے سرگوشی میں کہا۔ ”امریکا ہمیں بالکل لفٹ نہیں کراتا اور ہم اس کے ساتھ رشتے قائم کیے ہوئے ہیں۔“

پھر انہوں نے ”افریقائی انداز“ کا قہقہہ لگاتے ہوئے مزید کہا۔ ”وہ امریکا جیسے ملک کے صدر بن گئے ہیں، اس لیے یہ پورا ملک انہیں اپنا قرار دیتا ہے۔ جبکہ اس سے پہلے ان کے والد بھی ان کی صورت دیکھنا گوارا نہیں کرتے تھے۔“

ان کی یہ باتیں سن کر میں بھی ہنستا رہا۔ دراصل مجھے اس وقت ان باتوں کی حقیقت پر نہیں بلکہ پروفیسر صاحب نے جس اشائل میں وہ باتیں کی تھیں، اس پر ہنسی آئی تھی۔ ویسے بھی سیاہ فام لوگوں کی گفتگو کا اپنا ہی ایک منفرد انداز ہے۔ وہ ماتلی یا سنگھو پیر کے ہوں، ان کا تعلق کمران کوسٹ یا ممباسا سے ہو۔ خواہ موزمبیق، مشی گان یا ماسی سی، ریاست کے سیاہ فام باسی ہوں۔۔۔۔۔ یہ لوگ غم اور افسوس کی بات بھی اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ ظاہری طور پر مذاق معلوم ہوگا۔

میں ممباسا میں اپنے قیام کے دوران بارک اوباما اور ان کے سگے والدین اور سوتیلے والد کی زندگی کے بارے میں سوچتا رہا۔۔۔۔۔ مجھے پروفیسر صاحب کی باتیں حقیقت پر مبنی معلوم ہوئیں۔ دراصل اگر تعطیل کرنی ہو تو کینیا کی بجائے انڈونیشیا کو کرنی چاہیے جہاں اوباما اپنی سگی والدہ اور سوتیلے والد کے ساتھ خاص وقت رہے تھے۔ انہوں نے بنیادی تعلیم

بھی وہیں حاصل کی اور تھوڑی بہت ملٹی زبان بھی بول لیتے ہیں۔ وہ کینیا میں تو ایک دن بھی نہیں رہے! میں یہاں ان کی زندگی کا مختصر احوال تحریر کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میری طرح قارئین بھی کچھ باتوں پر ضرور چونکیں گے۔ ان ایام میں کینیا میں۔ اور افریقا کے دیگر ملکوں میں بھی، لیکن یہاں ہمارا فوکس صرف کینیا ہے۔

ہر سیاسی لیڈر تعلیم حاصل کرنے کے بعد کسی عہدے پر پہنچنے ہی اسی کے مطابق شادی کرتا ہے۔ ہر شخص پہلی شادی اپنے قبیلے کی رسم کے مطابق اپنی برادری میں کرتا ہے پھر تعلیم کے دوران یا ملازمت حاصل کرنے کے بعد دوسری، تیسری چوتھی اور پانچویں شادی کرتا ہے۔ بعض لوگ ایک کو مہر کر دوسری عورت سے شادی رچا لیتے ہیں۔ یہ ”رواج“ ہم سے ایک نسل پہلے، خاص طور پر سندھ کے مسلمانوں میں عام نظر آتا تھا۔ ہمارے کئی بیوروں، میروں، وڈیروں، بیورو کریش، صنعت کاروں اور سینٹھوں کی پہلی شادی کم عمری میں ہو جاتی تھی۔ یہ شادی اپنی ہی برادری میں ہوتی تھی۔ آئندہ چل کر وہ خاندانی بیوی سنگلاخ دیواروں کے عقب میں تنہائی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتی اور ہمارا، ہیرولاہور، کراچی یا کسی دوسرے بڑے شہر سے ایک تعلیم یافتہ خاتون یا کسی اداکارہ، گلوکارہ سے شادی کر کے اسے گاؤں میں لے آتا۔ جہاں وہ گھر میں بیٹھنے کی بجائے ”شوٹیں“ کے طور پر ہر وقت، ہر جگہ شوہر کے ساتھ رہتی تھی۔

یہی ”فیشن“ افریقا میں بھی تھا۔ کینیا کے پہلے صدر جومو کینیا تانے بھی چار پانچ شادیاں کی تھیں۔ ان میں سے ایک انگریز خاتون بھی تھیں۔ حالانکہ وہ خود اور دیگر افریقین انگریزوں سے سخت نفرت کرتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اپنے ملک کے کالوں پر دھاک بٹھانے کی غرض سے کم از کم ایک انگریز یا یورپین گوری سے شادی کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ خواہ وہ عمر میں بڑی ہی کیوں نہ ہو، دھوبن ہو یا بھنگن۔۔۔۔۔ بس شرط یہ تھی کہ گوری چھڑی ہو! جومو کینیا تانے بھی جیسا انگریز عورت سے شادی کی تھی، وہ پیشے کے لحاظ سے آیا تھی۔ حالانکہ مسٹر جومو اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔

یہ رسم یا اسٹیٹس سمبل ہمارے برصغیر میں بھی ایک عرصے تک قائم رہا۔ یہ بات دیگر ہے کہ اب ہمارا اور افریقا کا نو جوان ایک شادی ہی کو کافی سمجھتا ہے۔ وہ اس کے لیے سچا سمجھ کر انتخاب کرتا ہے۔ اس کے ذہن میں یہ خیال ہوتا ہے کہ اسے ایک جیون ساتھی کی ضرورت ہے۔ وہ اب

عورت کو بھیڑ بکری نہیں سمجھتا اور نہ ہی اسے ”شوٹیں“ کے طور پر استعمال کرتا ہے۔

امریکی صدر کے والد نے بھی چار پانچ شادیاں کی تھیں۔ انہوں نے پہلی شادی خاص کم عمری میں اپنے قبیلے کی لڑکی کے ساتھ کی۔ جب وہ تعلیم کے سلسلے میں امریکا گئے تو وہاں ایک گوری (اوباما کی والدہ) کے ساتھ دوسری شادی کی۔ انہوں نے اپنی امریکن بیوی سے یہ بات پوشیدہ رکھی کہ وہ پہلے ہی شادی شدہ ہیں۔ یہ ”راز“ کھلتے پر انہوں نے بتایا کہ ان کی خاندانی بیوی نے دوسری شادی کی اجازت دی تھی۔

پاکستان میں بھی مرد کے ایک کے بعد دوسری شادی کرنے کو Discourage کرنے کے لیے ایوب خان نے قانون نافذ کیا تھا کہ کوئی بھی مرد اپنی پہلی بیوی کی اجازت کے بغیر دوسری شادی نہیں کر سکتا۔ ایوب خان شاید یہ سمجھے تھے کہ اس قانون کے اجرا کے بعد مردوں کے لیے یہ کام خاصا مشکل ہو جائے گا۔ لیکن ہمارے وڈیروں، سیاستدانوں، رئیسوں، بیورو کریش کے ”معمولات“ میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ دوسری شادی کرتے رہے۔ پہلی خاندانی بیوی کی کیا مجال کہ وہ اس سلسلے میں ایک لفظ بھی بول سکے۔ میں گزشتہ سطور میں تحریر کر چکا ہوں کہ ایسے لوگوں کے لیے دیہاتی اور خاندانی بیویاں بھیڑ بکریوں سے بھی کم حیثیت رکھتی تھیں۔

لطف کی بات یہ کہ ملائیشیا جیسا ملک، جسے آج آپ یورپ جیسا دیکھتے ہیں اور یہاں یورپ کی طرح جوڑے نظر آتے ہیں، آج کا نو جوان صرف ایک شادی کرتا ہے۔ دوسری شادی نہایت مجبوری کی حالت میں کی جاتی ہے۔ یعنی پہلی بیوی کے فوت ہونے یا اس سے شدید اختلافات کی صورت میں علیحدگی حاصل کرنے کے بعد لیکن ستر کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں، جب میرا پہلی مرتبہ ملائیشیا کے شہروں میں جانا ہوا تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ کئی ملٹی سیاست دان، زمیندار، رئیس اور رٹائرڈ بوڑھے بیورو کریش ایک عدد جوان عورت کو بیوی کی حیثیت سے ہمیشہ اپنے ساتھ لیے چلتے ہیں۔ ان کا Combination عجیب لگتا تھا۔ بیوی کم عمر، بیٹی کے برابر۔۔۔۔۔ اور خود بوڑھے۔ اس پر خود کو جوان ظاہر کرنے کے لیے سر پر موجود چند بالوں کو خضاب سے سیاہ کر لیتے تھے۔ ان دنوں میں خضاب کے کلر بھی سادہ سے ہوتے تھے جو بالوں کو سیاہ کرنے کے ساتھ سر کی جلد کو بھی

کالا کر دیتے تھے۔ ان کے چہرے کی جلد پر سلوٹس اور ہاتھوں بیروں پر ریشہ طاری ہوتا۔ پیری میں جوان بیوی کے ساتھ تیز قدم اٹھاتے ہوئے لڑکھڑانے لگتے تھے لیکن اس بات پر بے حد خوش اور مسرور نظر آتے تھے کہ انہوں نے ایک کم سن لڑکی سے شادی کر کے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔

گزشتہ صدی میں یہی حال افریقا میں بھی تھا۔ ان میں بارب او باما کے والد بھی شامل تھے۔

☆☆☆

امریکا کے چوالیسویں موجودہ صدر او باما کا پورا نام ”بارک حسین او باما“ ہے۔ دلچسپ بات یہ کہ ان کے والد کا نام بھی یہی ہے۔ باپ بیٹے کی شناخت کے لیے والد ”بارک او باما لون“ یا ”بارک او باما سینئر“ کہلاتے ہیں جبکہ بیٹے ”بارک او باما ٹو“ یا ”بارک او باما جونیئر“ کہلاتے ہیں۔

او باما سینئر 1936ء میں کینیا کے قصبے ”کنیادھ“ یا ”کینگ“ میں پیدا ہوئے۔ یہ قصبہ وکٹوریا جھیل کے کنارے پر واقع ہے۔ افریقا کی اس خوبصورت اور بڑی جھیل کے کئی مقامی نام ہیں۔ مٹھے پانی کی یہ وسیع و عریض جھیل 70 ہزار کلو میٹر تک پھیلی ہوئی ہے۔ بارش کے علاوہ کئی دریاؤں کا پانی اس جھیل میں پہنچتا ہے۔ اس جھیل سے صرف ایک چھوٹی ندی ”سفید نیل“ (white Nile) نکلتی ہے جو آگے جا کر مصر کے دریائے نیل کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

وکٹوریا جھیل کے چاروں طرف یوگنڈا، تنزانیہ اور کینیا آباد ہیں۔ جھیل کے کنارے کنارے سفر کیا جائے تو یہ فاصلہ مجموعی طور پر 5000 کلومیٹر بنتا ہے۔ جھیل کے گرد کئی قدیم تاریخی اور ماڈرن خوبصورت شہر واقع ہیں۔ ان میں زیادہ تر شہر یوگنڈا اور تنزانیہ کے ہیں۔ یہ جھیل کینیا کے حصے میں صرف چھ فی صد آتی ہے۔ یہیں پر آباد لوگ قبیلے میں او باما کے والد نے جنم لیا۔ ان کے والد یعنی امریکی صدر او باما کے دادا کی کم از کم تین بیویاں تھیں۔ ان میں دوسری بیوی جیبہ اکومو نے او باما سینئر (یعنی امریکی صدر کے والد) کو جنم دیا۔ لیکن اس کی پرورش تیسری بیوی سارہ نے کی۔ کیونکہ جیبہ او باما سینئر کی پیدائش کے بعد جلد ہی شوہر سے روٹھ کر الگ ہو گئی اور پھر اس نے طلاق کا مطالبہ کیا۔

اس دور کے افریقی ادب کا مطالعہ کیجئے تو آپ کو یہ چیز عام نظر آئے گی۔ جھٹ شادی پٹ طلاق! ایک بیوی سے پیدا ہونے والی اولاد کی پرورش دوسری بیوی کرتی ہے۔ کہیں

او باما کی طرح باپ بیٹے کے ایک ہی نام کسی کا باپ فوت ہو گیا تو وہ چچا کا بیٹا بن گیا۔ اس کی ماں بھی چچا کی بیوی بن گئی۔ سو افریقا آنے والے کسی نئے آدمی کو حیرت ضرور ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دہریا ہے، کوئی اپنے قبیلے کی رسم کے مطابق کسی شجر کو پوجتا ہے یا کسی جانور کی پرستش کرتا ہے۔ کوئی کسی عیسائی پادری کے ہتھے چڑھ گیا تو وہ فوراً عیسائی بن گیا۔ پھر کچھ عرصے کے بعد دوبارہ دہریا بننے میں بھی دیر نہیں لگتی۔ کسی عرب یا آغا خانی کے پاس ملازمت کرنے سے وہ سنی، شیعہ یا اسماعیلی بن جاتا ہے۔ چھ ماہ بعد دوبارہ عیسائیت اختیار کر لیتا ہے۔ یعنی مختصر عرصے ہی میں حالات اور موڈ کے مطابق بیویاں اور مذہب بدلنا عام سی بات ہے۔

جس وقت او باما سینئر پیدا ہوئے ان کے والد اون یا ”یو باما“ عیسائی تھے۔ ان کی بیوی جیبہ مسلمان تھی۔ اون یا کو ایک یورپی کے ہاں باورچی کی حیثیت سے ملازم تھے۔ وہ اس کے ساتھ یورپ، انڈیا اور زینزیبار (زنجبار) میں بھی رہے۔ وہاں مسلمانوں کے ساتھ رہتے ہوئے وہ کیتھولک عیسائی سے مسلمان ہو گئے۔ ان کا بیٹا بارک حسین او باما سینئر بچپن میں مسلمان تھے پھر دہریا (Atheist) بن گئے۔ وہ 1950ء سے 1953ء تک ماسینو شہر میں واقع عیسائیوں کے ایک بورڈنگ اسکول میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک افریقی قصبے سے تعلق رکھنے کے باوجود وہ ایک ذہین طالب علم تھے۔ ان کے اسکول کے پرانے ریکارڈ بک (رجسٹر) میں اس وقت کے ہیڈ ماسٹر کے ریمارک موجود ہیں جو بارک او باما سینئر کے بارے میں ہیں۔

"He is very keen, Steady, Trustworthy and friendly. Concentrates, reliable and out going."

اس اسکول سے فارغ ہونے کے بعد جب وہ اٹھارہ برس کے تھے تو قبائلی رسم کے مطابق ”کیزیا آؤ کو“ نامی ایک خاندان کی لڑکی سے ان کی شادی کرائی گئی۔

او باما سینئر کو 23 برس کی عمر میں امریکا کی ”یونیورسٹی آف ہوائی“ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے اسکالرشپ ملی۔ وہ اپنے ایک بیٹے اور حاملہ بیوی کو کینیا میں چھوڑ کر امریکا پہنچ گئے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے مذہب اسلام کو بھی چھوڑ دیا اور دوبارہ دہریا کہلانے لگے۔ امریکا کی پچیسویں ریاست ہوائی کے شہر Maui میں ان کی ملاقات

امریکن لڑکی این ڈنہام سے ہوئی جو ان کے ساتھ تعلیم حاصل کر رہی تھی۔

2 فروری 1961ء کو دونوں نے شادی کر لی۔ 4 اگست 1961ء کو ان کے ہاں او باما جونیئر (امریکا کے موجودہ صدر) پیدا ہوئے۔ این کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کا شوہر پہلے ہی سے شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ ہے۔ اسے یہ معلومات بہت تاخیر سے حاصل ہوئی۔ بچے کی پیدائش کے بعد اس کی پرورش کی خاطر این نے اپنی تعلیم کو خیر باد کہا اور گھر میں رہنے لگی۔ اس نے اپنے شوہر کو تعلیم جاری رکھنے کا موقع دیا۔

ہارورڈ یونیورسٹی میں او باما سینئر رتھنڈ سینڈنامی ایک مچھ کے عشق میں مبتلا ہو گئے۔ اس طرح انہوں نے تیسری شادی کر لی۔ پھر تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ اسے اپنے ملک کینیا لے آئے۔ انہوں نے ہارورڈ یونیورسٹی سے آکٹاکس میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کی تھی۔ تیسری بیوی سے دو بچے ڈیوڈ اور مارک پیدا ہوئے۔ ڈیوڈ نو جوانی میں موٹر سائیکل کے ایک حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا اور چھوٹا بیٹا مارک تیرہویں میں رہتا ہے۔ اس کی تحریر کی ہوئی سوانح حیات نے خاص شہرت پائی ہے۔

او باما سینئر کی یہ تیسری شادی بھی بمشکل دو تین سال تک قائم رہ سکی۔ بیوی نے شوہر پر تشدد کا الزام لگا کر طلاق حاصل کی تھی۔ اس کے بعد او باما سینئر نے جائل (Jael) نامی کینیا کی ایک سیاہ فام خاتون سے چوتھی شادی کر لی۔ اس سے جارج او باما پیدا ہوا۔

1965ء میں امریکا سے واپس آ کر او باما سینئر کینیا کی وزارت ٹرانسپورٹ اور اس کے بعد وزارت خزانہ میں سینئر اکاؤنٹنٹ رہے۔ 1969ء میں کینیا کے سیاسی لیڈر ٹام مویا کے قتل کے بعد او باما سینئر کا زوال شروع ہوا۔ کینیا کے پہلے صدر جو مو کینیا تانے او باما سینئر کے کروت کو نظر رکھتے ہوئے انہیں نہ صرف ملازمت سے برخاست کیا بلکہ کینیا میں بینک لسٹ بھی کر دیا۔ ملازمت کے جانے کے بعد ان کا واحد شغل شراب نوشی رہا۔ اس دوران میں ان کا ایک خطرناک روڈ ایکسیڈنٹ ہو گیا جس کے نتیجے میں انہیں گریبا ایک سال اسپتال میں رہنا پڑا۔ اس کے بعد 1971ء میں جب وہ اپنے بیٹے (موجودہ امریکی صدر) سے ملنے ہوائی پہنچے تو ان کی ایک ٹانگ بیکار ہو چکی تھی۔ اس بات کا ذکر او باما جونیئر یعنی آج کے امریکی صدر نے اپنی

کتاب ”ڈریمس فرام مائی فادر“ کے صفحہ نمبر 71، 64 اور 219، 212 پر کیا ہے۔

او باما سینئر کی باقی زندگی شراب اور غربت کی گرفت میں ایسی آئی کہ وہ اس سے نجات نہ پاسکے۔ ستم ظریفی یہ کہ ان کا ایک اور روڈ ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ اس میں ان کی دوسری ٹانگ بھی ضائع ہو گئی۔ اس کے بعد وہ مکمل محتاجی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔ 1982ء میں ان کا تیسرا کار کریش ہوا جس میں وہ مارے گئے۔ اس وقت ان کی عمر 46 برس تھی۔ انہیں ان کے آبائی قصبے نیاگو ما میں دفنایا گیا۔

اب او باما جونیئر، امریکا کے چوالیسویں صدر کی والدہ این کا احوال..... ان کی اور او باما سینئر کی ملاقات امریکا کی ریاست ہوائی کی یونیورسٹی میں ہوئی تھی۔ ان دونوں کی شادی اور پھر جلد ہی طلاق ہو گئی۔ اس کے بعد این ڈنہام نے امریکا میں زیر تعلیم ایک غیر ملکی طالب علم لولو سوئیٹورو کے ساتھ دوسری شادی کر لی۔ اس کا تعلق انڈونیشیا سے تھا۔ 1967ء میں انڈونیشیا کا فوجی لیڈر سوہارٹو اقتدار میں آیا تو اس نے ولایت میں زیر تعلیم تمام طلباء کو اپنے وطن لوٹنے کا حکم جاری کر دیا۔ لولو سوئیٹورو اپنی بیوی این کے ساتھ جکارٹا کے علاقے میغینگ میں آ کر آباد ہوا۔ ان کے ساتھ او باما جونیئر یعنی این کے پہلے شوہر سے ہونے والا بیٹا بھی تھا۔ اس وقت او باما کی عمر چھ برس تھی۔ وہ دس سال کی عمر تک جکارٹا کے بیسویں پبلک اسکول اور سینٹ فرانسز اسکول سے تعلیم حاصل کرتے رہے۔ او باما 1971ء میں اپنے نانا کے پاس ہوائی میں رہنے لگے۔ یہ وہ سال تھا جب ان کے سگے والد پہلی مرتبہ ان سے ملنے ہوائی آئے تھے۔

صدر او باما اپنے بچپن کی یادداشتوں میں اپنے والد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ اپنے نانا کے ساتھ ہونو لولو کے جس محلے میں رہتے تھے، وہاں دور دور تک انہیں اپنے والد جیسا سیاہ فام نظر نہیں آتا تھا۔ وہ مزید لکھتے ہیں۔

"My father was black as pitch, my mother was as milk."

او باما کی والدہ ان سے ملنے کے لیے ہونو لولو آتی رہیں لیکن وہ ملازمت جکارٹا میں کرتی تھیں۔ انہوں نے یونیورسٹی آف ہوائی سے انٹھراپولوجی میں پی ایچ ڈی کیا تھا اور فورڈ فاؤنڈیشن کی جانب سے جکارٹا میں کام کرتی تھیں۔ آخری ایام میں وہ کینسر کا شکار ہو گئیں اور ہونو لولو لوٹ آئیں جہاں 1995ء میں ان انتقال ہو گیا۔ ان کی

پیدائش کا سال 1942ء ہے۔

اوباما چند برس ہوائی میں گزارنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے 1979ء میں لاس اینجلس چلے گئے۔ دو سال کے بعد 1981ء میں انہوں نے کولمبیا یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ یہ وہ یونیورسٹی ہے جس کا احوال میں اپنے ستر کی دہائی والے سفرنامے میں تحریر کر چکا ہوں کہ وہاں حیدر آباد سندھ کے عبدالرزاق شیخ کی ”شالا مار“ نامی ایک کپڑوں اور آرٹیفشل زیورات کی دکان تھی۔ وہاں کولمبیا یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس کا ہر وقت رش لگا رہتا تھا۔ ہمارا جہاز جب بھی نیویارک کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوتا تو عبدالرزاق شیخ کی دکان ہمارے لیے گویا ایک قسم کی بینک یا اوطاق بن جاتی تھی۔ یعنی وہ ہمارے ہم وطن لوگوں کی Meeting Place تھی۔ وہاں شالا مار دکان چلانے والے سلیم شیخ، آپا پروین، سپریم کورٹ کے وکیل عبداللطیف انصاری جیسے لوگ ہر وقت نظر آتے تھے۔ ان کے علاوہ ٹڈو قیصر کے نور احمد نظامانی، جھڈو کے میر مبارک تالپور اور پیر پکارا کے کرن پیر فضل الحق شاہ بھی وہیں قریب ہی رہتے تھے۔ ممکن ہے اوباما بھی آتے ہوں..... لیکن ہمارے دوستوں میں سے کسے خبر تھی کہ یہ اسٹوڈنٹ آئندہ چل کر اس ملک کے صدر بنیں گے۔ اگر انسان مستقبل کے بارے جان سکتا تو ان کے سکے والد ایسے بیٹے کو خود سے الگ کیوں کرتے۔ باپ نے تو بیٹے کی پیدائش کے وقت اس کی صورت دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی کہ اس کے نقش کس سے ملتے ہیں۔ حالانکہ وہ اسی شہر ہونولولو ہی میں رہتے تھے۔ پھر جب ان کی ٹانگ ٹوٹی، ملازمت بھی چلی گئی اور دارو کے لیے بھی رقم باقی نہ رہی تو ایسے میں انہیں اپنا بیٹا یاد آیا تھا اور وہ نہ جانے کس طرح کرائے کا انتظام کر کے بیٹے سے ملنے نیروبی سے ہوائی پہنچے تھے۔

☆☆☆

محاورے اور کہاوتیں سننے اور انہیں محفوظ کرنے کا شوق مجھے بچپن ہی سے رہا ہے۔ محاوروں کی ایک انگریزی کتاب Proverbs of Far East اور ایک سندھی کتاب ”روٹی ہے دوا“ سے تقریباً بیس سال پہلے شائع ہو چکی ہے۔ اول الذکر کتاب یعنی ”مشرق بعید کے محاورے“ میں، میں نے چین، جاپان اور ملائیشیا کے محاورے اور کہاوتیں شامل کی ہیں۔ مجھے ان ملکوں میں سب سے زیادہ رہنے کا موقع ملا۔ دوسری کتاب میں سندھی اور اردو محاورے شامل ہیں۔

کہاوت، ضرب المثل اور محاوروں سے نہ صرف عقل و انائی کی باتیں معلوم ہوتی ہیں بلکہ کسی بھی ملک میں رائج محاوروں سے وہاں کی قوم، کلچر، سوچ اور حالات کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

”تو گدھی کہہ رکی، تجھے رام سے کیا کام۔“ اور ”من تیل ہوگا نہ رادھانا ہے گی۔“ جیسے محاورے ہندو مذہب کے ہو سکتے ہیں، سوئڈن، سعودی عرب کے ہرگز نہیں۔ ممکن ہے ”آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا“ جیسی مثل دیگر ملکوں میں بھی پائی جاتی ہوں لیکن ”لیٹر کے گھر تیر، باہر ہانڈھوں کہ بھیت“ صرف ہمارے برصغیر کے ملکوں ہی میں ہو سکتی ہے۔

اسی طرح یہاں افریقا میں بھی گفتگو کے دوران عام طور پر جو محاورے، کہاوتیں اور ضرب المثل بیان کیے جاتے ہیں، ان میں کئی ایسے ہیں جو نہ صرف ہمارے ملکوں بلکہ مشرقی بعید کے ممالک اور یورپ میں بھی الفاظ کے معمولی سے رد و بدل کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ کچھ محاورے ایسے بھی ہیں جن کا تعلق صرف افریقا کے ملکوں اور وہاں کے کلچر سے ہے۔ مثلاً، ہمارے ہاں اور یورپ میں کئی محاورے در کہاوتیں ہیں۔ عورت کے خلاف ضرور ہیں..... اس کا یہی ایک سبب ہو سکتا ہے کہ ان محاوروں کو گھڑنے والے مرد حضرات ہیں۔ لیکن جاپان میں اس قسم کے محاورے حد سے زیادہ ہیں۔ کیونکہ وہاں کی عورت زیادہ تر مرد کے زیر اثر ہے۔

ایک جاپانی محاورہ ہے۔ ”سانپ سے زیادہ عورت سے بچنا چاہیے۔“

جاپانیوں کے لیے بدبختی کی علامت بھی عورت اور بیوقوف و خطرناک چیز بھی عورت ہے۔ جس طرح ہمارے ہاں عورت کے حوالے سے ایک عام کہاوت ہے کہ ”عورت کی عقل ایڑی میں ہوتی ہے..... وہ بھی چلنے کے دوران گر جاتی ہے۔“ ظاہر ہے اس میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس بات کے لیے کون سی سائنسی اور عقلی دلیل ہے جو اسے تسلیم کیا جائے؟ بس، اس کا ایک ہی سبب ہے! وہ یہ کہ ہماری سوسائٹی Male Dominated ہے۔

اس کے علاوہ اس قسم کے محاورے اور کہاوتیں تخلیق کرنے، انہیں لکھنے اور شائع کرنے والے مرد ہی ہیں۔ اس حوالے سے جاپانی سوسائٹی ہم سے زیادہ ”مردانہ قوت“ کا حامل ہے۔ وہاں عورت کی زیادہ تذلیل کی جاتی ہے کہنے ہیں۔ ”شادی کے پہلے ہی دن بیوی کو درست کر دینا چاہیے۔“ اور ”گھر کو صاف رکھنے والی بیویاں دوزخ سے

بچ سکتی ہیں۔“ دیکھا آپ نے! یعنی وہ دوزخ سے بچ سکتی ہے۔ یہ نہیں کہا جاتا کہ وہ جنت میں جاسکتی ہے۔ شاید جنت میں صرف جاپانی مرد جائیں گے، جو شراب پیتے ہیں، واشتائیں رکھتے ہیں اور ہر قسم کی بے اعتدالیوں میں مشغول رہتے ہیں۔ ایک اور کہاوت ہے ”وہ عورت وقادار جو دیر تک جاگ کر شوہر کا انتظار کرے.....“ ایک اور جاپانی محاورہ یاد آ رہا ہے۔ ”عورت پر ہرگز بھروسہ نہ کیا جائے، خواہ اس نے سات بیٹے جن کر دیے ہوں۔“ وغیرہ وغیرہ۔

یہی حال یہاں کے افریقی معاشرے کا ہے! افریقا کا ایسا کون سا ملک ہے جہاں عورت کے خلاف محاورے اور کہاوتیں مشہور نہ ہوں۔ کئی محاورے محض عورت کی تذلیل کے لیے تخلیق کیے گئے ہیں۔ یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اب جا کر کچھ سدھار پیدا ہوا ہے۔ کیونکہ نوع بنوع ایجادات نے دنیا کو ایک گلوبل ویج کی صورت دے دی ہے۔ کچھ تعلیم نے بھی مثبت اثر پیدا کیا ہے۔ جبکہ ستر کی دہائی اور اس سے پہلے کے برسوں میں جب ہمارا جہاز افریقا کے مشرقی اور مغربی کنارے کی بندرگاہ ہوں میں پہنچتا تھا تو یہاں عورتوں کی حالت دیکھ کر ہمیں اپنے ملک، خاص طور پر سندھ اور بلوچستان کے نظارے یاد آ جاتے تھے۔ افریقا میں عورت کی قدر ایک جانور گدھے اور شجر سے بھی کم نظر آتی تھی۔ اس سلسلے میں بطور طنز میں کہیں لکھ چکا ہوں کہ جب ایک افریقی مرد سے پوچھا گیا۔ ”آپ لوگ اپنی عورتوں سے اتنے بھاری گھاس کے گٹھے اور تین تین پانی کے مٹکے اٹھواتے ہیں۔ کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ آپ ایک ریڑھا رکھ لیں۔ جس پر یہ وزن آسانی سے لے جایا جاسکتا ہے۔“ افریقی کو یہ مشورہ ”دارے“ میں نہ آیا۔ اس نے گویا دلیل دیتے ہوئے جواب دیا۔ ”ریڑھے میں بھی پیہا خراب ہو جاتا ہے اور کبھی اس کا ہیرنگ ٹوٹ جاتا ہے.....“ یعنی اس میں خرچ ہی خرچ تھا۔

افریقی مرد جسمانی طاقت اور اخلاق کے حوالے سے خود کو برتر سمجھتے ہیں۔ ان کی نظر میں عورت کی حیثیت مہماڑ اور ٹوٹی ہوئی چپل سے زیادہ نہیں ہے۔ یہاں کی ایک مشہور کہاوت ہے۔ ”عورت، مرد نہیں ہو سکتی۔“ اس کا مطلب یہ ہے کہ مرد خواہ کامل، ست، غمی، بد اخلاق اور کمینہ ہو لیکن اس کے باوجود وہ ایک ایسی مخلوق ہے جس کی شادی عورت ہرگز نہیں کر سکتی۔

مجھے جاپانی یاد آتے ہیں..... ایک عام ٹورسٹ کو شاید محسوس نہ ہوتا ہو۔ لیکن جو شخص میری طرح زیادہ عرصہ جاپانیوں کے ساتھ رہا ہو۔ تو اس سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ جاپانی عورت کی اس کے معاشرے میں، خاص طور پر نصف صدی پہلے تک کیا حالت رہی ہے۔ اس قدر کہ 1950ء تک جاپانی عورت کو قدرتی چشموں کے پانی میں نہانے کی اجازت نہیں تھی۔ اسے اس حد تک منحوس سمجھا جاتا تھا کہ وہ فوجی پہاڑ جا کر نہیں دیکھ سکتی تھی۔ بہر حال افریقا کے یہ سیاہ قام ان سے بھی چار ہاتھ آگے ہیں۔ اس بات کا احساس ان کے محاوروں ہی سے ہوتا ہے۔ کہتے ہیں۔

”ایسی عورت سے شادی ہرگز نہ کی جائے جس کے پاؤں آپ سے بڑے ہوں۔“

اسی قسم کے چند دیگر محاورے یہاں تحریر کرتا ہوں۔

☆ عورتوں کو منہ (دہن) نہیں ہوتا۔

☆ دائرہ والی منہ بھی جھوٹ نہیں بولتا۔ (یعنی مرد ہی راست گو ہیں۔ ظاہر ہے کسی عورت کی دائرہ نہیں ہوتی)۔

☆ افریقا میں کئی مرد ایک سے زیادہ بیویاں رکھتے ہیں یا ایک کو چھوڑ کر دوسری شادی کر لیتے ہیں۔ اپنے اس فعل کو درست ثابت کرنے کے لیے کہ کوئی انہیں اس سلسلے میں ٹوکنے کی کوشش نہ کرے..... اس کے لیے بھی انہوں نے کئی محاورے تخلیق کر لیے ہیں۔ مثلاً:

☆ ایک بیوی ایک آنکھ کے برابر ہے۔ (یعنی بہتر زندگی کے لیے، بہتر دیکھنے کے لیے ایک سے زیادہ بیویوں کا ہونا ضروری ہے)

☆ ایک بیوی والا صرف ان کا سردار ہو سکتا ہے جو غیر شادی شدہ ہوں۔

☆ خراب بیوی کو سزا دینے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ نئی بیوی لائی جائے۔

☆ جس شخص کی صرف ایک بیوی ہو، اگر وہ بیمار پڑ جائے تو شوہر کمزور ہو جاتا ہے۔ (یعنی ہر مرد کے لیے دو تین بیویاں رکھنا ضروری ہے۔ تاکہ اگر ایک بیمار پڑ جائے تو دوسری، مرد کی خدمت اور اس کے لیے کھانے وغیرہ کا بندوبست کرے)

☆ بغیر مرد کے عورت اس زمین کی طرح ہے جس میں بیج نہ ہو۔

☆ عورت کی پٹائی کرنا..... اور اپنے اس فعل کو Justify کرنے کے لیے بھی محاورے ہیں۔

☆ اگر آپ اپنی بیوی سے واقعی پیار کرتے ہیں تو

اس کی پٹائی بھی کرتے رہیں۔

☆ سرکش بیوی جو توں ہی سے کنٹرول میں رہتی ہے۔

☆ خوبصورت بیوی گھر میں بیماریاں لاتی ہے۔

☆ کامل عورت کام کے سیزن میں حاملہ ہو جاتی

ہے۔ (یعنی پچھلی کی چٹائی اور اناج کی کٹائی کے دنوں میں وہ "بے کار" ہو جاتی ہے)

بہر حال یہاں عورتوں کے خلاف محاوروں کو چھوڑ کر دیگر افریقی محاورے دیکھتے ہیں۔

☆ بھڑ، بھڑ کوڈیک نہیں مارتی۔ (انسان ہی انسان کو نقصان پہنچا سکتا ہے)

☆ ڈوبنے والے جہاز کو کیپٹن کی کیا ضرورت۔

☆ ٹیڑھی میٹرھی ٹانگوں والے کو زرافہ کا شکار کرنے کے لیے نہیں لٹکنا چاہیے۔

☆ آپ کے سر پر خواہ کتنی ہی بارش ہوتی رہے، پھر

بھی آپ اپنے سر پر کیلا کاشت نہیں کر سکتے۔

☆ چیری میں غریب ہونے سے بہتر ہے کہ جوانی میں رہا جائے۔

☆ نو اور دس میں کوئی خاص فرق نہیں ہے (یہ ایسی مثال ہے، جس طرح ہمارے ہاں معمولی فرق بیان کرنے کے لیے انیس بیس کا فرق بتاتے ہیں)

☆ ایک انگلی سے جوں مارنا محال ہے (جس طرح

ہمارے ہاں کہا جاتا ہے کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی، جوں کو بھی دو ناخنوں کے درمیان ہی پٹل کر مارا جاسکتا ہے)

☆ مرغیوں کی بددعا سے عقاب پریشان نہیں ہوتے (اسی قسم کا محاورہ ہمارے ہاں بھی موجود ہے۔ "کوؤں کے

کونے سے ڈھور نہیں مرا کرتے)

☆ جو شخص سائڈ کے سینک کی چوٹ کھا چکا ہو، وہ کالے رنگ کی گائے سے بھی ڈرتا ہے (ہمارے ہاں بھی

ایسا ہی محاورہ ہے۔ دودھ کا جلا چھانچہ بچہ چونک کر پیتا ہے)

☆ جس کورٹ کے جج باز ہوں، وہاں سے چڑیا کس طرح باعزت بری ہو سکتی ہے۔

آخر میں عورت کے بارے میں چند مزید افریقی محاورے۔

☆ عورت اور آسمان کو آج تک کوئی سمجھ نہیں سکا۔

☆ عورت مکی کا بھڈ نہیں ہے کہ اسے شناخت کرنے کے لیے محض اس کا غلاف (چھلکا) اتارنا کافی ہو۔

☆ عورت سائے کی طرح ہے۔ اس کے پیچھے جائیں تو

وہ آگے بڑھتی رہے گی۔ اسے چھوڑ کر پلٹ جائیے تو آپ کے پیچھے پیچھے آئے گی۔

☆ خالی گھر سے بہتر ہے کہ خراب عورت قبول کر لی جائے۔

☆ عورت کبیل کی طرح ہے، جسے اوڑھنے سے گرمی اور چھوڑنے سے سردی محسوس ہوتی ہے۔

☆ اگر آپ بچے کے لیے بے چین ہیں تو کسی حاملہ عورت سے شادی کریں۔

☆ جھگڑا لوی بیوی سے بہتر ہے کہ سورج کی گرمی میں سویا جائے۔

☆ عورت ہر خرابی کی جڑ ہے۔ ہمیں ہماری روح اس کے شر سے بچا سکتی ہے۔

☆☆☆

آج کے دور میں یورپ اور امریکا کے ساتھ افریقا بھی کئی معاملات میں ماڈرن ہو گیا ہے۔ جہاں آپ کو جاپانی

اور جرمن کاریں نظر آتی ہیں، کمپیوٹر اور ٹی وی چینل نظر آتے ہیں۔ افریقا کے ہر ملک میں گوکہ بڑھے لکھے لوگ نظر آتے

ہیں لیکن مجموعی طور پر پورا افریقا، گھونگی اور جیکب آباد کا منظر پیش کرتا ہے۔ دیکھا جائے تو ان تمام ملکوں میں کینیا

خاصی بہتر حالت میں ہے۔

افریقا کے شمالی ملک مصر، لیبیا، ٹیونسٹیا، الجزائر اور موراکو میڈیٹرینین سمندر کے ملک کہلاتے ہیں۔ یورپ کے

قریب ہونے، تیل اور نورازم کے سبب امیر ملک ہیں۔ ان کے علاوہ صحارا صحرا کے زیریں حصے والا پورا افریقا آج بھی

بد حالی کا شکار ہے۔ براعظم افریقا کے انتہائی زیریں حصے میں واقع ملک "ساؤتھ افریقا" کو ہم ان میں شامل نہیں

کرتے۔ کیونکہ یہ ملک آج بھی گوروں کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا انگلینڈ کہلاتا ہے دیگر ملک..... اینگولا، نمیبیا،

ملاوی، برنڈی، راوند، چاڈ، برکانوفا سو..... سب کے سب کرپشن، لاقانونیت اور بد امنی کا شکار ہیں۔ یہ ناسور

ہمارے ہاں، ایشیا کے ملکوں میں بھی ہیں۔ لیکن بعض ملک یعنی جاپان، ملائیشیا، سنگاپور، کویت، سعودی عرب وغیرہ

یورپ کے ملکوں کی برابری کرتے ہیں۔ کوریا، فلپائن، تھائی لینڈ، دبئی، ایران اور انڈیا جیسے ملک انہیں فالو کرتے ہیں۔

ہم یہاں صرف کینیا اور براعظم افریقا کے مشرقی کنارے کے ملکوں کی بات کر رہے ہیں۔ یہاں صدیوں

سے انڈیا، ایران اور عرب ملکوں کی تجارت ہوئی رہی ہے۔

وہاں تجارت اور ملازمت کی غرض سے ہمارے ملکوں کے لوگ جاتے رہے ہیں۔ وہاں سے لوگ، چائے اور سیاہ فام غلام ہمارے ہاں پہنچتے تھے۔ ان ملکوں کی زبان اور پھر کا ایک دوسرے پر اثر رہا ہے۔

براعظم افریقا کے مشرقی کنارے پر طائرانہ نظر ڈالی جائے تو یہ اتھوپیا اور سومالیہ سے شروع ہوتا ہے۔ اتھوپیا، جسے کسی زمانے میں "ایسیسیا" بھی کہا جاتا تھا اور عربی زبان میں "جش" کہلاتا تھا۔ جس طرح زیز بیار کو "زنجبار" کہا جاتا تھا۔ عرب آج بھی اس ملک کو اسی نام سے یاد کرتے ہیں۔ اتھوپیا دراصل بحر احمر کا ملک ہے۔ سرخ

سمندر یعنی بحر احمر کے ایک طرف سعودی عرب ہے اور دوسری جانب اتھوپیا (جش) واقع ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مقدسہ میں جش امیر کبیر ملک تھا۔ اس کے بادشاہ کی سلطنت یمن تک پھیلی ہوئی تھی۔ مکہ کے مسلمان کشتیوں کے ذریعے ہجرت کر کے جش پہنچتے تھے۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا تعلق اسی ملک سے تھا۔ عربوں کا زیادہ واسطہ جش کے لوگوں سے رہا جو اس زمانے میں "جشی" کہلاتے تھے۔ بعد میں جب سوڈان،

کینیا، تنزانیہ اور افریقا کے دیگر ملکوں کے سیاہ فام پہنچے تو وہ بھی جشی کہلانے لگے۔ کیونکہ وہ تمام لوگ جش سے ہوتے ہوئے سعودی عرب پہنچتے تھے۔ جس طرح ملایا (آج کا

ملائیشیا) میں زمانہ قدیم میں ہر غیر ملکی شخص بنگال کے کنارے سے ہوتا ہوا پہنچتا تھا اور انہیں بنگالی کہا جاتا تھا۔ پر بنگالی بھی

فلج بنگال کے کنارے سے ہوتے ہوئے ملایا پہنچتے تھے۔ ملکی لوگ انہیں بھی بنگالی کہتے تھے۔ لیکن چونکہ وہ گورے تھے اس لیے انہیں "سفید بنگالی (پونج بنگالی) کہا گیا۔ سو

اسی طرح ہمارے ہاں بھی ہر سیاہ فام افریقی کے لیے لفظ "جشی" استعمال ہوتا ہے۔

بہر حال آج اس ملک جش (ایتھوپیا) کی حالت سب سے خراب ہے۔ سومالیہ انگریزوں کے راج میں خاصا

بہتر اور امیر ملک تھا۔ لیکن اب سومالیہ میں بھی سخت بد امنی ہے۔ یمن کی طرح یہاں بھی جگہ جگہ اغوا کے واقعات پیش آتے ہیں۔ اس سے نیچے، ملاوی، موزمبیق، سوازی لینڈ

میں بھی یہی حال ہے۔ ان میں یوگنڈا، تنزانیہ اور کینیا کو قدرے بہتر قرار دیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ یہاں انگریزوں کا

رہنہ رہا ہے۔ یہ تینوں ملک وکٹوریہ جھیل کے گرد واقع ہیں۔ علاقہ انگریزوں کے دور میں "ایسٹ افریقا" کہلاتا تھا اور

پورا علاقہ انگریزوں کی غرض سے ہمارے ملکوں کے لوگ جاتے رہے ہیں۔ وہاں سے لوگ، چائے اور سیاہ فام غلام ہمارے ہاں پہنچتے تھے۔ ان ملکوں کی زبان اور پھر کا ایک دوسرے پر اثر رہا ہے۔

براعظم افریقا کے مشرقی کنارے پر طائرانہ نظر ڈالی جائے تو یہ اتھوپیا اور سومالیہ سے شروع ہوتا ہے۔ اتھوپیا، جسے کسی زمانے میں "ایسیسیا" بھی کہا جاتا تھا اور عربی زبان میں "جش" کہلاتا تھا۔ جس طرح زیز بیار کو "زنجبار" کہا جاتا تھا۔ عرب آج بھی اس ملک کو اسی نام سے یاد کرتے ہیں۔ اتھوپیا دراصل بحر احمر کا ملک ہے۔ سرخ

سمندر یعنی بحر احمر کے ایک طرف سعودی عرب ہے اور دوسری جانب اتھوپیا (جش) واقع ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مقدسہ میں جش امیر کبیر ملک تھا۔ اس کے بادشاہ کی سلطنت یمن تک پھیلی ہوئی تھی۔ مکہ کے مسلمان کشتیوں کے ذریعے ہجرت کر کے جش پہنچتے تھے۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا تعلق اسی ملک سے تھا۔ عربوں کا زیادہ واسطہ جش کے لوگوں سے رہا جو اس زمانے میں "جشی" کہلاتے تھے۔ بعد میں جب سوڈان، کینیا، تنزانیہ اور افریقا کے دیگر ملکوں کے سیاہ فام پہنچے تو وہ بھی جشی کہلانے لگے۔ کیونکہ وہ تمام لوگ جش سے ہوتے ہوئے سعودی عرب پہنچتے تھے۔ جس طرح ملایا (آج کا

ملائیشیا) میں زمانہ قدیم میں ہر غیر ملکی شخص بنگال کے کنارے سے ہوتا ہوا پہنچتا تھا اور انہیں بنگالی کہا جاتا تھا۔ پر بنگالی بھی فلج بنگال کے کنارے سے ہوتے ہوئے ملایا پہنچتے تھے۔ ملکی لوگ انہیں بھی بنگالی کہتے تھے۔ لیکن چونکہ وہ گورے تھے اس لیے انہیں "سفید بنگالی (پونج بنگالی) کہا گیا۔ سو اسی طرح ہمارے ہاں بھی ہر سیاہ فام افریقی کے لیے لفظ "جشی" استعمال ہوتا ہے۔

بہر حال آج اس ملک جش (ایتھوپیا) کی حالت سب سے خراب ہے۔ سومالیہ انگریزوں کے راج میں خاصا بہتر اور امیر ملک تھا۔ لیکن اب سومالیہ میں بھی سخت بد امنی ہے۔ یمن کی طرح یہاں بھی جگہ جگہ اغوا کے واقعات پیش آتے ہیں۔ اس سے نیچے، ملاوی، موزمبیق، سوازی لینڈ میں بھی یہی حال ہے۔ ان میں یوگنڈا، تنزانیہ اور کینیا کو قدرے بہتر قرار دیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ یہاں انگریزوں کا رہنہ رہا ہے۔ یہ تینوں ملک وکٹوریہ جھیل کے گرد واقع ہیں۔ علاقہ انگریزوں کے دور میں "ایسٹ افریقا" کہلاتا تھا اور

پورا علاقہ سلجھا ہوا سمجھا جاتا تھا۔ یوگنڈا کا ستیاناس عیدی امین نے کیا۔ تنزانیہ کی حالت بھی مقامی سیاستدانوں کے ہاتھوں خراب ہوئی..... ان میں صرف کینیا ایسا ملک ہے جو کسی حد تک محفوظ ہے۔ یورپین اور امریکن کو افریقا گھومنے کا شوق چراتا ہے تو وہ کینیا کا رخ کرتے ہیں۔ پھر وہاں سے ان کا وٹا فارن قریبی افریقی ملک بھی چلا جاتا ہے۔

نیروبی اور ممباسا، کینیا کے مشہور شہر ہیں۔ ان شہروں میں ٹورسٹ کی کثیر تعداد نظر آتی ہے۔ نیروبی کی حیثیت اسلام آباد جیسی ہے، یعنی اسے آباد ہونے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ یہ فرق ضرور ہے کہ اسلام آباد کی عمر نصف صدی ہے اور نیروبی کو آباد ہونے ایک صدی ہو چکی ہے لیکن اس کے مقابلے میں

کینیا کے شہر ممباسا اور اس کی بندرگاہ کی حیثیت ہمارے ٹھٹھہ جیسی ہے۔ پاکستان کے معرض وجود میں آنے سے بھی صدیوں پہلے ٹھٹھہ موجود تھا۔ اسی طرح کینیا کی سرحدوں کے وجود میں آنے اور اس ملک پر یہ نام پڑنے سے صدیوں پہلے

ممباسا تھا۔ جہاں عربستان، ایران (جو اس زمانے میں "پرشیا" کہلاتا تھا) اور انڈیا کے سوداگر چوماسی کی ہواؤں سے فائدہ اٹھا کر اپنی کشتیوں کے ذریعے ممباسا پہنچتے تھے۔

ممباسا آج کینیا کا دوسرا بڑا شہر ہے جبکہ صدیوں تک یہ شہر پورے مشرقی افریقا میں دولت، امارت، تجارت، سیاحت اور خوشحالی میں اول نمبر پر رہا ہے۔ اس کا موازنہ

زیز بیار اور دارالسلام جیسی بندرگاہوں سے کیا جاتا تھا۔ بعد میں، بہت بعد میں یوگنڈا کا شہر کمپالا مشہور ہوا۔ پھر جب یہاں انگریزوں کا راج قائم ہوا اور انگریز کمپالا کوریل کے

ذریعے ممباسا سے ملانے لگے تو اس وقت یعنی سن 1900ء میں آج کے شہر نیروبی کے مقام پر ریلوے ڈپو، دو تین گودام

اور مزدور، افسروں کے لیے چند کوارٹر بنوائے گئے تھے۔ یہ گویا مستقبل کے نیروبی کی بنیاد تھی۔ موافق اور بہتر آب و

ہوا، ٹھٹھہ پانی اور ریلوے اسٹیشن کی موجودگی میں یہ شہر ایک سو سال کے اندر جنوبی افریقا کا بہترین اور ماڈرن شہر بن

گیا۔ ملک کا دارالحکومت ہونے کے علاوہ بین الاقوامی انرپورٹ بھی اسی شہر (نیروبی) میں ہے۔

اس کے باوجود ممباسا کی حیثیت آج بھی اہم ہے۔ کیونکہ ممباسا کو آج بھی نہ صرف کینیا بلکہ ارد گرد کے ملکوں

میں بڑی بندرگاہ کی وجہ سے اہم تسلیم کیا جاتا ہے۔ یوگنڈا جیسے ملکوں کا سامان بھی ممباسا کے راستے پہنچتا ہے کیونکہ

افغانستان کی طرح یوگنڈا کی بھی اپنی بندرگاہ نہیں ہے۔

جادو ٹونے کی شروعات نہ جانے کب ہوئی، کس نے تعلیم دی مگر یہ علم دنیا کے ہر خطے میں مروج ہے۔ ایسا کوئی ملک نہیں جہاں فسوں گری نہ ہوتی ہو۔ زمانہ قدیم میں تو جادوگر ساحری قوت سے ملک و تاج تک حاصل کر لیتے تھے۔ آج، ترقی یافتہ ملک میں بھی جادو ٹونے کا رواج ہے۔ کس ملک میں کس قسم کی ساحری مروج ہے، اسی کا خلاصہ۔

سحر ساحری

امجد اوسلو

جادو ٹونے پر ایک مختصر مگر جامع تحریر

گری، بر دور میں جاری رہی ہے اور آج بھی جاری ہے۔ جب کسی شخص کو دکھ پہنچانا یا زخمی کرنا یا قتل کرنا مقصود ہو تو ایک پتلا بنا کر اس میں سوئی یا نیلا مارا جاتا ہے تو دشمن کے جسم کے ان ہی مقامات پر تکلیف پہنچتی ہے یا وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔ قدیم بھارت، بابل اور مصری معاشروں میں اس قسم کی فسوں کاری عام تھی۔

ہیرو کے علاقے میں موم اور آٹے کو ملا کر دشمن کے راستے میں آنے والے چوراہے میں پھینک دیتے ہیں۔ ملایا میں جادوگر دشمن کے کٹے ہوئے ناخن، بال ابرو اور تھوک وغیرہ لے کر شہد کی مکھی کے چھتے کی موم حاصل کر کے اس میں ملا کر دشمن کا پتلا بناتے ہیں اور پھر اس پتلے کو ہلکی آنچ پر سات دنوں تک جھلساتے ہیں۔ سات راتوں تک عمل کرنے کے بعد پتلے کو جلا دیتے ہیں اور دشمن ہلاک ہو جاتا ہے۔ یہ تو تھا موت کا عمل۔ اب زندگی کا عمل ملاحظہ فرمائیں۔

اس قسم کے عمل ولادت اور صاحب اولاد وغیرہ ہونے کے لیے کیے جاتے ہیں۔

سامرا کے علاقے میں بانجھ عورت لکڑی کا بت بنا کر اسے اپنی آغوش میں بھرتی ہے اور کچھ منتر کا الاپ کرتے ہوئے یہ خیال کرتی ہے کہ وہ صاحب اولاد ہو جائے گی۔

بورنیو کے علاقے میں بچے کی ولادت کے وقت سہولت کی غرض سے جادوگر کو بلا یا جاتا ہے جو وہاں آ کر چند منتر دہراتا ہے۔ اسی دوران ایک دوسرا جادوگر کمرائے ولادت سے باہر نکل کر بالکل زچہ کا روپ دھارتا ہے۔ اس کے پیٹ کے ساتھ وزنی پتھر باندھ دیا جاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو دردزہ میں مبتلا ظاہر کرتا ہے اور بچے کی ولادت تک یہی انداز اختیار رکھتا ہے۔

جادو کے ذریعے علاج بھی کیا جاتا ہے اور یہ جادو کا مثبت پہلو ہے۔

بالش سحر سے بیماروں کا علاج کیا جاتا ہے۔ خاص طور پر یرقان کے مریضوں کا۔ علاج کے دوران مریض کو زرد چیزوں، زرد روشنی، خاص طور پر سورج کی روشنی سے دور رکھا

جادو ایک ایسا موضوع ہے جس نے زمانہ قدیم سے انسان کو اپنی طرف متوجہ کر رکھا ہے۔

جادو یا سحر فریفتہ کرنے کے معنی میں بھی آیا ہے۔ شرع میں سحر حرام ہے لیکن بعض کہتے ہیں کہ اگر اپنے آپ کو سحر یا جادو کے اثر سے بچانے کے لیے سیکھا جائے تو حرام نہیں ہے۔

سحر کے اثر میں اختلاف ہے۔ اکثر علما فرماتے ہیں کہ سحر میں اثر ہے جیسا کہ نظر میں ہے اور صد ہا لوگوں نے اس کا مشاہدہ بھی کیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ سحر کافی نفسہ تو کوئی اثر نہیں نہ عقل سلیم اس کو تسلیم کر سکتی ہے البتہ قوت واہمہ میں ایک اثر ضرور پیدا ہوتا ہے۔

ہم اس مضمون میں جادو کے اثر انگیز ہونے یا نہ ہونے کا جائزہ نہیں لے رہے اور نہ ہی آپ کو یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ جادو حرام ہے یا نہیں۔ بلکہ اس مضمون میں یہ جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے کہ دنیا کے مختلف ممالک اور مختلف قبائل میں جادو کی رسومات کیا کیا ہوتی ہیں؟

جادو کن کن مسائل کے لیے بروئے کار لاتے ہیں۔ ہم یہاں آپ کو جادو کی دو اقسام کے بارے میں ضرور بتانا چاہیں گے، انہیں آپ جادو کے دو مکتبہ فکر سمجھ لیں۔

1۔ ہومیو پیتھک یا پاتھل جادو

Homeopathic Magic

2۔ متعدی جادو۔

Contact or Coniagius Magic

بالش جادو میں دشمن کا پتلا بنا کر اس کے پتلے کو نقصان پہنچا کر دشمن کو بر باد کیا جاتا ہے جبکہ متعدی جادو میں دشمن کے لباس یا اس کے جسم کو چھونے والی اشیاء پر جادو کر کے دشمن کو نقصان پہنچایا جاتا ہے۔

یہ دونوں ہی بہت ہولناک اور خطرناک ہیں۔ مثال کے طور پر آپ کسی کے اترے ہوئے کپڑے حاصل کر کے اسے نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

بالش جادو گروں کے کہنے کے مطابق اس قسم کی فسوں

سنگاپور کی ہائی اسٹریٹ پر واقع تھیں۔ کشادہ، بلند چھت والی ہواداردکانیں، ان کے آگے چھت والا برآمدہ، اس کے بعد فٹ پاتھ اور پھر گاڑیوں کے چلنے کے لیے سڑک ہوتی تھی۔ ان تینوں شہروں کی دکانوں کے سامنے ان کے سندھی ہندو، گجراتی اور پارسی سیٹھ سفید کوٹ اور ٹوپی پہنے واک کرتے ہوئے آج بھی میرے تصور میں تیر آتے ہیں۔

1960ء سے پہلے تک صدر کراچی کی دکانوں کا بھی یہی حال تھا۔ پھر آبادی میں اضافے، لاریوں موٹروں اور سیاحوں کی کثرت نے ان سکون کے دنوں کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن اتنی کی دہائی کے ابتدائی سالوں تک اس قسم کی دکانیں ویسٹ انڈیز (جنوبی امریکا) کی اطراف برمودہ، ٹرینیڈاڈ اور کیوبا میں ضرور موجود تھیں۔ اب وہاں بھی ختم ہوتی جا رہی ہیں۔ زمین کی قیمت اس قدر بڑھ چکی ہے کہ بعض شہروں میں ایک فٹ زمین کی قیمت ایک لاکھ روپے تک پہنچ گئی ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ ممبئی، جو انگریزوں کے دور میں باپے اور بمبئی کہلاتا تھا..... وہاں کے علاقے فورٹ میں آج بھی اس قسم کی کئی دکانیں موجود ہیں۔

اگر آپ کراچی میں اس دور کی یہ دکان دیکھنا چاہتے ہیں تو صدر کے اس علاقے میں چلے جائیے جہاں فوٹو گرافرز، گھڑیوں اور کیمروں کی دکانیں ہیں۔ وہاں پرشن بیکری نامی ایک تقریباً سو سال پرانی دکان، اسی شکل میں آج بھی موجود ہے۔ یہ دکان ایرانیوں کی ہے۔ ان کی تیار کی جانے والی ڈبل روٹی، پاپے، پیٹیز اور کیک کا ذائقہ اب بھی وہی ہے۔ تقریباً 50 سال سے تو میں ہی دیکھتا چلا آ رہا ہوں۔ میں نے 1960ء میں دکان کے مالکوں کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا تو اس وقت وہ بھی میری طرح نوجوان تھے۔ اب میری طرح وہ بھی بوڑھے ہو چکے ہوں گے۔

اگر آپ کا گزر اس دکان کے سامنے سے ہو تو میں مشورہ دوں گا کہ آپ اس کے اندر تک چلے جائیں۔ جہاں کام کرنے والے آٹا گوندھتے اور بھٹی میں ڈبل روٹی بیکٹ وغیرہ تیار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ دکان اتنی بڑی اور کشادہ ہے کہ اس میں سے ارد گرد دینی ہوئی دکانوں جیسی کم از کم بارہ تیرہ دکانیں بن سکتی ہیں۔ سو اس قسم کی قدیم دکانیں اور حیدر آباد کی بمبئی بیکری جیسے شاپ ہاؤس ملائیشیا کے کئی شہروں میں کہیں کہیں آج بھی موجود ہیں۔ جہاں سے انگریز راج میں یورپین اور انگریز خریداری کرتے تھے۔

1968ء اور 1973ء کے دوران میرا اس بندرگاہ اور مشرقی افریقا کی دیگر بندرگاہوں، زنجبار، دارالسلام، لاریز و مارکس (موجودہ نام مویٹو) پیرا وغیرہ میں اکثر آنا رہا ہے۔ ان ایام میں سونز کینال بندھی، اس لیے مجھے جس جہاز پر بھی تعینات کیا گیا، وہ یہاں سے ضرور گزرتا تھا۔ کارگو نہ ہونے کے باوجود ہمیں جہاز کے ایندھن اور عملے کے راشن کے حصول کے لیے ممبراسا میں ایک دو دن ٹھہرنا پڑتا تھا۔ ممبراسا میں انڈین اور مسلمان دکانداروں کی موجودگی کے سبب ہمیں ہر چیز، یعنی مریج مسالے، حلال گوشت وغیرہ مل جاتا تھا۔ جہاز کی مرمت کے لیے پورے افریقا میں ایسا کوئی انتظام نہ تھا جیسا جاپان اور یورپ کی بندرگاہوں میں نظر آتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ممبراسا کو غنیمت سمجھا جاتا تھا۔ معمولی مرمت کے لیے بھی ہمیں ہفتہ، دس دن ٹھہرنا پڑ جاتا تھا لیکن کام ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد سمندر میں دس پندرہ دن کا سفر کر کے ہم یورپ یا امریکا کی کسی بندرگاہ میں پہنچ جاتے تھے۔

جب ہم جاپان، چین یا یورپ کی بندرگاہوں سے ہوتے ہوئے ممبراسا پہنچتے تو ہمیں عجیب احساس ہوتا تھا۔ خاص طور پر آبادی کے خیال سے! ادھر لوگوں کا ہجوم، گاڑیوں، موٹروں کا شور..... اور یہاں ممبراسا میں خاموشی اور سبزہ ہی سبزہ! لوگ، چند پرند گویا ہر شے فرصت میں نظر آتی۔ دوپہر کے وقت دنیا کے دوسرے ملکوں میں رش اور بھیڑ بھاڑ نظر آتی تھی..... اس کے مقابلے میں ممبراسا میں ایک طرح کا سکوت، خاموشی اور سکون! ان ایام میں انگریزوں کے راج سے یہ دستور چلا آ رہا تھا کہ دوپہر کے ڈھائی گھنٹے چھٹی ہوتی تھی۔ تاکہ ہر شخص کچھ دیر آرام کر کے اور دن کی گرمی گزار کر کام کا آغاز کرے۔ ہمارے ہاں سندھ میں بھی انگریزوں کا یہ دستور کافی عرصے تک جاری رہا۔ ہمارے زمانے میں پرائمری اسکول دو قسطوں میں ہوتا تھا۔

آدم شماری کے لحاظ سے ممبراسا آج بھی ویسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ آج کل حیدر آباد جتنے بڑے اس شہر کی آبادی آٹھ لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ 1970ء میں اس سے نصف بتائی جاتی تھی۔ سنگاپور اور کوالا لپور کی طرح یہاں ممبراسا میں بھی کافی تبدیلی آچکی ہے۔ اس سے پہلے کلندی روڈ (اب یہ سابق صدر کے نام سے حوئی ایونیو کہلاتا ہے) کی دکانیں ایسی انگریزی اسٹائل کی تھیں جیسی کوالا لپور میں باتوروڈ (یہ اب جالان تنکو عبدالرحمان روڈ کہلاتا ہے) اور



جاتا ہے اور مریض کے کمرے میں سرخ روشنی کا انتظام کیا جاتا ہے، اس مقصد کے لیے سرخ نل بھی باندھی جاتی ہے۔ اس دوران پنڈت یا پروہت اس پر منتر پڑھتا ہے جس کے الفاظ کچھ یوں ہوا کرتے ہیں ”تمہارا درد دل اور تمہارا یرقان آسمان پر سورج کی طرف لوٹ جائے گا۔ ہم اسے سرخ نل میں لپیٹ کر باندھ دیں گے۔ ہم تمہارا یرقان پرندوں کو لگا دیں گے۔“

منتر پڑھنے کے دوران پروہت یرقان زدہ مریض کو سرخ نل کے بال ملا پانی بھی پینے کو دیتا ہے۔ اس کے بعد زردی ختم کرنے کے لیے اس کے سر سے پرندوں کو باندھ کر اس کی چار پائی سے باندھ دیا جاتا ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان تینوں پرندوں کو یرقان ہو جاتا ہے اور مریض صحت مند ہو جاتا ہے۔

آخر یہ سب کیا تھا، یہ کیسی طاقتیں ہیں جو اس طرح مدد کیا کرتی ہیں۔ ان بولوں میں کیا اثر ہے؟ اس عمل میں کیا راز پنپا ہے؟ جادوگر مارسلیس رسولی کا علاج اس طرح کیا کرتا ہے۔

ساگوان کی جڑ لے کر اس کو درمیان سے چیرتا ہے۔ اس کا ایک ہر مریض کی گردن کے گرد لپیٹ دیتا اور دوسرا ہرا آگ کے دھوئیں پر کر دیتا ہے۔

جوں جوں لکڑی سوکھتی جاتی ہے، مریض کی رسولی غائب ہوتی جاتی ہے اور آخر کار بالکل غائب ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ مریض اگر مناسب معاوضہ ادا نہ کرے یا معاوضے سے انکار کر دیتے تو ایسی صورت میں وہ اسی سوکھی جڑ کو پانی میں ڈال دیتا ہے۔ جوں جوں لکڑی پانی کو جذب کرتی ہے، ویسے ویسے مریض کی رسولی ابھرتی چلی آتی ہے۔

یہ ایسی باتیں ہیں جن کی کوئی عقلی یا سائنسی توجیہ نہیں کی جاسکتی۔ اس کے باوجود ان میں اثر ہوتا ہے، آخر کیوں؟ شکار کے لیے بھی اسی قسم کے بے شمار ٹونے ٹونے اور عملیات وغیرہ کیے جاتے ہیں اور ان علاقوں میں یہ رواج برسوں سے چلے آ رہے ہیں۔

کولمبیا کے کسی شکاری کو جال لگانے کے بعد شکار نہ ملے تو وہ ننگا ہو کر کچھ دور تک جاتا ہے اور وہاں سے ٹہلتا ہوا یوں جال کی طرف آتا ہے جیسے اس نے جال کو دیکھا ہی نہ ہو۔

پھر اپنے آپ کو جال میں پھنسا لیتا ہے اور زور سے پکارتا ہے۔ ”نیلو۔ یہ کیا ہے، میں خوف زدہ ہوں۔ میں شکار ہو گیا ہوں۔“

ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اس کے بعد جال میں شکار آنا شروع ہو جاتے ہیں۔

ریسرچ کے مطابق جادوگر بیک وقت مثبت (Chase) اور منفی (Taboo) جادو کا سہارا لیتا ہے۔ وہ کسی بھی ایک اصول کو اپنانے کا خطرہ نہیں لیتا۔

عام طور پر جادوگر منفی جادو سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ منفی جادو ہی عملی طور پر کام آتا ہے۔

دونوں میں فرق یہ ہے کہ مثبت فقروں والا جادوگر کہتا ہے۔ ”اس طرح کرو اور وہ اسی طرح ہو جاتا ہے۔“

اور منفی فقروں والا جادوگر کہتا ہے ”یہ کام مت کرو، ورنہ نقصان ہوگا۔“

بہت سے ممالک میں بدشگونیوں یا شگون کی بہت اہمیت ہے۔

دنیا کے تقریباً ہر خطے میں ان کے اپنے رسوم و رواج اور عقائد کے مطابق شگون یا بدشگونیاں مروج ہیں۔ خود ہمارے یہاں بھی ایسے عقائد کی کمی نہیں ہے۔

آئیں کچھ شگون یا بدشگونیوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ جزائر شرق الہند میں جب کوئی شخص کسی شکاری سے ملنے اس کے گھر جاتا ہے تو اسے دروازے میں بغیر رُکے سیدھے اندر جانا ہوتا ہے۔ ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اگر کوئی ملاقاتی دروازے میں رُک جائے یا گھوم کے پیچھے کی طرف دیکھے تو شکاری کو شکار نہیں ملتا۔

کالے پانی کے بھارتی جن کا پیشہ عقاب شکار کرنا ہے، جب شکار کے لیے جال لگا دیتے ہیں تو اس کے بعد کسی بھی صورت میں کچھ کھاتے پیتے نہیں ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ کھانے پینے سے عقاب کے پیٹ میں درد شروع ہو جاتا ہے اور وہ جال کی طرف نہیں آتا۔

ملاگاسی کے علاقے میں فوجی کسی بھی جانور کے گردے نہیں کھاتے کیونکہ ان کے ملک میں گردے اور گولی کھانے کے لیے ایک ہی لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور وہ لوگ گردے کھانے کے بعد یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے گولی کھائی ہے۔

ملاگاسی کے علاقے میں فوجی کسی بھی جانور کے گردے نہیں کھاتے کیونکہ ان کے ملک میں گردے اور گولی کھانے کے لیے ایک ہی لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور وہ لوگ گردے کھانے کے بعد یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے گولی کھائی ہے۔

ان کے دل میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ گردے کھانے کے بعد انہیں لازماً گولی لگے گی۔

لاؤس میں ہاتھی کے شکار سے قبل شکاری اپنی بیوی کو بال کاٹنے یا جسم پر تیل سے لگانے سے منع کر جاتا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اگر گھر میں عورت اپنے بال کاٹے گی تو ہاتھی جال توڑ کر نکل جائے گا اور اگر وہ اپنے جسم پر تیل لگائے گی تو ہاتھی ان کے ہاتھ سے پھسل جائے گا۔

یہ تو چند ٹونے تھے، اب مختلف قسم کے جادو کے مختلف طریقے ملاحظہ فرمائیں۔ یہ طریقے کم و بیش ہمارے یہاں بھی رائج ہیں۔

اگر کوئی نوجوان رات کے وقت قبرستان میں جا کر وہاں سے قبر کی مٹی لائے اور اس مٹی کو اپنی معشوقہ کے والدین کے سونے کی جگہ پر چھڑک دے تو اس رات اس لڑکی کے والدین مردے کی نیند سوئیں گے۔

گزرے وقتوں میں نقب زن اس قسم کی مٹی سے کام لے کر لوگوں کے گھروں میں سیندھ لگاتے تھے۔ کیونکہ گھر والے مردے کی نیند سو جاتے تھے اور یہ مال دولت لے کر چلے جتے تھے۔ ہندو اس مقصد کے لیے چتا کی راکھ استعمال کرتے ہیں۔ جبکہ یورپ میں چوراس مقصد کے لیے پھانسی کی سزا پانے والے انسان کا خشک ہاتھ استعمال کرتے ہیں۔

سرویا اور بلغاریہ میں جادوگر ایسی عورتوں کو جو اپنے خاوند کے ہوتے ہوئے اپنے گھر میں رنگ رلیاں منانا چاہتی ہیں، انہیں ایک خاص قسم کی شراب یا پانی دیتے ہیں۔

عمل یہ ہے کہ لاش کی آنکھوں سے تانبے کے سٹکے مس کر کے پانی یا شراب میں ڈبو دیتے ہیں اور وہی شراب یا پانی ایسی خواتین اپنے شوہروں کو پلا دیتی ہیں۔ اسے پینے کے بعد بے چارہ شوہر بالکل اندھوں جیسا ہو جاتا ہے۔ وہ سب کچھ دیکھتا ہے لیکن اسے احساس نہیں ہوتا کہ اس کی بیوی کیا کر رہی ہے۔

نہ جانے جادو کی تعلیم انسانوں کو کہاں سے دی گئی اور منت سے طریقے اتنے کیسے معلوم ہوئے۔ انسان جادو جگانے کے لیے جانوروں، پرندوں اور کیڑے مکوڑوں سے بھی کام لیتا آیا ہے۔

مغرور غلام یا لونڈی کو واپس بلانے کے لیے عربی لوگ زمین میں حصار کھینچ کر اس کے درمیان میں ایک کیل بگاڑ دیتے ہیں۔ پھر اس کیل کے ساتھ ایک دھاگے سے غلام

کی صورت نہ بھونرا اور لونڈی کی صورت میں مادہ بھونرا باندھ دیتے ہیں۔

جوں جوں بھونرا چلتا ہے، دھاگا کیل کے ساتھ مل کھاتا چلا جاتا ہے اور اس کی لمبائی کم ہوتی چلی جاتی ہے اور ایک وقت وہ آتا ہے کہ بھونرے کے لیے چلنا ناممکن ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی مغرور غلام یا لونڈی کی واپسی شروع ہو جاتی ہے۔

پرندوں کے حوالے سے ایک اور عقیدہ ہے۔ کوئے کے انڈے لگانے سے سفید بال سیاہ ہو جاتے ہیں۔ بالوں میں انڈے لگاتے وقت وہ آدمی اپنے منہ میں تیل بھر لیتا ہے ورنہ اس کے دانت بھی سیاہ ہو جائیں گے اور کبھی سفید نہیں ہوں گے۔

یہ عقیدے یا عملیات آخر کس قسم کے ہوتے ہیں؟ انسان نے ہزاروں لاکھوں اشیا کو دیوتا سمجھا۔ اس کی پوجا کی۔ اس کے ذریعے طاقت حاصل کی یا کسی کو نقصان پہنچایا۔

مٹی، جانور، پرندے، پانی، آگ، درخت، بادل، بجلی، کیڑے مکوڑے، ہڈیاں، سر کے بال، تھوک، کپڑے، ناخن، خدا جانے کتنی ایسی چیزیں ہیں جو اسی انداز سے انسانوں کے کام آتی رہی ہیں یا جادوگر حضرات واہموں کی دنیا تخلیق کر کے انسانوں کو ان سے خوف زدہ کرتے رہے ہیں۔

ان ہزاروں لاکھوں اشیا میں پتھر بھی اپنی جگہ بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

آج بھی ہم انسانوں کی قسمتوں پر پتھروں کے اثر انداز ہونے کی داستانیں پڑھتے ہیں۔ ہندو مذہب میں تو پتھروں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

برہمنوں میں رسم ہے کہ شادی کے موقع پر دلہن کو ایک پتھر کے اوپر سے گزرا جاتا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اس طرح شادی کا بندھن پتھر کی طرح مضبوط ہو جاتا ہے۔

قدیم زمانے میں لوگ قیمتی پتھروں کے سحری خواص کے قائل تھے کیونکہ وہ لوگ ان کو بطور تعویذ پہنا کرتے تھے جبکہ بطور زیور ان کا استعمال بہت بعد میں ہوا۔

درختوں جیسی دھاریوں والے پتھروں کو قدیم یونانیوں نے شجریش (Agate-Tree) کا نام دیا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اس قسم کے پتھر اگر مل چلا تے وقت نل کے دونوں سینگوں پر باندھ دیں تو فصل بھر پور ہوتی ہے۔

یہ لوگ متحمل مزاجی اور بردباری حاصل کرنے کے لیے سلیمانی عقیق پہنتے۔ دو بھائیوں میں اتفاق برقرار رکھنے کے لیے دونوں کے گلے میں طاقت ور مقناطیس باندھتے۔

ستارہ شناسی کی بھی بہت اہمیت ہے۔ قدیم ہندو کتب میں لکھا ہے ”شادی کے دن غروب آفتاب کے بعد دولہا کو اپنی دلہن کے ساتھ کھلی جگہ یا چھت پر بیٹھ کر قطبی ستارے کے طلوع ہونے کا انتظار کرنا چاہیے۔ اس کے طلوع ہونے پر اپنی بیوی کو قطبی ستارہ دکھائے اور ساتھ ہی یہ الفاظ دہرائے۔ ”تم ہمیشہ سے قائم ہو، اے قائم و دائم، ہماری جوڑی بھی قائم اور دائم رکھ۔“ اس کے بعد اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہو کر کہے ”برہمپتی نے تجھے میرے بچوں کو جنم دینے کے لیے عطا کیا ہے۔“

اس کے بعد بیوی کہے ”ہزاروں خزائیں آئیں اور آ کر گزر جائیں۔“

یہ سب کچھ ہمدردانہ جادو یا ہومیوپیتھک جادو کے زمرے میں آتا ہے۔

اب آئیں چھوت دار جادو کی طرف۔ چھوت دار جادو کے اصولوں کے مطابق جسم سے الگ ہونے والا کوئی حصہ یا جسم کو چھو جانے والی چیز کہیں بھی ہو، اس پر کیا جانے والا جادو اس کے استعمال کرنے والے پر اثر انداز ہوتا ہے۔

اس قسم کی کہانیاں پوری دنیا میں مشہور ہیں۔

انسانی جسم کے دانت، بال، ناخن، ناف، آنول، خون، پسینے، کپڑے غرضیکہ ہر شے سے جادو جگایا جاسکتا ہے اور صدیوں سے جادوگر اسی قسم کا عمل کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ہمارے یہاں بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ بال جھاڑتے وقت اگر لڑکی کے بہت سے بال کنگھی میں آجائیں تو ان بالوں کا گچھا بنا کر اس پر تھکارتے ہوئے پھینکا جاتا ہے۔

ورنہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان ٹوٹے ہوئے بالوں کے ذریعے لڑکی پر جادو کیا جاسکتا ہے۔

بہت سے گھروں میں اترے ہوئے پڑانے کپڑے بھی جلا دیے جاتے ہیں کیونکہ ان کے ذریعے بھی جادو کا تصور ممکن ہے۔ سامری جادوگر نے بھی یہی کیا تھا۔ اس نے اس مٹی سے کام لیا تھا جو مٹی حضرت جبریل علیہ السلام کی گھوڑی کے سموں کے نیچے کی تھی۔

سامری کی مختصر کہانی کچھ یوں ہے کہ قوم بنی اسرائیل

یا قبیلہ سامرہ میں سے ایک شخص تھا جس کا نام موسیٰ بن خضر تھا۔ یہ شخص صفت زرگری میں استاد کا درجہ رکھتا تھا اور بت گری میں اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

جس دن فرعون غرق ہوا ہے، حضرت جبریل علیہ السلام ایک گھوڑی پر سوار ہو کر سمندر کے کنارے پھر رہے تھے اور جس جگہ گھوڑی کا سم پڑا وہ جگہ سبز ہو جاتی۔ یہ شخص حضرت جبریل کو پہچانتا تھا۔ اس نے سموں کی مٹی لے کر اپنے پاس تبرگہ رکھ لی۔ اس کا یہ خیال تھا کہ یہ مٹی بعد میں اس کے کام آئے گی۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر تشریف لے گئے تو بنی اسرائیل نے حضرت ہارون علیہ السلام سے کہا ”ہم لوگ قبیلوں سے زیورات لائے تھے، اب ان کا کیا کریں؟“

حضرت ہارون علیہ السلام نے فرمایا کہ ان کو جلا کر خاک میں دفن کر دو۔ اس موقع پر سامری نے کہا ”اگر زیور مجھے ملے تو میں ایک علم عصائے موسیٰ سے اعلیٰ بنادوں۔“

بنی اسرائیل اس کی باتوں میں آ گئے۔ سامری نے زیور کا ایک بچھڑا بنایا اور وہ خاک اس کے پیٹ میں ڈال دی، اس میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ بولنے لگا۔ بعضوں کے نزدیک گوشت و پوست بھی پیدا ہو گیا۔ سامری اور اس کے حواری بولے کہ موسیٰ تلاش حق میں پھرتا ہے اور وہ یہاں موجود ہے۔ شاید وہ بھول گیا۔

چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے (س طہ، ع 4) ”یعنی یہ تمہارا اور موسیٰ کا معبود ہے، سو موسیٰ شاید بھول گیا ہے کہ دوسری جگہ تلاش کو گیا ہے۔“

سامری کے اس جادو سے متاثر ہو کر آٹھ یا بارہ ہزار بنی اسرائیل اس بچھڑے کی پوجا کرنے لگے۔ معاملہ التستریل میں رقم ہے کہ سامری حضرت جبریل علیہ السلام کو اس لیے پہچانتا تھا کہ جب سامری پیدا ہوا تو اس کی ماں نے فرعون کے خوف سے اسے دریائے نیل کے کنارے ایک گڑھے میں ڈال دیا تھا۔ تب حضرت جبریل علیہ السلام اس کی پرورش پر مقرر ہوئے۔ ہر روز اس کے پاس تشریف لاتے اور وہ دیکھتا تھا۔

بنی اسرائیل کے اس واقعے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے بدعادی کہ جب کوئی تجھے چھوئے گا تو تجھے اور چھوئے والے دونوں کو بخار ہو جایا کرے گا۔

کہتے ہیں کہ اب تک قبیلہ سامرہ میں یہ بات ہے کہ

جب کسی غیر کا بدن کسی سے لگ جاتا ہے تو ساری قوم بخار میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

گو یا جادو کا اثر ایسا ہوا کرتا ہے کہ پوری کی پوری قوم گمراہ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ جادوگر کمزور عقیدے والوں کے سامنے ناممکن کو ممکن کر کے دکھا دیتے ہیں۔ چاہے اس کا اثر وقتی ہی کیوں نہ ہو یعنی جادو ایک مصنوعی کاریگری ہے اور اس کے کاریگر یعنی جادوگر کی مددنی طاقتیں کیا کرتی ہیں اور اس کے عمل کو اثر بنا دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر یورپ کے کئی ملکوں میں اگر کسی کے نقش قدم پر چاقو یا کیل ٹھونک دی جائے تو وہ شخص لنگڑا ہو جاتا ہے۔

یہ عقیدہ زمانہ قدیم سے چلا آ رہا ہے۔ فیثاغورث کا قول ہے کہ ”دوسرے شخص کے قدموں کے نشانات میں چاقو یا کیل مت گاڑو۔“

اس قول سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہاں اس قسم کی حرکتیں ہوا کرتی تھیں۔ اس کا یہ بھی کہنا تھا کہ بستر سے اُٹھتے وقت اپنے جسم کے تمام نشانات مٹا دو۔

تاریخ شاہد ہے کہ جادوگری نے ہمیشہ ہی اپنے علم اور سحر پر غرور کیا۔ انہوں نے اولیا اور انبیاء کو للکارا۔ خدا کی خدائی میں دخل انداز ہونے کی کوشش ہی نہیں کی بلکہ دعوے کیے۔

بعض اوقات جادوگروں کو ڈھیل بھی دی گئی اور جب وہ انتہا کو پہنچ گئے تو ان کی رسیاں پھینچ لی گئیں۔

جادو اور مذہب میں یہی بنیادی فرق ہے کہ جادو تباہی اور بربادی کا علمبردار ہے اور مذہب امن اور سلامتی کا راستہ دکھاتا ہے۔

پرانے وقتوں میں (یا شاید آج بھی ہندوؤں کے یہاں یہ سب ہوتا ہو) کسی ایک برہمنی شاکر کو بارش برسانے کی طاقت حاصل کرنی پڑتی تھی اور خاص کلمات ادا کرنے ہوتے تھے۔

یہ کلمات ایک قدیم ہندی کتاب ساما وید میں درج تھے، اس گیت کا نام ”سکوا ری“ ہے۔ اس عمل کے نڈر طالب علم اپنے ساتھیوں سے الگ ہو کر جنگلوں کی طرف نکل جاتے تھے۔ اس بن باس کا عرصہ ایک سے بارہ برس تک ہے۔ اس دوران ان لوگوں کو مختلف شرائط کی پابندی کرنی ہوتی ہے مثلاً

1۔ کالے کپڑے پہننا اور کالی اشیاء کھانا۔

2۔ دن میں تین دفعہ پانی کو چھوننا۔

3۔ بارش کے وقت سائبان یا چھت کے نیچے سے نکل کر بارش میں بیٹھ جانا اور سکوا ری پڑھنا۔ سکوا ری پانی کا نغمہ ہے۔

جب بجلی کا کونڈا لپکے اس وقت کہنا (یہ سکوا ری نغمہ کی مانند ہے)

بادل گر جنے پر کہنا ”عظیم دیوتا اس آواز کو پیدا کر رہا ہے۔“

4۔ ندی کے ساحل کو بغیر چھوئے ندی پار نہ کرنا۔

5۔ جب تک اس کی زندگی کو خطرہ نہ ہو سمندری سفر نہیں کر سکتا اور بحری جہاز پر سوار ہوتے وقت وہ پانی کو ضرور چھوئے گا۔

6۔ پانی کو دیکھ کر وہ یہ الفاظ دہرائے گا ”سکوا ری کے نغمے کا حسن میرے سامنے ہے۔“

7۔ بن باس مکمل ہونے پر جب اسے اپنے طور پر سکوا ری کا نغمہ الاپنے کی اجازت ملتی ہے تو اس وقت ایک برتن میں مختلف اقسام کے پودے ڈال کر اسے اپنے دونوں ہاتھ اس میں ڈبوئے کو کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس شخص کو پر جانا کا خطاب مل جاتا ہے۔ اور اس کے قبضے میں بارش برسانے کی قوت آ جاتی ہے۔

یہ تو ایک آدمی کی طاقت ہوئی جو بارش برسا سکتا ہے۔

اس کے علاوہ بہت سے علاقے ایسے بھی ہیں جہاں بارش کے لیے مختلف جادو کی ٹونکے کیے جاتے ہیں۔

مثال کے طور پر روس میں ڈارپٹ (Dorpat) کے علاقے میں جب بارش کی ضرورت ہو تو خشک سالی ختم کرنے کے لیے گاؤں کے تین افراد متبرک جھنڈ میں جا کر صنوبر کے درخت پر چڑھ کر کیتلی بجا کر بادلوں کی گرج، دوسرا ماچس جلا کر بجلی کی چمک اور تیسرا کسی برتن سے چاروں طرف پانی چھڑکتا جاتا ہے۔

یہ لیں بارش کے تینوں لوازمات ہو گئے۔ گرج، چمک اور بارش۔ ممکن ہے کہ اس طرح بارش بھی ہو جاتی ہو۔

وسطی آسٹریلیا کے ڈیری فیلڈ میں بارش برسانے کے لیے ایک عجیب و غریب جادوئی عمل کیا جاتا ہے جو کہ تکلیف دہ بھی ہے۔

یہ لوگ بلند آواز میں اپنی خشک سالی اور قحط کا رونا روتے ہوئے اپنے آباد اجداد کی ارواح مورا موزا کو پکارتے ہیں۔

مورا موزا کی مدد سے بارش حاصل کرنے کے لیے وہ

تلاش

طارق عزیز

وہ سب نئی دنیا کی تلاش میں نکلے تھے۔ سمندر کے بے کراں سینے پر بہتے بہتے کہاں سے کہاں نکل گئے تھے اور دشمن بھی تاک میں تھا۔ گرم مسالوں کی تلاش میں بھٹک رہے مہم جو کی کتھا۔

اس دور کی روداد جب دنیا کی وسعت کا صحیح اندازہ نہ تھا



آج جس طرح مغرب سے مشرق آنا جانا معمولی سی بات لگتی ہے، یہی سفر کبھی کتنا دشوار اور پیچیدہ تھا اس کا اندازہ لگانے کے لیے میگلن کی اس مہم پر غور کریں۔ مہم کے شروع میں وہ سب پُر امید تھے۔ یہی سمجھ رہے تھے کہ ہم بہ آسانی اس بحری مہم کو سر کر کے ایک نئی تاریخ کا آغاز کر دیں گے لیکن ایک کے بعد ایک ناکامی نے ان کے حوصلے توڑ دیے تھے۔ خاص کر اس دن یعنی 2 مئی 1521ء کی صبح جب موسم ابر آلود اور جس زدہ تھا۔ ہسپانوی مہم جوؤں کے تینوں بحری جہاز آبنائے سیبو میں جنوب کی طرف بڑھ رہے تھے۔ بحری جہازوں پر کل 122 افراد (117 یورپین ملاح، ایک کاروال ہوکا برازیلیئن بیٹا اور اندازاً چار مقامی راہنما) سوار تھے۔ جہازوں کے عملے نے جو آؤ لوپس کاروال ہوکو کیپٹن جنرل تسلیم کر لیا تھا۔ وہ میگلن، سیرانو اور ڈورنٹے باربوسا کے بعد مہم کا چوتھا قائد تھا۔ میگلن کی ناگہانی موت سے جو خلا پیدا ہو گیا تھا وہ اسے پُر کر سکتا تھا۔ کاروال ہونے سیبو سے نکلنے وقت اسپینی اوسا کو کٹوریا اور مارٹن مینڈز کو کون شپ سیون، کا کپتان مقرر کر دیا تھا۔ بحری جہازوں پر ماحول افسردہ تھا۔

ایک بات اور دیکھنے میں آئی ہے کہ جادو کے عمل میں چاہے دنیا کے کسی بھی حصے میں ہو رہا ہو، اگر جانوروں کی قربانی دینی ہو تو کالے رنگ کے جانوروں کی قربانی دی جاتی ہے۔

کالا بکرا، کالی مرغی، کالا سور، کالی بلی وغیرہ، ایسا لگتا ہے جیسے کالے رنگ اور شیطانی طاقتوں کے درمیان کوئی گہرا تعلق ہے۔ مثلاً ہمارے یہاں بھی بابا جی حضرات جب صدقے کا مشورہ دیتے ہیں تو کالے رنگ کے جانور کی بات کرتے ہیں۔ اس کے برعکس سفید رنگ پاکیزگی اور تقدس کی علامت ہوا کرتا ہے۔

جادو گروں نے ایک ماورائی دنیا تخلیق کر رکھی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ان کا اختیار کائنات کی ہر چیز پر ہے۔ بادل، بجلی، پتھر، بارش، دریا وغیرہ ان کے کنٹرول میں ہیں یا وہ اپنے جادو کے ذریعے ان کو اپنی مرضی کا پابند کر سکتے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ گرم اور سرد ہوا کی، سورج اور چاند بھی ان کی مرضی کے مطابق کام کرتے ہیں۔

جادو گروں کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ وہ ہوا کو روک سکتے اور چلا سکتے ہیں۔

ہائین ٹائی قبیلے کا کوئی باشندہ اگر چلتی ہوئی ہوا کو روکنا چاہے تو کسی موٹی کھال کو درخت کے ساتھ باندھ کر لٹکا دیتا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اس طرح ہوا کی قوت اور شدت ختم ہو جاتی ہے۔

یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ طوفانی ہوا کی جہتات ہوتے ہیں جو لوگوں کو آڑا کر لے جاتے یا ہلاک کر دیتے ہیں۔

یہ ایک بہت بڑا موضوع ہے۔

اس مختصر سے مضمون میں ہم پوری دنیا کے رسوم و رواج اور جادو کے طریقوں کا جائزہ نہیں لے سکتے۔ لیکن کسی حد تک آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ انسان کتنا وہمی اور کتنا کمزور ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی احساس ہو گیا ہوگا کہ خدا نے ہم کو مسلمان گھرانوں میں پیدا کر کے ہم پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہمارے یہاں مذہب کا تصور بہت باوقار ہے۔ ہماری ہر عبادت ہمیں انسان اور وہ بھی مہذب انسان بنانا سکھاتی ہے۔

ہم پتھروں، درختوں اور جانوروں سے نہیں مانگتے بلکہ رب کائنات سے مانگتے ہیں اور احترام کے ساتھ۔

کھلی جگہ پر 12 فٹ لمبا 8 فٹ چوڑا گڑھا کھود کر اس کے اوپر شہتیر اور ٹہنیوں کی چھت ڈال کر اس کے اوپر مخروطی شکل کی جھونپڑی بنا دیتے ہیں۔

دو جادوگر جن کو موراموزا کی ارواح کو طلب کرنے کا جادو آتا ہے۔ دونوں جادوگر دونوں بازوؤں کی کہنی کے نچلے حصوں پر پائیس کی کچھپیوں کو مار مار کر اپنا خون نکالتے ہیں، اس دوران قبیلے کے افراد جھونپڑی میں سمٹ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اس کے بعد دونوں جادوگروں میں سے ایک اپنا خون پیٹھے ہوئے افراد پر پھینکتا ہے۔ کچھ خون لوگوں کے اوپر گرتا ہے اور باقی ادھر ادھر بکھر جاتا ہے۔

یہ خون بارش کی علامت سمجھا جاتا ہے اور لوگوں کو لگنے والا خون بادلوں کی علامت ہوتا ہے۔ اس سارے عمل کے دوران دو بڑے پتھر جھونپڑی کے درمیان بادلوں کی علامت اور بارش کے شگون کے طور پر رکھے جاتے ہیں۔

اس کے بعد دونوں جادوگر ان پتھروں کی میل دور لے جا کر کسی اونچے درخت پر رکھ دیتے ہیں۔ اس دوران قبیلے کے لوگ جیسے گو باریک پیس کر پانی کے جھرنوں میں بھر دیتے ہیں اور ان کی عقیدے کے مطابق جب موراموزا اسے دیکھتے ہیں تو فوراً بادلوں کو بھیج کر بارش برسا دیتے ہیں۔

سب سے آخر میں قبیلے کے تمام چھوٹے بڑے مرد زانو کے بل جھک کر جھونپڑی کو اپنے سر سے ٹھوکر مارتے ہوئے دوسری طرف نکل جاتے ہیں۔

یہ عمل اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک جھونپڑی بالکل نہیں گر جاتی۔ اس سارے کام میں ہاتھوں کا استعمال سخت ممنوع ہے۔

نیو کیلی ڈونیا میں بارش برسانے والا جادوگر کالے کپڑے پہن کر قبرستان میں جا کر پُرانی قبر کھود کر مردے کی ہڈیاں نکال کر کسی غار میں چلا جاتا ہے۔

غار میں پہنچ کر جادوگر مردے کی ہڈیوں کو جوڑ کر ڈھانچا تیار کر کے لٹکا دیتا ہے اور ڈھانچے کے قدموں میں Taro نامی سبزی کے پتے بچھا دیتا ہے۔ بعد ازاں جادوگر ڈھانچے کی کھوپڑی پر پانی بہاتا ہے۔ یہ پانی بہتا ہوا تارو کے پتوں پر گرتا ہے اس کے بعد بارش کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔

جس طرح بارش برسانے کے لیے مختلف قسم کے جادو اور ٹونگوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ اسی طرح بارش روکنے کے لیے بھی جادو کا سہارا لیتے ہیں۔

ملاح چپ چاپ معمول کے کاموں میں مصروف تھے۔ میگلن کی ناگہانی موت کا زخم ابھی تازہ تھا کہ سیرانوسیت دو درجن سے زیادہ جہازرانوں کی ہلاکت کے واقعہ نے ان کے اعصاب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ملاحوں میں مایوسی پھیلی ہوئی تھی۔ پچھلے چار دن میں ہوئے پے درپے واقعات کے بعد اب گرم مصالحوں کے جزائر تک رسائی تو درکنار، سلامتی کے ساتھ وطن واپسی کا خواب بھی چمکنا چور ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔

کاروال ہو اور اس کے عملے کو اس وقت بہت سی مشکلات کا سامنا تھا۔ ان کے پاس خوراک اور افرادی قوت کی کمی تھی۔ وہ اپنے بہترین جہازرانوں کے ساتھ ساتھ اکلوتے ماہر فلکیات کو بھی کھو چکے تھے۔ وہ فلپائن جزائر کی بھول بھلیوں میں پھنسے ہوئے تھے اور ملوکا کے جزائر تک رسائی کے راستے کو لے کر ابھمن کا شکار تھے۔ وہ جانتے تھے کہ بنا سوچے سمجھے جنوب میں بڑھتے رہنے سے ان کا پرنگالی بحریہ سے سامنا ہونے کا خطرہ بڑھتا جا رہا تھا۔ کاروال ہو کے پاس ہسپانوی حکومت کے مہیا کردہ دنیا کے نقشے کے علاوہ میگلن کے ملوکا میں موجود پرنگالی مہم جو دوست فرانسسکو سیراؤ کا بنایا ہوا ایک نقشہ بھی موجود تھا۔ تاہم کرۂ ارض کے مغربی نصف کرے کے بڑے حصے کی دریافت کے بعد اب یہ نقشے بے اثر ہو چکے تھے۔ ادھر سیبو میں کوئی بھی غیر ملکی تاجر ان کی راہنمائی پر تیار نہیں تھا اور سونے پر سہاگہا یہ کہ وہ انزلیق سے بھی ہاتھ دھو چکے تھے۔ لے دے کے کاروال ہو کے ساتھ چند مقامی مترجم تھے، جن سے اسے کچھ زیادہ کی امید نہیں تھی۔ کاروال ہو کی پہلی ترجیح آبنائے سیبو سے نکل کر جنوب کے کھلے سمندر تک رسائی تھی۔ اس نے ”ٹرنینی ڈاؤ“ پر طلب کیے گئے ایک اجلاس میں اپنے ساتھیوں کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا کہ کسی کو بھی مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ بہت جلد ان خونی جزائر کی بھول بھلیوں سے باہر نکل جائیں گے اور خوراک جمع کرنے کے ساتھ ساتھ ایسے مقامی تاجروں کو تلاش کریں گے جو ان کی گرم مصالحوں کے جزائر تک رسائی میں مدد کریں۔ اجلاس کے دوران کچھ فرانسیسی اور جرمن ملاحوں نے ملوکا میں پرنگالیوں کی موجودگی کو بنیاد بناتے ہوئے کاروال ہو کو یہیں سے یورپ واپسی کا مشورہ دیا۔

”دو وجوہات کی بنا پر ایسا ممکن نہیں ہے۔ ایک تو ہمیں بحر الکاہل میں واپسی کے طویل سفر کے لیے کم از کم تین ماہ کی خوراک جمع کرنی ہوگی۔ دوسرا، منزل کے قریب

آجانے کے بعد خالی ہاتھ واپس جانے سے ہسپانوی ناراض ہو سکتا ہے۔“ کاروال ہونے جواب دیں۔ ”پرنگالیوں کی فکر ہم سب کو ہے۔ اس لیے ہم پوری چھان بین کے بعد ہی ملوکا کی طرف بڑھیں گے۔“

ٹرنینی ڈاؤ پر یہ اجلاس جاری تھا کہ موسم کے تیز ہونے کی وجہ سے شدید جس کے بعد مشرق میں بحر الکاہل کی طرف سے کالی گھٹائیں گھر آئیں۔ تیز ہوا کے ساتھ بارش شروع ہو گئی تھی۔ اسی دوران تیز گرج چمک کے ساتھ بجلی کی آڑی ترچھی لکیروں نے ٹرنینی ڈاؤ پر نصب بانسوں کو ملاحوں نے لگ بھگ ڈیڑھ سال کے بعد مقدس بازی کا نظارہ دیکھا تو ان کے مایوس اور افسردہ چہرے امید کی کرنیں پھوٹی دکھائی دیں۔

☆☆☆

چار مئی 1521ء کی صبح ہسپانوی قافلے نے آبنائے سیبو کو پار کر کے بحیرہ بوہول تک رسائی حاصل کی۔ جزیرہ پر مزید چند گھنٹوں کے سفر کے بعد انہوں نے جنوب میں ایک بڑے جزیرے کا نظارہ کیا۔ یہ منڈاناؤ کا جزیرہ تھا۔ قسمت انہیں ایک بار پھر وہیں لے آئی تھی جہاں انہوں نے لیما ساوا اور پھر سیبو جانے کی منصوبہ بندی کی تھی ماضی کی نسبت اس بار انہوں نے اپنے سابقہ پڑاؤ سے 400 کلومیٹر مغرب میں واقع ایک آباو بندرگاہ کے قریب لنگر گرائے۔ جزیرے پر آمد کے دوسرے یا تیسرے دن یہاں کے ایک مقامی حکمران راجا کالانوا (Calanua) کاروال ہو اور اس کے ساتھیوں سے ملاقات کی۔ کالانوا ہسپانوی مہم جوؤں کے ساتھ روہیہ دوستانہ تھا۔ پیکانی نامہ راجا کے اصرار پر چند روز اس کے محل میں گزارے۔ محل میں قیام کے دوران پیکانی نامے میگلن کی ہلاکت اور سیبو میں پیش آنے والے خونی واقعات کو گول کرتے ہوئے راجا انہیں سے لے کر فلپائن تک کے سفر کی روداد بتائی۔

جزیرے پر دو ہفتے کے قیام کے دوران کاروال ہو اس نتیجے پر پہنچا کہ مغرب میں ایک ہفتے کی مسافت پر واقع پالاوان (Palawan Island) ایک ایسا جزیرہ تھا جہاں سے اسے ملوکا تک رسائی کے لیے اپنے مطلب کے راہنما مل سکتے تھے۔ منڈاناؤ چھوڑنے سے دو دن پہلے مارٹن مینڈز اور چند دیگر جہازرانوں نے کاروال ہو کی اس جانب مہذول کرائی کہ تین بحری جہازوں کو دو دن دو دن رکھنے کے لیے ان کے پاس افرادی قوت کی کمی صورت حال یہ تھی عام سپاہی اور معمول کے کام کا تجربہ

والے بھی اپنی مہارت کے برخلاف ذمہ داریاں سرانجام دے رہے تھے۔ یوں کسی آڑے وقت میں تین حصوں میں تقاطعات سے فائدہ اٹھانا مشکل تھا۔ مارٹن مینڈز نے تجویز پیش کی کہ انہیں آگے بڑھنے سے پہلے تین میں سے ایک بحری جہاز سے نجات حاصل کر لینی چاہیے۔ کاروال ہونے تین بحری جہازوں کا معائنہ کرنے کے بعد کون شپ سیون سے تمام اہم سامان کو ٹرنینی ڈاؤ اور وکٹوریہ پر منتقل کرنے کا حکم دیا۔

21 مئی 1521ء کی صبح تک تمام کارروائی مکمل کر لی گئی جس کے بعد کاروال ہو کے حکم پر کون شپ سیون کو آگ لگا دی گئی۔ بندرگاہ میں ڈولتا جہاز دھڑا دھڑا جلنے لگا۔ مقامی لوگ بادبانی بحری جہاز سے بلند ہوتی آگ کی لپٹوں کو جراتی سے دیکھ رہے تھے۔ ہسپانوی ملاحوں کی اس جہاز سے بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ وہ اسے جلتا دیکھ کر افسردہ تھے تاہم ان کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ شام تک پورا جہاز جل کر راکھ ہو گیا تھا۔ اب پانی پڑو لے لکڑیوں کے انبار سے کالے سیاہ دھوئیں کی لکیریں اوپر اٹھ رہی تھیں۔ لگتا تھا جیسے آگ کے شعلوں نے بھی کون شپ سیون کے اس طرح انجام پر سیاہ ماتی لباس پہن لیا ہو۔

کاروال ہونے کون شپ سیون کے لیے پر آخری نظر ڈالی اور منڈاناؤ سے لنگر اٹھانے کا حکم دیا۔ کچھ ہی دیر میں دونوں بحری جہاز بحیرہ سولو کے کھلے سمندر میں مغرب کی طرف گامزن تھے۔ شمالاً جنوباً 600 کلومیٹر اور شرقاً غرباً 500 کلومیٹر چھوڑے بحیرہ سولو کے تین اطراف میں فلپائن کے جزائر جبکہ جنوب میں انڈونیشیا کا جزیرہ بورنیو واقع ہے۔ اگلے تین دن تک متواتر آگے بڑھنے کے بعد ہسپانوی ملاح نے بحیرہ سولو کے وسط میں خط استواء سے 9 ڈگری شمال اور 21 ڈگری مشرق کے خط پر واقع کاگیان (Cagayan) کے جزائر کا نظارہ کیا۔ انہوں نے کاگیان میں دو سے تین دن کا مختصر قیام کیا پھر سفر دوبارہ شروع ہوا۔ ان دنوں ان کا کھلے سمندر میں بحری قزاقوں سے سامنا ہو گیا۔ کاروال ہونے قزاقوں کی ایک درجن سے زیادہ کشتیوں کو چار حانہ انداز میں اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر اپنی اسی کو گولہ باری کا حکم دیا۔ قزاقوں کی ایک کشتی گولہ باری کی زد میں آ کر غرق ہو گئی جس کے بعد باقی کی کشتیاں جنوب کی طرف فرار ہو گئیں۔ جون کے آغاز پر ملاحوں نے

آسکر ایوارڈ

یہ ایوارڈ ہر سال امریکی اکیڈمی آف موشن پکچر، آرٹس اینڈ سائنسز کی جانب سے گزشتہ برس میں بننے والی فلموں میں غیر معمولی کارکردگی، تخلیقی اور تکنیکی شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دینے والے فلم ڈائریکٹر، ایکٹر، ایکٹریس، معاون اداکار، اداکارہ، گلوکار، سنیما فوٹو گرافر اور فلم کو دیا جاتا ہے۔ اس سلسلے کا پہلا انعام 1928ء میں بہترین فلم ونگز (Wings) کو دیا گیا۔ بہترین ہدایت کار فریتک بورزیگ، بہترین اداکار ایمیل، جینٹلو، بہترین اداکارہ جیٹ گیز اور بہترین سنیما فوٹو گرافر چارلس راشر اور کارل سٹرس کو دیا گیا۔ 1956ء سے غیر ملکی بہترین فلم کو بھی یہ ایوارڈ دیا جا رہا ہے۔ کسی بھی فلم میں سب سے زیادہ پوشاک زیب تن کرنے کا ریکارڈ ایلزبتھ ٹیلر کے پاس ہے۔ انہوں نے 1963ء میں فلم قلو پٹھرہ میں 130000 امریکی ڈالر کے 65 ملبوسات پہنے۔ والٹ ڈزنی (1901-1966ء) نے سب سے زیادہ آسکر ایوارڈ حاصل کیے ان کی تعداد بیس ہے۔ مرکزی کردار کے لیے سب سے زیادہ آسکرز کیتھرائن ہیمرن..... (1970) نے چار مرتبہ حاصل کیے۔ 1996ء میں سب سے زیادہ آسکر ایوارڈ دیے گئے، اس ضمن میں بریوہارٹ نے (بہترین فلم) میل گیس (بہترین ہدایت کار) جان ٹول (بہترین سنیما فوٹو گرافر) لون ہینڈز اور پربالبرگ (بہترین ساؤنڈ انجینئر) ایڈیٹنگ) پیٹر ٹارمنٹن، پال ٹینسن اور لوئیس برؤل نے (بہترین میک اپ) کے شعبوں میں یہ ایوارڈ حاصل کیے۔ شرمین عبید چنائے پہلی پاکستانی ہیں جنہوں نے یہ ایوارڈ حاصل کیا۔

مرسلہ: منورہ زاہد، کراچی

بحیرہ سولو کو پار کر کے پالاوان کے جزیرے کا نظارہ کیا۔ ہسپانوی جہازراں جو آؤ لوپس کاروال ہونے بطور پہلے یورپین کے پالاوان کے جزیرے میں قدم رکھا۔ اس کے بحری جہازوں نے جزیرے کے وسطی حصے میں ٹھیک اس جگہ پر لنگر گرائے جہاں آج پالاوان کا دارحکومت پورٹو پرس

(Puerto Princes) واقع ہے۔ اس زمانے میں پورٹو پرنس اس علاقے کی ایک مصروف بندرگاہ تھی۔ یہ مالے کے جزائر، چین اور فلپائن کے درمیان چل رہے تجارتی بحری جہازوں کا ایک اہم پڑاؤ تھی۔ کاروال ہونے بندرگاہ میں مقامی ماہی گیروں کی کشتیوں کے ساتھ ساتھ عربوں کے بادبانی اور چینوں کے درجنوں جنگی (Junk) بحری جہازوں کو بھی لنگر انداز دیکھا۔

☆☆☆☆☆

پالاوان کا جزیرہ، فلپائن کے دیگر جزائر کی نسبت مملکت کے جنوب مغرب میں کسی قدر فاصلے پر واقع ایک استوائی جزیرہ ہے۔ جزیرے کی لمبائی 450 کلومیٹر، وسط چوڑائی 35 کلومیٹر جبکہ کل زمینی رقبہ 11 ہزار 8 سو مربع کلومیٹر اور موجودہ آبادی 15 لاکھ (2010) کے قریب ہے۔ پالاوان کے مشرق میں بحیرہ سولو، مغرب میں بحیرہ جنوبی چین، شمال میں فلپائن کا سب سے بڑا جزیرہ لوزون اور جنوب میں انڈونیشیا کا جزیرہ بورنیو واقع ہے۔ پالاوان کے چاروں اطراف کا ساحل کٹا پھٹا اور پوری ساحلی پٹی اونچے نیچے سرسبز ٹیلوں پر مشتمل ہے۔ جزیرے کے درمیانی حصے میں لمبائی کے رخ پر پھیلا اوسطاً پانچ ہزار فٹ بلند پہاڑی سلسلہ واقع ہے۔ اس سلسلے کا سب سے اونچا پہاڑ Mantalingajan ہے جس کی بلندی 6843 فٹ ہے۔ فلپائن کے دیگر جزائر کی نسبت پالاوان میں بارشیں معمول سے زیادہ ہوتی ہیں۔ جس کی وجہ سے جزیرے کے طول و عرض میں برساتی ندی نالوں اور پہاڑی چشموں کی کثرت ہے۔ یہاں ہر طرف پھیلی ہریالی، خوبصورت مناظر اور خوشگوار موسم کی وجہ سے پالاوان کو استوائی جنت کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ یورپین کی آمد کے وقت جزیرے کی آبادی کا اندازہ ایک لاکھ کے قریب تھا۔ اس زمانے میں یہاں فلپائی، انڈو چائنا اور مالین نسل سے ملتے جلتے قبائل آباد تھے۔ فلپائی جزائر سے دور ہونے کی وجہ سے مقامی معاشرے پر چینی اور مالین تہذیب کے اثرات نمایاں تھے۔ یہاں کا سب سے بڑا مذہب بدھ مت تھا۔ مقامی آبادی کا سب سے بڑا ذریعہ معاش زراعت اور ماہی گیری تھا۔ تاہم جنوبی چین اور بورنیو کی بندرگاہوں کے درمیان اہم پڑاؤ ہونے کی وجہ سے مقامی لوگ بین الاقوامی تجارت کے معاملات کا مکمل ادراک رکھتے تھے۔

☆☆☆

پورٹو پرنس کی بندرگاہ سے متصل آبادی کے تازیل کے درختوں سے گھرے ایک کچے راستے پر اکلوتا لیکن مصروف بازار واقع تھا۔ سیوکی نسبت یہاں بازار میں چینیوں اور عربوں کے ساتھ ساتھ ہندوستانی تاجروں کی اچھی خاصی تعداد مختلف سرگرمیوں کے لیے مصروف دکھائی دے رہی تھی۔ بیشتر تاجروں کی توجہ وہ دکانیں تھیں جہاں چین سے لایا گیا ریشم، بورنیو کی پالاوان میں پیدا ہونے والا چاول اور جہاز رانی کے سامان فروخت ہو رہا تھا۔ مقامی دکانداروں کے لیے یہ ملاحوں سے لین دین کوئی انوکھی بات نہیں تھی، تاہم وہ چڑی والے یورپین کو پہلی بار اپنے درمیان دیکھ کر کاروال ہو کر رہے تھے۔ یہاں موجود بعض عرب تاجروں نے انہیں مشورہ دیا کہ جنوبی جزائر (انڈونیشیا) جانے سے پہلے یہاں فروغ ہو رہے چاول کی خریداری ضرور کریں جو انتہائی سستا خوش ذائقہ ہے۔ پالاوانی لوگوں کا سب سے دل پسند مرغ بازی تھا۔ شوقین لوگ لڑائی کے لیے تیار مرغوں کی خریداری کے دوران ان کی تیز دھار نوکلی چونچ، بڑے ہوئے پنجے اور سونے کی طرح نوکیلے ناخنوں کی تراش کو جانچ رہے تھے۔ یورپین نے وہاں اکثر کھلی جگہوں مرغوں کی لڑائی کے مقابلے ہوتے دیکھے۔ وہ یہ دیکھ کر حیرت مندی ہوئے کہ مقامیوں کے ساتھ ساتھ وہاں موجود عرب ہندوستانی تاجر بھی اپنی پسند کے مرغوں پر بڑھ چڑھ کر شرطیں لگا رہے تھے۔ جہاز رانی کا سامان فروخت کرنے والے دکانوں کے قریب غلاموں کا بازار بھی لگا ہوا تھا۔ مختلف عمروں کے مضبوط جسموں والے مالین غلام، غیر ملکی جہازرانوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے آوازیں لگا رہے تھے۔ ان غلاموں کو انتہائی قلیل معاوضے پر طویل مدت اور بعض شرائط کے ساتھ پوری زندگی کے لیے خریداجا سکتا تھا۔ کاروال ہو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا جب بعض غلاموں نے اسے عربی کے ساتھ ساتھ پرتگیزی میں مخاطب کرتے ہوئے اپنی خدمات پیش کیں۔

کاروال ہونے پالاوان میں تین مہینے کا قیام کیا۔ دوران اس نے یہاں سے کئی من خشک چاول کے ساتھ ساتھ چند مقامی غلاموں کی خریداری بھی کی۔ اس نے یہاں موجود غیر ملکیوں سے جنوبی جزائر کے بارے میں معلومات اکٹھی کیں لوگوں نے بتایا کہ ملو کا کے جزائر اور جزائر کی بندرگاہ سے متعلق آبادی کے تازیل کے درختوں سے گھرے ایک کچے راستے پر اکلوتا لیکن مصروف بازار واقع تھا۔ سیوکی نسبت یہاں بازار میں چینیوں اور عربوں کے ساتھ ساتھ ہندوستانی تاجروں کی اچھی خاصی تعداد مختلف سرگرمیوں کے لیے مصروف دکھائی دے رہی تھی۔ بیشتر تاجروں کی توجہ وہ دکانیں تھیں جہاں چین سے لایا گیا ریشم، بورنیو کی پالاوان میں پیدا ہونے والا چاول اور جہاز رانی کے سامان فروخت ہو رہا تھا۔ مقامی دکانداروں کے لیے یہ ملاحوں سے لین دین کوئی انوکھی بات نہیں تھی، تاہم وہ چڑی والے یورپین کو پہلی بار اپنے درمیان دیکھ کر کاروال ہو کر رہے تھے۔ یہاں موجود بعض عرب تاجروں نے انہیں مشورہ دیا کہ جنوبی جزائر (انڈونیشیا) جانے سے پہلے یہاں فروغ ہو رہے چاول کی خریداری ضرور کریں جو انتہائی سستا خوش ذائقہ ہے۔ پالاوانی لوگوں کا سب سے دل پسند مرغ بازی تھا۔ شوقین لوگ لڑائی کے لیے تیار مرغوں کی خریداری کے دوران ان کی تیز دھار نوکلی چونچ، بڑے ہوئے پنجے اور سونے کی طرح نوکیلے ناخنوں کی تراش کو جانچ رہے تھے۔ یورپین نے وہاں اکثر کھلی جگہوں مرغوں کی لڑائی کے مقابلے ہوتے دیکھے۔ وہ یہ دیکھ کر حیرت مندی ہوئے کہ مقامیوں کے ساتھ ساتھ وہاں موجود عرب ہندوستانی تاجر بھی اپنی پسند کے مرغوں پر بڑھ چڑھ کر شرطیں لگا رہے تھے۔ جہاز رانی کا سامان فروخت کرنے والے دکانوں کے قریب غلاموں کا بازار بھی لگا ہوا تھا۔ مختلف عمروں کے مضبوط جسموں والے مالین غلام، غیر ملکی جہازرانوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے آوازیں لگا رہے تھے۔ ان غلاموں کو انتہائی قلیل معاوضے پر طویل مدت اور بعض شرائط کے ساتھ پوری زندگی کے لیے خریداجا سکتا تھا۔ کاروال ہو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا جب بعض غلاموں نے اسے عربی کے ساتھ ساتھ پرتگیزی میں مخاطب کرتے ہوئے اپنی خدمات پیش کیں۔

☆☆☆

21 جون 1521ء کے دن کاروال ہو کر دو دنوں بحری جہازوں نے پالاوان سے لنگر اٹھائے اور بحیرہ سولو میں جنوب کی طرف بڑھنے لگے۔ آنے والے تین دن تک انہیں اپنے مغرب میں لمبائی کے رخ پر پھیلا پالاوان کا جزیرہ دکھائی دیتا رہا۔ اس دوران موسم ابر آلود رہا اور ہوا موافق نہ ہونے کی وجہ سے ان کے بحری جہاز قریب 5 کلومیٹر گھٹنا (تقریباً 2.6 ناٹ) کی سمت رفتار سے آگے بڑھ رہے۔ 25 جون کے دن کاروال ہونے عربوں کے مشغول ہونے پر جہازوں کا رخ جنوب کی بجائے جنوب مغرب کی طرف کر دیا۔ وہ درجنوں چھوٹے بڑے سرسبز جزائر کی تلاش میں داخل ہوئے۔ اگلے چند گھنٹوں کے دوران انہوں نے پکاس کلومیٹر لمبی اور اتنی ہی چوڑی آبناے کو پار کر لیا۔ اب وہ بحیرہ جنوبی چین (South China Sea) کی طرف تھے۔ جہاں انہیں جنوب میں واقع ایک بہت بڑے جزیرے کے خدوخال صاف دکھائی دے رہے تھے۔ اس جزیرے کے دوران انہیں دکھائی دیا یہ سب سے بڑا جزیرہ تھا۔

یہاں انڈونیشیا کا جزیرہ بورنیو تھا۔

عین خط استواء پر واقع بورنیو کا جزیرہ، نیوگنی کے بعد مالے کے جزائر کا دوسرا بڑا جبکہ گرین لینڈ اور نیوگنی کے بعد دنیا کا تیسرا سب سے بڑا جزیرہ ہے۔ بورنیو کا کل زمینی رقبہ 7 لاکھ 51 ہزار 1 سو مربع کلومیٹر ہے۔ اس رقبے کا 73 فیصد جنوبی حصہ انڈونیشیا، 16.2 فیصد شمال مشرقی حصہ ملائیشیا اور 0.8 فیصد شمالی حصہ بروٹائی کی ریاست پر مشتمل ہے۔ آج (2010) میں جزیرے کی کل آبادی ڈیڑھ کروڑ جبکہ یورپین کی آمد کے وقت آبادی کا اندازہ بیس لاکھ کے قریب تھا۔ بورنیو کے شمال میں بحیرہ سولو، جنوب میں بحیرہ جاوا، مشرق میں آبنائے ماکاسار اور مغرب میں بحیرہ جنوبی چین واقع ہے۔ بورنیو ایک پہاڑی جزیرہ ہے جس کا 50 فیصد شمالی اور کچھ وسطی حصہ بلند پہاڑی سلسلوں جبکہ باقی کا جنوبی حصہ گھنے استوائی درختوں سے اٹے اونچے نیچے ٹیلوں پر مشتمل ہے۔ شمالی حصے میں ملائیشیا کی حدود میں واقع ماؤنٹ کینابالو (Kinabalu) جزیرے کا بلند ترین پہاڑ ہے جس کی بلندی 13455 فٹ ہے۔ بورنیو کے جزیرے پر سیکڑوں برساتی ندی نالے اور دریا بہتے ہیں۔ یہاں بننے والے اہم دریاؤں میں انڈونیشیا کی حدود میں بننے والا دریاے بریٹو (Barito) لمبائی 890 کلومیٹر، ماہاکان (Mahakan) لمبائی 800 کلومیٹر اور ملائیشیا کی حدود میں بننے والا 600 کلومیٹر لمبا دریاے راجنگ (Rajang) نمایاں ہیں۔ استوائی جزیرہ ہونے کی وجہ سے بورنیو کی آب و ہوا گرم مرطوب ہے۔ یہاں کا اوسط سالانہ درجہ حرارت 26 ڈگری سینٹی گریڈ اور بارشوں کی اوسط 4064 ملی میٹر (160 انچ) سالانہ ہے۔

بورنیو کی ایک اہم خصوصیت جزیرے کے شمالی پہاڑی حصے میں پائی جانے والی سیکڑوں میٹر گہری اور کئی کئی کلومیٹر لمبی قدرتی غاریں ہیں۔ لاکھوں چگادڑوں اور انول داقسام کے حشرات کا مسکن یہ غاریں پچھلے ہزاروں سالوں سے انسان کے لیے معیشتی ہوئی ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ ان وسیع و عریض قدرتی گڑھوں میں قدرت کے کیا کیا اسرار چھپے ہوئے ہیں؟ یہاں واقع بعض غاروں کے اندر 10 ہزار سال پرانے انسانی ہڈی کے نشان بنے پائے گئے ہیں۔ ماہرین آثار قدیمہ کے مطابق آرٹ کے یہ ہزاروں سال پرانے نمونے قدیم یورپائی باشندوں کی ایک رسم کی یاد دلاتے ہیں۔ پرانے لوگ شکار پر قابو پانے کے بعد اپنے ہاتھ کو غار کی چٹائی دیوار پر دھکنے کے بعد منہ میں بھرا رنگ ایک زوردار پھونک کے ساتھ ہڈی پر چھینکتے تھے جس سے بطور فتح کی علامت ان کی ہڈی کا نشان دیوار پر چھپ جاتا تھا۔ ماہرین حیاتیات کے مطابق بورنیو ایک ایسا جزیرہ ہے جہاں کرہ ارض کے دیگر برساتی علاقوں کی نسبت سب سے زیادہ نایاب اقسام کی جنگلی حیات پائی جاتی ہے۔

یورپین کی آمد کے وقت یورینو کا جنوبی اور وسطی حصہ سلطنت آف ملاکا اور شمالی مغربی ساحلی علاقہ بروٹائی کی ریاست پر مشتمل تھا۔ اس زمانے میں بروٹائی پر ایک ہندو راجا سری پادا (Sripada) کی حکومت تھی۔ راجا سری پادا علاقے کا بااثر اور طاقتور ترین حکمران تھا۔ وہ مالے کے جزائر میں شامل کئی کے ان چند حکمرانوں میں سے ایک تھا جس کی فوج آتش توپوں سے لیس تھی۔ ان توپوں کے علاوہ راجا کی طاقت کا مظہر اس کی فوج میں شامل ایک ہزار سے زیادہ ہاتھی بھی تھے۔ یہ دیوبیکل ہاتھی پوری طرح تربیت یافتہ اور سر سے پاؤں تک لوہا پہنے ہوئے تھے۔ ہسپانوی مہم جوؤں کی آمد تک بروٹائی میں پرتگالیوں کے قدم نہیں پہنچے تھے۔ تاہم مقامی اور عرب تاجروں کے ذریعہ سے کنگڈم آف ملاکا میں پرتگالیوں کی سرگرمیوں کی خبریں راجا سری پادا تک براہ پہنچ رہی تھیں۔ عربوں نے راجا کو بتایا تھا کہ پرتگال نہ صرف یورپ بلکہ دنیا کا سب سے طاقتور اور دولت مند ملک تھا۔ انہوں نے راجا کو خبردار کیا کہ یورینو کے جنوب مغرب میں موجود جس جس ریاست نے پرتگالیوں سے دشمنی مول لی تھی ان کے حکمرانوں کو اپنے اقتدار سے محروم ہونا پڑا تھا۔

یورینو کا نظارہ کر لینے کے بعد ہسپانوی بحری جہاز اگلے چار دن جزیرے کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے جنوب کی طرف بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ 29 جون 1521ء کے دن کاروال ہو۔۔۔ کی قیادت میں دونوں بحری جہازوں نے ٹھیک اس مقام پر لنگر گرائے جہاں آج بروٹائی کا دارالحکومت بندر سری بیگوان (Bandar Seri Begawan) واقع ہے۔ پالاوان کی بندرگاہ پورٹو پرس سے یہاں تک انہوں نے قریب ایک ہزار کلومیٹر کا سفر طے کر لیا تھا اور اب وہ بروٹائی میں قدم رکھنے کو بے تاب تھے۔ بندر سری بیگوان اور اس کے قرب وجوار کا علاقہ ان کی توقع سے کہیں زیادہ آباد اور پُر رونق تھا۔ یہاں مقامیوں، چینیوں اور عربوں کے بحری جہازوں کے ساتھ ساتھ بروٹائی کی شاہی بحریہ کے کئی درجن جنگی جہاز بھی لنگر انداز تھے۔ مقامی بحریہ کے یہ جنگی جہاز، چینیوں کے جنگ بحری جہازوں کی ترقی یافتہ شکل تھے۔ گوکہ یہ ٹرینی ڈاڈ کے مقابلے میں کسی قدر چھوٹے تھے تاہم ہسپانوی مہم جو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ بعض جنگی جہازوں پر آتش گولہ داغنے والی توپیں

بھی نصب تھیں۔ کاروال ہو اور اس کے ساتھیوں کے قدم رکھتے ہی مقامی حکام نے ان کا پُر جوش استقبال وہاں قطار در قطار کھڑے سدھائے ہوئے ہاتھیوں کے دستے نے اپنی سوئیں اٹھا کر سفید فاموں کو بددعاؤں کی خوش آمدید کہا۔ یورپین کے لیے ہاتھی ایک بالکل نیا جانور تھا۔ وہ ایک کمزور سے مہات کے سامنے اس دیوبیکل جانور کی فرما برداری سے سوئے ہلاتے دیکھ کر حیران تھے۔ بندرگاہ حکام اور کاروال ہو کے درمیان خیر مقدمی جملوں کا تبادلہ جس کے بعد حکام نے انہیں راجا سری پادا کے محل پر دعوت دی۔ کاروال ہونے اپنی جگہ اپنی اوسا، ایل کا تو فی ٹا، اپنے برازیلین بیٹے اور دو سپاہیوں کے ساتھ پالاوانی ترجمان کو شاہی محل روانہ کر دیا۔

پیکانی ٹا کے مطابق ان کے وفد کو براہ راست محل جانے سے پہلے شہر کی سیر کرائی گئی۔ ہسپانویوں نے محسوس کیا کہ بحر الکامل کو پار کرنے بعد سے لے کر اب تک وہ جس ریاست میں گئے تھے، بروٹائی ان سب کی نسبت دولت مند اور ترقی یافتہ ریاست تھی۔ مقامیوں کا ریشہ اور لباس ان کی خوشحالی کا آئینہ دار تھا۔ شہر کی سڑکیں کشادہ اور صاف ستھری تھیں۔ وہاں جگہ جگہ ہاتھیوں کے بار برداری کے کام لیے جا رہے تھے۔ مرکزی بازار کے بڑے کئی چھوٹے چھوٹے بازار بھی تھے۔ ان بازاروں کے ساتھ چھل پہل تھی اور چھوٹی بڑی دکانیں ایک ترتیب کے ساتھ موجود تھیں۔ یہاں چین سے درآمد کیا گیا ریشمی کپڑا اور مغربی ایشیا سے لائے گئے منقش غالیچے اور قالین دستیاب تھے۔ یہاں انہوں نے سونے چاندی کے جواہرات کے ساتھ ساتھ ہاتھی دانت سے بنی مورتیاں اور دیگر قیمتی اشیاء بھی فروخت ہوتے دیکھیں۔ یورپین دیکھ کر حیران ہوئے کہ یہاں کا غنڈ قلم کارواج بھی تھا۔ بعض دکاندار لین دین کا حساب کتاب ایک کاغذ پر درج کرتے دکھائی دیے۔ بازار میں تازہ استوائی پھلوں، سبز یوں کے ساتھ ساتھ لوگ اور کالی مرچ کے ڈھیرے دیکھ کر ملاحوں کی خوشی کا ٹھکانا نہیں رہا۔ اپنی اوسا نے چاندی کے عوض کچھ لوگ خریدی۔ اس نے پایا کہ یہ لوگ خوشبو اور ذائقے میں اپنی مثال آپ تھیں۔ غرض یہ کہ سیر کے دوران ہسپانویوں پر یہ واضح ہو گیا کہ اس باران واسطہ ایک مہذب اور ترقی یافتہ ایشیائی قوم سے پڑا تھا۔ انہیں یہاں جو بھی قدم اٹھانا تھا سوچ سمجھ کر اٹھانا تھا۔ یہاں

بھی مصالحوں کی فراوانی دیکھ کر وہ سوچ رہے تھے کہ اگر راجا کے ساتھ ان کی ملاقات کامیاب ہو جاتی ہے تو ان کا لوکا جانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ بروٹائی کی حکومت سے تجارتی معاہدہ کر کے یہیں سے لوگ خرید کر

یورپ روانہ ہو سکتے تھے۔ وہ ایک کھنڈوں کے سیر سپاٹے کے بعد ہسپانوی وفد کے راجا سری پادا کے عالی شان محل پہنچا۔ چونے پتھر کی ساختے میں ڈھلی چٹانی سلوں سے بنا وسیع و عریض شاہی محل کسی طرح بھی یورپین بادشاہوں کی رہائش گاہوں سے کم نہیں تھا۔ محل میں اوپکی چھت والی طویل راہداریوں اور راندوں کے اطراف میں لاتعداد کمرے بنے ہوئے تھے۔ چینی اور اندازے محراب دار تھے۔ مرکزی دروازے کے دروازے کے ہر حصے میں دبیز قالین بچھے ہوئے تھے۔ محل کے اندر دروازوں پر کئی پر دیے جبکہ کمروں کے دروازوں پر مہیوں کی جھالریں لٹک رہی تھیں۔ اپنی اوسا اور اس کے ساتھ ایک طویل نجی سجاوٹ کی راہداری سے گزر کر ہاتھی کے قد کے برابر ایک دروازے پر پہنچے۔ دروازے پر موجود ہار دی دربانوں نے معزز مہمانوں کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ یہ ایک بڑا ہال کمر تھا جس کی سجاوٹ دیکھ کر اپنی اوسا اور اس کے ساتھیوں کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ انہیں لگا جیسے وہ سونے کی کان میں آگئے ہوں۔ راجا کا تخت خالص سونے کا تھا اور اس کے ارد گرد پر لگی تمام آرائشی اشیاء سونے کی تھیں۔ حتیٰ کہ راجا کا زرق برق ریشمی لباس بھی سونے کے تاروں سے سلا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ راجا قیمتی لباس پہنے تخت پر بٹگائیں کے سہارے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے سونے کا تاج پہن رکھا تھا جس کے ماتھے پر مرنی کے انڈے کے برابر دو چمکاتے ہیرے دمک رہے تھے۔ راجا کے تخت کے سامنے دونوں اطراف میں رکھی درجنوں کرسیوں پر اس کے درباری بیٹھے ہوئے تھے۔ دربار میں مقامیوں کے ساتھ ساتھ عرب اور ہندوستانی عمائدین نمایاں تھے۔ بعض مقامیوں نے سر پر پیلے رنگ کی بڑی بڑی پگڑیاں بھی پہنی ہوئی تھیں۔ اپنی اوسا نے پایا کہ راجا سری پادا کے دربار میں ایک چیز بھی موجود تھی جو اس وقت سوائے یورپ کے کسی دکن یا ہندوستان میں نہیں تھی۔ ان میں سے ایک چینی کے منقش تخت تھا جو بادشاہ کے تخت کے قریب فریضے سے رکھے گئے تھے۔ وہ صوبہ کے چٹھے تھے جنہیں بعض درباریوں نے ان کے پر لگا رکھا تھا۔ دربار میں ان دونوں چیزوں کی

اندازِ بیاں اور.....

ہمارے ہاں کھانوں کو چٹ پٹا اور لذیذ بنانے کے لیے جتنے مصالحے بلکہ گرم مصالحے استعمال ہوتے ہیں دنیا میں کہیں اور نہیں ہوتے۔ اس کے ساتھ برصغیر میں روٹی بھی کئی قسموں کی ہوتی ہے۔ تندوری روٹی، نان، تافان، روغنی نان، پرائٹھے اور پھلکے۔

ہمارا ہاں سے جو پاکستانی حج پر جاتے ہیں۔ ان میں سے کئی لوگ تو بے ساتھ لے جاتے ہیں کہ ہاتھ کی بکی ہوئی روٹی کے بغیر ان کا گزارہ نہیں ہوتا۔ ایسی ہی ٹیپنگی کا ذکر ہے، جس کے افراد پھلکوں کے عادی تھے لیکن تو اساتھ لے جانا بھول گئے۔ وہاں جا کر پہلی فکر یہ ہوئی کہ تو بے کا بندوبست کیا جائے، دو تین پھر تیلے آدی تو بے کی خرید پر مامور کیے گئے۔ انہوں نے پہلے تو بے کی عربی معلوم کرنے کی کوشش کی مگر مایوسی ہوئی۔ بازار میں جا کر ہاتھ کے اشارے سے گول گول چیز خریدنے کی خواہش ظاہر کی جس پر روٹی پکائی جاسکے۔ ان اشاروں کتنا یوں سے مخاطب یہ سمجھے کہ شاید انہیں روٹی درکار ہے۔ کسی نے تندور کی راہ دکھائی اور روٹی کی عربی بتائی۔ ”خمیر“ لیکن انہیں ”خمیر“ نہیں خمیر بنانے کے لیے تو بے کی تلاش تھی۔ تھک ہار کر انہوں نے برتنوں کی دکان ڈھونڈنا شروع کی کہ وہاں تو بے پر نظر پڑی تو خرید لیں گے۔ خاصی جدوجہد کے بعد ایک دکان پر تو نظر آیا تو خرید لیا۔ چلتے ہوئے دکاندار سے ٹوٹی پھوٹی عربی زبان میں پوچھا۔ ”اسے عربی زبان میں کیا کہتے ہیں؟“

جواب ملا ”توا“

(ابن انشاء کی کتاب سے اقتباس)

مرسلہ: رانا محمد شاہد

موجودگی اس بات کا ثبوت تھا کہ راجا کا یورپین سے براہ راست نہیں تو بلواسطہ تعلق ضرور تھا۔ اپنی اوسا نے آگے بڑھ کر راجا کو تعظیم دی۔ اس نے چینی کی ایک صراحی، چند گلاس اور کپڑے کے دوریشی تھان راجا کی خدمت میں بطور نذر پیش کیے۔ اپنی اوسا نے اپنے مترجم کے ذریعے راجا سے بات چیت کی۔ اس نے جو آؤ زیو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کے کپتان نے اپنے بیٹے کو بادشاہ کی خدمت میں تحائف دے کر روانہ کیا ہے۔ راجا نے غور سے ننھے جو آؤ زیو کی طرف دیکھا اور اپنی اوسا سے بروٹائی آنے کا مقصد دریافت کیا۔ اپنی اوسا نے راجا کے درباریوں پر نظر ڈالتے ہوئے بہ آواز بلند کہا کہ وہ لوگ اپن کے بادشاہ چارلس اول کی طرف سے بروٹائی کے لیے دوستی کا پیغام لے کر آئے ہیں۔

پیکانی ٹا کے مطابق جیسے ہی ان کے مترجم نے تعارفی جملے دہرائے راجا اور اس کے دائیں بائیں کھڑے چند معزز درباری چونک سے گئے۔ راجا نے پہلے ہسپانوی مہم جوؤں اور پھر اپنے دائیں طرف ہاتھ باندھے کھڑے ایک فوجی افسر کی طرف دیکھا۔ افسر لپک کر راجا کے قریب گیا۔ اس نے کچھ دیر تک راجا کے سر سے سر جوڑ کر کھسر کھسر کرنے کے بعد اپنی اوسا سے پوچھا کہ وہ پرتگال کے بارے میں کیا جانتا ہے؟ اس اچانک سوال پر اپنی اوسا اور ایل کا تو دونوں ہی چونک گئے۔ اپنی اوسا کے دماغ نے تیزی سے سوچنا شروع کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ بروٹائی کے راجا کو نکلڈم آف ملاکا میں پرتگالی بیڑے کی سرگرمیوں کا مکمل علم تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ راجا نے پرتگالیوں سے کوئی تجارتی معاہدہ کر رکھا ہو۔

اپنی اوسا نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور راجا کو بتایا کہ پرتگال، اپن کے مقابلے میں ایک چھوٹا ملک ہے اور اس کی فوج کی ہسپانوی فوج کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اپنی اوسا کا جواب سن کر راجا نے کچھ دیر تک اپنے مشیروں سے بات چیت کی جس کے بعد ایک فوجی افسر نے ہسپانوی وفد کو اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ کچھ ہی دیر میں وہ لوگ ایک چھوٹے لیکن آراستہ کمرے میں موجود تھے۔ فوجی افسر نے اپنی اوسا اور اس کے ساتھیوں کو وہیں انتظار کرنے کی ہدایت کی اور پیکانی ٹا سمیت باقی کے لوگوں کو لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ کمرے میں کئی گھنٹے تک بھوکے پیاسے اکیلے رہنے کے بعد اپنی اوسا کو اندازہ ہو گیا کہ ان کے

ساتھ کوئی انہونی ہو چکی تھی۔

اپنی اوسا نہیں جانتا تھا کہ بروٹائی کے راجا اور اس کے حکام نے عربوں کے توسط سے پرتگال کی باہمی چپقلش کے قصے سن رکھے تھے۔ وہ جانتے ہی نہ تھے کہ پرتگال رقبے کے لحاظ سے اپن سے کم لیکن یورپ سے بڑی فوجی قوت تھی۔ راجا اور اس کے حکام بیڑے کے ہی انتظار میں تھے۔ درحقیقت انہوں نے ہسپانوی مہم جوؤں کا پرتگالی تاجر سمجھ کر استقبال بھرے دربار میں اپنی اوسا کے منہ سے سچ سن کر حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ راجا نے اپنے فوجی مشیروں باز پرس کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ پرتگالیوں کی آمد ان کے حریفوں کی بروٹائی آمد اس کی ریاست کے نیک شگون نہیں تھا۔

☆☆☆

پیکانی ٹا نے بندرگاہ واپس پہنچ کر کاروال ہو کر راجا نے ان کے باقی ساتھیوں کو بریغمال بنالیا ہے۔ ہے کہ اگر ہم اپنے گرفتار ساتھیوں کی سلامتی چاہتے وہاں سے فوراً روانہ ہو جائیں۔ بروٹائی میں ہرجوش کے بعد کاروال ہو کر راجا سری پادا سے اس سلوک کی تائید نہیں تھی۔ وہ راجا کے رویے پر ابھن کا شکار تھا۔ کی سوچ بچار کے بعد کاروال ہوا اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ تجربہ کار ساتھیوں بشمول اپنے حقیقی بیٹے کو بروٹائی میں کر نہیں جاسکتا تھا۔ اس نے اپنے عملے کو بحری جہازوں میں دھور بننے کی ہدایت کرتے ہوئے فی الحال دیکھو اور انہوں کی حکمت عملی اپنانے کا فیصلہ کیا۔ یہ رات خیریت گزر گئی تاہم اگلی صبح ملاحوں نے دیکھا کہ مقامی بحری جنگ جہازوں نے انہیں گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ کچھ دور پر سو سے زیادہ سدھائے ہوئے ہاتھی بھی کھڑے جمے ہوئے تھے۔ ہاتھیوں پر مسلح تیر انداز بیٹھے تھے جبکہ ان کے آگے قطار در قطار آتش گولہ پھینکنے والی توپیں بھی کھڑی تھیں۔ کاروال ہو کر یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ یہ دو بدو مقابلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جہاں تک اندازوں اور جنگ بحری جہازوں کا سوال تھا تو انہیں جاسکتا تھا لیکن اصل مسئلہ خشکی پر موجود ان 62 توپوں کی جن کی تعداد ہسپانوی بحری جہازوں پر موجود توپوں سے گنا زیادہ تھی۔ مقامیوں کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ انہیں کر دکھانے کے موذ میں تھے۔

کاروال ہونے فوری طور پر اپنے بحری جہازوں پر قبضہ جھنڈا لہرانے کا حکم دیا۔ اس دوران ایک جنگ جہاز دیر سے آگے بڑھتا ہوا ٹرینی ڈاؤ کے قریب آ گیا۔ اس نے کھلے حصے میں کھڑے ایک مقامی فوجی افسر نے بروٹائی کی بحریہ کے سپہ سالار کے طور پر اپنا تعارف کرواتے ہوئے کاروال ہو سے مطالبہ کیا کہ وہ فوری طور پر بروٹائی کی طرف سے باہر چلا جائے۔ کاروال ہونے اپنے ترجمان کے ذریعے مقامی سپہ سالار سے درخواست کی کہ اسے اپنے بحری جہازوں کی مرمت کے لیے تھوڑی سی مہلت دی جائے۔ اس نے شراب کے نشے میں دھت مقامی سپہ سالار کو اس ہدایت کے بدلے کچھ تحائف دینے کی پیش کش کی۔

کاروال ہو کر پیش کش سن کر فوجی افسر کی رال مچنے لگی۔ اس نے زنگ میں آ کر کہا کہ وہ راجا سری پادا کا قریبی رشتہ دار ہے اور اس ناتے وہ کسی طور راجا سے کم تر رہتے کا نہیں ہے۔ یہ انکشاف سن کر کاروال ہو کر آنکھیں چمک اٹھیں اس نے فوجی افسر کو لہجہ اختیار کرتے ہوئے راجا کے رشتے دار کو شے میں اتارنا شروع کر دیا۔ کچھ ہی دیر میں مورب مال یہ بنی کہ مقامی سپہ سالار اپنے پانچ ساتھیوں کے ساتھ ٹرینی ڈاؤ کے ایک خانے میں موجود تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور منہ سے مغلطات کا طوفان جاری تھا۔ کاروال ہونے نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا لیکن اس نے انہیں دھمکانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ کاروال ہونے ایک طویل سانس لی۔ اپنی بغل میں اڑسا ہوا پستول نکالا اور مقامی سپہ سالار کے قریب فرش پر بیٹھے اس کے ایک ساتھی کو گولی مار دی۔ فرش پر تڑپتے اپنے ساتھی کا حشر دیکھ کر مقامی سپہ سالار کی چلتی زبان رک گئی اس نے تھوک نکل کر کاروال ہو کر طرف دیکھا اور مزید انکشاف کیا کہ اس کا تعلق فلیپائن کے جزیرے لوزون کی فوج سے ہے۔ لوزون کا بادشاہ اور وہ راجا سری پادا ایک دوسرے کے قریبی رشتے دار ہیں۔ اس نے کاروال ہو کر شورہ دیا کہ وہ ان کی گرفتاری کی اطلاع مقامی حکام تک پہنچا دے تو راجا اس کے بدلے ان کے ساتھیوں کو رہا کر دے گا۔

کاروال نے مقامی سپہ سالار کے مشورے پر عمل کیا۔ اگلی صبح اس نے یہ دیکھ کر سکون کی سانس لی کہ نہ صرف بندرگاہ میں کھڑے ہاتھی اور ان کے آگے قطار در قطار رکھی توپیں وہاں سے ہٹائی گئی تھیں بلکہ ان کے بحری جہازوں کو بحریہ میں لیے جنگ بھی وہاں سے غائب تھے۔ وہ سمجھ گیا

کہ اس کے ہاتھ ٹرپ کا پتا لگ چکا تھا۔ اب کاروال ہوا اور مقامی حکام کے درمیان بات چیت کا آغاز ہوا۔ کاروال ہو نے مطالبہ کیا کہ مقامی بریغالیوں کے بدلے نہ صرف اس کے ساتھیوں کو رہا کیا جائے بلکہ تین خوبصورت عورتوں کو بھی ان کے حوالے کیا جائے۔ اپنے کپتان کے منہ سے عورتوں کا مطالبہ اس کے جہاز رانوں کو ناگوار گزرا۔ انہیں مہم کے دوران میگلن کی دی گئی وہ ہدایت اچھی طرح یاد تھی جس میں اُس نے بحری جہازوں پر سیکس کو ممنوع قرار دیا تھا۔ آنے والے دنوں میں ہسپانوی ملاحوں اور بروٹائی کے حکام کے درمیان ایک دوسرے کے بریغالیوں کو رہا کرنے سے متعلق بات چیت کسی نتیجے تک نہ پہنچی۔

جولائی 1521ء کے پہلے عشرے کے دوران کاروال ہونے کچھ سونے کے سکوں اور خوراک کے بدلے ایک مقامی کو رہا کر دیا۔ اس دوران کاروال ہوا اپنے ساتھیوں کے دباؤ پر عورتوں کی حواگی کے مطالبے سے دستبردار ہو گیا تھا۔ وہ حیران تھا کہ راجا اس کے ساتھیوں کو رہا کرنے میں اتنی سستی سے کام کیوں لے رہا تھا؟ جولائی کے آخر میں اس کا صبر جواب دے گیا۔ اس نے راجا سری پادا کو پیغام بھجوایا کہ اگر اگلے دو دن کے اندر اندر اس کے ساتھی رہا نہ ہوئے تو وہ ایک ایک کر کے تمام بریغالیوں کو قتل کر دے گا۔ یہ دھمکی کام کر گئی۔ اپنی اوسا اور ایل کا نو کو بندرگاہ پہنچا دیا گیا اور کچھ ہی دیر میں دونوں طرف کے بریغالیوں کا تبادلہ عمل میں آ گیا۔ کاروال ہونے غور کیا۔ اسے اپنا بیٹا کہیں دکھائی نہ دیا۔ وہ لپک کر اپنے ساتھیوں کے قریب پہنچا اور ان سے جو آؤ زیو کے بارے میں سوال کیا۔

”انہوں نے دونوں ہسپانوی سپاہیوں اور..... جو آؤ زیو کو..... گرفتاری کے فوراً بعد..... قتل کر دیا تھا۔“ ایل کا نو نے رک رک کر جواب دیا۔

جو آؤ زیو کی ہلاکت کی خبر سن کر ماحول افسردہ سا ہو گیا۔ کاروال ہو گھرے صدے میں تھا۔ وہ اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھامے افسردہ سا ایک طرف بیٹھ گیا۔ مارٹن مینڈز کے بار بار یاد دلانے پر کہ انہیں یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے، کاروال ہونے سر اٹھایا اور کہا کہ وہ بروٹائی آمد کے غلط فیصلے کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے مہم کے معاملات سے الگ ہوتا ہے۔ وہ لوگ لنگر اٹھا دیں اور کھلے سمندر میں پہنچ کر اپنے نئے قائد کا انتخاب کر لیں۔ (جاری ہے)



سراب

راوی : شہباز ملک

تحریر: کاشف ربیر

71

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکار سی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب۔ ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن و دل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سراپوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

ماہنامہ سرگزشت

مارچ 2013ء

172

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے جبکہ میں آری میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ سویرا جو میرے دل کا حصہ تھی وہ میرے مقدر بنادی گئی اور میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ میں نے کاروبار شروع کیا۔ ایک روز میری سے واپس آتے ہوئے نادری علی کا ہم سے ہو گیا پھر یہ کمرہ ذاتی اتنا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شاہیہ دکن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے دوست۔ پھر تو ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئی تھیں۔ میں دوبارہ وطن لوٹا تو فتح خان سے کمرہ ملا اس کے آدمیوں کو شکست دے کر میں اندرون ملک آ گیا۔ آتے وقت میرے ہاتھ حکومت چین کا ایک بریف کیس آ گیا۔ جو شہلا کے لیے تھا۔ شہلا کو راضی کیا کہ وہ مجھے بینک کے لاکر تک پہنچا دے تاکہ میں چائیز بریف کیس حاصل کر لوں۔ ہم بینک میں سیف سے بریف کیس نکالے تھے کہ شہلا نے فتح خان کے آدمیوں کو بلالیا تھا۔ وہ مجھے یرغمال بنا کر فتح خان کے گھر میں لے آئی۔ فتح خان نے مجھے مجبور کر دیا کہ حاصل کرنے کے لیے مجھے ڈیوڈ شاہیہ کے ہیرے تلاش کر کے دینے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ فتح خان، برٹ شاہیہ، برٹ شاہیہ کے پوتوں سے فتح خان کو نشانے پر لیا تھا کہ اس کے آدی نے برٹ شاہیہ کو کوئی مار دی۔ مرتے وقت برٹ شاہیہ بڑا بڑا "تار تار" ہنست "ہنست" برٹ شاہیہ کی آواز صرف میں نے سنی تھی، تھوڑی دیر میں اندازہ ہو گیا کہ فتح خان نے اندازہ لگا لیا ہے کہ اس پوری کارروائی میں میرا ہاتھ ہے مائیک سے اعلان ہوا کہ جو بھی ہے، وہ ہاتھ اٹھا کر باہر آ جائے۔ وہ راجا صاحب کے آدی تھے۔ وہاں سے میں نکل آیا۔ وہاں ایمن بھی تھی۔ اگلے دن ہم پنڈی جانے کے لیے نکلے۔ راستے میں فتح خان نے گھیر کر بے بس کر دیا اور ایمن کو خود کش جیکٹ پہنا دی جسے اتارنے کی کی جاتی تو دھماکا ہو جاتا۔ ہم عبداللہ کی کوٹھی میں اطلاع ملی کہ شہلا کا فون آیا تھا۔ میں نے اسے کال کر کے بریف کیس مانگا۔ اس نے بریف دینے کے لیے ویران جگہ مقرر کی۔ ہم وہاں پہنچے اور بریف کیس لے کر چلے تو مجھے شک ہوا اور میں نے بریف کیس ڈھلان پر رکھ دیا۔ وہ ہم سے پھٹ گیا۔ ہم واپس ہو رہے تھے کہ وسیم کا فون آیا کہ سویرا کو فتح خان نے حویلی پہنچا دیا ہے۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے ہم پھینک کر مجھے بے ہوش کر دیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو این آری کے حویلی میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل کر پھر جیپ تک پہنچا تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ کرنل زرو کی نے ہم دونوں کو پکڑ لیا۔ وہ مجھے پھر سے اٹھ کر نکل کر پھر میں دینا چاہتا تھا۔ میں نے کرنل کو زخمی کر کے بساط اپنے حق میں کر لی۔ زخمی فتح خان اور زرو کی کو لے کر چلا۔ راستے میں فتح خان کو اتار دیا۔ دور جانے کے بعد ایک کوٹھی نظر آئی جو ایک ملیر کی آفس کی تھی۔ میں نے اسے حالات بتا کر مدد طلب کی آفس زرو کی کو ملیر کی پولیس کے حوالے کرنے چلا گیا تھا کہ کوٹھی پر حملہ ہو گیا۔ میں نے حملہ پسپا کیا۔ مجھے اعلیٰ جنس والے ساتھ لے گئے۔ انہی لوگوں نے مجھے پنڈی پہنچانے کا انتظام کر دیا۔ میں دوستوں کے درمیان آ کر بیوی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی کہ ایک کوٹھی میں ہم دھماکا۔ کوٹھی نادری علی کی تھی جسے کسی نے تباہ کیا تھا۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ مجھے شہلا کی تلاش تھی۔ اس لیے نادری کوٹھی کی جانب توجہ دی تھی خبر ملی کہ شہلا کسی صابریہ کی شخص سے ملنے جا رہی ہے۔ میں دوستوں کے ساتھ اس کی تلاش میں نکل پڑا۔ کچھ کے ذمے کام یہ لگا گیا کہ وہ صابریہ کو پکڑ لیں۔ صابریہ تو پکڑ میں آئی مگر شہلا نکل گئی۔ صابریہ نے بتایا کہ شہلا کالی کوٹھی میں ملے گی۔ ہم وہاں پہنچے تو شہلا آخری سانس لے رہی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ موت و غیرہ حویلی بھیج دیا جائے۔ ہیلی کاپٹر ہار گیا۔ جیسے ہی چوہر بلند ہوا اس پر فائرنگ شروع ہو گئی جو ایک ریوٹ کنٹرول گن سے کی جا رہی تھی۔ یہ کالی فاضلی کا تھا، ہم نے اسے اغوا کر لیا، اسے خانے میں قید کر کے باہر نکلے۔ مجھے خیال آیا کہ ایک دو جگہیں مزید ہونی چاہیے جہاں ہم نظر رکھیں۔ اخبار میں ایک اشتہار نظروں سے گزرا جس میں فرسٹ مکان کرائے پر دینے کی بات کی گئی تھی۔ ہم بڑے پر جا پہنچے۔ مکان پسند آیا اور اسے دس لاکھ اینڈ وائس دے کر لے لی۔ مگر اگلے دن سے مکان مالک اشفاق احمد نظر نہیں آیا۔ اس کی نگرانی کے لیے عبداللہ نے ایک آدی کو لگا دیا۔ پھر خود بھی رات میں وہاں پہنچا۔ بھی اندر سے ایک آدی بھاگتا ہوا نکلا تھا کہ افغان احمد نے اس پر فائر کر دیا پھر اسے گھسیٹا ہوا اندر لے گیا۔ وہ بے قدموں میں بھی اندر آ گیا۔ ایک کمرے میں سے خانہ نظر آیا میں اندر جھانک رہا تھا کہ تاریکی میں ایک شعلہ چمکا۔ شعلہ لائٹر کا تھا۔ مالک مکان افغان احمد نے نہ برکولی چلائی۔ کافی دیر کی کھش کے بعد میں نے اسے پکڑ لیا اور گاڑی میں ڈال کر حویلی کے لیے نکل پڑا۔ فاضلی قید میں تھا اور وسیم اسے ہیروں کی انجکشن لگا کر عادی بنا رہا تھا۔ افغان احمد نے بتایا کہ وہ کسی بڑے آدی کو پکڑتا ہے اور اس کے گھر پر قبضہ کر کے دس بیس لاکھ کی جعل سازی کر لیتا ہے۔ میں عبداللہ سے ملنے جا رہا تھا کہ ڈی ایس پی اکرم چشتی نے مجھے گرفتار کیا اور بے پناہ تشدد کے بعد مرشد کے ہاں پہنچا دیا۔ میں نے مرشد یرغمال بنا کر وہاں سے نکلتا چاہا تھا کہ فاضلی خود دار ہوا اور اس نے میرے سر پر وار کر دیا۔ چوٹ کی وجہ سے میرا سر گھوم رہا تھا۔ مجھے جو عقل سے عاری بنانے کا انجکشن لگا تھا وہ بے اثر ثابت ہوا مگر میں نے عقل سے عاری بنے رہنے کی اداکاری شروع کر دی۔ فاضلی نے مجھے اور ایک لیلہ ڈاکٹر کو قید کر لیا تاکہ وہ مجھ پر نظر رکھ سکے۔ میں وہاں سے فرار ہونے لگا تو لیلہ ڈاکٹر ماری گئی۔ میں نے فاضلی کو زخمی کر دیا مگر وہ ہوش میں آئے ہی مجھے جیپ سے کچلنے کی کوشش کرنے لگا۔

مجھے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جیپ کا طاقتور انجن غریبوں نے پہلے نوئی کی لاش کو روندنا اور پھر وہ جیپ میری طرف کسی خون آشام درندے کی طرح لپکی۔ میں ذرا ترچا ہوا کہ تصادم کی شدت کم کر سکوں۔ مجھے بس اتنی ہی سہولت ملی تھی۔ اس کے باوجود جیپ کی ٹکر نے مجھے معمولی حملہ کی طرح ہوا میں اچھال دیا اور میں اڑ کر عقب میں موجود ایک درخت کے تنے سے ٹکر کے بل ٹکرایا تھا اور میری سر میں شدید تکلیف کے ساتھ ایک چمک سی اٹھی جو دھن تک گئی تھی۔ یہ ایسی تکلیف تھی جیسے کسی نے میری کمر سے ٹکی کا تار لگا دیا ہو۔ درخت سے ٹکرا کر میں نیچے گرا اور ہر جانب کر درخت کے پیچھے چلا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ میں جیپ اور درخت کے درمیان آنے سے بچ گیا۔ میں آج تک نہیں بھگتا کہ میں درخت کے پیچھے کس طرح چلا گیا تھا۔ جیپ آ کر درخت کے تنے سے ٹکرانی اور تصادم سے اس کا پٹا اور اٹھ گیا تھا۔

یہ پھیل کا مضبوط تنے والا درخت تھا ورنہ کوئی عام درخت ہوتا تو یقیناً گر جاتا۔ جیپ بہت قوت سے ٹکرانی تھی کیونکہ فاضلی مسلسل ایسی لیٹر دے رہا تھا اور جیپ نے جس رفتار سے مجھے ٹکر ماری تھی وہ اس سے زیادہ رفتار سے آ کر درخت سے ٹکرانی تھی۔ دھماکا یقیناً شدید تھا لیکن مجھے دھماکا سننے کا ہوش کہاں تھا؟ میرے اپنے ہوش اڑے ہوئے تھے۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن مجھ سے اٹھا نہیں گیا تھا۔ ریڑھ کی ہڈی پر لگنے والی چوٹ نے فی الحال مجھے ہار کر دیا تھا۔ میں رینگ کر پیچھے ہٹنے لگا۔ اس درخت کے پیچھے کئی اور درخت تھے اور جیپ آنے کی گنجائش نہیں تھی۔ فاضلی نے جس طرح مجھ پر جیپ چڑھائی تھی صاف لگ رہا تھا وہ میرے خاتمے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے اس بات کی پروا بھی نہیں کی تھی کہ کچھ فاصلے پر درخت تھا اور جیپ اس سے ٹکرانی تو اسے بھی نقصان ہو سکتا تھا۔

میں پیچھے سرک رہا تھا کہ وہ جیپ سے اترا اور اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا چاقو تھا اسی سے اس نے نوئی کا گلا کاٹا تھا۔ صاف ظاہر تھا انجکشن نے جس طرح مجھ پر اثر کیا تھا اسی طرح فاضلی پر بھی بے اثر رہا تھا اور اس نے میری ترکیب مجھ پر آزمائی تھی۔ وہ شرافت سے ظاہر کرتا رہا کہ اپنی شخصیت کھو بیٹھا ہے اور جب میں نے اسے جیپ سے لے کر مجھے بند کیا تو اس نے کہیں چھپا ہوا یہ چاقو نکال کر اپنے ہاتھ میں کاٹیں اور پھر باہر نکل کر نوئی کا گلا کاٹ

دیا۔ میں پوری طرح جیپ کی تلاشی نہیں لے سکا تھا۔ فاضلی نے اسی کا فائدہ اٹھایا تھا۔ درخت اور جیپ کے تصادم میں اسے بھی چوٹ آئی تھی اور اس کے سر سے بہنے والا خون اس کے چہرے پر پھیل کر اسے خوفناک بنا رہا تھا۔ اس نے بھیڑیے کی طرح دانت نکالے۔

"شہباز تمہارا آخری وقت آ گیا ہے۔"

"ممکن ہے۔" میں نے بدستور پیچھے سرکتے ہوئے جواب دیا۔ "لیکن میں نے بہت سے لوگوں کے منہ سے آخری جملہ یہی سنا ہے اور اس کے بعد وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔"

"لیکن میں تمہیں مار کر مروں گا۔" اس نے کہا اور میری طرف بڑھتا رہا۔ حالت اس کی بھی اچھی نہیں تھی کیونکہ وہ ڈمگاتے قدموں سے آگے آ رہا تھا۔ میں بدستور پیچھے سرک رہا تھا۔ میں درخت سے ٹکرا کر گرا تو پستول نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ تصادم کے بعد میرے پاؤں سن ہو گئے تھے لیکن کچھ دیر بعد وہ حرکت کرنے لگے تھے۔ اس سے میرا یہ خدشہ دور ہو گیا کہ میری ریڑھ کی ہڈی کو کوئی ناقابل تلافی نقصان ہو گیا ہے۔ مگر ابھی میں اس قابل نہیں ہوا تھا کہ پیروں پر کھڑا ہو سکوں۔

"تم نے پجاری نوئی کو بھی مار دیا۔" میں نے اس کی توجہ ہٹانے کے لیے کہا۔ "وہ بے گناہ تھی۔"

"اے مرنا ہی تھا وہ ہمارے خلاف گواہ تھی لیکن میں نے سوچا اسے تمہارے ساتھ ہی ماروں گا۔"

جیپ نے درخت سے ٹکرانے سے پہلے نوئی کے بے جان جسم کو بھی روندنا تھا۔ اسے تو فرق نہیں پڑا کیونکہ وہ میرے سامنے ہی دم توڑ چکی تھی البتہ اس کی لاش کی حالت بری ہو گئی ہوگی۔ میں زمین پر سرک رہا تھا اور فاضلی ست قدموں سے میری طرف بڑھا آ رہا تھا۔ چند لمحوں میں وہ میرے پاس آ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موجود چاقو زیادہ بڑا نہیں تھا اس کا بلڈ مشکل سے چار انچ چوڑا تھا لیکن یہ دونوں طرف سے ریزر جیسی دھار والا چاقو تھا اور مشاق ہاتھوں میں نہایت مہلک ہتھیار کی حیثیت رکھتا تھا۔ میں اپنا دفاع کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ فاضلی نے خود پر قابو پالیا تھا اور اس کی سانپ جیسی تیز آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ وہ یقیناً سوچ رہا تھا کہ کس زاویے سے حملہ کرے کہ مجھے مدافعت کا موقع نہ ملے۔ اسے دھوکے میں رکھنے کے لیے میں اپنی حالت کچھ زیادہ ہی خراب کر کے پیش کر رہا

تھا۔ میری آنکھیں نیم دائیں اور سریوں اٹھا تھا جیسے میرے لیے یہ چھوٹا سا کام بھی آسان نہ ہو۔ مگر فاضلی جیسے عیار آدمی کو دھوکا دینا آسان نہیں تھا۔ اس نے پہلے بھی دھوکا نہیں کھایا تھا جب مرشد بھی مطمئن ہو گیا تھا کہ میں واقعی اپنے ہوش کھو بیٹھا ہوں۔

”شہباز تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔“ فاضلی نے اچانک کہا وہ رک گیا تھا۔ ”میرا خیال ہے تم اتنے کمزور نہیں ہو جتنا خود کو ظاہر کر رہے ہو۔“

میں چاہ رہا تھا کہ وہ میرے پاس آئے اور اس کے خبیث ذہن میں خیال نہ آئے کہ کیمین میں اس کے ساتھیوں کے ہتھیار موجود ہیں۔ مگر ایسا لگ رہا تھا کہ میری یہ دعا قبول نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ فاضلی رک گیا تھا اور سوچ رہا تھا۔ ”کیا.... سوچ رہے ہو مرشد کی ناجائز اولاد۔“ میں نے اسے اکسانے کے لیے گالی دی۔ ”آؤ مجھے قتل کرو۔“

اس کا موڈ آف ہو گیا۔ ”بکو اس مت کرو۔“

”تمہارے نام نہاد باپ کو تمہاری اصل ولدیت کا علم ہے؟“

”اسی نے مجھے بتایا تھا۔ وہ بچپن سے مجھ سے خار کھاتا تھا، مجھے بلا وجہ مارتا تھا، نفرت کا اظہار کرتا تھا۔ ایک دن جب میں جوان ہو گیا تھا تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تب اس نے بتایا کہ میں اصل میں مرشد کی اولاد ہوں۔“

”پھر تم نے کیا کیا؟“

”میں نے اس ذلیل شخص کو قتل کر دیا جو بے غیرت تھا۔“

”حالانکہ تمہیں مرشد کو قتل کرنا چاہیے تھا۔“

”میں اسے بھی قتل کروں گا لیکن ابھی نہیں۔ جب میں اس کی ساری طاقت اور دولت حاصل کر لوں گا تب اسے قتل کروں گا۔“

”یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”جو شخص اپنے گئے بھائی کی پروا نہ کرے وہ اپنی ناجائز اولاد کی پروا کیوں کرنے لگا۔“

”اسے ابھی میرے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہے۔“

مجھے فاضلی کی بات پر ہنسی آئی۔ وہ مرشد جیسے عیار آدمی کو اتنا انجان سمجھ رہا تھا اسے معلوم نہیں تھا کہ مرشد خود بے خبر بن کر اسے بے وقوف بنا رہا ہے۔ لیکن میں نے فاضلی کو بتایا نہیں اس کے بجائے میں نے کہا۔ ”تمہاری حالت بتا رہی ہے کہ انجکشن نے تم پر بھی اثر نہیں کیا ہے؟“

”میرا خیال ہے یہ سیٹ کسی وجہ سے بیکار ہو گیا شاید مرشد نے اسے رکھنے میں احتیاط نہیں کی اور ہو گئی۔“

”تم نے میری ٹوپی میرے سر رکھ دی اور رہے۔“ میں نے کہا۔ ”اب انتظار کس بات کا ہے۔“ فاضلی عیاری سے مسکرایا۔ ”میرا خیال ہے اس میں بھی تمہارے نزدیک آنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔“ مجھے افسوس ہے میں اب تک تمہیں بہادر نہ تھا۔

”میں بزدل ہی بھلا۔“ اس نے جواب دیا۔

کیمین کی طرف جانے لگا۔ اس کا ارادہ یقیناً وہاں سے گن لاکر مجھے دور سے شوٹ کرنے کا تھا۔ اس حال میں وہ میرے پاس آنے کو تیار نہیں تھا جب کہ اس کے

میں چاقو تھا اور میں قطعی نہ تھا۔ جیسے ہی وہ نظروں اوچھل ہوا میں حرکت میں آ گیا۔ اتنی دیر میں میرا جسم حد تک میرے قابو میں آ گیا تھا۔ مگر میں خاصی مشکل کھڑا ہوسکا تھا بڑھ کی ہڈی اور کمر میں خوفناک قسم کی لہریں اٹھ رہی تھیں اور کھڑے ہونے پر ایک لمحے کے لیے وہی بجلی والی چمک ہوئی جو دماغ تک گئی تھی۔

تلاش کرنے میں وقت کا ضائع ہوتا اس لیے میں ہر لمحہ گھبراہٹ میں رہتا تھا اور جب تک بالکل جھک کر نہ دیکھا جائے گڑھا تیزی سے کیمین سے دور جانے لگا۔ میری عافیت اسی میں

کہ فاضلی سے ممکن حد تک دور رہوں۔ درختوں کا یہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔

اب تک میں تنوں اور شاخوں کا سہارا لے کر چل رہا لیکن جھنڈے باہر آ کر جب مجھے اپنے بل بوتے پر چلنا پڑا تب مجھے صحیح معنوں میں تکلیف کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

حالات اور مصائب نے مجھے غیر معمولی قوت برداشت دے دی تھی تو اس وقت میری چیخیں نکل رہی ہوتیں۔ ذرا آگے جھاڑیاں تھیں ایک بار میں ان میں گھس جاتا تو فاضلی

لیے مجھے تلاش کرنا آسان نہ رہتا۔ اس لیے میں تکلیف کا انداز کر کے ہر ممکن تیزی سے چل رہا تھا۔ فاضلی کسی لمحے واپس آ سکتا تھا اور مجھے جھنڈے میں نہ پا کر زخمی بھی ہو سکتا تھا۔

طرح میری تلاش میں نکل کھڑا ہوتا۔ اب اس میں شبہ نہ کہ وہ مجھے قتل کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے میری طرف سے ہر ممکن تیزی کے باوجود فاضلی

اس وقت نمودار ہوا جب میں جھاڑیوں میں داخل ہوا تو اس نے مجھے دیکھتے ہی شاٹ گن سے فائر کیا اور گولی

”میں کہاں تھی۔ درمیان میں کوئی دوسو گز کا فاصلہ آ گیا تھا اس کے اگلے فائر سے پہلے میں جھاڑیوں میں داخل

رہا تھا۔ گلاب سے حصار میرے لیے اتنا کارآمد نہیں رہا تھا فاضلی نے دیکھ لیا تھا کہ میں کہاں ہوں اور وہ سیدھا

اس کی لائسنس میں جھاڑیوں تک آ جاتا تو میں بھی پڑتی جھاڑیاں کھٹکنا پڑتیں اور میری

کامیابی کا امکان بڑھ جاتا لیکن اب وہ سیدھا نہیں آتا اور میں اس چال سے گم رہ گیا تھا۔ مجھے جلد از جلد کوئی جگہ تلاش

کرنی چاہیے تھی جہاں میں کچھ دیر کے لیے پناہ لے سکوں۔ اس وقت میں میرے لیے مزید بھاگ دوڑ محال ہوتی جا رہی تھی۔

میں جھاڑیوں میں کوئی ایسی جگہ دیکھ رہا تھا جہاں میں چھپ سکوں اور فاضلی کو شک بھی نہ ہو۔ ایک چھوٹی اور کم

اونچائی کے پاس سے گزرتے ہوئے میرا پاؤں کسی گڑھے میں گرا گیا اور میں گرتے گرتے بچا تھا۔ میں نے جھک

کر دیکھا۔ جھاڑی ایک گڑھے کی تہ میں اگی ہوئی تھی اور میں نے اس کی اونچائی کم لگ رہی تھی۔ جانوروں نے

لیے وہی بجلی والی چمک ہوئی جو دماغ تک گئی تھی۔ تلاش کرنے میں وقت کا ضائع ہوتا اس لیے میں ہر لمحہ گھبراہٹ میں رہتا تھا اور جب تک بالکل جھک کر نہ دیکھا جائے گڑھا

تیزی سے کیمین سے دور جانے لگا۔ میری عافیت اسی میں کہ فاضلی سے ممکن حد تک دور رہوں۔ درختوں کا یہ

زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اب تک میں تنوں اور شاخوں کا سہارا لے کر چل رہا لیکن جھنڈے باہر آ کر جب مجھے اپنے بل بوتے پر چلنا پڑا تب

مجھے صحیح معنوں میں تکلیف کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ حالات اور مصائب نے مجھے غیر معمولی قوت برداشت دے دی تھی تو اس

وقت میری چیخیں نکل رہی ہوتیں۔ ذرا آگے جھاڑیاں تھیں ایک بار میں ان میں گھس جاتا تو فاضلی

لیے مجھے تلاش کرنا آسان نہ رہتا۔ اس لیے میں تکلیف کا انداز کر کے ہر ممکن تیزی سے چل رہا تھا۔ فاضلی کسی لمحے

واپس آ سکتا تھا اور مجھے جھنڈے میں نہ پا کر زخمی بھی ہو سکتا تھا۔ طرح میری تلاش میں نکل کھڑا ہوتا۔ اب اس میں

شبہ نہ کہ وہ مجھے قتل کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے میری طرف سے ہر ممکن تیزی کے باوجود فاضلی

اس وقت نمودار ہوا جب میں جھاڑیوں میں داخل ہوا تو اس نے مجھے دیکھتے ہی شاٹ گن سے فائر کیا اور گولی

”میں کہاں تھی۔ درمیان میں کوئی دوسو گز کا فاصلہ آ گیا تھا اس کے اگلے فائر سے پہلے میں جھاڑیوں میں داخل

رہا تھا۔ گلاب سے حصار میرے لیے اتنا کارآمد نہیں رہا تھا فاضلی نے دیکھ لیا تھا کہ میں کہاں ہوں اور وہ سیدھا

”میں جلد تمہیں تلاش کر لوں گا اور کتے کی موت مار دوں گا۔“ فاضلی بولا۔ وہ جھاڑیاں ہٹا ہٹا کر دیکھ رہا تھا اور

رفتہ رفتہ اس جھاڑی کے پاس آتا جا رہا تھا جس کے نیچے میں موجود تھا۔ ”کاش کہ میں نے اس زہریلے ناگ کو زندہ

پکڑنے کے بجائے اسی وقت اس کا سر چل دیا ہوتا۔“ میں نے سوچا لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ زندگی اور موت کا فیصلہ تو

اللہ کرتا ہے اگر فاضلی کی موت آگئی ہوتی تو وہ یقیناً میرے ہاتھ سے مارا جا چکا ہوتا لیکن ابھی اس کی موت کا وقت نہیں

آیا تھا۔ فاضلی نزدیک آتا جا رہا تھا اور وہ جس طرح ایک ایک جھاڑی کو ٹٹول رہا تھا مجھے قطعی خوش فہمی نہیں تھی کہ وہ اس

جھاڑی کو دیکھے بغیر چھوڑ دے گا۔ اس نے میری حالت دیکھ لی تھی اور جان گیا تھا کہ اس حالت میں، میں زیادہ دور نہیں

جاسکتا تھا جب کہ میں پہلے ہی اپنی ہمت سے بڑھ کر چل چکا تھا اس لیے لازمی کہیں آس پاس ہی چھپا ہوں گا۔ اس لیے

وہ سکون سے ایک ایک جھاڑی ٹٹول رہا تھا اس یقین کے ساتھ کہ جلد یا بدیر وہ مجھ تک پہنچ جائے گا۔ مگر قدرت کو کچھ

اور منظور تھا۔ فاضلی اس جھاڑی کے اتنے پاس آ گیا تھا کہ اس کے جوتے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ وہ شاٹ گن کی نال

سے جھاڑیاں ٹٹول رہا تھا پھر وہ جھاڑی کے پاس آ کھڑا ہوا میں نے سانس بھی روک لیا تھا۔ وہ شاٹ گن کی نال سے

پتے ہٹا رہا تھا اور کسی لمحے کوئی شاخ ہٹاتا اور اسے میرا دیدار نصیب ہو جاتا۔ اس کے بعد وہ مارے خوشی کے

فائر کرنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہ کرتا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ جھاڑی ہٹاتا کسی کے للکارنے کی آواز آئی۔ ”اوتے یہاں

کیا کر رہا ہے؟“

میرا دل ڈوب گیا۔ کیا فاضلی کے مزید کچھ آدمی آ گئے تھے۔ مگر فاضلی کا رد عمل بالکل مختلف تھا۔ اس نے بھڑک کر

بولنے والے پر فائر کر دیا۔ شاٹ گن اتنے قریب سے چلی کہ اس کے بارود کا دھواں مجھ تک آیا تھا۔ کوئی چلا یا اور

جواب میں بیک وقت کئی گولیاں چلیں اور فاضلی لڑکھڑا کر نیچے گرا۔ کوئی گولی اسے لگی تھی کیونکہ اس کی کراہ میں اذیت

شامل تھی۔ میں نے ذرا سر اوپر کر کے دیکھا تو فاضلی میرے بالکل سامنے زمین پر جت پڑا تھا اور اس کے سینے سے رے رے

کر خون ابل رہا تھا۔ گولی کسی قدر دائیں طرف لگی تھی اور یقیناً پچیس پھردوں میں گھس گئی تھی۔ فاضلی نے سر گھمایا اور غالباً

مجھے بالکل سامنے پا کر دم بہ خود رہ گیا تھا۔ میں مسکرایا اور

آہستہ سے کہا۔

”میں نے کیا کہا تھا، میں نے کئی افراد کے منہ سے اپنی موت کی پیشگوئی سنی ہے اور وہ خود فوت ہو گئے شاید تم بھی ان میں شامل ہونے والے ہو۔“

فاضلی نے کوشش کر کے شاٹ گن اٹھانا چاہی لیکن اسی لمحے کسی نے اس کے ہاتھ پر لات ماری اور شاٹ گن دوڑ جا گری۔ میں نے پھر سے خود کو سیکڑ لیا، مزید دبا گیا اس پر گولی چلانے والے آن پہنچے تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کون تھے۔ ان کی تعداد پھروں سے تین لگ رہی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو الزام دے رہے تھے۔ ”مجھے کس نے کہا تھا گولی چلانے کو۔“ کوئی بولا۔

”تو کیا اسے پھول مارتا، حرامی نے بھی تو گولی چلائی تھی۔“ دوسرا بولا۔ ”بس مولانا بچت کی۔“

”بچت کی اولاد، چودھری صاحب کو کیا جواب دے گا۔“ تیسرے نے کہا۔ ”ہم یہاں زمین دیکھتے ہیں بندے مارنے کے لیے نہیں ہیں۔“

”بکواس کیے جا رہے ہو پہلے اس نے گولی چلائی تھی۔“ دوسرا بھٹا گیا۔ ”چودھری صاحب نے یہ تو نہیں کہا ہے کہ کوئی گولی مارے تو بھی تم کچھ نہ کرو۔“

فاضلی ہاتھ کے اشارے سے ان لوگوں کو متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا غالباً وہ انہیں میرے بارے میں بتانا چاہتا تھا لیکن وہ آپس کی بحث میں الجھے ہوئے تھے۔ بالآخر فاضلی کا حوصلہ جواب دے گیا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ اچانک پہلے والے نے تشویش سے کہا۔ ”اوئے مجھے یہ بندہ جانا پہچانا لگ رہا ہے۔“

اب تیسرے کو یاد آ گیا۔ ”یہ تو مرشد بادشاہ کا آدمی ہے۔ ہاں یاد آ گیا فاضلی نام ہے اس کا۔۔۔“

”مارے گئے۔“ پہلا کراہا۔ ”اب کیا جواب دیں گے اس کے بارے میں؟“

”اے اٹھاؤ۔“ گولی چلانے والا پریشان ہو گیا۔ ”یہ مر گیا تو اور مصیبت آئے گی۔“

”مصیبت کے پتر گولی چلانے سے پہلے سوچنا تھا۔“ تیسرا بولا۔ ان میں ایک مختصر سا جھگڑا ہوا جس میں ایک دوسرے کی ماں بہنوں کو بے تکلفی سے کھینٹا گیا اور بالآخر مفاہمت ہو گئی۔ تینوں کو احساس تھا کہ انہوں نے مرشد کے خاص آدمی پر گولی چلا کر کتنی بڑی غلطی کی تھی اور وہ مرجاتا تو یہ غلطی نہایت سنگین ہو جاتی اور عین ممکن ہے انہیں اس کا تاوان

اپنی جان کی صورت میں دینا پڑتا۔ اس لیے انہوں نے جل کر فاضلی کو اٹھایا اور وہاں سے رخصت ہو گئے۔ رخ کیبن سے مخالف سمت میں تھا۔ ان کی باتوں سے لگا تھا کہ وہ کسی چودھری کے کارندے تھے اور اس کی زیر حفاظت کے لیے یہاں موجود تھے۔ دوسرے ان کی بات سے لگ رہا تھا کہ وہ مرشد اور فاضلی سے واقف تھے۔ مطلب تھا کہ میں مرشد کے علاقے میں ہی تھا۔ اس میں میرا جلد از جلد یہاں سے دور نکل جانا لازمی تھا۔

جیسے ہی وہ فاضلی سمیت جھاڑیوں سے نکلے میں گڑھے سے نکل آیا۔ اتنی دیر آرام کرنے کے بعد یہ حالت پہلے سے خاصی بہتر ہو گئی تھی۔ میں جھاڑیوں کی تک جھک کر چلتا رہا اگرچہ یہ پوز تکلیف دہ تھا لیکن کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ ممکن تھا کہ چودھری مزید کارندے تفتیش کے لیے اس طرف آنکلتے اور میں نظروں میں آ جاتا۔ یہ تو واضح تھا کہ وہ فاضلی کی جانب سے کیے جانے والے فائر کی آواز سن کر آئے تھے۔ میں جھاڑیوں اور درختوں کے درمیان والا میدان تیزی سے طے کیا کیونکہ اسی میں مجھے دیکھ لیے جانے کا سب سے بڑا خطرہ تھا لیکن خیریت رہی کسی طرف سے لکار سنائی نہ دی۔ درختوں میں داخل ہو کر میں نے چند منٹ آرام کیا پھر جیب کی طرف بڑھا۔ اگر وہ چلنے کے قابل تھی تو میں اس میں یہاں سے نکل سکتا تھا۔

مگر جیب کی حالت دیکھ کر لگ رہا تھا کہ وہ چلنے کے قابل نہیں ہے۔ ٹکڑے ریڈی ایٹر ٹوٹ گیا تھا اور پانی چکا تھا۔ اس حالت میں اگر جیب کا انجن اشارت بھی ہو تو چند منٹ سے زیادہ نہیں چل سکتا تھا اس کے بعد وہ سیر جاتا۔ میں ذرا آگے آیا تو زمین پر پڑا پستول مل گیا۔ میری نہیں پڑی تھی، وہ دھوپ میں چکا تو مجھے پتا چلا۔ میں جھک کر اسے اٹھایا اور پھر جیب کی طرف آیا۔ پچھلی لاش پر کھانے پینے کا سامان موجود تھا جو جھکے کی وجہ سے بیٹھ چپے کر گیا تھا۔ پانی کی بوتل محفوظ تھی اس کا ڈھکن بند تھا۔ لیے پانی بہہ جانے سے بچ گیا۔ میں نے ڈھکن کھول کر پانی بڑے گھونٹ لیے تو میری حالت میں نمایاں بہتری آئی تھی۔ کھانے کی باسکٹ بھی گر گئی تھی لیکن اس میں چھ چیزیں تھیں۔ میں نے باسکٹ اور پانی کی بوتل اٹھائی اور جیب کی طرف آیا۔ میں نے جان بوجھ کر نو می کی لاش کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔

کیبن میں آ کر شازی کے دوسرے ساتھی کے جسم سے جیکٹ اور اس کے جوتے اتارے۔ مجھے ان دونوں چیزوں کی ضرورت تھی۔ موسم معتدل ہو گیا تھا لیکن مجھے سامان رکھنے کے لیے جیکٹ کی ضرورت تھی میرے لباس میں جینس نہیں تھیں اور جوتے میری ضرورت تھے، ننگے پاؤں میں زیادہ دور نہیں جاسکتا تھا۔ جیکٹ پہن کر میں نے جیبوں میں کھانے پینے کی چیزیں اور شاٹ گن کے اضافی بلیٹ بھر لیے۔ پستول کے دو فاضل میگزین بھی ساتھ رکھ لیے تھے۔ پانی کی بوتل نصف ہو چکی تھی لیکن اب بھی اس میں ساڑھے تین لیٹرز کے قریب پانی موجود تھا۔ میں نے مزید پانی کیونکہ میں بوتل ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر بھٹکنا پڑے اس دوران میں پانی میرے کام آئے۔ دونوں کے لباس سے میں نے رقم بھی نکال لی تھی انہیں اس کی ضرورت نہیں تھی۔ فسوس کہ ان میں سے کسی کے پاس موبائل فون نہیں تھا ورنہ وہ میرے کام آتا۔ ایک شاٹ گن فاضلی لے گیا تھا دوسری میں نے اٹھائی۔

باہر آیا تو نہ چاہتے ہوئے بھی میری نظر نو می کی لاش پر پڑ گئی۔ جیب کے پہلوں نے اس کا جسم روند دیا تھا اور وہ کسی بڑی مڑی گڑیا کی طرح پڑی ہوئی تھی۔ میں نے اس کی مغفرت کی دعا کی اور وہاں سے چل پڑا۔ اس سے زیادہ میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ سورج کی پوزیشن سے میں نے مشرق کا تعین کیا۔ مغرب کی طرف پہاڑ تھے اور مشرق کی طرف مجھے کوئی نہ کوئی آبادی مل جانی۔ اگر میں مرشد کے علاقے میں تھا تب بھی مجھے مشرق کا ہی رخ کرنا تھا۔ میری حالت پہلے سے خاصی بہتر ہو گئی تھی لیکن کچھ دیر چلنے کے بعد کمر میں تکلیف شروع ہو جاتی اور مجھے رکنا پڑتا تھا۔ اپریل کا آغاز تھا اس لیے دھوپ میں شدت آگئی تھی اور مجھے بار بار پیاس لگ رہی تھی۔ یہ اتنے عرصے تک پانی سے محرومی کا قدرتی نتیجہ بھی تھا اس لیے میں ہر پانچ چھ منٹ بعد ایک گھونٹ پانی پی رہا تھا اس سے میرے جسم میں پانی کی کمی رفتہ رفتہ دور ہو رہی تھی۔ ایک گھنٹے بعد میں نے ڈھل روٹی کا ایک ٹوس کھایا۔ باسی ہونے سے اس کا ذائقہ کسی قدر بدلا تھا مگر مجھے ٹھیک لگا۔

جب دوبارہ روانہ ہوا تو دس منٹ بعد ایک کچی سڑک مل گئی۔ میں نے اس کے راستے سے جان بوجھ کر اجتناب کیا تھا جس سے گزر کر فاضلی اور اس کے ساتھی کیبن تک آتے جاتے تھے۔ اگر فاضلی ہوش میں آ جاتا اور میرے

بارے میں انکشاف کر دیتا تو چودھری کے آدمی یقیناً اسی طرف میری تلاش کرتے اس لیے میں ویران جگہوں سے گزرتا رہا۔ البتہ اس راستے پر آ کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ میں اس جگہ سے پانچ چھ کلومیٹرز دور نکل آیا تھا اور عین ممکن تھا کہ یہ وہ کچا راستہ نہ ہو۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور کچے راستے پر چل پڑا لیکن میں نے کان کھلے رکھے تھے اگر مجھے کسی گاڑی کی آواز سنائی دیتی تو میں راستہ چھوڑ کر نزدیکی جگہ پناہ لیتا جہاں گزرنے والوں کی نظر مجھے نہ دیکھ پاتی۔ لیکن خاصی دیر گزر جانے کے باوجود کوئی گاڑی تو کیا کوئی پیدل بندہ بھی نہیں ملا اور نہ ہی کسی آبادی کے آثار دکھائی دیے تھے۔

شام کے چار بج رہے تھے اور اب سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ میں نے شازی کی کلائی سے گھڑی اتار لی تھی۔ اس سے وقت دیکھنے کی آسانی ہو گئی تھی۔ ساڑھے چھ بجے تک سورج غروب ہو جاتا اور تاریکی چھا جاتی اگر میں اس وقت تک کسی آبادی تک پہنچنے میں ناکام رہتا تو رات مجھے اسی ویرانے میں گزارنی پڑتی۔ لیکن مجھے اس کی زیادہ فکر نہیں تھی کیونکہ میرے پاس کھانا پانی تو تھا۔ میں آرام سے کل کا دن بھی گزار سکتا تھا۔ پانچ بجے ایک جگہ رک کر میں نے قبل از وقت ڈنر کیا کیونکہ اندھیرا اچھانے کے بعد یہ کام ذرا مشکل ہو جاتا اور اس کا بھی امکان تھا کہ کھانے کی چیزیں خراب ہو سکتی ہیں۔ ویسے بھی کئی دن بھوکے رہنے کے بعد مجھے رہ رہ کر بھوک لگ رہی تھی اور مسلسل چلنے سے کھائی جانے والی چیزیں فوراً ہی ہضم بھی ہو رہی تھیں۔ سورج غروب ہونے کے بعد میں نے تقریباً تمام چیزیں ختم کر دی تھیں اور اب میرے پاس صرف پانی رہ گیا تھا۔ یہ بھی اب دو لیٹر زہرہ گیا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کمر کی تکلیف کم ہو گئی تھی مگر اب بھی چلتے ہوئے جھٹکا لگتا تو کمر میں چمک سی اٹھتی تھی۔ مجھے فاضلی کا خیال آیا۔ گولی اس کے سینے میں لگی تھی اور اس وقت وہ چند منٹ کا مہمان نظر آ رہا تھا لیکن اس کا بھی امکان تھا کہ فوری طبی امداد ملنے سے وہ بچ جائے۔ اس نے مجھے مارنے کی پوری کوشش کی تھی۔ بلکہ آخری لمحے تو وہ دیوانہ ہو گیا تھا۔ جیسے اپنی زندگی کی قیمت پر مجھے ماردینا چاہتا ہو۔ مگر ہوا یہ کہ قدرت نے میرے بجائے اس کا نام مرنے والوں میں شامل کر رکھا تھا۔ اس وقت جب بے ظاہر وہ پوری طرح با اختیار تھا اور موت مجھ سے صرف ایک جنبش کے

فاصلے پر رہ گئی تھی تو اچانک تقدیر نے پلٹا کھایا۔ شاید فاضلی نے بھی نہیں سوچا ہوگا کہ گولی میرے جسم میں اترنے کے بجائے اس کے سینے میں اتر جائے گی۔ اس گولی نے اسے مجبور کر دیا ورنہ اس نے ہار نہیں مانی تھی اور آخری وقت میں بھی مجھے مارنے کی کوشش کی۔ وہ بھول گیا کہ مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہے۔

تاریکی چھانے کے بعد میں نے سفر کی رفتار درست کر دی تھی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ آج چاند کی سولہ یا سترہ تاریخ ہے اور کچھ دیر میں چاند طلوع ہو جائے گا تب میں زیادہ آسانی سے سفر کر سکوں گا اس لیے میں ایک جگہ رک گیا۔ جھاڑیوں اور گھاس میں رکنے کے بجائے میں نے ایک صاف جگہ منتخب کی جہاں سانپ یا کسی زہریلے کیڑے کے پائے جانے کے امکانات کم تھے۔ کئی گھنٹے کے مسلسل سفر نے مجھے تھکا دیا تھا اس لیے لینا تو پتا نہیں چلا کہ کب آنکھ لگ گئی۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ کوئی میرے پاس ہے کوئی بول رہا تھا۔ میرا ذہن چونکا ہو گیا۔ جاگتے ہی مجھے اپنے پاس دو افراد کی موجودگی کا احساس ہوا لیکن میں نے حرکت سے گریز کیا پھر ایک سہمی ہوئی نسوانی آواز آئی۔ ”اماں اے زندہ اے کہ مر گیا۔“

”چپ کریم بختے۔“ دوسری عورت نے جو آواز سے عمر رسیدہ لگ رہی تھی اسے جھڑک دیا۔

”اماں دیکھ تو۔“

”نہ کوئی چکر نہ ہو، کوئی مار کر ڈال گیا ہو پولیس ہمیں پکڑ لے۔“

اتنی دیر میں مجھے پہلی بار کسی انسان سے واسطہ پڑا تھا۔ میں اچانک اٹھا تو دونوں عورتوں کی چیخ نکل گئی۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ”ڈرو نہیں، میں سو رہا تھا۔ مسافر ہوں تھک گیا تو ادھر آنکھ لگ گئی۔“

”کہاں سے آرہا ہے۔“ بوڑھی عورت نے پوچھا۔ چاند نکل آیا تھا اور اس کی روشنی میں وہ دونوں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ جوان لڑکی یا عورت خود چاند سے کم نہیں تھی وہ بوڑھی عورت کے پیچھے دہلی اپنی فسوں خیز آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

”مجھے راولپنڈی جانا ہے۔ یہاں پاس کوئی آبادی ہے جہاں سے مجھے پنڈی جانے کے لیے سواری مل جائے۔“ میں نے کہا۔

”پاس ہمارا گاؤں ہے۔“ لڑکی نے جرات کر کے

کہا۔ ”وہاں سے تانگہ مل جائے گا۔“

”گاؤں کہاں ہے؟“

”اس ٹیلے کے پیچھے۔“ لڑکی نے جواب دیا۔ بوڑھی عورت خاموش تھی اور اسے لڑکی کا بولنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

اس نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا۔ ”بس اب گھر چل۔“

دونوں ٹیلے کی طرف چل پڑیں ان کے ہاتھوں میں مٹی کے لوٹے تھے اور وہ رفع حاجت کے لیے یہاں آئی تھیں جیسا کہ گاؤں کا رواج ہے۔ عورتیں رات کے ابتدائی پہر میں باہر جاتی ہیں۔ لیکن اب یہ رواج بہت ہی دور دراز اور پس ماندہ دیہات میں رہ گیا تھا۔ میں نے عورتوں کے پیچھے جانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ شکر ہے انہوں نے شاٹ گن نہیں دیکھی تھی وہ زمین پر پڑی تھی اور ان کی نظر اس پر نہیں گئی۔ ان کے جانے کے بعد میں نے شاٹ گن

اٹھائی۔ جب میں دوسری طرف سے ٹیلے کے پیچھے گاؤں کے پاس پہنچا تو میرا اندازہ درست ثابت ہوا یہ چھوٹا سا گاؤں تھا جس میں تقریباً سارے مکان غریب غریبا کے تھے۔ گھروں کی تعداد سو سے بھی کم تھی اور ہاں بجلی بھی نہیں تھی باقی سہولتوں کا حال سوچا جاسکتا تھا۔ ہاڑوں کی کثرت بتا رہی تھی کہ یہ لوگ چرواہے تھے اور مویشی پالتے تھے۔ میں نے گاؤں سے باہر جانے والے راستے کا جائزہ لیا اور

شاٹ گن ایک جگہ چھپا دی۔ گاؤں کی واحد دکان کھلی ہوئی تھی۔ لائیس کی روشنی میں چند افراد بچوں پر بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر سب خاموش ہو گئے میں چلیے اور انداز سے گاؤں یا آس پاس کا نہیں لگ رہا تھا۔ اس خاموشی کو میں نے توڑا۔ ”اسلام علیکم۔“

ان الفاظ نے خوف اور اجنبیت کی دیواریں گرا دیں اور وہ سب اٹھ کر گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملانے لگے۔

مجھے بیٹھنے کی دعوت دی گئی اور دکاندار نے عقب میں موجود مکان کی طرف بچے کو دوڑایا کہ چائے لے کر آئے۔ چائے کے لفظ نے میرے اندر زندگی بھر دی تھی۔ انہوں نے کنویں کا تازہ اور مٹی کی خوشبو والا پانی پیش کیا جسے میں بلا تکلف پی گیا۔ حالانکہ میرے پاس منرل واٹر موجود تھا۔ پانی پی کر میں نے اپنا تعارف کرایا اور ظاہر ہے غلط کرایا تھا۔ ”شکاری ہوں، راولپنڈی سے آیا ہوں اور یہاں ایک جگہ راستہ بھول گیا پھر گاڑی بھی خراب ہو گئی۔ اب مجھے راولپنڈی واپس جانا ہے اور میں کئی گھنٹے سے اس علاقے میں بھٹک رہا ہوں لیکن راستہ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔“

ان حضرات نے پہلے پوچھا کہ میں شکار کے لیے کہاں گیا تھا۔ میں نے مرشد کی درگاہ والی جگہ کے نزدیک ایک جگہ کا نام لیا۔ ایک آدمی چمک کر بولا۔ ”میں سمجھ گیا جی۔۔۔ آپ کی گڈی کہاں ہے؟“

”یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم، شہر جاؤں گا تو مدد لے کر آؤں گا۔ میرا تو سامان بھی گاڑی میں بند پڑا ہے۔ بس کھانے پینے کا سامان لے کر چلا تھا۔“

انہوں نے ایک کچے نقشے کی مدد سے سمجھایا کہ میں پنڈی سے کوئی پندرہ میل دور تھا اور مجھے یہاں سے پنڈی لے جانے کے لیے تانگہ مل سکتا تھا لیکن وہ مجھے نزدیکی سرک تک لے جاتا جہاں رات کو بھی ٹریفک چلتا ہے اور مجھے پنڈی جانے کے لیے کوئی نہ کوئی گاڑی مل جاتی۔ تانگے والے کو بلایا گیا۔ درحقیقت یہ ریڑھا تھا جس پر روز صبح و شام دودھ رکھ کر شہر لے جایا جاتا تھا۔ اسے تانگہ کہنا ایسا ہی تھا جیسے کسی کمرشل یک اب کو کار کہنا، مگر یہ تانگے سے یوں بہتر تھا کہ اس میں جھٹکے کم لگتے۔ تانگے والے سے پہلے جانے آگئی جو خاص دیہاتی طرز کی تھی۔ دودھ میں چند دانے چائے کی پتی کے پکا کر اسے چائے قرار دیتے ہیں۔ میں چائے پی کر روانہ ہونے کو تیار تھا۔ اس نے چائے کا سرور بخشا ہوا نہ لیکن مجھے تازہ دم ضرور کر دیا تھا۔ خوش قسمتی سے دکان والے کے پاس پینا ڈول بھی تھی۔ میں نے اس سے ایک پتالے لیا اور دو گولیاں اسی وقت کھالیں۔ دکاندار میری مہمان نوازی پر آمادہ تھا لیکن میں نے منع کر دیا۔

”دوستو، تم لوگوں نے جتنی خاطر کر دی ہے وہی بہت ہے۔ میرے گھر والے پیچھے پریشان ہوں گے اور نیکی نے تو اعلان بھی کر دیا ہوگا کہ میں کسی کے ساتھ بھاگ گیا ہوں شکار کا تو بہانہ ہے۔“

وہ مسکرانے لگے تھے بہر حال اس جھوٹ کی وجہ سے مجھے جانے کی اجازت مل گئی۔ ریڑھا ایکسپریس سواری تھی اور اس پر دودھ کے فولادی ڈرم جاتے تھے لیکن میں ڈرم نہیں انسان تھا اس لیے ریڑھے کی ناہمواری پر میرے لیے تکلیف کے بے شمار اسباب تھے۔ اس کا حل یہ نکالا گیا کہ دکان والے نے گھر سے ایک روٹی کا گدا منگو کر اس پر بچھا دیا اور میں آرام سے بیٹھ گیا۔ ان لوگوں کے خلوص اور مہمان نوازی نے مجھے متاثر کیا تھا لیکن میں نے غلطی سے بھی ایسا کوئی سوال نہیں کیا جو بعد میں میری نشان دہی کا باعث بن جاتا۔ میں تو یہاں سے جا رہا تھا لیکن یہ معصوم لوگ فاضلی یا

چودھری کے عتاب کا نشانہ بن سکتے تھے۔ اب وہ پورے یقین سے کہہ سکتے تھے کہ ادھر آنے والا تو اصل میں شکاری تھا۔ اسی وجہ سے میں نے شاٹ گن اٹھانے کا ارادہ بھی ترک کر دیا۔ ریڑھے والا بعد میں بتاتا کہ شکاری باؤ نے راستے سے ایک شاٹ گن بھی اٹھائی تھی تو میرا کردار مشکوک ہو جاتا۔ راستہ کچا تھا مگر گدے کی وجہ سے آسانی سے طے ہو گیا۔ میں باقاعدہ لیٹ کر سفر کرتا رہا۔

آدھے گھنٹے بعد ریڑھے والے نے مجھے ایک کچی سرک کے کنارے اتارا۔ رات کے دس بج رہے تھے اور سرک دیران تھی لیکن ریڑھے کے مالک نے مجھے یقین دلایا کہ یہاں سے وقفے وقفے سے بسیں گزرتی تھیں۔ دوسری ٹریفک بھی چلتی رہتی تھی۔ وہ ہاتھ ملا کر جانے لگا تو میں نے زبردستی اسے دو سو روپے تمنا دیے۔ وہ بہت خوش ہو کر اور بار بار سلام کرتا گیا تھا۔ یہی دو سو روپے میں اتنی طویل مسافت پر کسی ٹیکسی والے کو پیش کرتا تو اس کا منہ سیدھا نہیں ہوتا۔ آدھے گھنٹے بعد تو نہیں لیکن پون گھنٹے بعد ایک بس نمودار ہوئی جو پنڈی کی طرف جا رہی تھی۔ رات کے اس وقت بھی یہ مسافروں اور ان کے اسباب سے لبالب بھری ہوئی تھی۔ مگر رکنے پر پتا چلا کہ بس برات لے کر واپس جا رہی ہے۔ مجھے چھت پر موجود برات کے ساتھ بیٹھنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ دولہا بھی وہیں موجود تھا اور دلہن نیچے زنانہ کپارٹ میں تھی۔ برات پنڈی سے بھی آگے کہیں واپس جا رہی تھی۔ یہ شہر میں داخل نہیں ہوئی لیکن مجھے شہر کے پاس اتار دیا۔ آدھے گھنٹے بعد میں ایک ٹیکسی میں پنڈی کی طرف جا رہا تھا۔ راجا بازار میں ساری رات کھلے رہنے والے ایک ہوٹل کے فون سے میں نے عبد اللہ کو کال کی۔

”شہباز صاحب۔۔۔“ اس نے بے یقینی سے کہا۔

”یار اب تک تو تم لوگوں کو عادی ہو جانا چاہیے میں ایسے ہی غائب ہو کر ایسے ہی واپس آ جاتا ہوں۔ ہاں جب دنیا میں نہ رہا تو پھر واپسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔“

”اللہ نہ کرے۔“ اس نے جلدی سے کہا۔ ”یہ بتائیں کہ آپ کہاں سے بات کر رہے ہیں؟“

”لائسنس محفوظ ہے؟“

”ہاں آپ اس کی فکر نہ کریں۔“

میں نے عبد اللہ کو ہوٹل کے بارے میں بتایا۔ جب تک وہ یا اس کے آدمی آتے ہیں میں نے ڈنر کر لینا مناسب سمجھا۔ چلیے سے قطع نظر میرے پاس مال غنیمت کی خاصی رقم

ماہنامہ سرگزشت

180

www.pakcity.com

ماہنامہ سرگزشت

181

www.pakcity.com

ماہنامہ سرگزشت

180

www.pakcity.com

ماہنامہ سرگزشت

181

www.pakcity.com

ماہنامہ سرگزشت

180

www.pakcity.com

ماہنامہ سرگزشت

181

تھی اس لیے میں نے ویٹر کی مشکوک نظروں کی بالکل پروا نہیں کی البتہ طے کر لیا کہ اس بدتمیز ویٹر کو پھر گز نہیں دوں گا۔ جب میں ڈنر سے فارغ ہو کر کافی پی رہا تھا تو ایک سیاہ وین آکر ہوٹل کے دوسری طرف رکی۔ میں چونکا ہوا گیا لیکن جب وین سے عبداللہ دو افراد کے ساتھ اترے تو میرے اتنے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ عبداللہ اپنے آدمیوں کو باہر چھوڑ کر اندر آیا اس نے اندر آتے ہی مجھے دیکھ لیا تھا۔ اس لیے سیدھا میرے پاس آیا اس نے بلا تمہید کہا۔ ”شہباز صاحب فوراً چلیں، حالات ٹھیک نہیں ہیں آپ کا اس طرح منظر عام پر ہونا ٹھیک نہیں ہے۔“

میں پہلے ہی بل ادا کر چکا تھا اس لیے فوری روانگی میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ عبداللہ کا لہجہ بتا رہا تھا کہ حالات واقعی گہمیر ہیں۔ لیکن میں نے سوال جواب کی جگہ پہنچنے تک کے لیے ملتوی کر دیے۔ سیاہ وین میں مزید تین افراد تھے۔ ایک ڈرائیور اور دو مسلح افراد موجود تھے۔ گویا عبداللہ پانچ افراد کے ساتھ آیا تھا لیکن سیاہ وین چلی تو مزید دو گاڑیاں اور حرکت میں آئیں۔ ان میں سے ایک وین کے پیچھے آگئی اور ایک آگے نکل گئی۔ میں نے عبداللہ کی طرف دیکھا تو اس نے سر کی جنبش سے تصدیق کی کہ یہ اس کے آدمی تھے۔ گویا وہ پوری تیاری کے ساتھ آیا تھا۔ اگر کوئی مداخلت کرتا تو اسے بھرپور جواب دیا جاسکتا تھا۔ لیکن سیاہ وین کا رخ عبداللہ کی کوشی کی طرف نہیں تھا۔ اس لیے میں نے پہلا سوال ضروری سمجھا۔ ”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”پنڈی میں ایک جگہ ہے۔“ عبداللہ نے جواب دیا۔ ”اسلام آباد میں ہتھیاروں کے ساتھ نقل و حرکت مشکل ہوئی ہے۔“

میں چونکا۔ ”تم نے کوشی چھوڑ دی ہے، سعدیہ اور مونا کہاں ہیں؟“

عبداللہ مسکرایا۔ ”وہ سفیر صاحب کے ساتھ حویلی جا چکی ہیں۔ بیٹو اور مانی بھی وہیں ہیں۔“

”یہ کب گئے؟“

”تین دن ہو گئے ہیں۔“

”وسیم اور دوسرے لوگ؟“

”سب اپنی اپنی جگہوں پر ہیں اور خیریت سے ہیں۔“ میں نے سکون کا سانس لیا۔ ورنہ اسیری کے دنوں میں مجھے سب سے زیادہ یہی خیال پریشان کرتا تھا کہ میرے ساتھی جذباتی ہو کر کوئی ایسا قدم نہ اٹھالیں کہ خود انہیں

نقصان پہنچ جائے۔ مگر انہوں نے عقل مندی کا ثبوت دیا تھا۔ اس دوران میں انہوں نے کرنے والا کام کر لیا تھا یعنی مونا اور سعدیہ کو حویلی پہنچا دیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ عبداللہ نے چار مزید تربیت یافتہ آدمی بھی وہاں بھیج دیے تھے جب کہ چھ ایجنسی گارڈز پہلے ہی تھے۔ مانی حویلی کی الیکٹرانک سیکورٹی کرنے گیا تھا۔ تمام آلات اس نے میرے ساتھ لے کر پہلے ہی حاصل کر لیے تھے۔ وہ لوگ یہاں زیادہ محفوظ تھے۔ عبداللہ سے موبائل لے کر میں نے حویلی کال کی اور جب تک ہم اپنے ٹھکانے پر پہنچے میری تقریباً سب سے بات ہو گئی تھی۔ صرف سویرا رہ گئی تھی اور میں چاہنے کے باوجود کسی سے نہیں کہہ سکا تھا کہ اس سے میری بات کرا دے۔ پھر یہاں وین میں بھی سب موجود تھے اس لیے سویرا سے بات میں نے بعد کے لیے ملتوی کر دی۔

نیا ٹھکانا فیض آباد کے پاس ایک کوشی تھی۔ یہ جگہ مری روڈ سے زیادہ دور نہیں تھی۔ کوشی زیادہ بڑی نہیں تھی لیکن اس کی دو خوبیاں تھیں، ایک تو اس کے دونوں طرف گلی تھی اور طویل ڈرائیو دے ایک گیٹ سے دوسرے گیٹ تک تھا۔ آنے جانے کے لیے کوئی بھی گیٹ استعمال کیا جاسکتا تھا۔ دوسرے اس کے دائیں بائیں کوئی مکان نہیں تھا اس لیے یہ آبادی میں ہوتے ہوئے بھی آبادی سے الگ تھی۔ میں اندر آیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ کوشی باہر سے خالی اور خاموش لگ رہی تھی لیکن اندر سے پوری طرح آباد تھی۔ وہ اس طرح کہ عبداللہ کی کوشی والے تقریباً تمام افراد یہاں نظر آرہے تھے۔ میں نے عبداللہ کی طرف دیکھا۔ ”لگتا ہے تم نے مستقل ٹھکانا بنالیا ہے؟“

”ایسا ہی سمجھ لیں۔ میں کچھ عرصے سے چکر میں تھا کہ کوئی مناسب جگہ ملے جسے دشمنوں سے چھپ کر حاصل کیا جاسکے۔ اتفاق سے یہ کوشی بک رہی تھی مالک باہر جا رہا تھا۔ میں نے سامنے آئے بغیر ایک وکیل کے توسط سے خرید لی۔ پھر اسی وکیل کی مدد سے یہاں کام کراتا رہا اور جب ہمیں ضرورت پڑی تو یہاں منتقل ہو گئے۔ یہ پہلی کوشی کی طرح بڑی اور پُر آسائش تو نہیں ہے لیکن سیکورٹی کے لحاظ سے اچھی ہے۔“

پہلی منزل تو صرف نشست گاہ، ملازموں اور دوسرے کاموں کے لیے مخصوص تھی دوسری منزل پر رہائشی کمرے تھے۔ نیچے آٹھ کمرے تھے تو اوپر بھی آٹھ کمرے تھے اور ان میں سے پانچ مکمل بندروڑ تھے باقی کو بھی اس

مصدق کے لیے استعمال کیا جاسکتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک بڑا سالون تھا۔ عبداللہ نے اوپر آتے ہوئے کافی کا کہہ دیا تھا پھر اس نے مجھے ایک بیڈروم دکھایا۔ ”یہ آپ کے لیے ہے“ یہاں آپ کا سامان بھی آگیا ہے اگر چاہیں تو باتھ لے کر پہنچ کر لیں۔“

خود میرا دل بھی یہی چاہ رہا تھا اس لیے میں تو لیا لے کر باتھ روم میں چلا گیا۔ موسم رات کو سرد ہو جاتا تھا اس لیے گرم پانی مڑہ دے گیا۔ پھر میں نے کمر کی بھی سکاکی کی جس میں اب بھی درد باقی تھا۔ دس منٹ بعد میں باتھ روم سے نکلا تو جیسے گزشتہ دنوں کے مصائب بھی پانی کے ساتھ بہا آئے اور بالکل ہلکا پھلکا ہو رہا تھا۔ ایک آرام دو۔ ٹراؤزر اور شرٹ پہن کر میں لاؤنج میں آیا تو کافی اور کچھ چیزیں آہنی تھیں۔ عبداللہ نے کہا۔ ”وسیم صاحب بھی روانہ ہو چکے ہیں وہ دس پندرہ منٹ میں یہاں پہنچ جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے سند باد جہازی کے نئے سفر نامے کی تفصیل اس وقت تک کے لیے ملتوی کی جاتی ہے۔“ عبداللہ مسکرانے لگا۔ ”یہ آپ نے ٹھیک فرمایا۔ اچانک ہی کسی نئے سفر پر لے جائے جاتے ہیں اور واپسی کے بعد حیرت انگیز کہانیاں سناتے ہیں۔“

”راجا صاحب کیسے ہیں؟“

”ٹھیک ہیں درمیان میں ان کی طبیعت خراب ہوئی تھی لیکن اب بہتر ہے۔ وہ آپ کے بارے میں روز ہی پوچھتے ہیں۔“

”اللہ ان کو صحت دے۔“ میں نے کہا اور نادر کے بارے میں پوچھا۔

”وہ بدستور سرکاری تحویل میں ہے۔“ عبداللہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”اس نے کچھ انکشافات بھی کیے ہیں۔“

”کیسے انکشافات؟“

”ایک تو یہ کہ مرشد کے ڈیرے یعنی نام نہاد درگاہ پر فیرنگی آکر رکھتے ہیں اور اپنے حلیے اور ڈیل ڈول سے وہ کسی نام شیعے سے متعلق لگتے ہیں۔“

”کمانڈوز ٹائپ؟“

”آپ نے درست کہا۔ جب وہ آتے ہیں اور عام طور سے گروپ کی صورت میں آتے ہیں تو درگاہ کو عارضی طور پر عام لوگوں کے لیے بند کر دیا جاتا ہے۔“

”یہ نادر کا مشاہدہ ہے یا وہ اس بارے میں کچھ جانتا ہے؟“

”میرا خیال ہے وہ جانتا ہے لیکن بتا نہیں رہا ہے۔“ اس کا کہنا ہے کہ اسے یہ بات اس کے ایک آدمی نے بتائی ہے جو درگاہ میں ہوتا ہے اور نادر کا وفادار ہے۔“

میں سوچ میں پڑ گیا تھا۔ عبداللہ غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ”آپ کا کیا خیال ہے مرشد نے ہمارے خلاف باہر سے کرائے کے گوریلے منگوائے ہیں؟“

”نہیں اسے ان کی ضرورت نہیں ہے اس کے پاس ایسے آدمیوں کی کمی نہیں ہے جو اس کے ایک اشارے پر جان قربان کر دیں۔ یہ کوئی اور ہی چکر لگتا ہے۔ یہ بتاؤ کہ میری غیر موجودگی میں تم لوگوں نے مرشد کے خلاف کوئی قدم تو نہیں اٹھایا؟“

”اس بارے میں آپ کو وسیم صاحب ہی بتائیں گے۔“

ادھر عبداللہ نے یہ جملہ کہا اور ادھر وسیم نے اندر قدم رکھا۔ ”میرا ذکر ہو رہا تھا۔“ اس نے کہا اور مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔ ”شکر ہے آپ کو صحیح سلامت دیکھ رہا ہوں۔“

”لیکن اس سے یہ مت سمجھنا کہ دشمنوں نے کوئی کسر چھوڑ دی تھی۔ بس یہ سمجھ لو کہ اللہ کی مہربانی ہے کہ اس وقت تم لوگوں کے سامنے ٹھیک ٹھاک کھڑا ہوں۔“

”ہم نے جو ویڈیو میں دیکھا تھا وہی بتانے کو کافی تھا۔“ کہتے ہوئے وسیم کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ”لیکن مرشد کو اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑے گا۔“

”شکر ہے تم لوگوں نے کوئی اندھا قدم نہیں اٹھایا۔“

”نہیں قدم تو اٹھایا تھا۔“ وسیم معنی خیز انداز میں بولا۔ ”مرشد، مرشد ہاؤس کے لان میں چہل قدمی کر رہا تھا کہ ایک گولی نے اس کے کلاہ کے اٹھے ہوئے حصے میں سوراخ کر دیا تھا۔“

”اتنا سچا نشانہ؟“

وسیم نے سر ہلایا۔ ”میں نے خود لگایا تھا۔ مرشد ہاؤس سے کوئی سات سو گز کی دوری پر ایک چھ منزلہ فلیٹ مپلس ہے اس کی چھت سے نشانہ لیا تھا۔“

”یہ کب کی بات ہے؟“

”ایک ہفتہ ہو گیا ہے جب آپ کو غائب ہوئے دوسرا دن تھا اور اس کے بعد ہی ہمیں ویڈیو ملی تھی۔“

”اس وقت میں اکرم چشتی کے عتاب سے گزر رہا تھا۔ اس حرا مزادے نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔“

”عقرب وہ ہمارے پاس ہوگا اور تب ہم بھی کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے۔“ وسیم نے کہا۔ ”اس واقعے کے بعد

مرشد دل گیا تھا اس نے فون پر ہم سے وعدہ کیا کہ آپ کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

”مرشد اور اس کا وعدہ۔“ میں نے تلخی سے کہا۔ ”تم شیطان کے وعدے پر اعتبار کر سکتے ہو مرشد کے وعدے پر نہیں۔“

”کیا اس نے پھر کچھ کیا تھا؟“

”کچھ نہیں.... بس یوں سمجھ لو اس نے مجھ سے ہمیشہ کے لیے جان چھڑانے کا پلان بنا لیا تھا وہ تو قدرت کو منظور نہیں تھا ورنہ اس وقت میں تمہارے پاس کسی پانچ سالہ بچے کی طرح موجود ہوتا۔ اپنی شخصیت اور ماضی سب بھول چکا ہوتا۔“ میں نے انہیں کسی قدر تفصیل سے بتایا کہ مجھ پر کیا گزری تھی۔ جب میں فاضلی کی واپسی تک پہنچا تو وسیم نے کہا۔ ”وہ نہایت شاطر آدمی ہے اس نے نہ جانے کیسے فیصل کوشتے میں اتار لیا اور اس کی مدد سے فرار ہو گیا۔“

”اس نے فیصل کو دس لاکھ روپے کا لالچ دیا تھا اور جب وہ خطرے کی حدود سے نکلا تو اس نے سب سے پہلے اس غدار کا کام تمام کیا تھا۔“

”ہمیں اس کی لاش مل گئی تھی۔ وہ اچھا آدمی تھا۔ دجانے کیسے فاضلی کے چکر میں آ گیا۔“ وسیم نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ”اس کے بھائی آکر اس کی لاش لے گئے تھے۔“

میں نے داستان آگے شروع کی۔ شخصیت اور یادداشت ختم کرنے والے انجکشن کا سن کر وسیم نے پھر مداخلت کی۔ ”مجھے معلوم ہے، کوئی جاپانی کمپنی نے چند سال پہلے بنائے تھے کہ وہ مجرم جو کسی صورت نہیں سدھر سکتے.... اور وہ جیل میں بھی سکون سے نہیں رہتے ان کو یہ انجکشن لگا کر مسئلہ ہی ختم کر دیا جائے۔ جاپان میں سزائے موت پر پابندی ہے لیکن جب انسانی حقوق کی تنظیموں نے شور کیا تو اس انجکشن کو بین قرار دے دیا مگر سنا تھا کہ یہ چوری چھپے بک رہے ہیں۔“

”تم بھی کچھ انجکشن منگواؤ۔“ میں نے مشورہ دیا۔ ”ہم اپنے دشمنوں پر آزما سکتے ہیں۔“

”یہ کام مجھ پر چھوڑ دیں۔“ عبد اللہ نے کہا۔ داستان سمیٹتے ہوئے بھی صبح کے تین بج گئے تھے۔ آخر میں فاضلی کے شدید زخمی ہونے کا سن کر وسیم پرجوش ہو گیا۔ ”اگر وہ مرا نہیں ہے تو کسی اسپتال میں ہوگا وہیں اس کا کام تمام کر دیتے ہیں۔“

میں نے اس سے اختلاف نہیں کیا کیونکہ میرے

ساتھی متفق ہو گئے تھے کہ اب دشمن کو اس کے سکون میں ادائیگی کی جائے اور انہماکی کی یا لیس کو بالائے طاق رکھ دیا جائے کیونکہ دشمن اسے مانتا ہی نہیں ہے۔ عبد اللہ نے تائید کی۔ ”اگر ایسا ہے تو ایک دشمن سے تو جان چھوٹے گی۔“

”اب مجھے صحیح معنوں میں اندازہ ہوا ہے کہ فاضلی کس قدر خطرناک شخص ہے۔“ وسیم نے کہا۔ ”اس شخص کو پہلی فرصت میں اس دنیا سے رخصت کر دینا چاہیے۔“

”اس کے عزائم تو اپنے حقیقی باپ کے لیے بھی خطرناک ہیں، وہ مرشد کا بھی صفایا کرنا چاہتا ہے لیکن اس سے پہلے وہ اس کی جگہ حاصل کر لے گا۔“ میں نے کہا۔ ”یہ اچھا ہوا کہ فیصل نے اسے حویلی سے یوں نکالا کہ وہ اس کی لوکیشن نہیں دیکھ سکا ورنہ ہمیں بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑتا۔“

وسیم نے سر ہلایا۔ ”اسی وجہ سے میں نے فیصل کا قصور معاف کر دیا اور اس کے گھر والوں کو دس لاکھ روپے بھیجے ہیں۔ اب سانپ زخمی ہے اور اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ صحت یاب ہو کر ڈسنے کے قابل ہو جائے اس کا سر ہمیشہ کے لیے نیکل دینا ہی بہتر ہوگا۔“

”میں ابھی اپنے آدمیوں کو لگاتا ہوں وہ شہر کے تمام اسپتالوں میں اسے دیکھیں۔“ عبد اللہ کھڑا ہو گیا۔ ”شہباز صاحب آپ آرام کریں۔ اگر کمر میں تکلیف زیادہ ہے تو ڈاکٹر بھی آ سکتا ہے۔“

”نہیں اب تو معمولی سی رہ گئی ہے۔“ میں نے انکار کر دیا۔ ”اگر تکلیف بڑھ گئی تو صبح کسی ڈاکٹر کو دکھا لوں گا لیکن یہاں کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

پوچھا۔ اس نے جواب دیا۔ ”اس کا پتا نہیں چلا ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ کسی اسپتال میں ہوا تو اصل نام سے نہیں ہوگا اس لیے میں نے حویلی کے زخم کے حوالے سے معلوم کرایا۔ میرے آدمی انجکشن کے سادہ لباس نمائندے بن کر پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ لیکن ایسا لگ رہا ہے کہ یا تو فاضلی کو کسی عام سے نیکل یا اسپتال میں داخل کرایا گیا ہے یا پھر اس کا گھر میں بلانچ ہو رہا ہے یا پھر....“

”وہ دنیا سے گزر چکا ہے۔“ میں نے عبد اللہ کا جملہ مکمل کیا۔ ”لیکن فاضلی جیسے ڈھیٹ اتنی آسانی سے دنیا سے نہیں ہاتھ دیتے ہیں۔ مجھے یقین ہے وہ بچ گیا ہوگا۔“

”میری بھی یہی خواہش ہے وہ بچ جائے اور ہم میں سے کسی کے ہاتھ مارا جائے۔“ عبد اللہ نے تائید کی۔ ”وسیم صاحب کل روکنے کے باوجود واپس چلے گئے تھے۔“

”اس کا اپنی جگہ ہونا ضروری ہے۔ وہ ہماری اصل فرس ہے اور اسے صرف ضرورت کے وقت ہی منظر عام پر آنے چاہیے۔“ میں نے کہا۔ ”یہاں کتنے آدمی ہیں؟“

”اگر آپ کی مراد لڑنے والوں سے ہے تو ایسے سات افراد ہیں آٹھواں آپ مجھے شمار کر لیں۔“

”گو یا مجھے سمیت نو افراد ہیں؟“

”جی باقی تین نوکر ہیں گھر کے کام کرتے ہیں۔ ایک باورچی ہے۔ ایک نگران ہے اور ایک چوکیدار ہے۔“

”یہ علاقہ کیسا ہے؟“

”یہاں سب اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ لیکن ہم بھی احتیاط کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ کوئی سے باہر جاتے وقت مسلح نظر نہ آئیں۔ اس طرح کوشی کے کھلے حصوں میں بھی کم آتے جاتے ہیں۔“

”یہ اچھی پالیسی ہے جتنا لوگوں کی نظروں میں کم آئیں گے وہ اتنا ہی کم ہمارے بارے میں سوچیں گے۔“

”گاڑیاں میں نے ساری بدل دی ہیں۔ یہاں والی فروخت کرنے کے بعد ساری گاڑیاں باہر سے منگوائی ہیں۔“

”ابھی ایک ایک دودو کر کے۔ دولاہور کی گاڑیاں ہیں اور ایک گوجرانوالہ کی اور ایک نوشہرہ کی گاڑی ہے۔“

”یہ بھی اچھا ہوا سوائے کیونٹیلیشن وین کے تقریباً ساری گاڑیاں دشمنوں کی نظروں میں آ چکی تھیں اور شاید ہمیں ان کی مدد سے تلاش کر لیا جاتا ہوگا۔“

”نہی سوچ کر میں نے ایک روٹیشن پالیسی سوچ لی

ہے۔ ایک مہینے بعد ان کی جگہ چار دوسری گاڑیاں آ جائیں گی۔ اس کے لیے میں نے وہیں کے آٹو انجکشن سے بات کی ہے۔ وہ گاڑیاں آئیں گی تو انہیں یہیں فروخت کر دیا جائے گا۔ اس میں کچھ رقم لگے گی لیکن ہمیں تحفظ حاصل ہو جائے گا۔“

”کوشش کرنا کہ گاڑیاں زیادہ پرانی نہ ہوں اور اپنے کام میں بہترین ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”ایاز کہاں ہے؟“

”اس کی ماں کی طبیعت خراب تھی وہ گھر گیا ہوا ہے۔“

ماں سے مراد ایاز کی خالہ تھی جس نے اس کی پرورش کی تھی۔ ”ایاز مخلص آدمی ہے لیکن اب اس پر گھر اور بیوی کا بوجھ آ گیا ہے۔“

”میں نے اس سے ایک دو بار اس سلسلے میں بات کی ہے لیکن وہ ہمارا ساتھ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے۔“

”یہ بھی ہے۔“ میں نے گہری سانس لی۔ ”اللہ نے ایسے مخلص ساتھی دیے ہیں جو ہر قدم پر میرے ساتھ ہوتے ہیں اور کبھی چھوڑ کر جانے کے لیے تیار نہیں ہوتے ہیں۔“

مرشد، فاضلی، اکرم چشتی، فتح خان اور ڈیوڈ شاہیجی دشمن ہونے کے باوجود میں اسی وجہ سے آج بھی زندہ اور آزاد تھا کہ اللہ نے مجھے اتنے ہی مخلص دوست بھی دیے تھے جتنے خطرناک اور سفاک میرے دشمن تھے۔ کھانے کے بعد میں نے ایاز سے رابطہ کیا وہ میری آواز سن کر خوش ہو گیا۔

”مجھے وسیم صاحب سے اطلاع مل گئی تھی کہ آپ واپس آ گئے ہیں۔ میں آج روانہ ہو جاؤں گا۔“

”نہیں تم ابھی وہیں رکو۔ تمہاری والدہ کی طبیعت کیسی ہے؟“

”پہلے سے بہتر ہے، لیکن آپ آنے سے کیوں منع کر رہے ہیں؟“

”ابھی تمہاری اتنی ضرورت نہیں ہے، تمہیں معلوم ہوگا کہ عبد اللہ والی کوشی چھوڑ دی ہے۔ اکثر لوگ میری حویلی جا چکے ہیں۔ وسیم کا سیٹ اپ الگ ہے اور ہم ایک نئی جگہ منتقل ہوئے ہیں۔ میں کل رات آیا ہوں اور ابھی کچھ دن حالات کا جائزہ لیتا ہے جیسے ہی آگے کا کوئی فیصلہ ہوا تم بھی آ جانا لیکن فی الحال تم اپنی والدہ کی خدمت کرو اور شاہین کو وقت دو۔“

”یہ نہیں آپ مجھے آرام تو نہیں دے رہے ہیں؟“

اس نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

”نہیں یار، سچ کہہ رہا ہوں یہاں واقعی فی الحال امن ہے۔ جب کوئی معرکہ ہوگا تب دیکھا جائے گا۔“

”ٹھیک ہے میں کچھ دن اور رک جاتا ہوں۔“
 ”نہیں تم تا حکم ثانی گھر پر رہو گے اور رابطے میں بھی
 محتاط رہو کیونکہ دشمن ہمارا خاتمہ چاہتا ہے۔ اگر ذرا سا بھی
 خطرہ محسوس کرو تو گھر والوں کو کہیں اور منتقل کر دینا۔“
 ”ٹھیک ہے۔“ اس نے بادل نا خواستہ کہا۔ ”لیکن
 جیسے ہی میری ضرورت ہو آپ لازمی مجھے بلائیں گے۔“
 ”دشمنوں سے گھرے انسان کو اللہ کے بعد سب سے
 زیادہ ضرورت جان نثار دوستوں کی ہوتی ہے۔ تمہارے پاس
 رقم ہے؟“

”ہاں عبد اللہ نے آتے وقت مجھے پچاس ہزار دیے
 تھے۔“
 ”اگر مزید ضرورت ہو تو بلا تکلف کہہ دینا۔“
 ایاز سے بات کر کے مجھے صابر کا خیال آیا۔ اسے
 روانہ ہوئے سات دن ہو چکے تھے۔ میں نے جس دن صابر
 کو منظر آباد جانے کے لیے چھوڑا تھا اسی دن اکرم چشتی کے
 اسکوڈ نے مجھے اٹھا لیا تھا اور آج اس واقعے کو آٹھواں دن
 تھا۔ مجھے اس کی لڑکی شازیہ کا خیال آیا اس کے بارے میں
 عبد اللہ سے پوچھا نہیں تھا۔ کھانے کے بعد عبد اللہ کہیں چلا
 گیا تھا میں نے ایک ملازم سے پوچھا تو اس نے بتایا۔ ”وہ
 باہر نکلے ہیں جناب۔“

ملازم کو بھی سے آیا تھا۔ ”تمہیں یاد ہے کچھ دن پہلے
 ایک نئی لڑکی آئی تھی وہ اب کہاں ہے؟“
 ”وہ جی سعدیہ بی بی اور مونا بی بی کے ساتھ چلی گئی
 تھی۔“ ملازم نے جواب دیا۔ یعنی وہ حویلی چلی گئی تھی اور
 عبد اللہ اس کا ذکر کرنا بھول گیا تھا۔ میرے پاس موبائل نہیں
 تھا ورنہ میں عبد اللہ سے کال کر کے صابر کے رابطے کے
 بارے میں پوچھتا۔ اسے ایک مخصوص اخبار میں کلاسیفائیڈ
 میں اشتہار دینا تھا۔ یہاں فون نہیں تھا اور میں سویرا سے
 بات کرنا چاہ رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا وہ کتنی شدت سے میری کال
 کی منتظر ہوگی۔ عبد اللہ کی واپسی تک مجھے انتظار کرنا
 تھا۔ وقت گزاری کے لیے میں آج کا اخبار لے کر اوپر آ گیا
 اور ملازم سے کہہ دیا کہ عبد اللہ کے آتے ہی وہ اسے میرا
 پیغام دے دے۔ اخبار میں کوئی خاص خبر نہیں تھی سوائے
 اس کے کہ آنے والے ایکشنز میں سیاسی پارٹیوں اور
 سیاست دانوں نے ابھی سے جوڑ توڑ شروع کر دیا تھا۔ ایک
 چھوٹی سی خبر مرشد کے بارے میں تھی اس نے جوئی پارٹی
 جوائن کی تھی اس کی طرف سے ایک جلسے میں خطاب کرتے

ہوئے اس نے فکر انگیز انکشافات کیے تھے۔ یہ وہی فکر انگیز
 انکشافات ہیں جو ہمارے سیاست دان ملک کے قیام سے
 لے کر آج تک کرتے آئے ہیں۔ مثلاً ملک خطرے میں
 ہے۔ اندرونی اور بیرونی سازشیں جاری ہیں، ملک ایک
 نئے خطرے کی طرف بڑھ رہا ہے اور ان سب باتوں کا لب
 لباب یہ ہوتا ہے کہ نئی قیادت لانی جائے۔
 مرشد نئی پارٹی میں زیادہ سرگرم تھا اور یقیناً وہ آنے
 والے الیکشن میں کوئی بڑا عہدہ حاصل کرنے کے چکر میں
 تھا۔ اس کی نظر کسی اہم وزارت پر لگی ہوگی۔ ایم این اے
 اور ایم پی اے بننا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ بلکہ اس
 کے اپنے علاقے میں ایک قومی اسمبلی اور دو صوبائی اسمبلی
 کی نشستیں تھیں۔ پارٹی کے لیے یہ بھی کشش انگیز چیز
 تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر مرشد آنے والا انتخاب جیت
 جاتا ہے اور حکومت میں کوئی اہم عہدہ بھی حاصل کر لیتا ہے تو
 اس کی فرعونیت مزید بڑھ جائے گی اس سے پہلے اسے روکنا
 لازمی تھا۔ اس وقت وہ پھنسا ہوا تھا۔ نادر غائب تھا۔ اس کا
 دست راست اور ناجائز بیٹا فاضل اگر مراد نہیں تھا تب بھی
 شدید زخمی ضرور ہوا تھا۔ اس کے سارے پلان ناکام رہے
 تھے اور وسم نے اس کے کٹے میں سوراخ کر کے اسے عملی
 طور پر سمجھا دیا تھا کہ اب اس کے مقابل کتنے طاقتور ہو چکے
 ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مجھے جسمانی نقصان پہنچاتے ہوئے
 ڈر رہا تھا۔

مجھے لگ رہا تھا کہ میں رفتہ رفتہ اس فیصلے کی طرف جا
 رہا تھا جو میں کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر میرے دشمن مجھے اسی
 طرف دھکیل رہے تھے۔ انہوں نے میرے باعزت جینے کی
 کوئی راہ نہیں چھوڑی تھی اور عملاً بتا دیا تھا کہ جب تک ان کا
 وجود باقی ہے مجھے چین سے رہنا نصیب نہیں ہوگا۔ مرشد
 کے اشارے پر پولیس پہلے سے زیادہ سرگرمی سے میرے
 پیچھے لگ چکی تھی۔ امکان یہی تھا کہ اب میں پولیس کے ہاتھ
 لگا تو مجھے پولیس مقابلے میں مار کر دیا جائے گا۔ اس طرح
 براہ راست مرشد پر الزام بھی نہیں آئے گا۔ مرشد اور اکرم
 چشتی جیسے لوگوں نے مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں انہیں انہی کے
 سکوں میں ادائیگی کروں۔ سب سے پہلے مجھے اکرم چشتی
 سے نمٹنا تھا۔ یہ خبیث صفت شخص میرا ذاتی دشمن نہیں تھا لیکن
 شاہ سے زیادہ شاہ کا وفادار بننے کے لیے اس نے حد کر دی
 تھی۔ عبد اللہ کچھ دیر سے آیا تھا اور خاصا پُر جوش لگ رہا
 تھا۔ اس نے آتے ہی کہا۔ ”میرے آدمیوں نے پتا لگا لیا

فاضل مرشد ہاؤس میں موجود ہے۔ گزشتہ رات اس کا
 کسی نامعلوم اسپتال میں آپریشن ہوا اور پھر صبح اسے
 ایوب نیس میں مرشد ہاؤس منتقل کر دیا گیا۔“
 ”اس کا مطلب ہے وہ بچ گیا ہے۔“
 ”میں نے کہا تھا نا کہ وہ بچ جائے تاکہ ہم اسے جہنم
 رسید کر سکیں۔“ عبد اللہ خوش تھا۔ ”اب آپ دیکھیے گا۔“
 ”اے چھوڑو وہ ابھی ایک دو ہفتے باہر نہیں آ سکتا۔۔۔
 مجھے اکرم چشتی کے بارے میں معلوم کر کے بتاؤ۔“
 ”اس کے بارے میں جو معلوم کرنا ہے مجھ سے پوچھ
 لیں۔“

”وہ آج کل کہاں ہوتا ہے اور اس کی رہائش کہاں
 ہے۔“
 ”وہ خود انویسٹی گیشن آفس میں ہوتا ہے ڈی آئی جی
 انویسٹی گیشن کے ساتھ اور رہائش اس کی سیٹلائٹ ٹاؤن
 میں ہے۔“

”اس کا پتا اور ڈیوٹی کے اوقات مجھے بتا دو۔“
 ”آپ کا کیا ارادہ ہے جناب؟“
 ”اے اٹھا کر حویلی پہنچانا ہے۔“
 عبد اللہ ہلکا ہلکا۔ ”جناب اس سے اچھا یہ نہیں ہے کہ
 اس کا قصہ ہی پاک کر دیا جائے۔“
 ”نہیں فی الحال میں اس کا خاتمہ نہیں چاہتا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”اے مارنے سے مرشد کو کوئی فرق نہیں پڑے
 گا کیونکہ ایک اکرم چشتی چلا جائے گا تو پولیس میں اس جیسے
 لوگوں کی کوئی کمی نہیں ہے جو مرشد کے ایک اشارے پر دم
 بلانے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اکرم چشتی کو زندہ رہنا
 چاہیے لیکن ساتھ ہی مرشد کے لیے تنبیہ بن جانا چاہیے۔“

”آپ کے ذہن میں کوئی خیال ہے؟“
 ”ہاں پہلے اسے اٹھا کر حویلی پہنچانا ہے۔“
 عبد اللہ فکر مند ہو گیا۔ ”اس کے گھر سے حویلی خاصے
 فاصلے پر ہے اور ایک پولیس والے کا اغوا دونوں شہروں کی
 پولیس کو فوری حرکت میں لے آئے گا۔“

”مجھے ایک سیل فون کی ضرورت ہے میرا خیال ہے
 وسم کو بلا لیتے ہیں اور پھر اس پر بات کرتے ہیں۔“
 عبد اللہ نے مجھے میرا سیل فون دیا جو میں نے اکرم
 چشتی کے ہاتھ لگنے سے پہلے عبد اللہ کے آدمی کو دے دیا
 تھا۔ میں نے وسم کو کال کی۔ ”یہاں آ جاؤ یا ایک ضروری
 معرکہ درپیش ہے تیار کیے ساتھ آنا ممکن ہے واپسی میں

ایک پارسل لے جانا پڑے۔“
 ”میں سمجھ گیا جناب۔“ وسم کی پُر جوش آواز
 آئی۔ ”میں ایک گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔“
 کچھ عرصے پہلے تک وسم خود بھی خاصا محتاط تھا لیکن
 اب اس میں بھی تبدیلی آئی تھی اور اس نے سمجھ لیا تھا کہ دشمن
 اس طرح باز نہیں آئے گا۔ اس کے مقابلے میں عبد اللہ محتاط
 تھا کیونکہ بنیادی طور پر وہ مار دھاڑ والا آدمی نہیں تھا وہ منظم
 تھا اس لیے ہر کام احتیاط سے کرتا تھا۔ دشمن کو معاف کرنے
 کا وہ بھی قائل نہیں تھا لیکن ساتھ ہی وہ بلاوجہ پنکا لینے کا
 مخالف تھا۔ میں نے عبد اللہ سے کہا۔ ”میرا خیال ہے ہم وسم
 سے کہیں باہر ملتے ہیں۔“

”جیسا آپ کہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ میں نے
 وسم سے رابطہ کر کے ایک جگہ ملے کی اور عبد اللہ کے ساتھ روانہ
 ہو گیا۔ میں نے بہت عرصے سے شیونیس بنائی تھی۔ پہلے فرنیچ
 تھی اب شیو بڑھنے سے وہ باقاعدہ ڈاڑھی کی شکل اختیار کر
 گئی تھی اور مرشد کے آدمی مجھے اسی حلیے میں دیکھتے رہے تھے
 اس لیے میں نے کلین شیو کی اور پھر سر پر خود موٹی مشین پھیر
 لی۔ مشین باتھ روم میں موجود تھی۔ باریک بالوں کی وجہ سے
 میرا حلیہ خاصا بدل گیا۔ پھر میں نے موٹے فریم والی عینک
 لگائی جس میں زیر و کے ڈارک شیشے تھے۔ یہ عبد اللہ نے مہیا
 کی تھی۔ اس نے میرا معائنہ کیا اور بولا۔ ”اب آپ تقریباً
 ستر فیصد بدل گئے ہیں۔“

”لیکن دشمن پھر بھی پہچان جاتا ہے۔“ میں نے
 کہا۔ ”البتہ پولیس والے دھوکا کھا جائیں گے۔“
 ہم ایک کروڑ کار میں باہر نکلے اس کے شیشے بھی کسی
 قدر تاریک تھے۔ اس لیے قریب سے دیکھے بغیر کوئی اندر
 والوں کو نہیں جان سکتا تھا۔ میں نے وسم کو ایک پارک کا پتا
 بتایا تھا۔ وسم وین کے ساتھ ایک ڈبہ نما جیب بھی لایا تھا یہ
 پرانی لیکن طاقتور انجن والی ملٹری ماڈل جیب تھی۔ جس کے
 پچھلے حصے میں مقامی ساختہ فولاد کا بنا ہوا ڈبہ لگایا گیا تھا۔ وسم
 وین کے پچھلے حصے میں ہمارا منتظر تھا۔ سلام دعا کے بعد میں
 نے اکرم چشتی کا معاملہ اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے سر
 ہلایا۔ ”اس سے بسم اللہ کرنا نہایت مناسب رہے گا۔ میرا تو
 خون کھول رہا ہے جب سے اس کی خباثت کا پتا چلا ہے۔“
 ”جب مجھ پر گزر رہی تھی تو میں نے بھی بہت
 سارے ارادے باندھے تھے لیکن اب مجھے صرف انتقام
 کے لیے اسے اٹھانا یا مار دینا مناسب نہیں لگ رہا ہے، ہم

اس سے کثیر القاصد فائدے حاصل کریں گے اور پھر اس کا فیصلہ کریں گے کہ کیا کرتا ہے اس لیے فی الحال اسے یوں اٹھانا ہے کہ اس کے ساتھ سوئی بیوی کو بھی پتہ نہ چلے۔
وسیم مسکرایا۔ ”میں پوری تیاری کے ساتھ آیا ہوں۔“
”سب سے پہلے ہمیں اس کے گھر کا معائنہ کرنا ہے۔“
”اس کے لیے یہ دین نہایت موزوں رہے گی۔“
وسیم نے کہا۔ ”ہم کسی کی نظروں میں آئے بغیر گھر کا معائنہ کر سکتے ہیں۔“

”بس تو ہمیں یہ کام کر لینا چاہیے۔“ میں نے سر ہلایا۔ ہم نے اپنی کروڑا اسی پارک کے ساتھ چھوڑ دی۔ وسیم کے ساتھ آئی دوسری گاڑی اور اس میں سوار افراد بھی وہیں رک گئے اور ہم وین میں اکرم چشتی کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ سیٹلائٹ ٹاؤن یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا اور اس کا شمار پنڈی کی پرانی پوش آبادی میں ہوتا ہے۔ یہاں خاندانی رئیس رہتے ہیں اور ایک زمانے میں سچ خاندانی ہی ہوتے تھے اب تو ہر دولت مند خاندانی ہو جاتا ہے۔ اکرم چشتی کا گھر نسبتاً چھوٹے پلاٹوں والے علاقے میں تھا۔ اس کے باوجود اس کا گھر باہر سے کسی کو بھی کا منظر پیش کرتا تھا۔ حیرت انگیز طور پر ایک ڈی ایس پی کے گھر پر پولیس گارڈز لگی تھی اور دو پولیس والے خود کار رائلٹیں اٹھائے گیٹ کے سامنے کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ہتھیار خطرناک تھے لیکن پولیس روایتی تھی۔ ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ ضرورت پڑنے پر رائلٹیں اٹھا کر فائر کرنے کا سوچنے میں بھی ان کو ایک دو منٹ لگ سکتے ہیں۔ ہم وین میں بڑی اسکرین پر یہ منظر نہایت وضاحت سے دیکھ رہے تھے۔ کیرانہ صرف کوٹھی کا منظر دکھا رہا تھا بلکہ اسے ریکارڈ بھی کر رہا تھا۔ ڈرائیور نے جان بوجھ کر وین کی رفتار نہایت سست کر دی۔ یہ دو طرفہ لگی تھی جس میں ایک طرف سے داخل ہو کر دوسری طرف سے نکلا جاسکتا تھا۔ اگر ایک طرف لگی ہوتی تو ہمیں مشکل ہو جاتی۔ پلٹ کر واپس آنا پڑتا۔ ہم گلی سے نکلے اور وین ایک طرف روک کر کیرانے کی بتائی ویڈیو دیکھی۔ وسیم نے اسے ذرا سلو موشن میں کر دیا تھا۔ یہ دو منزلہ کوٹھی تھی جس کے سامنے والے حصے میں خاصا بڑا کارپورج تھا اور اس وقت بھی وہاں ایک نیلی ہنڈا کار کھڑی تھی۔ عبداللہ نے کہا۔ ”اکرم چشتی گھر پر نہیں ہے کیونکہ وہ سرمئی رنگ کی وٹر استعمال کرتا ہے یہ نئی کار ہے۔“

”حالانکہ اس کی تجوہ موٹر سائیکل سے اوپر جانے کی

اجازت نہیں دیتی ہوگی۔“ میں نے تنہی سے کہا۔ ”یہ کوٹھی بھی اس کی حرام کمائی سے بنی ہوگی اور اس کی بیوی یا کسی قریبی عزیز کے نام پر ہوگی۔“

”اکرم چشتی کی دو بیویاں ہیں۔“ عبداللہ نے انکشافات کا سلسلہ جاری رکھا۔ ”ایک کسی گاؤں میں ہوتی ہے وہ اس کی خاندانی بیوی ہے دوسری شہری اور ماڈرن ہے۔ لیکن نام نہاد ہی ماڈرن کہہ سکتے ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ وہ ایسی ہے جیسے بھینس کے مقابلے میں گائے ہوتی ہے۔ پہلی بیوی سے نامعلوم تعداد میں بچے ہیں لیکن اس بیوی سے اکرم چشتی کی تین اولادیں ہیں۔“

”اس کے علاوہ بھی وہ دوسری جگہوں پر منہ مارتا ہو گا۔“ وسیم نے لقمہ دیا تو عبداللہ ہنسا۔
”تو حرام کس لیے کماتا ہے؟“

”حالات ٹھیک نہیں لگ رہے ہیں۔“ وسیم نے تشویش سے کہا۔ ”اکرم چشتی نے اپنے گھر کی سیکورٹی سخت کی ہوئی ہے۔ پلان ایسا ہو جس میں ناکامی کا خطرہ ایک فیصد سے بھی کم ہو۔“

”کوٹھی شاید نصف کنال رقبے پر ہے۔ سامنے مکانیت کم ہے کیونکہ کورڈ کارپورج ہے لیکن اوپر والی عمارت زیادہ بڑی ہے اور میرے خیال میں بیڈرومز اوپر ہی ہوں گے۔“ میں نے کوٹھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وسیم نے کوٹھی کا منظر پوز کر دیا تھا۔ ”زینے سامنے دکھائی دے رہے ہیں یہ اوپر کورڈ میرس میں نکلتے ہوں گے۔“

میرس کو فوٹو لای گول کی مدد سے بند کر دیا گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ زینوں کے آخر میں کوئی دروازہ ہوگا۔ وسیم نے کہا۔ ”اگر یہ دروازہ کسی طرح سے کھلوا لیا جائے تو اس کے بعد کام آسان ہو جائے گا۔“

”سوال یہ ہے کہ اکرم چشتی یا کوئی اور دروازہ کھولے گا ہی کیوں؟“

وسیم عبداللہ کے سوال پر سوچ میں پڑ گیا۔ ”اگر ان دونوں پولیس والوں میں سے کوئی کسی وجہ سے اکرم چشتی سے بات کرنا چاہے تو....؟“

”جس ہو جائے گا۔“ میں نے کہا۔
”یہ بھی ممکن ہے اندر اور باہر سیکورٹی کیرے لگے ہوں۔ یہ آج کل بہت عام ہو گئے ہیں۔“ عبداللہ نے خیال پیش کیا۔ ”اس صورت میں اکرم چشتی پہلے سے ہوشیار ہو جائے گا۔“

”براہ راست کارروائی کیسی رہے گی؟“ وسیم نے پوچھا۔

”اس کے بجائے اسے راستے میں اٹھا لینا زیادہ مناسب ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”گھر میں گھسنے سے دوسرے مسائل پیدا ہوں گے۔ ممکن ہے شور کی وجہ سے غیر متعلقہ لوگ بھی صدمہ ہو سکتے ہیں جیسے اکرم چشتی کے بیوی بچے، اس بہت میں راستے میں کارروائی بہترین آپشن ہے۔“

”اس کی دن کی ڈیوٹی ہوتی ہے نائن ٹو فائیو۔“ عبداللہ نے کہا۔ ”لیکن واپسی کا کچھ پتا نہیں ہوتا ہے۔“
”البتہ دفتر کے لیے نکلنے کا وقت تقریباً طے شدہ ہو گا۔ نو یا دس بجے تک وہ گھر سے نکل جاتا ہوگا۔“ وسیم بولا۔ ”بہترین وقت بہترین ہوگا۔“

”بس کل صبح اسے اٹھا لو۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”اکرم چشتی کے نہ ہونے سے پولیس کی میرے خلاف جاری مہم کمزور پڑ جائے گی۔“

”میں اپنا ریکی اسکوڈ بلا لیتا ہوں۔“ وسیم نے کہا۔ ”ہم کل صبح سورج نکلنے سے پہلے یہاں پہنچ جائیں گے۔“
”میں بھی آؤں گا۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن اکرم چشتی کے گھر کی نگرانی ابھی سے شروع ہو جانی چاہیے۔“
”میں دو افراد بھی لگا دیتا ہوں وہ گھر اور اکرم چشتی کی نقل و حرکت پر نظر رکھیں گے۔“

وسیم نے حویلی رابطہ کر کے بانک سوار بلوا لیے۔ یہ اپنے کام کے ماہر تھے۔ اکرم چشتی کے گھر والی گلی دونوں طرف کھلتی تھی۔ اس لیے دو افراد ضروری تھے۔ ہم گلی سے نکل کر اس سڑک پر آ گئے جہاں اندازے کے مطابق اکرم چشتی کو دفتر سے آتے ہوئے گزرنا تھا۔ وین ایک طرف پارک کر دی۔ وسیم نے اس کے کیرے سامنے سے آنے والی ٹریفک پر کنٹرول کر دیے تھے۔ اب ہم ہر گاڑی کے ڈرائیور کو دیکھ سکتے تھے۔ ہمیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ اکرم چشتی کی وٹر خاصی تیزی سے گزری تھی لیکن کیرے نے اس کے ٹھوک چہرے کو ریکارڈ کر لیا تھا۔ تشویشناک بات یہ تھی کہ اس کے ساتھ ایک پولیس والا اور بھی بیٹھا تھا۔ یعنی وہ کسی وقت

بھی اکیلا نہیں ہوتا تھا سفر میں اپنے ساتھ ایک گارڈ رکھتا تھا۔ ”اس کے ٹھاٹ دیکھو ایک گارڈ ساتھ بھی رکھتا ہے۔“ وسیم نے کہا۔ ”خیر کوئی مسئلہ نہیں ہے گھر کے باہر سب سے نمٹا جاسکتا ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”اب فرض کر لیں کہ یہ کل صبح جب دفتر جانے کے لیے نکلے گا تو اسے گھرنے کے لیے سب سے موزوں جگہ کون سی ہو سکتی ہے۔“

”یہ ابھی دیکھ لیتے ہیں۔“ وسیم نے کہا اور ڈرائیور سے پولیس ہیڈ کوارٹر کی طرف چلنے کو کہا لیکن آدھے گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد کوئی ایسی جگہ نہیں ملی جو سنسان ہو اور ہم وہاں آرام سے کارروائی کر سکیں۔ اتفاق سے یہ بہت مصروف رہنے والی سڑک تھی جو سیٹلائٹ ٹاؤن سے پولیس ہیڈ کوارٹر کی طرف جاتی تھی۔ کسی کارروائی کی صورت میں درجنوں گواہ بن جاتے۔

”اس طرح کام نہیں بنے گا۔ اس میں پھنسنے کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔“ میں نے کہا۔

”اکرم چشتی کے گھر کی طرف آنے والی ذیلی سڑک کے بارے میں کیا خیال ہے۔“ عبداللہ نے اچانک کہا۔ ”وہاں سناٹا ہوتا ہے بڑے پلاٹوں والا رہائشی علاقہ ہے اس لیے لوگ بھی کم نظر آتے ہیں۔“

عبداللہ کا خیال اچھا تھا۔ کم سے کم ہائی وے کے مقابلے میں یہاں خطرہ بہت کم تھا۔ پلاننگ وسیم کا کام تھا اس لیے جگہ کا انتخاب ہونے کے بعد یہ اس پر چھوڑ دیا گیا۔ اس دوران میں اس کے آدمی پہنچ گئے تھے۔ وسیم نے انہیں ذمے داری سمجھائی اور ہمیں واپس پارک کی طرف چھوڑنے روانہ ہو گیا۔ میں نے راستے میں مشورہ دیا۔ ”اس کام میں وین مت استعمال کرنا، میرا مطلب ہے یہ ظاہر وین دور رہے اور اکرم چشتی کو کسی دوسری گاڑی میں لے جانا۔“

”یہ ٹھیک ہے وین کا ہر بار نظر آنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔“ وسیم بولا۔ ”میں نے ایک اسپرے گن لے لی ہے اور ہمارے پاس کچا پینٹ بھی ہے۔ اس کا رنگ آدھے گھنٹے میں بدلا جاسکتا ہے اور رنگ کو صرف دس منٹ میں وائر پریشر گن سے اتارا جاسکتا ہے۔“

”تب اس کا رنگ بدل دو اس کا سیاہ رنگ متوجہ کرتا ہے۔“

ہمیں پارک کے پاس چھوڑ کر وسیم واپس روانہ ہو گیا۔ وسیم واپس روانہ ہوا تو ہم بھی چل پڑے۔ میں نے

”بالکل ہے جناب۔“ وہ اس وقت بھی مکان کے باہر گاڑی میں موجود ہے۔
 ”اگر یہ کوئی باقاعدہ اسکیم ہے تو یہاں کوئی چوکیداری سسٹم بھی ہوگا اپنے آدمی سے کہو چوکیدار کو تلاش کرے اور اس سے معلومات حاصل کرے لیکن اسے شک کا موقع نہ دے۔“
 ”وہ شک تو کرے گا۔“ وسیم نے جواب دیا۔ ”لیکن اس کا طریقہ ہے۔ رقم اس کا منہ بند کرنے کی اور رقم کے ساتھ دھمکی اسے خاموش رہنے پر مجبور کرے گی۔“
 ”اپنے آدمی سے کہو یہ کام کر گزرے، وہاں کتنے لوگ ہیں؟“
 ”دونوں ہیں۔“

”ٹھیک ہے ایک آدمی مکان اور اکرم چشتی کی گمرانی کرے اور دوسرا چوکیدار کو تلاش کرے۔“
 ”کیا خیال ہے یہیں اکرم چشتی کو نہ چھاپ لیا جائے؟“
 ”نہیں کوئی کچا کام نہیں کرتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”نہ جانے اس مکان میں کون ہے اور پھر وہی بات ہوگی معاملہ فوراً کھل جائے گا اور اکرم چشتی کو حویلی تک لے جانے میں مشکل پیش آسکتی ہے۔ دوسرے مکان میں موجود افراد گواہ بن جائیں گے۔“

”میں ہدایت کرتا ہوں۔“ وسیم نے کہا اور کال کاٹ دی۔ میں کمرے میں آیا کیونکہ صبح سویرے اٹھنا تھا اس لیے میں نے کھانا کم کھایا تھا۔ کچھ دیر بعد غسل کر کے ایک گلاس دودھ لیا اور سو گیا۔ موبائل میں پانچ کا الارم لگایا تھا۔ میری جھکن خاصی حد تک اتر گئی تھی لیکن میں نے محسوس کیا کہ میں پوری طرح فٹ نہیں ہوں۔ مجھے اس میں ایک دو دن اور لگتے۔ الارم بجا تو میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا اور نیچے آیا جہاں عبداللہ اور اس کے آدمی تیار تھے۔ میں نے کافی کا کہہ کر عبداللہ سے رپورٹ لی۔ اس نے بتایا۔

”اکرم چشتی اس مکان سے گیارہ بجے نکلا اور واپس اپنی کوٹھی پر آ گیا تھا۔ چوکیدار سے جو معلومات حاصل ہوئیں ان کے مطابق اس گھر میں ایک عورت اور ایک مرد رہتے ہیں لیکن ان کا کردار نہایت مشکوک ہے کیونکہ تقریباً روزی نئی شکلوں والے افراد یہاں آتے ہیں اور اکثر لوگ رات کو رک جاتے ہیں۔ کیونکہ آبادی زیادہ نہیں ہے اور جو ہیں وہ بھی خود میں گن ہوتے ہیں اس لیے عام لوگوں کو ان کے

کردار کے بارے میں زیادہ علم نہیں ہے لیکن چوکیداروں سے اس قسم کی چیزیں نہیں چھپ سکتی ہیں۔“
 ”یعنی قصہ مختصر ہے کہ اکرم چشتی یہاں عیاشی کے لیے جاتا ہے۔“
 ”اس جیسے آدمی سے اسی کردار کی توقع کی جاسکتی ہے۔“
 ”رواگی کب ہے؟“
 ”دس منٹ میں۔“

میں تیار تھا عبداللہ نے ایک بریٹا اور اس کے دو عدد فاضل میگزین میرے سپرد کیے۔ کافی پیتے ہوئے میں نے ان کا معائنہ کیا اور مطمئن ہو کر اپنی جیکٹ میں رکھ لیا۔ موسم بہت سرد نہیں تھا لیکن جیکٹ پہننے کی گنجائش تھی۔ ساڑھے پانچ بجے ہم روانہ ہوئے تو صبح کی روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ وسیم اور اس کے ساتھی اکرم چشتی کے گھر کے پاس پہنچ چکے تھے۔ اس کے آدمیوں نے دور سے کوٹھی کا جائزہ لیا تھا۔ وہاں تاریکی تھی اور کوٹھی کے باہر ایک گاڑی موجود تھا دوسرا یقیناً اندر آرام کر رہا تھا جیسی روح ویسے فرشتے تھے۔ اکرم چشتی جیسے کرپٹ پولیس افسر کے محافظ بھی اس کی طرح حرام خور تھے۔ ہمارے وہاں پہنچنے تک روشنی ہو گئی تھی لیکن ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔ دین کے ساتھ وسیم وہی ڈبا نما جیب بھی لایا تھا۔ اکرم چشتی کو اسی میں ڈال کر لے جانا تھا۔ اس کے علاوہ تین بانک سوار تھے۔ مجموعی طور پر وسیم کے ساتھ سات افراد تھے اور عبداللہ جو اصل میں بیک اپ میں تھا وہ پانچ مسلح آدمی ساتھ لایا تھا۔ اس کا کام کسی ہنگامی صورت حال میں مداخلت کرنا تھا۔ ہمارے ساتھ دو گاڑیاں تھیں۔ ایک میں میں اور عبداللہ تھے اور دوسری گاڑی میں اس کے پانچ آدمی تھے۔ وسیم نے دین پر نہ صرف مگر کر لیا تھا بلکہ اسے دور کھڑا کیا تھا۔ دین کی وجہ سے تمام لوگ آپس میں ریڈیو سے ایک دوسرے سے منسلک تھے۔ میں نے ہیڈ سیٹ لگایا اور وسیم سے پوزیشن پوچھی۔ ”تمام لوگ اپنی جگہوں پر ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”پلان کیا ہے؟“
 ”جیسے ہی اکرم چشتی گھر سے نکلے گا۔ بانک سوار اس کا پیچھا کریں گے اور خاموش پستول سے گاڑی کا ٹائر برسٹ کر دیں گے۔ آگے سے جیب کار کا راستہ روکے گی۔“
 ”اکرم چشتی اتنی آسانی سے قابو میں نہیں آئے گا وہ مزاحمت کرے گا۔“

”اس کے لیے ہمارے آدمی تیار ہوں گے۔ ان کے پاس بے ہوش کرنے والی ڈارٹ گن ہوگی۔“
 ”بے ہوشی کی دوا کچھ دیر سے اثر کرتی ہے۔“
 ”اگر زیادہ مزاحمت کی تو میں نے اپنے آدمیوں کو ہدایت کر دی ہے وہ جان لیے بغیر گولی چلا سکتے ہیں۔“ وسیم نے کہا۔ ”ویسے اس قسم کے کاموں میں خطرہ تو ہوتا ہے۔“
 ”گلی کے دونوں سروں پر وسیم کے آدمی موجود تھے اور وہ کوٹھی پر مکمل نظر رکھے ہوئے تھے۔ سات بجے ان میں سے ایک نے اطلاع دی۔ ”جناب اندر سے ایک گاڑی نکلی ہے۔“
 ”کون سی گاڑی ہے؟“
 ”نہلی ہنڈا ہے جناب۔“
 ”کار گلی کے کونے پر پہنچی تو ایک بانک اس کے پیچھے لگ گئی۔ بانک سوار نے اطلاع دی۔ ”کار میں کوئی ملازم ہے۔ اس کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔“

”شاید یہ کسی عارضی کام سے نکلا ہوگا۔“ وسیم نے کہا۔ ”اس کے پیچھے لگے رہو اور جب ریڈیو کی حد سے نکل جاؤ تو موبائل پر رابطہ کرنا۔“
 دس منٹ بعد اطلاع ملی کہ ملازم ایک معروف حلوائی

سے حلوہ پوری اور دوسرا سامان لے رہا تھا۔ یہ کام کر کے وہ ساڑھے سات بجے تک واپس کوٹھی پہنچ گیا گویا وہاں ناشتے کی تیاری تھی۔ صبح ہوتے ہی دوسرا گاڑی بھی ڈیوٹی پر واپس آ گیا تھا۔ دن اور رات کے الگ الگ محافظ ہوتے تھیں۔ فی الحال ان کی تبدیلی کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ آٹھ بجے ان کے لیے بھی اندر سے ناشتا آ گیا تھا۔ ہم صبر سے انتظار کر رہے تھے کہ اکرم چشتی دفتر جانے کے لیے باہر نکلے تو ہم اپنی کارروائی کریں۔ سب اپنی اپنی جگہ مستعد تھے۔ تمام گاڑیوں اور بانکس کی نمبر پلیٹس بدلی ہوئی تھیں۔ جو لوگ اکرم چشتی اور اس کے گاڑی کے سامنے آتے ان کے چہرے چھپے ہوتے اس لیے بعد میں کوئی ثبوت باقی نہیں رہتا۔ ساڑھے آٹھ بجے کے قریب گیٹ پر موجود گاڑی مستعد ہو گئے اور اپنی رائفلیں سنبھال کر کھڑے ہو گئے۔

”میرا خیال ہے اکرم چشتی باہر آنے والا ہے۔“ وسیم نے کہا۔
 سب چوکتے ہو گئے۔ چند منٹ بعد وٹز باہر آئی اور اس نے گلی کے اس سرے کا رخ کیا جہاں ہم موجود تھے۔ وسیم کے آدمی لمحہ بہ لمحہ خبردار کر رہے تھے۔ ایک منٹ بعد کار گلی کے سرے پر نمودار ہوئی اور بڑی سڑک کی طرف جانے لگی۔



آپ کے تجربے...
 مشورے... تجربات...
 اور نئی دلیچس باتیں... کھائیں

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

وسط سیرما کی آنکھیلیاں
 مارچ 2013ء کی دلچسپیاں

سرورق کی کہانیاں

- پہلی کہانی: جنون عشق میں سنگ و خشت ہو جانے والوں کا قصہ دل گداز
- دوسری کہانی: جاسوسی اور تھرلر کے سنگ لمحہ بہ لمحہ گیمبر داستان کی لڑیاں
- اولین صفحات: زندگی کے صحرائیں تنہا بھٹکتی لڑکی کی کہانی... جس کے گرد زندگی کا دائرہ تنگ ہو رہا تھا... سلیم فاروقی کے قلم کی سبک فتاری
- گرداب: واقعات کے نگار میں گرفتار لوگوں کا آغاز و انجام اسما قادری کا سلسلہ
- للکار: محبت کی جلی جلی شمعیں انتقام کے بھرنے کے شعلے طاہر جاوید مغل کی سنسنی خیز تحریر

مغرب کے نرالے انداز

مغربی دنیا کی تہذیب و سہولت کی عکاسی اور محبت کی پروردہ ناقابل فرسوش کہانیاں

لگی فوراً ہی تینوں بانک والے اس کے پیچھے نمودار ہوئے تھے۔ میں عبد اللہ کے ساتھ دور تھا اور صرف رواں کٹری پر گزارہ کر رہا تھا پھر وسم نے بتایا۔ ”اسے روک لیا ہے۔“ یہ سنتے ہی عبد اللہ نے گاڑی اشارت کر کے آگے بڑھا دی اور جب تک ہم اس جگہ پہنچے اکرم چشتی اور اس کا محافظ بے ہوش کیے جا چکے تھے۔ انہیں حرکت کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ جیب نے راستہ روکا تھا اور اس سے پہلے کہ اکرم چشتی یا اس کا گارڈ ہوشیار ہوتے انہیں ڈارٹ گن کی مدد سے بے ہوش کیا جا چکا تھا۔ اکرم چشتی کو نہایت پھرتی سے جیب کے فولادی بکس میں منتقل کر دیا گیا تھا اور اس پر ایسی بوریاں ڈال دی گئی تھیں جن میں کچی روٹی بھری ہوئی تھی۔ اب کوئی گاڑی روک کر چپک بھی کرتا تو اسے روٹی کی بوریاں ہی ملتیں۔ ہم وہاں نہیں رکے تھے بلکہ یوں دیکھتے ہوئے گزرے جیسے عام لوگ ہوں۔ وین اپنی جگہ موجود تھی اور بانک والے آگے نکل گئے تھے۔ جیب روانہ ہوئی اور اکرم چشتی کی کار بے ہوش گارڈ کے ساتھ رہ گئی تھی۔ وہ پچھلے کھڑی تھی اور اس کے دروازے بند تھے۔ اتفاق سے کسی نے بھی یہ سینہ ہوتے نہیں دیکھا تھا اس لیے اب جب تک کوئی خاص طور سے کار کے پاس جا کر نہ دیکھتا اسے بے ہوش گارڈ کا بھی پتا نہیں چلتا۔

”کمال کر دیا۔“ میں نے ریڈیو پر کہا۔ ”اتنی صفائی سے کام کیا ہے۔“

”ڈارٹ گن صرف دو منٹ میں بے ہوش کر دیتی ہے اور آدمی کو تین چار گھنٹے سے پہلے ہوش نہیں آتا۔“ وسم نے کہا۔ ”وین پیچھے رہے گی میں خود جیب میں آ گیا ہوں۔“ ”اچھا میں تو تمہیں وین میں سمجھ رہا ہوں۔“ میں نے کہا اور عبد اللہ کی طرف دیکھا۔ ”میرا خیال ہے تم اپنے باقی آدمیوں کو واپس بھیج دو ہم وسم کے ساتھ چل رہے ہیں۔“ عبد اللہ موبائل پر اپنے آدمیوں سے رابطہ کرنے لگا جو دوسری گاڑی میں تھے اس گاڑی میں صرف میں اور عبد اللہ تھے۔ جیب میں وسم اور اس کے ساتھ ڈرائیور تھا۔ باقی تین بانک سوار تھے۔ مجھے اکرم چشتی کے پکڑے جانے کی خوشی تھی۔ اس شخص سے اپنا حساب برابر کرنا تھا۔ ابھی میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ اس کا کیا کرنا ہے۔ ممکن ہے اس کے لیے سزائے موت تجویز کی جانی۔ لیکن ایک بات میں نے سوچ لی تھی۔ اس سانپ کو اب زہر اور دانت کے ساتھ نہیں چھوڑنا ہے۔ اگر اسے زندہ رہا بھی کیا تو ناکارہ کر کے

رہا کریں گے اور اس سے پہلے حویلی کے نہ خانے میں اسے کچھ یادگار وقت گزارنا تھا جسے وہ مرتے دم تک نہ فراموش کر سکے۔ عبد اللہ نے اپنے آدمی واپس بھجوا دیے تھے اور اب خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ وین کہیں آس پاس تھی لیکن اس کا مواصلاتی سسٹم بند کر دیا گیا تھا اس لیے ہم آپس میں بات نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے ہیڈ سیٹ اتار دیا۔ میرے موبائل کی بیل بجی وسم کال کر رہا تھا۔ میں نے کال ریسیو کی۔

”کیا ہوا وسم؟“

”کوئی گڑبڑ ہے جناب اس سڑک پر آگے پولیس نے ناکا لگا رکھا ہے۔ گاڑیوں کی تلاشی لی جا رہی ہے۔“ ابھی ہم دور تھے میں نے عبد اللہ سے گاڑی سڑک سے ہٹانے کو کہا اور وہ اسے گھما کر سروس روڈ پر لے آیا۔ مزید آگے جا کر ہم ٹریفک کے جھوم میں پھنس سکتے تھے۔ میں نے کہا۔ ”وسم یہ ناممکن ہے کہ پولیس اتنی جلدی حرکت میں آجائے انہیں اکرم چشتی کی تلاش نہیں ہے۔ یہ کوئی اور چکر ہے۔“ ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن ہم بھی اس چکر کی لپیٹ میں آ سکتے ہیں۔ ہم آگے آچکے ہیں اور واپسی کی گنجائش نہیں ہے۔“

صورت حال اچانک تشویشناک ہو گئی تھی۔ اکرم چشتی جتنی آسانی سے ہمارے ہاتھ لگا تھا اس سے لگ رہا تھا کہ اب کوئی مشکل نہیں ہے لیکن مشکل اچانک ہی سامنے آئی تھی۔ یہ سڑک پنڈی شہر کے اندر تھی اور یہاں اس طرح چیکنگ کا مطلب تھا پولیس کوئی بڑی سرگرمی کر رہی تھی۔ پچھلے کچھ عرصے سے جڑواں شہروں کے حالات ٹھیک نہیں رہے تھے۔ تو اتر سے دہشت گردی کی وارداتوں نے پولیس اور انتظامیہ کو چوکنا کر دیا تھا اور ممکن ہے یہ تلاشی بھی اسی سلسلے میں لی جا رہی ہو۔ میں نے وسم سے کہا۔ ”دائیں بانیں نکلنے کی گنجائش نہیں ہے؟“

”ہے لیکن گرین ہیلٹ ہے اسے روند کر نکلے تو پولیس فوراً پیچھے آئے گی تاکہ پر دو موبائل موجود ہیں۔“

”تلاشی کس طرح سے لی جا رہی ہے صرف کاغذات دیکھ رہے ہیں یا عملی تلاشی بھی لے رہے ہیں۔“

”عملی تلاشی لی جا رہی ہے۔ تین تین کی قطاروں میں گاڑیاں لگی ہیں۔ ان کی ڈکیاں تک کھلو کر دیکھ رہے ہیں۔“

”کسی بھی طرح سے وہاں سے نکلو۔“ میں نے کہا۔ ”ایک بارنا کے کے پاس پہنچ گئے تو گلو خلاصی مشکل ہو جائے گی۔“

”ہم دائیں طرف ہیں۔ دوسری والی سڑک پر نکل کر واپس آئیں گے۔ اس پر ٹریفک بہت کم ہے۔“ عبد اللہ سن رہا تھا اس نے کہا۔ ”وسم صاحب سے کہیں واپس آتے ہوئے بانیں طرف سڑک نکل رہی ہے؟“ ”جی ہاں۔ یہ سیدھی جی ٹی روڈ پر نکلے گی۔“ ”آپ نکلے تو جناب اس کے بعد دیکھتے ہیں۔“ عبد اللہ نے پچھنچس جائیں۔“

حویلی ایک سے پہلے جی ٹی روڈ اور پشاور جانے والی سڑک کے درمیان ایک عام سی شاہراہ کے قریب تھی۔ یہ سڑک آباد بھی نہیں تھا اور اس سڑک پر بھی زیادہ رش نہیں تھا۔ لیکن اب اس تک پہنچنا مشکل لگ رہا تھا۔ ہم پہلی شاہی پھنس گئے تھے۔ وسم نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”ہم گریڈنگ کر اس کر کے دوسری طرف آ گئے ہیں۔“

”مگر تمہارے ساتھی بھی ہیں؟“

”ہاں وہ تینوں بھی پیچھے آئے ہیں۔“

”پولیس موبائل؟“

”ان کا نہیں پتا، وہ خاصی پیچھے ہیں۔“

”اپنے آدمیوں کو حکم دو کہ اگر موبائلز پیچھے آنے کی کوشش کریں تو ان کے ٹائر برسٹ کر دیں۔“

”میں پہلے ہی ان سے کہہ چکا ہوں۔“ وسم نے بتایا۔ ”لیکن ابھی تک کوئی موبائل پیچھے آتی نظر نہیں آ رہی ہے البتہ لوگوں نے بہت گالیاں دی ہوں گی جن سے جیب گراتے نکراتے بنی۔“

”ان کی فکر مت کرو۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”وہ بے چارے حق بہ جانب ہیں گالیاں دینے میں۔“

میں اور عبد اللہ سروس روڈ پر تھے اور اسی پر واپسی کے لیے نکل پڑے۔ عبد اللہ نے مشورہ دیا۔ ”جب تک پولیس ٹریفک ہے آپ کا باہر نکلنا خطرے سے خالی نہیں ہے اس لیے ہم واپس چلتے ہیں۔ حویلی بعد میں جاسکتے ہیں۔“

میں نے اس کی بات پر غور کیا اور پھر خود کو اتفاق پر پکڑ لیا۔ پولیس جس طرح سے ناکا لگا کر کھڑی تھی اس سے صاف ظاہر تھا کہ کوئی بڑی گڑبڑ تھی اور شاید دہشت گردی کا معاملہ تھا ورنہ عام مجرموں کے لیے پولیس اور انتظامیہ اس طرح مستعد نہیں ہوتی ہے۔ میں نے سر ہٹا کر دیکھا۔ ہم پنڈی سے نکلنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ جب تک وسم یہ حفاظت نہیں نکل جاتا ہے ہم یہیں

رہیں گے۔“

”میرا خیال ہے وسم صاحب کو جی ٹی روڈ کے بجائے پشاور جانے والی موٹر وے پکڑنی چاہیے اس پر رش کم ہوتا ہے اور وہاں ناکے کا امکان بھی کم ہوگا۔ بس راستہ ذرا طویل ہو جائے گا۔“

میں نے وسم کو کال کر کے موٹر وے سے جانے کا مشورہ دیا۔ وہ جی ٹی روڈ تک پہنچ گیا تھا۔ اسے ایک خورد سے پہلے جانا تھا۔ حویلی جی ٹی روڈ اور موٹر وے کے درمیان کے علاقے میں تھی۔ وسم کے تینوں بانک سوار اس کے ساتھ تھے۔ جیسے جیسے سورج بلند ہو رہا تھا دن گرم ہوتا جا رہا تھا۔ یہ غیر متوقع گرمی تھی کیونکہ اپریل کے آغاز میں بھی راولپنڈی اسلام آباد کا موسم خوشگوار ہی ہوتا ہے۔ عبد اللہ نے گاڑی ایک چھوٹے سے رستوران کے سامنے روک لی اور ہم اندر چلے آئے۔ یہاں ایک دور.... کی میز سنبھال کر ناشتے کا آرڈر کیا۔ عبد اللہ نے ناشتا کر لیا تھا لیکن میں نے صرف ایک کافی لی تھی اور اب مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ عبد اللہ نے اپنے لیے چائے منگوائی تھی۔ جب تک میں ناشتا کرتا رہا وہ وقفے وقفے سے وسم کو کال کر کے اپ ڈیٹ لیتا رہا۔ وسم موٹر وے تک پہنچ گیا تھا۔ جب تک میں ناشتے سے فارغ ہوا وسم اکرم چشتی سمیت پنڈی کی حدود سے نکل چکا تھا۔

”میرا خیال ہے اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔“ عبد اللہ نے سکون کا سانس لیا۔ ”یہ اکرم چشتی سچ سچ نہایت منحوس آدمی ہے۔ کتنی آسانی سے ہاتھ آ گیا اور کیسی مشکل میں پڑتے پڑتے بچے ہیں۔ اگر وسم صاحب ذرا اور آگے نکل جاتے تو پھر واپسی کا امکان باقی نہ رہتا۔“

”یہ بہتر ہوا کیونکہ جی ٹی روڈ پر ناکے کا امکان تھا اگر وسم یہاں نہ پھنستا تو وہاں پھنس جاتا اب وہ موٹر وے سے نکل گیا ہے۔“

حویلی اچھی جگہ ہے لیکن دور بہت ہے ہمیں کہیں آس پاس بھی کوئی ایسا ہی ٹھکانا تلاش کرنا چاہیے۔“

”اس کے برعکس ان لوگوں کا دور رہنا ہی ٹھیک ہے شہر میں دشمنوں کی نظروں میں آنے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ جیسے راجا صاحب والی کوٹھی سے تمام دشمن واقف ہو گئے تھے اور بالآخر میں وہیں سے نکلنے کے بعد دشمن کے ہتھے چڑھا۔ اس سارے کھیل میں اہمیت وقت اور فاصلوں کی نہیں راز داری کی ہے۔ حویلی دور دراز ہے اس لیے

”دیکھو وہ بیمار آدمی ہے اور اسے مستقل علاج کی ضرورت ہے۔“ مرشد نے چالاکی سے کہا۔

”بھئی تم نے اسے بے یار و مددگار اور لاوارث چھوڑ دیا تھا وہ بڑی مشکل سے اپنا علاج کر رہا تھا۔“ میں نے طنز کیا۔ ”وہ میرا دشمن ہے لیکن تم فکر مت کرو ہم اس کی اچھی ہی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔“

”اچھا ایسا کرو جب ہمارے وکیل آپس میں مل کر ایک فریم ورک بنالیں تب تم نادرو کو آزاد کر دینا۔“

”مرشد وہ میرے پاس بالکل محفوظ اور آرام سے ہے یقین کرو اسے سوئی چھینے جتنی تکلیف بھی نہیں ہوتی ہے۔ آخر تم اسے واپس لینے کے لیے اتنے بے قرار کیوں ہو؟“

”میرے کچھ خاندانی مسائل ہیں جن کی وجہ سے نادرو کی جلد از جلد واپسی لازمی ہے ورنہ مجھے بڑا نقصان بھی ہو سکتا ہے۔“

غالباً مرشد کے منہ سے پریشانی میں یہ بات نکل گئی تھی۔ نادرو کی کم شدگی اس کے خاندان میں مسائل میں اضافہ کر رہی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ اس کم شدگی کو مرشد کے کھاتے میں ڈال کر اس پر دباؤ ڈالا جا رہا تھا۔ یہ اچھی خبر تھی اس سے مرشد مجبور ہوتا کہ جلد از جلد مجھ سے صلح کر لے۔ صلح کے لیے میں نے اسے بتا دیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ میں نے جواب دیا۔ ”مجھے تمہارے خاندانی مسائل سے کچھ لینا دینا نہیں ہے میں تمہیں صلح کے لیے اپنی شرط بتا چکا ہوں میں تم سے کوئی گارنٹی نہیں مانگ رہا اور سچی بات ہے مجھے تمہاری کسی گارنٹی پر اعتبار بھی نہیں ہوگا اس لیے میں صرف ایک شرط رکھ رہا ہوں، میرے کیسز ختم کرادو۔ اب میں تم سے کل رابطہ کروں گا اگر تمہارے وکیل نے ندیم بھٹی سے رابطہ کیا تو۔۔۔“

”میری بات سنو۔۔۔“ مرشد نے کہنا چاہا لیکن میں نے کال کاٹ دی اور ہیڈ فون اتار دیا اور موبائل سے وسیم کا نمبر ملایا۔

”کیا صورت حال ہے؟“

”پارسل پہنچ گیا ہے جناب۔“ وسیم نے چپک کر کہا۔ ”ہم نے حساب کتاب کی تیاری بھی شروع کر دی ہے۔“

”اچھا۔“ میں نے دلچسپی سے کہا۔ ”کیا ہو رہا ہے اس کے ساتھ؟“

”خالص پولیس اسٹائل میں اسے الٹا لٹا دیا ہے اور مرچوں کی دھونی دینے کی تیاری ہے۔“

”گڈ بس اتنا خیال رکھنا کہ یہ بد بخت دم گھٹ کر نہ مر

جائے۔“

”آپ فکر نہ کریں جناب اسے پتا چلے گا کہ کچھ کم نہیں ہیں۔“ وسیم نے جواب دیا، وہ بہت تھا۔ ”میری درخواست ہے کہ اسے دو دن کے لیے سپرد کریں اس کے بعد ہی کوئی بات کرے گا۔“

”وہ اب بھی تمہارے سپرد ہے اور تمہیں اس ساتھ مناسب سلوک کرنے کے لیے کسی سے اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔“

”بس تو آپ دو دن بعد اسے دیکھیے گا آپ بھی اس کو اٹھیں گے۔“

مجھے لگ رہا تھا کہ اکرم چشتی کی شامت قریب تھی

اس نے ساری عمر میں جو کیا تھا شاید وہ اسے دو دن میں بڑے۔ لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ میں انسانیت اور کسی اچھی صفت سے عاری اس شخص سے اپنے ساتھیوں کو موازنہ کر رہا ہوں۔ وہ کسی بھی سطح پر چلے جائیں اگر ہم کی سطح پر نہیں پہنچ سکتے تھے۔ تھانوں میں عام پولیس والے سولہ سترہ سال یا اس سے بھی کم عمر کے افراد کے ساتھ بہیمانہ سلوک کرتے ہیں اس کی خبریں آئے دن اخبارات اور ٹی وی پر آتی رہتی ہیں۔ تھانوں میں لوگ تفتیش کے آگے ہار مان کر جان بھی دے دیتے ہیں کیونکہ ان کے پاس بتانے کے لیے سچ کے سوا کچھ نہیں ہوتا ہے۔ وہ اپنے سچ بڑے رستے ہیں جو عقل مند ہوتے ہیں وہ جھوٹا الزام تسلیم کر کے کھال اور جان بچا لیتے ہیں اور اس کے بعد جب معاملہ عدالت میں جاتا ہے تو وہ عام طور سے بری ہو جاتے ہیں۔ وسیم اور اس کے ساتھی اکرم چشتی کے ساتھ وہ سلوک نہیں کر سکتے تھے جو وہ دوسروں کے ساتھ رکھتا تھا۔

بہر حال اکرم چشتی کو زندگی میں پہلی بار یہ ضرورت چل جاتا کہ تشدد کیا چیز ہوتی ہے خاص طور پر جب آپ پر کیا جا رہا ہو۔ وسیم سے بات کر کے مجھے ایمن کا خیال آیا ہونے لگا۔ اس سے بھی رابطہ نہیں تھا۔ فتح خان کی پہلی بارودی جیکٹ سے نجات حاصل کرنے کے بعد وہ وہاں اگلینڈ چلی گئی تھی۔ میرے موبائل میں اس کا نمبر محفوظ تھا لیکن میں نے اسے انٹرنیٹ کی مدد سے کال کی۔ اس نے کال ریسپونڈ کی اور بوجھل لہجے میں ہیلو کہا۔

”ایمن کیسی ہو؟“

”شہباز۔“ وہ چونک کر بولی۔ ”تم کہاں ہو؟“

”میں اب بھی یہاں ہی ہوں لیکن تمہارا نمبر بند جا رہا تھا۔“

”ایمن کیسی ہو؟“

”شہباز۔“ وہ چونک کر بولی۔ ”تم کہاں ہو؟“

”میں نے ای میل بھی کی ہے۔“

”میں حسب معمول غائب تھا کل واپس آیا ہوں۔“

”شہباز میں بہت تکلیف میں ہوں۔“ ایمن کہتے ہوئے رو دی تھی۔ ”میں اس وقت بھی اسپتال میں ہوں اور میری تکلیف کم نہیں کر پار ہے۔“

”کیا ہوا ہے۔۔۔ کوئی حادثہ ہوا ہے؟“

”میری زندگی میں ڈیوڈ شا سے بڑا حادثہ اور کیا ہے۔“ اس نے خود کو سنبھال کر تلخ لہجے میں کہا۔ ”وہ کل مجھے مارنے آیا تھا۔“

”ایمن کیا اس نے کچھ کیا ہے؟“

”ہاں یہ اسی کا کیا دھرا ہے۔ لیکن شہباز میری سمجھ میں آ رہا ہے اس نے کیا کیا ہے۔ میرے بائیں بازو میں بارود ہے جیسے کسی نے میرا بازو آگ میں ڈال دیا ہے اور وہ مشتعل چل رہا ہے۔ تکلیف کی شدت میں ایک لمحے کو بھی نہیں آتی ہے۔“ وہ پھر رونے لگی۔

میں نے جہاں تک ایمن کو دیکھا تھا وہ بہت حوصلے والی لڑکی تھی۔ جب فتح خان نے اسے بارودی جیکٹ پہنائی تو جب بھی اس نے بہت حوصلے سے اس صورت حال کا سامنا کیا تھا ورنہ جسم سے لگی موت کا احساس اچھے اچھوں کے حواس کو آزاد دیتا ہے۔ مگر اس وقت وہ بچوں کی طرح رو رہی تھی۔ میں نے یہ مشکل اسے چپ کرایا اور تسلی دے کر اصل کہانی سنی جو اس نے سسکیوں اور پچھکیوں کے درمیان سنائی تھی۔

گزشتہ روز ایمن شام کے وقت لندن میں واقع اپنے فلیٹ میں پہنچی تو اس نے وہاں غیر متوقع طور پر ڈیوڈ شا کو فلیٹ کی نشست گاہ میں موجود پایا۔ اسے دیکھ کر ایمن مشتعل ہو گئی تھی۔ ”تم اندر کیسے آئے، تم نے ٹریس پاس کیا ہے۔“

”آرام سے لڑکی۔“ ڈیوڈ شا نے اسے گھور کر دیکھا۔ ”میں نے کسی چیز کو نہیں چھیڑا ہے اور میں تم سے بات کرنے آیا ہوں۔“

ڈیوڈ شا کے گھورتے ہی ایمن کو لگا جیسے اس کے اندر لٹنے غصے پر کسی نے برف کا ڈھیر الٹ دیا ہو اور وہ لکھوں میں بالکل ٹھنڈی پڑ گئی۔ بلکہ اسے ڈیوڈ شا سے خوف بھی محسوس ہونے لگا تھا جو شخص چوروں کی طرح لاک کھول کر اندر آئے اس کے ارادے اچھے نہیں ہو سکتے تھے۔ کیا وہ اسے مارنے آیا تھا؟ یہ سوچ کر اس کا جسم مزید سرد پڑ گیا کیونکہ آس پاس کے فلیٹ خالی تھے اور یہاں زیادہ تر بوڑھے لوگ رہتے تھے

جن سے کسی مدد کی توقع محال تھی اگر وہ مدد کے لیے چلاتی تو شاید کوئی سننے والا بھی نہ ہوتا۔ ڈیوڈ شا نے اس کی کیفیت بھانپ لی اور اس بار ٹری سے بولا۔ ”ڈرومت میں تمہیں کوئی نقصان پہنچانے نہیں آیا ہوں اگر تم میری بات مانو گی تو آنے والی مشکل سے بچ جاؤ گی۔“

”کیسی مشکل؟“ ایمن نے ہمت کر کے پوچھا۔ ”کیا تم مجھے دھمکی دے رہے ہو۔“

ڈیوڈ شا نے اس کا سوال نظر انداز کر کے کہا۔ ”تم نے میرے خلاف عدالت میں کیس فائل کرنے کی تیاری کر لی ہے میں چاہتا ہوں تم ایسا نہ کرو اس کے بدلے تم مجھ سے جو چاہے مانگ لو۔“

”مجھے اپنے باپ کی جاگیر اور خطاب واپس چاہیے۔“ ایمن نے کہا۔

”وہ تمہیں کسی صورت نہیں مل سکتا چاہے تم اس کے لیے عدالت میں ہی کیوں نہ چلی جاؤ۔ لیکن میں عدالت کے چکروں میں نہیں پڑنا چاہتا کیونکہ ان دنوں میں اپنی زندگی کے اہم ترین کام میں مصروف ہوں۔ اس لیے تمہارے پاس آیا ہوں۔ تم چاہو تو مجھ سے نقد رقم یا جاگیر لے سکتی ہو۔“ ایمن کا حوصلہ لوٹ آیا۔ اس نے انکار کر دیا۔ ”مجھے بھیک نہیں اپنا حق چاہیے۔“

”تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔“ ڈیوڈ شا کا لہجہ دوبارہ سرد ہو گیا۔ ”میں صرف اس خیال سے چلا آیا کہ میرا تم سے ایک رشتہ بھی ہے لیکن تم ایک ہٹ دھرم اور ضدی لڑکی ہو اس لیے اب سزا بھگتو گی۔“ یہ کہہ کر ڈیوڈ شا ایمن کی طرف بڑھا۔ وہ خوف زدہ ہو گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ڈیوڈ شا اس پر حملہ کرنے والا ہے۔ لیکن پاس آ کر ڈیوڈ شا نے نرمی سے ایمن کا بایاں بازو پکڑا۔ اس نے بازو ایک لمحے کے لیے پکڑا تھا اور پھر چھوڑ دیا۔ اس وقت ایمن نے محسوس کیا کہ کسی سرد سی چیز نے اسے لمس دیا ہو۔ ڈیوڈ شا پیچھے ہٹا اور دروازے کے پاس جا کر اس نے اپنا ہیٹ اور کوٹ اٹھا کر پہنے پھر ایمن کی طرف دیکھا۔ ”اگر تمہیں میری پیش کش کا خیال آئے تو میرے گھر کال کر لینا میرا نمبر تمہیں معلوم ہوگا۔“

ایمن نے منہ سے جواب نہیں دیا لیکن دل ہی دل میں اس نے ڈیوڈ شا کی پیش کش پر تھوکا تھا۔ اس کے جاتے ہی ایمن نے دروازہ بند کر کے تمام زنجیریں اور حفاظتی لاک بند کر دیے تھے۔ اس وقت اسے کچھ محسوس نہیں ہوا تھا البتہ رات تک اسے بازو میں جہاں ڈیوڈ شا نے چھوا تھا لمحائی

سوزش ہونے لگی۔ یہ سوزش بس ایک دو لمحے کے لیے ہوتی تھی اور پھر وہ نارمل ہو جاتی۔ ایمن نے زیادہ توجہ نہیں دی تھی کیونکہ بازو پر یہ ظاہر کوئی نشان بھی نہیں تھا۔ وہ رات سکون سے سوئی لیکن صبح چار بجے اس کی آنکھ تکلیف سے کھلی، اسے لگا جیسے اس کے بازو پر کوئی گرم چیز گری ہو وہ بوکھلا کر اٹھی اور اپنا بازو چیک کیا وہ بالکل نارمل تھا مگر تکلیف شدت کی تھی اور ٹھیک اسی جگہ ہو رہی تھی جہاں ڈیوڈ شانے اس کا بازو پکڑا تھا۔ اسے خیال آیا کہ یہ ڈیوڈ شا کی حرکت تھی وہ اس کے بازو کے ساتھ کچھ کر کے گیا تھا اور جب ہی اس نے جاتے ہوئے معنی خیز انداز میں اسے پیکش کی تھی۔

تکلیف اتنی شدید تھی کہ ایمن نے امیر جنسی کو کال کر دی اور کچھ دیر میں ایسولینس مع ڈاکٹر کے وہاں آچکی تھی۔ ڈاکٹر نے ایمن کے بازو کا معائنہ کیا لیکن اس کی سمجھ میں بھی نہیں آیا کہ یہ کیا چکر ہو سکتا ہے۔ اس نے بہتر سمجھا کہ ایمن کو اسپتال لے جائے جہاں اس کا زیادہ بہتر معائنہ ہو سکتا تھا۔ اسپتال میں چند گھنٹوں کے اندر اس کے بازو کے بے شمار ٹیسٹ ہو گئے تھے۔ اس کا بلڈ اور یورین ٹیسٹ بھی لیا گیا تھا۔ بازو کا ایم آئی آر ہوا مگر نتیجہ صفر نکلا۔ کہیں کوئی خرابی یا ایسی علامت نہیں تھی جو اس تکلیف کی وضاحت کر سکتی مگر ایمن کی حالت دیکھ کر ڈاکٹر اسے غلط بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ اس کا رنگ تکلیف سے پیلا پڑ گیا تھا اور چہرے سے ہی وہ برسوں کی بیمار لگنے لگی تھی۔ جب کسی طرح بھی کچھ سامنے نہیں آیا اور تکلیف میں بھی کمی نہیں ہوئی تو ڈاکٹروں نے اسے مارفین کا انجکشن دے کر سلا دیا۔ مگر تکلیف کی شدت سے وہ کچھ دیر بعد ہی ہوش میں آگئی تھی۔ دوسرا انجکشن بھی بے اثر رہا تو ڈاکٹروں نے مزید انجکشن لگانے سے گریز کیا۔ تکلیف کے ان لمحوں میں ایمن کو میرا خیال آیا اور اس نے اپنے اسمارٹ فون سے مجھے کال کرنے کی کوشش کے ساتھ ائی میل بھی کی۔ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتی تھی۔

”میری خوش قسمتی کہ تم نے خود رابطہ کر لیا۔“ اس نے اپنی کہانی کے آخر میں کہا۔ ”پلیز شہباز کچھ کرو میں مر رہی ہوں۔“

”حوصلہ رکھو میرا خیال ہے یہ ڈیوڈ شا کی شرارت ہے۔ اس کا مقصد تمہیں عدالت میں جانے سے باز رکھنا ہے۔ مجھے یقین ہے اس کے پاس اس تکلیف کا توڑ بھی ہوگا۔“

”لیکن میں اس ذلیل شخص سے بھیک نہیں مانگنا چاہتی۔“

”اسے بھیک مانگنا نہیں حکمت عملی کہہ رہی ہے۔“

”میں اس سے بات کرتا ہوں۔“

”شہباز میں اسے چھوڑ دوں گی نہیں اسے عدالت ضرور لے جاؤں گی۔“ اس نے ضدی لہجے میں کہا۔

”دیکھو ابھی تم مشکل میں ہو اس لیے ضد مت لو اور صبر سے اس وقت کا انتظار کرو جب ڈیوڈ شا ہو جائے اور پھر تم اپنا کام کر سکو۔ میں نے تمہیں یہ خبردار کیا تھا وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔ وہ صرف لحاظ سے خطرناک نہیں ہے بلکہ اس کے پاس کچھ ایسے ہیں جن کی مدد سے وہ کسی کو اس کی مرضی کے خلاف کرنے کے لیے مجبور کر سکتا ہے۔ کسی کو ضرور پہنچا سکتا ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے اس نے میرے خلاف کیا ایسا ہی کیا ہے؟“

”اس کا امکان ہے ورنہ تم خود سوچو کہ ڈاکٹر نارمل قرار دے رہے ہیں اور تم کہہ رہی ہو کہ تمہیں تکلیف ہے۔“

”میں بھی اور ڈاکٹر بھی حیران ہیں یہ کیسی تکلیف جس کی کوئی وجہ سامنے نہیں آ رہی ہے۔“

”اسی لیے میں کہہ رہا ہوں کہ مجھے ڈیوڈ شا سے بات کرنے دو۔“

”تم اس سے کیا کہو گے؟“

”دیکھو ابھی کچھ سوچا نہیں ہے لیکن تمہاری تکلیف کرانا اصل مقصد ہے۔“

”وہ تم سے اپنی شرائط منوائے گا۔“ ایمن نے خدشہ ظاہر کیا۔

”وہ پہلے بھی کئی بار مجھ سے اپنی شرائط منوا چکا ہے۔ میں نے بے پروائی سے کہا۔ ”اس لیے تم اس کی فکر مت کرو۔“

”ٹھیک ہے تم اس سے بات کر کے دیکھ لو۔“

”میں نے بے دلی سے کہا۔ ”مجھے نہیں خیال کہ وہ اتنی آسانی سے مانے گا۔“

”میں بات کرتا ہوں۔“ میں نے ایمن کو تسلی دی اور کال کاٹ کر ڈیوڈ شا کے گھر کا نمبر ملایا۔ کال اس کے ریسپونڈ کی اور مکینٹی لہجے میں بولا۔

”ہوازدس۔“

”شہباز احمد۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مجھے ڈیوڈ شا سے بات کرنی ہے فوراً۔“

”ٹھیک کو میرا لہجہ اچھا نہیں لگا اس لیے اس نے دوسرے

”میں مسٹر شا کو مطلع کرتا ہوں۔“

”تقریباً دو منٹ بعد ڈیوڈ شا کی مخصوص سرد آواز ”شہباز تم اس معاملے سے الگ رہو۔“

”تمہیں کیا پتا کہ میں نے کس معاملے میں کال کی ہے؟“

”مجھے معلوم ہے تم نے ایمن کے سلسلے میں کال کی ہے۔ اس ضدی لڑکی کو اپنی ضد کی سزا بھگتنی ہوگی۔“

”ڈیوڈ شا تم بھول رہے ہو وہ تمہارے خاندان سے ہے اس لیے اس میں ضد تو آئے گی۔ بہر حال تمہارا اندازہ درست ہے میں نے ایمن کے سلسلے میں کال کی ہے۔“

”میں نے کہا تھا میں اس سلسلے میں تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا اس سے کہو اگر وہ اپنی تکلیف ختم کرنا چاہتی ہے تو مجھ سے بات کرے۔“

”وہ تمہیں کال نہیں کرے گی چاہے وہ تکلیف سے مر لیا نہ جائے۔ وہ تو مجھے بھی کال کرنے سے روک رہی تھی۔ حالانکہ وہ بہت تکلیف میں ہے۔ تم نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے؟“

”یہ ایک خاص زہر ہے جو جلد کے ٹشوز میں سرایت کر کے بارہ سے سولہ گھنٹے بعد شدید سوزش اور جلن کا باعث بنتا ہے۔ اس کا کوئی توڑ نہیں ہے اور اسے جلد میں تلاش بھی نہیں کیا جاسکتا۔“ ڈیوڈ شا نے صاف گوئی سے بتا دیا۔

”اس کا اندازہ بتا رہا تھا کہ کوئی دوسرا ایمن کی تکلیف کو دور نہیں کر سکتا۔“

”زہر.... وہ مر بھی سکتی ہے؟“ میں نے تشویش سے پوچھا۔

”نہیں اس سے کوئی مرنا نہیں ہے۔ یہ زہر اصل میں اعصابی خلیوں کو وہ پیغام دینے پر مجبور کرتا ہے جو وہ تکلیف کی صورت میں دیتے ہیں۔ ہوتا کچھ نہیں ہے مگر دماغ کو ایسا پیغام مل رہا ہوتا ہے کہ جسم کے مذکورہ حصے میں بے پناہ تکلیف ہے۔ اگر وہ تکلیف برداشت کر سکتی ہے تو دس سے بارہ دن میں زہر کا اثر ختم ہو جائے گا۔“

”اس کا کوئی توڑ بھی ہوگا۔“ میں نے سوال کیا کیونکہ ڈیوڈ شا خود ہی مجھے زہر کے بارے میں تفصیل سے بتا رہا تھا۔

”توڑ ہے اور اگر ایمن مجھ سے بات کرے اور کیس کو عدالت میں نہ لے جانے کا وعدہ کرے تو میں توڑ بتا سکتا ہوں۔“

”اس کی طرف سے یہ وعدہ میں کرتا ہوں وہ کیس عدالت میں لے کر نہیں جائے گی۔“ میں نے کہا۔ ”تم جانتے ٹھیک وعدہ خلافی کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔“

”میں تمہیں جانتا ہوں لیکن یہ معاملہ میرے اور ایمن کے درمیان میں ہے اس لیے تم اس میں دخل دینے سے گریز کرو۔“

”ڈیوڈ شا میرے بہت سارے معاملات ایسے تھے جن میں تمہیں دخل نہیں دینا چاہیے تھا لیکن تم نے دخل دیا۔ ابھی بھارتیوں کے ساتھ تمہارا جو معاہدہ ہوا ہے میں اس کے بارے میں بھی جانتا ہوں لیکن میں نے تم سے کوئی شکایت نہیں کی ہے۔ اس لیے اگر تم چاہتے ہو کہ ہمارے درمیان آگے بھی اسی طرح کا تعلق رہے تو تمہیں میری دخل اندازی قبول کرنا ہوگی ورنہ تم آئندہ مجھ سے کچھ منوانے کی پوزیشن میں نہیں رہو گے۔ تم نے مرشد کے بارے میں جو گارنٹی دی تھی وہ اس نے مسترد کر دی اس لیے میں بھی اب تمہارے لیے کچھ کرنے کا پابند نہیں ہوں۔“

”مرشد۔“ ڈیوڈ شا نے غالباً دانت پیسے۔ ”اس نے اچھا نہیں کیا ہے۔“

”وہ پہلے بھی اچھا نہیں کرتا رہا ہے اس لیے آئندہ بھی نہیں کرے گا۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”تمہیں یہ خوش فہمی کیوں ہو گئی کہ وہ تمہارے ساتھ اچھا کرے گا؟“

”میں ڈیوڈ شا ہوں۔“

”تم شاید خود کو بہت کچھ سمجھنے لگے ہو لیکن ڈیوڈ شا تم ایک انسان ہو اور موت کے سامنے اتنے ہی کمزور ہو جتنا ایک انسان ہوتا ہے۔“ میں نے اس کی حقیقت بیان کی۔

”تم کیا چاہتے ہو؟“ وہ جھنجھلا گیا۔

”ایمن کا بازو ٹھیک کر دو۔“

”جب تک وہ مجھ سے بات نہیں کرے گی یہ ممکن نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے یہ تم چاہتی تھی کا معاملہ ہے اس لیے میں اس میں دخل نہیں دے رہا لیکن ڈیوڈ شا اس بات کو یاد رکھنا کہ میں نے تم سے ایک درخواست کی تھی اور تم نے اسے مسترد کر دیا۔“

”وہ نرم پڑ گیا۔“ میں نے مسترد نہیں کیا ہے۔ میں نے اپنی شرط بتا دی ہے۔“

”وہ نہیں مانے گی چاہے یہ تکلیف اس کی جان کیوں نہ لے لے اور وہ مر گئی تو ہمارے درمیان ہمیشہ کے لیے ایک دراڑ آ جائے گی۔“

”تم اس کی اتنی حمایت کیوں کر رہے ہو۔“ ڈیوڈ شا کے لہجے میں شک آ گیا۔ ”کیا تم اسے پسند کرتے ہو؟“

”ان معنوں میں نہیں جو تمہارے ذہن میں ہے۔ وہ

میری بہت اچھی دوست ہے اور ایک بار اس نے میری جان بچائی تھی۔“

”جان تو تم نے بھی اس کی بچائی ہے۔“

”یہ میرا اور اس کا حساب ہے۔ تم اپنی بات کرو۔“

ڈیوڈ شا میں جانتا ہوں تم مجھ سے کیا چاہتے ہو اور میں نے بھی تمہیں انکار نہیں کیا ہے۔ لیکن اس کے بدلے تمہیں میرے لیے بھی کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔“

”یعنی اگر میں ایک کو ٹھیک کر دوں تو تم میرے لیے کام کرو گے۔“

”نہیں میرے اندر کوئی ناقابل مزاحمت انکار نہیں آئے گا۔ تم جو چاہتے ہو اس کی اتنی معمولی قیمت لگا کر اپنے مقصد کی تو ہین مت کرو۔“

ڈیوڈ شا نے چند لمحے سوچا اور پھر گہری سانس لی۔ ”ٹھیک ہے۔ شہباز تم ان چند لوگوں میں سے ہو جو مجھ سے کوئی بات منوانا سکتے ہیں لیکن یاد رکھنا اس کی ایک حد ہوگی۔“

”تو تم ایمین کی تکلیف ختم کر دو گے؟“

”ہاں چند گھنٹوں بعد اسپتال والوں کو کوریئر سے ایک انجکشن ملے گا اور وہ اسے ایمین کے بازو میں لگا دیں۔“

”چند منٹ کے اندر اس کی تکلیف ختم ہو جائے گی۔“

”اسپتال والے آسانی سے راضی نہیں ہوں گے اور ان کے علم میں آئی تو بات آگے تک جائے گی۔“

”ٹھیک ہے میرا آدمی براہ راست ایمین کے پاس آئے گا وہ اپنا نام پیٹرک بتائے گا اور پھر میرا حوالہ دے گا۔“

”انجکشن اس کے پاس ہوگا ایمین لگوا لے گی۔“

”دیکھو وہ بھی اتنی آسانی سے نہیں مانے گی اس کے ذہن میں بھی شک ہوگا کہ کہیں اس بہانے سے نہ ہرند دے دیا جائے۔“

”جہنم میں جاؤ تم سب۔“ اس نے چڑ کر کہا۔ ”کیا میں اس وقت اسے نہ ہر نہیں دے سکتا تھا جب اس کے پاس آیا تھا۔“

”ہاں یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ میں نے قائل ہو کر کہا۔ ”ٹھیک ہے تم اپنا آدمی ایمین کے پاس بھیج دو میں اس سے بات کرتا ہوں۔“

”پولیس کو خبردار کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اگر میرے آدمی نے وہاں نگرانی محسوس کی تو وہ خاموشی سے واپس چلا جائے گا اور ایمین کو زہر کا اثر ختم ہونے تک یہ تکلیف بھگتنا ہوگی۔ اگر وہ اس وقت تک زندہ رہی یا اس کا ڈنٹی توازن

درست رہا۔ یہ تکلیف اسے پاگل بھی کر سکتی ہے۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہوگی اور میرے خیال میں جیسے آدمی کو پولیس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”یہ پاکستان نہیں برطانیہ ہے۔“ اس نے خشک میں کہا اور فون رکھ دیا۔ میں شرمندہ ہو گیا وہ ٹھیک کہہ رہا تھا اپنی حکومت کا کتنا ہی اہم آدمی لیکن وہ کوئی قانون کرتے ہوئے پکڑا جاتا تو اسے عدالت کا سامنا کرنا پڑتا لیکن یہ میری غلط فہمی بھی ہو سکتی تھی۔ ساری دنیا میں کارپوریشن اور قانون شکنی کی جو روایات انگریز چھوڑ کر تھے وہ بالآخر انگریزوں تک بھی پہنچ گئی ہیں۔ انہوں نے ہونا دنیا میں بوائے تھے اس کی فضل خود ان کے ہاں بھی آگے میں خیالوں سے چونکا مجھے ایمین کو بھی بتانا تھا اس سے اسے کال ملائی تو اس کا نمبر انگریز جارہا تھا۔ وقفہ غنیمت میں نیچے آیا اور صوفی سے کافی کا کہا۔

”صاحب اب تو بچ کا وقت ہو رہا ہے۔“

”ابھی بھوک نہیں ہے تم کافی اوپر بھجوادو۔“

”کریم۔“

میں اوپر آیا اور ایمین کا نمبر دوبارہ ملا یا۔ اس بار فون جاری تھی اس نے کال ریسیو کی۔ ”میری ایک فرینڈ کا فون آیا تھا۔“ اس نے میری آواز سن کر کہا۔ ”اس لیے تمہیں انگریز ملا ہوگا بہت بات تو فی ہے بڑی مشکل سے جان چھڑائی میں نے۔“

”میری ڈیوڈ شا سے بات ہو گئی ہے۔ اس کا ایک آدمی اسپتال آئے گا اور تمہیں ایک انجکشن لگائے گا بازو میں۔“

”میں کوئی انجکشن نہیں لگواؤں گی۔“ حسب توقع اس نے صاف انکار کر دیا۔ ”مجھے اس شخص پر ایک فیصد اعتبار بھی نہیں ہے۔ وہ مجھے مار دینا چاہتا ہے۔“

”اگر وہ تمہیں زہر دینا چاہتا تو تمہارے گھر میں اسے سکتا تھا کسی کو پتا بھی نہیں چلتا اور تم دنیا سے گزر جاتیں۔“

”کوئی بات نہیں ہے۔ وہ اس زہر کا توڑ ہوگا جو اس نے تمہارے ہاتھ پر لگایا ہے۔“ انجکشن کے بغیر اثر ختم ہونے میں دس بارہ دن لگ سکتے ہیں کیا تم اتنے دن یہ تکلیف برداشت کر سکتی ہو؟“

”نہیں۔“ اس کی آواز لرز گئی۔ ”میں تو ابھی سے مر رہی ہوں۔“

”تو بس ہمت کرو اور انجکشن لگوا لو۔ وہ آدمی خاموشی سے آئے گا اپنا نام پیٹرک بتائے گا اور ڈیوڈ شا کا حوالہ دے گا۔“

”میں اس کے لیے مشکلی سے ایمین اس کے لیے راضی ہوئی تھی بڑی مشکل سے ایمین اس کے لیے راضی ہوئی تھی اس نے شرط رکھی کہ جب وہ آدمی آئے گا تو وہ مجھے اس کے لیے راضی ہوئی تھی اس کے دوران ہی انجکشن لگوائے گئے۔ میں نے اسے اپنا موبائل نمبر دے دیا۔ صوفی خود کافی لے آیا تھا۔ لیپ ٹاپ بند کر کے میں نے کافی لی۔ حالات اب تیزی سے بدل رہے تھے کبھی ایسا لگتا کہ معاملات سمٹ رہے تھے اور کبھی ایسا ہوتا کہ جیسے مزید پھیلتے جا رہے تھے۔ اصل مسئلہ میرے کیمر کا تھا وہ حل ہو جاتا تو پھر میں اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکتا تھا۔ کیمر سے مجھے ایک خیال آیا اور میں نے انٹرنیٹ سے اس کا نمبر برائے راست ملائے میں خطرہ تھا۔ ممکن ہے اس کا نمبر ڈاکٹر بروڈیشن ہو۔ اب تو پولیس بھی سرگرمی سے مجھے تلاش کر رہی تھی۔ ندیم نے کال ریسیو کی۔ ”ہیلو کون؟“

”ندیم میں بات کر رہا ہوں۔“ میں نے نام لیے بغیر کہا۔

”میں کون؟ اس طرح تو نیک بیبیاں اپنے شوہر کے لیے بولتی ہیں نام لیے بغیر۔“ ندیم نے کہا تو مجھے خیال آیا کہ میں نے اسے جھوٹا خیال دیا تھا اسے آف کر کے دوبارہ کہا۔

”ابے میں ہوں تیرا مجازی باپ۔ اتنی جلدی تو لوگ باپ کو نہیں بھولتے ہیں۔“

”وہ ہنس۔“ اب بولا تو اپنی اصل نچر جیسی آواز میں پہلے تو کام زدہ گدھے جیسی آواز آرہی تھی۔

”بکواس بند کر، یہ بتا کہ یہ نمبر محفوظ ہے۔“

”ہاں بہت سارے موبائلوں میں محفوظ ہے۔“

”ندیم سنجیدہ ہو جا۔“ میں نے جھنجھلا کر کہا۔ ”آج تمہیں کامیڈی سوچ رہی ہے۔“

”ہاں بار محفوظ ہے میں نے کروایا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”تو کھل کر بات کر سکتا ہے۔“

”میں نے اسے اپنے اور مرشد کے درمیان ہونے والی گفتگو سے آگاہ کیا اور پھر اس کی رائے پوچھی۔“ تو نے ٹھیک کہا کی ہے، اگر مرشد چاہے اور پولیس پر ٹھیک طریقے سے اپنا ڈاکو لے تو معاملہ ختم ہو سکتا ہے۔ ایک مہینہ تو نہیں لیکن دو مہینے میں تیرے سارے کیس غیر موثر۔۔۔۔۔ اور نئے کیس ہر روز میری عدالت سے خارج ہو سکتے ہیں۔“

”اس کے لیے میرا عدالت میں حاضر ہونا ضروری

آکسیجن

ایک بے رنگ، بے بو اور بے ذائقہ گیس جو انسانی اور حیوانی زندگی کے لیے بے حد ضروری ہے۔ سانس کے ذریعے سے آکسیجن ہمارے پھیپھڑوں میں جا کر خون کو صاف کرتی ہے اور پھر رگ رگ میں پھیل جاتی ہے۔ پھیپھڑوں کے اندر فاسد مادوں کو جلا دیتی ہے۔ اس لیے سانس جب باہر خارج ہوتا ہے تو اس میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار ہوتی ہے۔ اس کے باعث اس کی کثیر مقدار فضا میں موجود رہتی ہے۔ تمام کرہ ہوائی کا تقریباً 1/5 حصہ آکسیجن ہے۔ پانی میں بھی 1/3 حصہ آکسیجن ہوتی ہے، اور بھی کئی چیزوں کے ساتھ اس کے مرکبات ملتے ہیں۔ آکسیجن میں جلانے کی خاصیت پائی جاتی ہے۔ اسے ہائیڈروجن کے ساتھ ملا کر ایک گرم شعلہ پیدا کرتے ہیں جسے آکسی ہائیڈروجن شعلہ کہتے ہیں۔ یہ شعلہ دھاتوں کو پگھلا کر جوڑنے کے کام آتا ہے۔ اسی طرح ایسی ٹی لین گیس (acetylene) کے ساتھ ملا کر ایسا شعلہ تیار کیا جاتا ہے، جس کا درجہ حرارت چار ہزار درجے سینٹی گریڈ تک ہوتا ہے۔ یہ شعلہ سخت دھاتوں کو کاٹنے اور لوہے کو پگھلا کر جوڑنے کے کام آتا ہے۔

مرسلہ: نور العین، سکھر

تو نہیں ہوگا؟“

”نہیں وہ تو اگر میں تیری بریت کی درخواست کروں تب ایسا ہونا ضروری ہوگا۔ لیکن یہ مرشد بڑی حرامی چیز ہے۔ تجھے یقین ہے وہ واقعی کیمر ختم کرانے میں سنجیدہ ہے؟“

”یہ کہنا تو اتنا ہی مشکل ہے جتنا کتے کی دم کے بارے میں یقین سے کہنا کہ وہ سیدھی ہو سکتی ہے۔ بہر حال اس کی گوٹ پھنسی ہے اور ممکن ہے وہ سچ سچ مان جائے۔ اس کا وکیل کل کسی وقت تجھ سے رابطہ کرے گا۔ اس سے پتا چلے گا کہ اس کی اصل نیت کیا ہے۔“

”اگر اس کے وکیل نے رابطہ کر لیا تو اس کا مطلب ہو گا کہ مرشد واقعی سنجیدہ ہے۔“ ندیم نے کہا۔ ”فقیر والا کیس تو ختم ہو گیا ہے۔ اب تجھ پر اصل کیس نادر علی پر حملے کا ہے۔“

دوسرا کیس مرشد کی کوشی کی تباہی کا تھا جس میں سات ملازمین سمیت چار پولیس اہلکار بھی اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ مگر اس کیس میں جان نہیں ہے مسئلہ وہی ہے۔ اسے دہشت گردی ایکٹ کے تحت درج کیا ہے اور پولیس اور پریس سے دباؤ کی وجہ سے سرگرم ہے کہ ایک بار تو اس کے گھنے میں آجائے۔ عدالت میں اصل کیس نادر والا ہی ہے۔

”ایف آئی آر مرشد نے خود درج کرائی ہے؟“

”نہیں اس کے ایک ملازم نے، یہ قول اس کے اس وقت کوشی کے پاس موجود تھا اور اس نے تجھے اور تیرے ساتھیوں کو کوشی پر حملہ کرتے اور اسے آگ لگاتے دیکھا تھا۔ وہ چشم دید گواہ بھی ہے۔“

”وہ جھوٹا ہے وہاں موجود ہر فرد مارا گیا تھا۔“

”مجھے معلوم ہے لیکن بھائی یہاں تو جھوٹ سچ ہوتا اور جو سچ ہوتا ہے اسے جھوٹ قرار دیا جاتا ہے۔“ ندیم نے کہا۔

”بہر حال تو فکر نہ کریں یہ معاملہ دیکھ لوں گا۔“

کافی پی کر مجھے بھوک لگنے لگی تھی، میں نیچے آیا اور باورچی کو کھانا لگانے کو کہا۔ عبداللہ حسب معمول غائب تھا۔ میں نے اکیلے کھانا کھایا اور پھر اوپر آ گیا۔ اب مجھے ایمن کی کال کا انتظار تھا۔ اسی انتظار میں بیڈ پر لیٹے لیٹے کسی وقت آنکھ لگ گئی۔ پھر موبائل کی تیل سے آنکھ کھلی تو شام ہو چکی تھی۔ نمبر ایمن کا تھا۔ میں نے جلدی سے کال ریسیو کی۔ میری آواز سنتے ہی وہ مرتعش لہجے میں بولی۔ ”شہباز وہ آ گیا ہے۔“

”اپنا نام کیا بتایا ہے؟“

”پیٹرک اور ڈیوڈ شا کا حوالہ بھی دیا ہے۔“ ایمن بولی۔

”اس سے میری بات کراؤ۔“

”کچھ دیر بعد فون پر ایک اکھڑ آواز آئی۔“ کیا بات ہے؟“

”تمہیں ڈیوڈ شانے بھیجا ہے۔“

”ہاں مجھے اس عورت کو ایک انجکشن دینا ہے۔“

”میری بات غور سے سنو اگر اس انجکشن میں کوئی گڑبڑ ہے تو یقین رکھو تم اس اسپتال سے زندہ باہر نہیں جاسکو گے۔“

”کیا بکو اس ہے۔“ اس نے بگڑ کر کہا۔

”اسپتال سے باہر ایک اسٹائپر موجود ہے اور اگر تم نے میری اجازت کے بغیر یہاں سے جانے کی کوشش کی تو باہر نکلے ہی وہ تمہاری کھوپڑی اڑا دے۔“ میں نے اس کی

بات نظر انداز کر کے غلط بیانی کی۔

”اچھا اسے کیسے پتا چلے گا کہ میں ہی وہ شخص ہوں؟“

”کیونکہ وہ یہاں چھپے ایک کمرے کی دیکھ رہا ہے اور اس نے تمہیں اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔“ میں نے بیانی کا سلسلہ جاری رکھا۔ ”اس لیے جو کرنا ہے سوچو اور تم اسی وقت یہاں سے واپس جاسکو گے جب ایمن ہاتھ کا درد ٹھیک ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ کچھ ہوا تو تمہیں نتائج سے آگاہ کر چکا ہوں۔“

”مجھے دھمکیاں مت دو۔“ اس نے بد مزگی کہا۔ ”یہ زہر کا توڑ ہے۔“

”ٹھیک ہے سیل فون ایمن کو دو۔“ میں نے کہا۔

”موبائل ایمن کو واپس کر دیا۔“ ایمن تم انجکشن لگوانے مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”کچھ نہیں ہوگا، ڈر مت۔“

ایمن نے اسے انجکشن لگانے کی اجازت دے دی اور لمحے بعد اس کی سسکی سنائی دی۔ ”اس نے انجکشن لگا دیا ہے۔“

”کیسا محسوس ہو رہا ہے؟“

”پتا نہیں لیکن تکلیف کم ہو رہی ہے۔“

پیٹرک کی ہلکی سی آواز آئی۔ ”فکر مت کرو صرف تم منٹ میں تمہاری تکلیف مکمل طور پر ختم ہو جائے گی۔“

واقعی ایسا ہی ہوا تھا۔ تین منٹ بعد ایمن نے کہا۔ ”شہباز میری تکلیف بالکل ختم ہو گئی ہے۔ یقیناً نہیں آ رہا ہے کہ چند منٹ پہلے میں مر رہی تھی۔“

”ڈیوڈ شانے بھی یہی کہا تھا۔“

پیٹرک کی آواز آئی۔ ”تمہارا کام ہو گیا ہے کیا اب مجھے جانے کی اجازت ہے۔“

”یہ جانے کو کہہ رہا ہے۔“ ایمن بولی۔

”نہیں اس سے کہو ابھی پندرہ منٹ اور رکے، میں انجکشن کے بارے میں مکمل اطمینان چاہتا ہوں۔“

ایمن نے اسے پندرہ منٹ رکنے کے لیے کہا تو وہ بگڑ گیا۔ ”میں خطرہ مول لے کر اندر آیا ہوں سب سے چپ کر اور کوئی ڈاکٹر یا اسپتال کا کوئی آدمی آ گیا تو میں مشکل میں جاؤں گا۔“

”تم فکر مت کرو میں تمہیں اپنا ملاقاتی قرار دال گی۔“ ایمن نے ہوشیاری سے اس کا اعتراض مسترد کر دیا۔ ”صرف پندرہ منٹ کی تو بات ہے۔“

”ٹھیک ہے لیکن اس کے بعد میں یہاں نہیں روکوں گا۔“

اس نے غرا کر کہا۔ ایمن اٹھ بیٹھی تھی اس نے مجھ سے کہا۔ ”شہباز ڈیوڈ شانے زہر کیسے میرے بازو میں داخل کیا ہوگا؟“

”میں بتاتا ہوں۔“ پیٹرک بولا۔ ”یہ چھونے سے بھی ہلکے میں سرایت کر جاتا ہے اسے کوئی بھی ہاتھ میں لے کر لگا سکتا ہے۔“

”لیکن پھر اسے بھی اس کی تکلیف کا سامنا کرنا پڑے گا۔“ ایمن نے کہا تو پیٹرک نے جواب دیا۔

”جس کے پاس یہ انجکشن ہے اسے کسی تکلیف کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔“

میں نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے ڈیوڈ شانے زہر اپنے ہاتھ پر رکھا تھا جب اس نے تمہارا بازو پکڑا تو زہر تمہاری جلد میں سرایت کر گیا اور بارہ گھنٹے بعد اس نے اثر کیا۔“

پندرہ منٹ پورے ہوتے ہی پیٹرک کھڑا ہو گیا۔ ”اب میں جا رہا ہوں۔“

اس کے جانے کے بعد ایمن نے کہا۔ ”شہباز اب میں بالکل ٹھیک ہوں، حیرت کی بات یہ ہے کہ انجکشن کا نشان بھی نہیں آیا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے تمہاری کھال موٹی ہے ورنہ مرمی جلد پر تو چھونے سے بھی نشان آ جاتا ہے۔“

”جی نہیں ایسی نہیں ہے میری جلد۔“ اس نے خفگی سے کہا۔ ”کیا تم نے مجھے دیکھا اور چھوا نہیں ہے۔“

”ہاں خوش قسمتی سے یہ دونوں کام کیے ہیں۔“

”تب ایسا کیوں کہہ رہے ہو؟“

”مذاق کر رہا تھا۔ مجھے خوشی ہے تمہاری تکلیف ختم ہو گئی۔“

”شہباز یہ تمہارا مجھ پر ایک اور احسان ہے۔“ اس نے جذباتی لہجے میں کہا اور کیونکہ میں اس سے کوئی چار پانچ ہزار میل کے فاصلے پر تھا اس لیے اس نے فون کے ساتھ ایک پُر شور حرکت کی۔ میں نے بوکھلا کر کہا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے تم میری دوست ہو اور اگلی میں احسان نہیں ہوتا ہے۔“

”پھر بھی میں اسے احسان ہی کہوں گی، کاش کہ تم میرے سامنے ہوتے۔“ اس نے مزید جذباتی ہو کر کہا اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں اس کے سامنے نہیں تھا ورنہ وہ نہ جانے کیا کر گزرتی۔ وہ ایک کھلی ہوئی اور بے آواز تہذیب کی پروردہ تھی۔ مجھے یاد ہے پہلی بار جب میں

نے فتح خان کی خوشخوار محبوبہ شینا سے اسے بچایا تھا تو اس نے میرا منہ چوم لیا تھا حالانکہ وہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ یہ کام اس نے بنا کسی جھجک یا شرم کے کیا تھا کیونکہ اس کی تہذیب میں یہ شکر ہے کا ایک انداز تھا۔ اس کے پیچھے جس کا کوئی جذبہ کارفرما نہیں تھا۔ مگر اس وقت اس کا انداز بڑا خطرناک تھا۔ اس لیے میں نے موضوع بدل دیا۔

”ایمن اب تمہیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے، پہلی بات تو یہ کہ میں نے ڈیوڈ شا سے وعدہ کیا ہے کہ تم اس کے خلاف عدالت میں نہیں جاؤ گی۔“

”صرف تمہاری خاطر میں یہ بات مان لیتی ہوں۔“

اس نے سر دواہ بھر کر کہا۔

”دوسرے یہ کہ تم ڈیوڈ شا سے دور رہو گی۔ اپنے فلیٹ کے لاک پیچ کر آؤ اور وہاں کوئی الارم یا خفیہ کیمرہ لگاؤ جو آنے جانے والوں کو ریکارڈ کر سکے۔“

”یہ اچھا مشورہ ہے میں ایسا ہی کروں گی۔“

”اور ہو سکے تو کچھ دن کے لیے ملک سے باہر چلی جاؤ۔“

وہ ہنسی۔ ”یہ بھی ہو جائے گا کیونکہ سائبریا میں ایک ڈاکو میٹری بنانی ہے ہم پندرہ اپریل کو روانہ ہو رہے ہیں اور تقریباً ایک مہینے بعد واپس ہو گی۔“

”یہ تمہاری ڈاکو میٹری ہے؟“

”نہیں یہ ایک سائبریا کی ہے میں کو پروڈیوسر اور میزبان ہوں۔“

”ٹھیک ہے اس بہانے تم یہاں سے چلی جاؤ۔“

”کیا تم میرے لیے خطرہ محسوس کر رہے ہو؟“

”ہاں مجھے محسوس ہوا کہ ڈیوڈ شا بلاوجہ حرکت میں نہیں آیا ہے۔ بہ ظاہر اس نے تمہیں شکار کیا ہے لیکن درحقیقت اس نے مجھ سے رابطہ کیا ہے۔ ورنہ وہ اتنی آسانی سے تمہاری تکلیف ختم کرنے پر آمادہ نہ ہوتا۔“

”کیا اسے معلوم تھا کہ تم اس سے رابطہ کرو گے؟“

”ہاں اسے معلوم ہے کہ تکلیف کا شکار ہونے کے بعد تم مجھ سے رابطہ کرو گی اور میں اس سے بات کروں گا۔“

”یعنی اس نے مجھے چارے کی جگہ استعمال کیا ہے۔“ وہ خفا ہو گئی۔

”اسے شکار کی زبان میں گارا بھی کہتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”شیر کو شکار کرنے کے لیے کوئی بکری یا دوسرا جانور کہیں باندھ دیا جاتا ہے جب شیر اسے مار کر کھانے آتا

ہے تو چنانچہ پریشاں شکاری اسے شکار کر لیتا ہے۔“
”یعنی میں بکری ہوں، تم شیر ہو اور ڈیوڈ شکاری ہے۔“

”تقریباً ایسا ہی سمجھو بس ذرا سا فرق ہے کہ میں تمہارا شکار کرنے نہیں آیا بلکہ ہمدردی میں آیا اور ڈیوڈ شکار مقصد پورا ہو گیا۔“

”وہ آخر تم سے چاہتا کیا ہے؟“

”اس کے دماغ میں وہی سودا سایا ہوا ہے جو تمہارے دادا کے دماغ میں سایا تھا یعنی وادی تک جانے کا اور وہاں کے عجائبات حاصل کرنے کا نیز وادی کی دریافت کا سہرا اپنے سر باندھنے کا۔ اس کے علاوہ بھی ڈیوڈ شکار کے کچھ مقاصد ہوں تو مجھے ان کا علم نہیں ہے۔“
”تم نے سب تو بتا دیا۔“

”ڈیوڈ شاویلیم شکار کے مقابلے میں مختلف سوچ کا مالک ہے۔ ولیم شکار کی سوچ نوآبادیاتی تھی۔ لیکن ڈیوڈ شکار کی سوچ سازشی ہے۔ ولیم شکار سپاہی تھا اور ڈیوڈ شکار ایک ایجنٹ ہے جو ملکوں میں انتشار برپا کرتا ہے اور قوموں کے خلاف سازشیں کرتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ ابھی تم بھگت چکی ہے۔“

”تم کہہ رہے تھے کہ وہ جادو بھی جانتا ہے۔“
”ہاں وہ اس معاملے میں بھی دخل رکھتا ہے لیکن تم پر اس نے زہر آزمایا تھا۔“

”وہ تمہیں اس وادی تک لے جانا چاہتا ہے؟“
”ہاں کیونکہ یہ قول اس کے اور راجا عمر دراز کے وادی میں داخلے کی بجلی میں ہوں جو مجھے وہاں لے جائے گا اسے وادی میں داخل ہونے کا راستہ مل جائے گا اور اگر مجھے نہ لے جایا گیا تو وہ ناکام ہو جائیں گے۔“

”شہباز یہ تو میرے لیے بھی ایک اچھا ناپک ہے اگر میں اس وادی کو دنیا کے سامنے لے آؤں تو میں ایک دن مشہور ہو جاؤں گی۔“

”یہ اتنا آسان نہیں ہے۔“ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ میں اسے مخالفت یا موافقت کا کوئی تاثر دینا نہیں چاہتا تھا۔ ”تم نے سوچا نہیں یہ اتنا ہی آسان ہوتا تو ڈیوڈ شکاریا بے انداز وسائل رکھنے والا شخص اب تک وادی اور اس کے عجائبات کو دنیا کے سامنے نہ لا چکا ہوتا۔“

”ممکن ہے اس کی کچھ مجبوریوں ہوں۔“
”ہو سکتا ہے لیکن ایمن اس وادی کی طرف جانا۔“

موت کے منہ میں جانے کے مترادف ہے۔ راستہ نہیں گزار ہے۔ وادی تک فضا سے رسائی بھی ممکن نہیں کیونکہ وہاں کا موسم ناقابل اعتبار ہے۔ پہلی کا پڑاؤ نہیں جاسکتا ہے اور طیارے کے وہاں اترنے کی گنجائش نہیں ہے۔“

”یعنی صرف زمینی راستے سے وہاں جایا ہے؟“

”بالکل اور اسے تم کے ٹویا ماؤنٹ ایورسٹ سرک کے برابر دشوار سمجھو بلکہ ناگوار بہت جتنا دشوار۔“
”تم مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہے ہو؟“ اس لہجے میں شک تھا۔

”نہیں حقیقت بیان کر رہا ہوں، راجا عمر دراز اس وادی کی طرف جا چکا ہے اور میں نے اس کی وادی کی کہانی سنی ہے۔“

”وہ بھی تو وہاں جانا چاہتا ہے۔“

”ہاں لیکن اس کی عمر بہت ہو گئی ہے اور وہ بیمار ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ اس کو راجا کی اصل بیماری کے بارے میں بتاؤں۔ اس کی طرف سے اب کسی کوشش کا کوئی امکان نہیں ہے۔“

”مجھے شک ہے۔“ ایمن نے صاف گوئی سے کہا۔ ”میں نے راجا عمر دراز کو دیکھا ہے اور وہ انتہائی مزاج اور اپنی ضد پر اڑنے والا شخص ہے اگر اسے معلوم کہ اس کی زندگی بس چند گھنٹوں کی رہ گئی ہے تب بھی وادی کی طرف جانے کی خواہش سے باز نہیں آئے گا۔“

میں نے دل میں تسلیم کیا کہ وہ درست کہہ رہی تھی کینسر کے موذی مرض میں مبتلا راجا عمر دراز ابھی بھی اس میں تھا کہ کسی طرح میں مان جاؤں اور وہ مجھے لے کر وادی کی طرف روانہ ہو جائے۔ اس کے لیے وہ میری ہر طرح کی مدد کے ساتھ نہایت صبر و سکون سے اس وقت کا انتظار کر رہا تھا جب میں اپنے مسائل پر قابو پا لوں۔ اس نے ایک بار بھی میرے لیے اپنے احسان جتانے یا ان کا صلہ چاہنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے برعکس اس کے انداز میں مجھے اپنے لیے فائدے کے بجائے خلوص نظر آتا تھا۔ میں نے ایمن سے بحث سے گریز کیا۔ ”یہ بتاؤ پاکستان آنے کا ارادہ ہے؟“

”نہیں آج کل وہاں حالات غیر ملکیوں خاص سے سفید فاموں کے لیے اچھے نہیں ہیں۔ کچھ ڈاکو بھی پروگرام تھا لیکن وہ بھی ملتوی کر دیا گیا ہے۔“

”حالات واقعی اچھے نہیں ہیں۔ مگر یہ تم لوگوں کی ہی رہائی ہے۔“

”مطلب؟“ وہ چمک کر بولی۔
”مطلب یہ کہ پہلے انگریز یہاں مسائل چھوڑ گئے اور اس کے بعد رہی کئی کسر امریکا اور روس کی آپس کی جنگ نے پوری کر دی۔ اب امریکا خود براہ راست یہاں موجود ہے لیکن حالات سدھرنے کے بجائے مزید خراب ہوتے جا رہے ہیں۔“

”یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن تم لوگوں کو خود بھی اپنی بہتری کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔“

”کاش کہ جو اخلاقیات تمہارے معاشرے میں نظر آ رہی ہیں جہاں کوئی اخبار فٹ پاتھ سے رقم رکھے بغیر نہیں دیتا ہے اور آدمی رات کو اکیلا ڈرائیو بھی سگنل پر رک جاتا ہے۔ یہی اخلاقیات تم لوگوں کی بین الاقوامی سیاست میں نظر آتی تو آج دنیا جنت ہوتی۔“

ایمن نے برامان کر کہا۔ ”تم لوگ سارا الزام مغرب کی کوکوں دیتے ہو۔“

”کیونکہ طاقتور مغرب ہے اور یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ کمزور ممالک کو ترقی میں مدد دے نہ کہ ان کے خلاف سازشیں کرے اور پولیس افسر کے بجائے ڈاکو کا کردار ادا کرے۔ ہم کمزور ہیں اپنا دفاع نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ایسا کریں تو اسے دہشت گردی کا نام دیا جاتا ہے۔ اپنے ملک میں ایک کرپٹ وزیر برداشت نہ کرنے والے ممالک ہمارے ہاں کرپٹ ترین حکومتوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ تیسری دنیا کے کرپشن سے لوٹے گئے کھربوں ڈالرز کہاں محفوظ ہیں؟ ہر بادشاہ، ہر آمر اور ہر نام نہاد جمہوریت پسند اپنے ملک سے بھاگ کر کہاں پناہ حاصل کرتا ہے۔“

”او کے... او کے۔“ اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ ”یہ بین الاقوامی سیاست ہے جس سے میرا تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”مس ایمن شاہ، تعلق تو عراق کی عوام کا صدام کے جرائم سے بھی نہیں تھا۔ انہوں نے اسے منتخب نہیں کیا تھا اس کے باوجود انہیں گزشتہ دس سال سے اس بات کی سزا بھگتنا پڑ رہی ہے۔ اس کے برعکس مغرب کے تم جیسے لوگ جو اپنے سیاست دانوں کو اس طرح منتخب کرتے ہو جیسے ہم جوتے یا کپڑے منتخب کرتے ہیں تو تم لوگ ان کے کیسے سے کیسے ملکی الذمہ ہو سکتے ہو؟“

”میں ایمن شاہ، تعلق تو عراق کی عوام کا صدام کے جرائم سے بھی نہیں تھا۔ انہوں نے اسے منتخب نہیں کیا تھا اس کے باوجود انہیں گزشتہ دس سال سے اس بات کی سزا بھگتنا پڑ رہی ہے۔ اس کے برعکس مغرب کے تم جیسے لوگ جو اپنے سیاست دانوں کو اس طرح منتخب کرتے ہو جیسے ہم جوتے یا کپڑے منتخب کرتے ہیں تو تم لوگ ان کے کیسے سے کیسے ملکی الذمہ ہو سکتے ہو؟“

”میں ایمن شاہ، تعلق تو عراق کی عوام کا صدام کے جرائم سے بھی نہیں تھا۔ انہوں نے اسے منتخب نہیں کیا تھا اس کے باوجود انہیں گزشتہ دس سال سے اس بات کی سزا بھگتنا پڑ رہی ہے۔ اس کے برعکس مغرب کے تم جیسے لوگ جو اپنے سیاست دانوں کو اس طرح منتخب کرتے ہو جیسے ہم جوتے یا کپڑے منتخب کرتے ہیں تو تم لوگ ان کے کیسے سے کیسے ملکی الذمہ ہو سکتے ہو؟“

”میں ایمن شاہ، تعلق تو عراق کی عوام کا صدام کے جرائم سے بھی نہیں تھا۔ انہوں نے اسے منتخب نہیں کیا تھا اس کے باوجود انہیں گزشتہ دس سال سے اس بات کی سزا بھگتنا پڑ رہی ہے۔ اس کے برعکس مغرب کے تم جیسے لوگ جو اپنے سیاست دانوں کو اس طرح منتخب کرتے ہو جیسے ہم جوتے یا کپڑے منتخب کرتے ہیں تو تم لوگ ان کے کیسے سے کیسے ملکی الذمہ ہو سکتے ہو؟“

وہ زبردستی ہنسی۔ ”کیا ہو گیا ہے تمہیں... آج تم مختلف لگ رہے ہو۔“

میں نے گہری سانس لے کر اپنے اعصاب کا بوجھ کم کیا۔ ”سوری... میرے مسائل اور میرے ملک کے مسائل بڑھ رہے ہیں اور یہ ظاہر دونوں کا کوئی حل نظر نہیں آ رہا ہے۔ شاید اسی لیے میں فرسٹٹ ہو رہا ہوں۔ ایمن ایک بات میں پوری سنجیدگی اور خلوص سے کہہ رہا ہوں اگر مغرب والوں نے اسی طرح اپنی حکومتوں کو بین الاقوامی معاملات میں کھلی چھوٹ دے رکھی تو وہ دن دور نہیں ہے جب ان کی دنیا میں لگائی آگ خود ان کے گھر کا رخ کرے گی اور اس وقت تم لوگ کسی کو الزام نہیں دے سکو گے۔“

”سچی بات ہے میں اور دوسرے بہت سارے لوگ اس بات کو محسوس کرتے ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے ہم بعض معاملات میں تم لوگوں سے بھی زیادہ بے بس ہیں۔ تمہارے پاس عمل کرنے کی دوسری راہیں ہوتی ہیں لیکن ہمارے پاس اس کے سوا کوئی راہ نہیں ہے جو پہلے سے طے کر دی گئی ہے۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہو ہم وہ خوش قسمت ملت ہیں جس میں کوئی کام غلط ہو رہا ہو تو کچھ نہ کچھ لوگ اٹھ کر اسے غلط ضرور کہتے ہیں اور اسے روکنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔“

”شکر ہے تم سمجھ گئے۔ ہم اس چیز سے محروم ہیں۔ ہم جانتے ہوئے بھی غلط کو غلط نہیں کہہ سکتے اور اپنے دائرے سے ہٹ کر اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔“ ایمن نے کہا۔ ”اب میں ڈاکٹر سے بات کرنے جا رہی ہوں کہ میں ٹھیک ہوں اور وہ مجھے ڈسچارج کر دیں۔“

”میرا خیال ہے ٹھیک ہونے پر بھی تمہارے ٹیسٹ لیے جائیں گے کہ تم بیٹھے بیٹھے ٹھیک کیسے ہو گئیں۔“

”میرا بھی خیال ہے اپنا خیال رکھنا پائے۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ میں نے ذرا سخت لہجے میں بات کی تھی۔ بہر حال اب تو کر دی تھی۔ میں نے لیپ ٹاپ آن کر کے ڈیوڈ شکار کو کال کی۔ کال بٹنر نے ریسپونڈ کیا اور مجھے رکھائی سے اطلاع دی کہ مسٹر ڈیوڈ شکار گھر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے میں پوچھتا کہ وہ کب تشریف لائیں گے اس بدتمیز نے فون رکھ دیا۔ میں نے دل ہی دل میں اسے سنائیں کہ تم اور تمہارا آقا دونوں جہنم میں جائیں گے تو اس کا شکر یہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ اگرچہ وہ اس کا مستحق نہیں تھا۔ شام ہو چکی تھی کچھ دیر بعد رعب اللہ نے دستک دی اور اندر آیا۔ وہ چائے لے آیا تھا۔

”تم نے کیوں زحمت کی ملازم سے بھجوا دیتے۔“
”زحمت کیسی جناب، آپ کی خدمت کر کے خوشی ملتی ہے۔“ اس نے ٹرے میرے سامنے رکھی جس میں تازہ سمو سے بھی تھے۔ ”جناب ایسے سمو سے پورے ملک میں کہیں نہیں ملتے ہیں۔“

”یہ تو ہے۔“ میں نے کہا اور سموں سے انصاف کرنے لگا۔ ”تم کیا سمو سے لینے گئے تھے؟“
”نہیں جناب، کام سے نکلا تھا راستے میں یہ بھی نظر آگئے تو لیتا آیا۔“
”کام کیا تھا؟“

”راجا صاحب نے کوٹھی فروخت کرنے کا حکم دیا ہے۔“

میں چونک گیا۔ ”کوٹھی فروخت کرنے کا حکم دیا ہے؟“

”میں ایک ملازم ہوں راجا صاحب سے کسی فیصلے کی وجہ کیسے معلوم کر سکتا ہوں؟“ اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

”میرا مطلب ہے کہ راجا صاحب کوٹھی اس لیے فروخت کر رہے ہیں کہ وہ دشمن کی نظر میں آچکی ہے یا کوئی اور وجہ ہو سکتی ہے؟“

”میرا خیال ہے یہی وجہ ہے ویسے اب آپ کا کیا ارادہ ہے؟“ عبداللہ نے پوچھا۔

”کل صبح حویلی کی طرف جانے کا ارادہ ہے۔ میں اکرم چشتی سے ملاقات کے لیے بے چین ہوں اور پھر نادر سے بھی بات کرنی ہے۔“

”آپ کے سامنے جانے سے حقیقت کھل جائے گی۔“
”حقیقت کھل چکی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے مرشد کو بتا دیا ہے کہ اس کا بھائی میرے پاس ہے اور وہ نادر کی واپسی کے لیے سمجھوتا کرنے کو تیار ہو گیا ہے۔“

”واقعی؟“ عبداللہ حیران ہوا۔

میں نے اسے تفصیل سے اپنی اور مرشد کے درمیان ہونے والی گفتگو سنائی پھر برسبیل تذکرہ ایمن اور ڈیوڈ شا کے بارے میں بھی بتایا۔ عبداللہ نے پُر جوش لہجے میں کہا۔ ”جناب اگر آپ کے خلاف کیس ختم ہو جائے تو سمجھ لیں آپ آدمی بازی جیت لیں گے۔“

”یہ سوچ کر میں نے نادر کی تحویل کا اقرار کر لیا ہے اب میں نادر سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”میں بھی چل سکتا ہوں؟“ اس نے پوچھا۔
”ہاں کیوں نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”ہم سب سویرے ہی گئے جب لوگ دفنوں اور کام پر جانے کے لیے نکلتے ہیں۔“
”اس وقت رش زیادہ ہوتا ہے۔“ عبداللہ سرکرایا۔
”کسی ایک آدمی یا گاڑی پر توجہ دینا مشکل ہوتا ہے۔“

”ہاں اس وقت پولیس یا ٹریفک والے بھی گاڑیوں کو روکتے ہیں کیونکہ ہر شخص کو جانے کی جلدی ہوتی ہے۔“
”یہی ٹائم ہے ہمارے شہر سے نکلنے کا ورنہ مجھے یہ ہے پولیس اب بھی مستعد ہوگی۔ کل کچھ دہشت گردوں کی شہر میں موجودگی کی اطلاع ملی تھی اس وجہ سے پولیس کل آج چوکس تھی۔“

میں دوپہر میں سو لیا تھا اس لیے رات کے کھانے کے بعد ٹیرس میں چھل قدمی کرتا رہا۔ بارش کی ہلکی سی پھواروں کے ساتھ رخ ہوا کے جھونکے بھی آرہے تھے لیکن اس وقت پرے نہیں لگ رہے تھے۔ کیونکہ میں نے شمال کی طرف تھی۔ اگر عام لباس کے ساتھ باہر آتا تو ہوا کے جھونکے اتنے اچھے نہیں لگتے۔ جب نیند کا خیال آیا تو اندر آگیا اور گرم پانی سے نہانے کے بعد سونے کے لیے لیٹ گیا۔ گزشتہ دنوں جو ذہنی و جسمانی سختیاں برداشت کی تھیں اب ان کے اثرات تقریباً ختم ہو چکے تھے۔ مسلسل آرام اور بہترین خوراک نے میری ذہنی و جسمانی توانائیاں بحال کر دی تھیں۔ اب میں کسی بھی مہم جوئی کے لیے بالکل تیار تھا۔ صبح میری آنکھ خود بخود خود سورج نکلنے سے پہلے کھل گئی۔ واش روم سے فارغ ہو کر نیچے آیا تو عبداللہ بھی تیار موجود تھا۔ میں نے اکثر اسے جاگتے ہوئے اور چاق و چوبند ہی دیکھا تھا۔ آرام کرتے کم پایا تھا اور وہ بھی مختصر وقت کے لیے۔ وہ عام طور سے رات دیر تک جاگتا تھا اور صبح جلدی اٹھ جاتا تھا۔ عبداللہ نے پوچھا۔ ”آپ تیار ہیں؟“

”بالکل... ناشتا کرتے ہی نکلتے ہیں۔“
لیکن ناشتے کے دوران ہی عبداللہ کو اسٹیٹ ایجنٹ کی کال آگئی۔ ”ہیلو... موجود ہوں... کس وقت... اچھا ٹھیک ہے۔“ اس نے کال کے بعد میری طرف دیکھا۔ ”مسئلہ کیا ہے جناب... کوٹھی کا ایک خریدار اب سے دو گھنٹے پہلے کوٹھی دیکھنے آ رہا ہے میرا وہاں موجود ہونا ضروری ہے۔“

”کوئی بات نہیں تم چلے جاؤ، میں ابھی روانہ ہوں تم بعد میں آ جانا۔“

”یہ ٹھیک رہے گا آپ کون سی گاڑی میں جانا ہے۔“

”میں آگے۔“
”یہاں مجھے کوئی بانٹک نظر نہیں آرہی ہے اس لیے کوئی کار لے جاتا ہوں۔“
”ایسا کریں آپ منی جیب لے جائیں طویل فاصلوں کے لیے اچھی گاڑی ہے، اس کا پیک اپ بھی زیادہ ہے۔“
ناشتے کے بعد میں نے وسیم سے رابطہ کیا۔ ”میں آ رہا ہوں حالات کیسے ہیں؟“

”بہترین ہیں۔ اپنے ڈی ایس پی صاحب اس وقت کوکوس رہے ہیں جب وہ پیدا ہوئے اور پھر پولیس میں بھرتی ہوئے۔“

”ابھی تو مقامات آہ و فغاں اور آئیں گے بس ذرا مجھے تھکادو۔“ میں نے فیس کر کہا اور فون بند کر دیا۔ عبداللہ رک با تھا۔ اسے کچھ دیر بعد جانا تھا اس لیے میں نکل گیا۔ احتیاط کے طور پر میں نے بڑے سائز کا سن گلاس لگا لیا تھا اور ہلکی جیکٹ کے کالر اوپر کر لیے تھے اس سے میں خاصا مختلف دکھائی دے رہا تھا۔ بارش کے بعد دھوپ نکل آئی تھی اور سڑکوں پر ٹریفک کا ہجوم تھا۔ میں نے جی ٹی روڈ کا راستہ اختیار کیا اور اس وقت سکون کا سانس لیا جب کسی پولیس والے کی صورت دیکھے بغیر پنڈی شہر کی حدود سے باہر نکل گیا۔ اب میرا رخ پشاور کی طرف تھا۔ ترنول سے گزرنے کے بعد میں مختلف چھوٹے شہروں سے گزرتا رہا پھر اس لنک سڑک پر آگیا جو حویلی کی طرف جاتی تھی۔ اس پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد میں حویلی کے سامنے تھا۔ گاڑی میں بھی کیمرے کی مدد سے مجھے دیکھ لیا گیا تھا اس لیے عقبی گیٹ کھل گیا۔ یہاں بارش کچھ زیادہ ہوئی تھی کیونکہ جاہ جا کے میں پانی جمع تھا اور حویلی کا عقبی صحن کچھ کچھ پور ہوا تھا۔ میں کچھ دیر بیٹھ کر ناشتا کیا۔ وسیم نظر نہیں آیا میں نے اس کے بارے میں پوچھا۔ ایک آدمی نے بتایا۔ ”وہ نیچے تہ خانے میں ہیں۔“

یعنی وہ اکرم چشتی کے ساتھ تھا۔ میں نیچے تہ خانے میں آیا تو اس کے در و دیوار پر سیلن آئی تھی۔ یہ بارش کا اثر تھا۔ اکرم چشتی سچ ایک جگہ الٹا لٹکا ہوا تھا اور اس کے گلے میں موجود سیاہ ڈوری والا موٹا چاندی کا منقش تعویذ اس کے منہ سے ٹکراتا تھا۔ ڈوری کا حلقہ اتنا بڑا نہیں تھا کہ اس کے سر سے گزر جاتا۔ ایک انڈرویر کے علاوہ کوئی لباس اس کے جسم پر نہیں تھا۔ مستقل الٹا لٹکے رہنے سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس کی پشت پر سیاہ لکیروں کا ایک جال بنا ہوا تھا۔

ظاہر ہے اس کی ہنٹر سے مرمت ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے جسم پر اور کوئی زخم نہیں تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے گڑ گڑا کر کچھ کہا لیکن اس کی ٹوٹی پھوٹی زبان میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ وسیم اس کی پشت پر موجود تھا اس نے عقب سے لات ماری۔

”ٹھیک سے بول... اپنی مادری زبان میں... باپ تو تیرا کوئی دوغلی نسل کا کتا ہو گا ہی۔“ درمیان میں وسیم نے خالص پولیس اسٹائل کی گالیاں فٹ کی تھیں۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

”لگتا ہے تم بھی پولیس میں بھرتی ہونے کے خواہش مند ہو۔“

”اگر ہوا تو صرف اس کے لیے ہوں گا۔“ وسیم نے ایک لات اور رسید کی ساکرم چشتی ٹپ کر رہ گیا تھا۔ میں نے افسوس سے سر ہلایا۔

”ڈی ایس پی کی خاطر تو وضع صرف لاتوں سے... یہ لاتوں کے بھوت بھی نہیں ہیں، ان کو منانے کے لیے کسی اور چیز کی ضرورت ہے۔“

”کس چیز کی جناب آپ حکم کریں۔“ وسیم نے کہا۔
”یہاں بجلی کا کوئی تار ہے؟“

یہ سن کر ہی اکرم چشتی ٹپ گیا تھا۔ اس نے پھر غوٹاں کر کے فریاد کی۔ وسیم سمجھ گیا اور تار کا بندوبست کرنے چلا گیا۔ میں اکرم چشتی کے پاس بیٹھ گیا۔ ”صبر کرو اتنی جلدی کیا ہے کرنٹ کھانے کی، یاد ہے تم نے میرے ساتھ کیا کیا تھا۔ مجھے یقین ہے صرف میرے ساتھ ہی نہیں لاتعداد بے گناہوں کے ساتھ تم نے اس سے زیادہ بہیمانہ سلوک کیا ہو گا۔ مجھے کسی سے ذاتی انتقام لینا اچھا نہیں لگتا ہے لیکن ہم تمہیں احساس دلانا چاہتے ہیں کہ جب تم بے بس لوگوں پر تشدد کرتے ہو تو ان پر کیا گزرتی ہے۔“

اکرم چشتی کا موٹا تعویذ اس کے منہ سے ٹکراتا تھا اور اس وجہ سے بھی اسے بولنے میں دشواری پیش آرہی تھی لیکن اس نے کسی طرح سر ہلا کر کہا۔ ”شہباز خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔“

”یہ معافی ہی ہے ورنہ اگر تمہاری موت کا فیصلہ ہو چکا ہوتا تو تمہیں یہاں لانے کی زحمت ہی نہ کی جاتی اور اس وقت تمہاری لاش مردہ خانے میں پڑی ہوتی۔ جو ڈارٹ گن چلا سکتے ہیں ان کے لیے ایک گولی چلانا کون سا مسئلہ تھا۔ مگر تمہیں اپنے اعمال کی کچھ نہ کچھ سزا تو بھگتنا ہوگی۔“

ناز اختر ناز..... حیدر آباد

وابستہ سنگ در دوراں ہی نہیں ہیں
اک موم کی صورت بھی مکیں ہے مرے دل میں
جور پہ ابراہیم..... سرگودھا

وہ ہاتھ آنکھوں پہ رکھ لوں تو ٹھنڈ پڑ جائے
اگرچہ لاکھ رم شعلہ صفا دیکھوں
نعمان معذرت رضوی..... ملتان

روح پابند سلاسل تھی نگاہیں خاموش
ابن آدم سے خدا اس کا خفا ہو جیسے
فیصل آباد

نیاز حیدر..... فیصل آباد
رنگ اور نسل کے باعث نہ کھلیں مے قتل
آتش افروز نہ اقوام کا خرمن ہوگا
اختر عثمان..... سرگودھا

مبارع درد لٹ گئی پرانے مال کی طرح
لیوں پہ آہ رہ گئی فقط سوال کی طرح
فہد ندیم..... فیصل آباد

میری آنکھوں میں نیکی تو نہ تھی
آپ دامن یوں ہی چھڑانے لگے
ریاض اختر..... چنوت

مٹھی باتوں سے ادا جاگتی ہے
نرم آنکھوں میں سنورتے ہیں خیال
رانا محمد..... کنڈیاں

میرے چاہنے والے مجھ کو بھول گئے تو کیا
موسم ہو تبدیل تو پتے جھڑنے لگتے ہیں
(نادیہ گبول کراچی کا جواب)

سلیم کامریڈ..... کھاناں
ابھی تک بے کفن سی ہے میری وحشت کی عریانی
یہ کس امید پر گھر کو بے امان کر لیا میں نے
(میمونہ عباسی کا جواب)

مجاہد علی ایس بنی..... ڈگری
کب کسی کا درد اپناتے ہیں لوگ
رخ ہوا کا دیکھ کر اکثر بدل جاتے ہیں لوگ

(سلیم کامریڈ کھاناں کا جواب)

سید اسرار علی..... لاہور

یہاں ہے کون جو آکر مری گواہی دے
میں شہر سنگ میں لب کھولنے سے ڈرتی ہوں
اکتہار ارتضی..... منڈی بہاوالدین

دھشتوں کا سورج جھلسا نہ دے زمیں کو
تنتنی تپش ہے اس میں جلنے لگا ہے سایا
(زاہد جمال سکرٹ کا جواب)

تنویر رفیق..... کراچی

اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں
وہ صورتیں الٹی کس دیں بستیاں ہیں
(ناز اختر ناز حیدر آباد کا جواب)

محمد عقیل چشمہ..... حافظ آباد

یہ اچانک جو اجالا سا ہوا جاتا ہے
دل نے چپکے سے تیرا نام پکارا ہوگا
نینا قیصرانی..... کوٹ قیصرانی

نہ جانے کس عمر میں جائے گی یہ عادت اپنی
روٹھنا اس سے مگر اوروں سے چلتے رہنا
(اجتہال سلیم حیدر آباد کا جواب)

عبدالحکیم..... لاہور

یہ معجزہ بھی محبت کبھی دکھائے مجھے
کہ سنگ تجھ پر گرنے اور زخم آئے مجھے
محمد سعید..... ہالہ نئو

یہ مصلحت وقت ہے خاموش ہیں ورنہ
ہے کون جو حالات سے بیزار نہیں ہے
(سید اسرار علی لاہور کا جواب)

عاشق حسین..... چنوت

وہ کلی کہاں چلی بے کلی کی چھاؤں میں
سادگی نے چھو لیا دامن حیات کو
ریحانہ افتخار ملک..... شیخوپورہ

وہ چال ہو کہ بدن ہو کمان جیسی کشش
قدم سے گھات ادا سے ادا نکلتی ہے

”شیر کے دانت اور نیچے نکال دو تو وہ بیکار ہو جائے
پھر اس کی بے پناہ طاقت بھی کسی کام کی نہیں رہتی ہے۔“
”اس کی طاقت ہے اس کی نوکری اور ہم اس کی
نوکری کس طرح چھین سکتے ہیں۔“

”ہم اس کی نوکری نہیں چھین سکتے لیکن اگر
اسے نوکری کے قابل ہی نہ چھوڑیں تو.....؟“ میرا جواب
خیر ہو گیا وہم نے چونک کر مجھے دیکھا۔

”آپ کا مطلب ہے اسے فزیکلی طور پر ملازمت
کے قابل نہ چھوڑا جائے۔“
”بالکل۔“

وسیم سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے کہا۔ ”کس طرح
کیا اسے اندھا، گونگا اور بہرا کر دیا جائے۔“

”ہاں یہ کام زیادہ مشکل نہیں ہے۔“ میں نے
کہا۔ ”چپکنے والے کسی سلوشن کی ایک ٹیوب کام کر دے گی۔“
اس کے بعد اکرم چشتی کسی کام کا نہیں رہے گا۔

یہ موضوع ایسا تھا کہ اس پر بات کرتے ہوئے میں
اور وسیم دونوں ہی سنجیدہ تھے۔ ہم ایک انسان کے بارے
میں بات کر رہے تھے۔ وہ انسان ہمارا جانی دشمن تھا اور اس
کا بس چلتا تو ہمیں دنیا سے مٹا دیتا۔ اس کے باوجود ہم اسے

جان سے مارنا نہیں چاہتے تھے لیکن اسے چھوڑ بھی نہیں سکتے
تھے۔ اسے بے ضرر بنانے کا یہ عمل اس کے ساتھ ہمارے
لیے بھی تکلیف دہ تھا لیکن یہ ناگزیر تھا۔ میری تجویز کے
بعد اصولی طور پر فیصلہ ہو گیا تھا کہ اکرم چشتی کے ساتھ کیا کرنا

ہے۔ اب اس فیصلے پر عمل درآمد وسیم کی ذمہ داری تھی۔
مزید گفتگو کے لیے میں نے دوسرے موضوع کا انتخاب
کیا۔ ”تم نے اپنے آدمیوں کی اسکر دہنی کی۔“

”ممکن حد تک..... دو افراد مجھے ذرا ہلکے محسوس
ہوتے ہیں۔ ایک تو فیصل کا ساتھی ہے۔“

”ان پر نظر رکھو اور جب اس ٹھکانے کو چھوڑنے کا
وقت آئے تو انہیں چلتا کرنا۔“

”میں نے یہی سوچا ہے۔“ وسیم نے سر ہلایا۔ ”میں نے
کوئی باہر چلایا اور جو لفظ میری سمجھ میں آیا تھا وہ پولیس
میں اور وسیم بے ساختہ کھڑے ہو گئے۔ وسیم کا ایک آواز
نمودار ہوا۔ اس نے تیزی سے کہا۔

”جناب پولیس..... اس نے چاروں طرف سے
حویلی کو گھیر لیا ہے۔“

جاری ہے

”وسیم ایک دو لچ اسٹیل انڈر اور تار لے آیا۔ اس کی
مدد سے کرنٹ کو کنٹرول کیا جاسکتا تھا اور اسے جان لیوا سطح
سے نچا رکھا جاسکتا تھا۔ اس نے تار کا ننگا حصہ اکرم چشتی کی
دونوں رانوں کے درمیان ایک نہایت حساس مقام سے
باندھا۔ وہ تڑپ رہا تھا اور مزاحمت کے ساتھ ساتھ التجائیں
بھی کر رہا تھا لیکن وسیم نے اس کی فریادوں پر دھیان دیے
بغیر اپنا کام کیا اور تار کا دوسرا حصہ اسٹیل انڈر کے ساکٹ میں
لگا دیا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور میں نے جیلر کی طرح
سر سے اشارہ کیا جو جلا کو اجازت دیتا ہے اور وسیم نے ٹپ
آن کر دیا۔ کرنٹ لگتے ہی اکرم چشتی نے ایسی چیخ ماری کہ
میں بھی اچھل پڑا تھا۔ اس چیخ کے بعد وہ اٹنے لگے لگے یوں
تھر تھرانے لگا جیسے کسی قسم کا کوئی رقص کر رہا ہو۔ اس کا چہرہ
انتہائی سرخ ہو گیا اور یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا سر پھٹ
جائے گا۔ آدھے منٹ بعد میں نے کرنٹ بند کرنے کو کہا تو
اکرم چشتی کی حالت غیر ہو گئی تھی اس کی زبان منہ سے نکل
آئی تھی اور آنکھیں حلقوں میں گردش کر رہی تھیں۔ تہ خانے
میں خنکی کے باوجود پیدنا پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ جب اس
کی حالت ذرا سدھری تو وسیم نے مجھ سے پوچھے بغیر سوچ
آن کر دیا اس بار اکرم چشتی کٹے بکرے کی طرح چلایا تھا۔

وقفے وقفے سے ایسے چار دور چلے تو اس کی ہمت
جواب دے گئی اور اس نے بے ہوشی میں عافیت بھی گئی۔ وہ
چھوٹے لگا تھا اس کی زبان دانتوں کے درمیان آکر کٹ گئی
تھی اور گوشت جلنے جیسی بو آرہی تھی۔ میری طبیعت متلانیے

لگی اور میں اس جگہ سے ہٹ گیا۔ وسیم نے تار اتار دیا اور
اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ اکرم چشتی کو کھول کر اس کے پیروں
میں گڑا ڈال دیں۔ ہم اوپر آئے تو وسیم نے کہا۔ ”فرعون
صفت شخص ہے، ہوش میں آنے کے بعد ہمیں دھمکیاں دے
رہا تھا لیکن جب اسے الٹا لٹکا کر پہلی دھونی دی تو دماغ
ٹھکانے پر آ گیا اور منت سماجت پر اتر آیا تھا۔“

”میرا خیال ہے اتنا کافی ہے۔“ میں نے کہا۔
وسیم نے میری طرف عجیب نظروں سے دیکھا۔

”شہباز صاحب ابھی تو چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے ہیں۔
آپ نے دودن کی اجازت دی تھی۔“

”نہیں یار، میں کسی انسان پر چاہے وہ اکرم چشتی ہی
کیوں نہ ہو اس حد تک تشدد نہیں کر سکتا۔ اسے سزا دینی ہے تو
براہ راست دے دو۔“

”آپ کے خیال میں اسے کیا سزا دینی چاہیے؟“

(نسرین رانا فیصل آباد کا جواب)

میمونہ عباسی..... حیدر آباد
مجھ سے بچھڑ کے تو بھی تو روئے گا عمر بھر
یہ سوچ لے کہ میں بھی تری خواہشوں میں ہوں
نازش سحر..... کراچی
میں کہ پھولوں کو چتا رہا رات بھر
ایک انسان شبنم میں بیجا ہوا
اصغر بگلش..... ڈی آئی خان
مذہب والوں کو یہ حسرت کب دنیا سے کفر مٹے گا
میں تو بس اتنا سوچ رہا ہوں کب انسان انسان بنے گا
اسامیل رند..... ملتان
مجھے درد دل وہاں لے گیا
جہاں در کھلے تھے طلسمات کے
نوشین ملک..... سکھر
میں اسے ڈھونڈنے یادوں کی کھلی سڑکوں پر
خنگ بچوں کی طرح روز بکھر جاتا ہوں
(عبدالرحمان ساہیوال کا جواب)

حمیرا کریم..... پشاور

جب یہ طے ہے کہ یہاں کوئی نہیں آئے گا
کس کی خاطر در و دیوار سنوارے جائیں

(نادیہ گبول کراچی کا جواب)

نازش سحر..... کراچی
اترنا جا رہا ہے آج سورج
سندر سرخ تر ہونے لگا ہے
عباس ملتان..... ملتان
آئینہ جب مجھ سے آنکھ ملاتا ہے
آئینے پر عکس کی حیرت کھلتی ہے

(راحت خان ڈی جی خان کا جواب)

مدیحہ سلطان..... سکرنڈ
گلتا ہے کئی راتوں کا جاگا تھا مصور
تصویر کی آنکھوں سے جھکن جھانک رہی تھی

فہیم الرحمن..... میانوالی

لکھ کر ہمارا نام زمیں پر مٹا دیا
ان کا تھا کھیل خاک میں ہم کو ملا دیا
(تسلیم ضیاء کراچی کا جواب)

نوازش کریم..... پشاور

اشکوں سے ہماری ہے منور نئی دنیا
شبنم کو ضیا دی تو کرن ہم نے بنایا
نازمین ناز..... زاهدان (ایران)
آخر شب وہ ستاروں کی سرکتی ہوئی چھاؤں
میں وہیں بیٹھ گیا رات جہاں گزری
علی شاہ..... گلگت
اے غم، انیس دل، یہ تیری دلتوازیاں
ہم کو تری خوشی کے لیے مسکراتا تھا
قدیل احمد..... منڈی بہا الدین
آنسوؤں کی جھڑی ہے آنکھوں میں
ہم نے پایا ہے نصیب بادل کا
مجاہد علی..... ڈگری
اب جس کے جی میں آئے وہی پائے روشنی
ہم نے تو اپنا دل جلا کے سرعام رکھ دیا
(مہناز اسد کاموٹی کا جواب)

تنویر رفیق..... لاٹھی کراچی

وعدہ وہ کر گیا تھا کہ آؤں گا خواب میں
آیا ضرور مگر تھا نقاب میں
(تنویر آصف چوہدری جہلم کا جواب)

شمیم احمد..... کراچی

امن ہوتا ہے پیار سے ورنہ
لاکھوں لوگوں کے سر کٹے ہوتے
(فتح علی میانوالی کا جواب)

طلحہ یاسین..... لطیف آباد

کچھ تو تھے دوست بھی وفا دشمن
کچھ مری آنکھ میں حیا بھی تھی
(روبی سیالکوٹ کا جواب)

سعید قاسمی..... ڈلوال

نہ ہے دشمنی کسی دن سے اب نہ ہے دوستی کسی رات سے
ہے بچائی کیا جو وہ لے گیا مجھے جھین کمری ذات سے

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا
ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔
اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان
کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر
ہی شعر ارسال کریں۔

میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام..... ہے۔

نام:

پتا:

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سہنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوا دیا جائے
کسی ایک پر ☒ کیجیے۔

کو پین کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 مارچ 2013 تک علمی آزمائش 89 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں۔

مقابلہ

بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی
تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ ”بیت بازی“
شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر
کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر
ارسال کر سکتے ہیں۔

نام:

پتا:

محترم / محترمہ..... کے شعر کے جواب میں
شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شامل اشاعت کر لیں
(شعر الگ کاغذ پر ہے) **50**

مقابلہ بیت بازی

پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی، 74200



اگر آپ کو

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ
ماہنامہ سہنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

کے حصول میں دقت پیش آرہی ہے یا آپ کو اپنے
علاقے کے بک اسٹال سے کوئی شکایت ہے اور
آپ کے علاقے میں بروقت پرچہ نہیں پہنچ رہا تو

شکایت فیکس کریں

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

شرعباس 0301-2454188

بدالدین سرکولیشن منیجر 35802552-35386783-35804200

فیکس نمبر 35802551

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیروز ٹرنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35895313 فیکس: 35802551

علمی آزمائش - 89

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کامنٹرہ انعامی مسئلہ

علمی آزمائش کے اس مفرد مسئلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھیجیے۔ درست جواب بھیجے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت مسپیمنس ڈائجسٹ، جامسو می ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ”یک علمی سرگزشت“ کے عنوان تلے مفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو جاننے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 مارچ 2013ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

1928ء میں فیروز پور (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ کثیر ڈکالچ لاہور سے ریاضی اور معاشیات میں بی اے اور گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے اردو کیا، چلڈرن کپلیکس لائبریری کی ایگزیکٹو ممبر اور پنجاب یونیورسٹی سٹڈی کیٹ کی رکن رہیں۔ ایک بڑے افسانہ نگار کی شریک حیات بنیں۔ خود بھی ریڈیو اور ٹی وی کے لیے بے شمار ڈرامے اور سیریز تحریر کیے، سورج بکھی، چار چمن، اہل کرم، ستم گریز، لیے، اک تیرے آنے سے پہلے، بزدل، یہ جنوں نہیں تو کیا ہے، منزل بہ منزل، فٹ پاتھ کی گھاس، باٹ بسیرا، تحریریں مشہور ہوئیں۔ حکومت نے تمغا امتیاز دیا۔

علمی آزمائش 87 کا جواب

14 اکتوبر 1938ء کی شب ساڑھے دس بجے پیدا ہونے والی فرح دیا سلطانہ کے والد سہراب دیا ایرانی افواج میں افسر تھے۔ اس لڑکی کی ایک دوست بھی شہناز۔ اس نے دوستی کو مستحکم کرنے کے لیے اس کی شادی اپنے باپ سے کراوی تاکہ وہ اس سے بھائی حاصل کر لے۔ اس لڑکی نے اس گھر کے لیے چراغ تو دیا مگر خود اس کی زندگی اندھیرے میں گم ہو گئی۔ اس کی اور اس کے شوہر کی موت ملک سے باہر ہوئی۔

انعام یافتگان

1- مہرین امتیاز، لاہور-2 زارا اکبر، بہاولپور-3 نصیر شاہ، جھنگ

4- زاہد انصاری، حیدرآباد-5 حدیقہ اشرف، کراچی

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے ذوالفقار احمد خان، شمیم احمد، سمیع عزیز، نعمت اقبال رضوی، عطیہ نورین، اربہم اقبال رضوی، محمد علی مشاہد، فرزانہ پروین، انصار حسین، لعین احمد، سرور احسن صدیقی، نیاز خانچی، مختیار شاہ، عارفہ سلطانہ، خالد عثمانی، کہکشاں تبسم، عنایت مسیح، علی احمد، رجب علی مرزا، نجم الدین حیدر، نصرت فاروقی، نجم احمد، انعام خان، افتخار احسن، وجاہت علی، کاوش اختر، تنویر حسین زیدی، نوازش علی شاہ، ناصر افروز، ممتاز الحسن، وجاہت شاہ، انصار حسین، قائم علی، ابرار احمد، نجم الدین حیدر، حکیم اللہ جمی، منور علی، ملک سرفراز گل، کاشف حیدر، جاوید علی۔

مظفر حسن، پیام فاروقی، ناظم پاشا، کائنات فاطمہ، نذر علی برمانی، خالد خان۔ لاہور سے ایم بی اسلم، ابرار الحسن، قدیر اللہ، ناصر فاروق، کاشان صدیقی، الدینو آراکس، گل زیب، پروین ضیاء، شاراخر، ارشد علی، احمد علی مشرق، ممتاز الحسن، عقیل سندھو، نعمان اشرف، ارباز خان، اکرم صدیقی، ابرار احمد انعام، تابش عطاری، نیاز احمد ملک، برق ضیائی، الدلی، احمد بشیر بٹ، فہیم مرزا، حدیقہ اشرف، ملک واحد الحق، ابرار احمد، نازش خان، ہما جیس، حمیرا خاتون، ممتاز الحسن، زبیر اسلم، نازش حسین، تابش اطہر۔ راولپنڈی سے ڈاکٹر سعادت علی خان، شیراز ملک، ڈاکٹر فلم یاسین، ناصر جاہ، تنسیم فاروق آرکلی، صادق حسن، نرجس علی، بخت خان، زبیر شاہ اشرفی، خاقان خان، زویا بخاری، سید محمد تقی، تنویر الحسن، صفدر شیرازی، نسرین اشرف، کائنات ہانو، رانا فتح یاب، زاہد عباسی۔ اسلام آباد سے نیلو فر شاہین، ممتاز احمد، کشور جہاں، توصیف احمد، صدیقی الرضی، نعمت اللہ خان، نصر حیات عباس، نیاز اللہ، شاہین اشفاق، سعید اختر، درو ممتاز، انور یوسف زئی، شہناز فیضی، محمد شہین، بشیر فاروقی، محمد شہزاد، بیدری اکرم۔ ملتان سے محمد بلال اقبال، محمد سعید چشتی، نورین افشار، ایاز سومرو، زندان خان، حکیم اللہ چغتائی، ذیشان ملک، فرحت مغیر، قدوس بخش، سعیدہ جلال، فاضل خان اچکزئی، لبنی ظہیر، رضوانہ اختر، اللہ دتہ، محمد عتیق، فرزانہ ملک، زینب چوہان، قدوس بخش۔ جہلم سے ارباز خان، ملک سرفراز، ندیمہ امتیاز۔ فیصل آباد سے محمد زاہد، ماسٹر عبدالعزیز (سندری) جھنگ سے عطا مصطفیٰ، گوجرانوالہ سے الف اے کھوکھر۔ چکوال سے رمضان وٹو، ارشد حسین۔ واہ کینٹ سے نور افضل خان ٹٹک۔ منڈی بہاؤ الدین سے خرم جہان زیب۔ میانوالی سے عبدالحق (کالا باغ) ایم شفیق قدسی (مسلم بازار) کوئٹہ سے حبیب احسن، ناصر چنگیزی، نعمان خان، حسن عسکری، زاہد علی، فرحت باہر، خاقان چنگیزی، راؤ رشید، ارباز خان، فیض اللہ خان، قتیل سید پوری، تقی چنگیزی، نگارث، صالح بشیر، نصرت چنگیزی۔ سرگودھا سے انعام اللہ انعام، اکبر خان، اشرف ممتاز، زاہد حسن، نادر شاہ، حیات خان، فصیح الزماں، عظمیٰ اکملی، نوانہ، خلیق الزماں، نصر حیات۔ شجاع آباد سے حسن علی زیدی، فہیم اللہ، نصیر جنوٹی۔ خانیوال سے طارق شہزاد، سید ابٹام اشرف مشہدی۔ حیدرآباد سے احمد انصاری، باہر خان، طہ یاسین، دعا زہرا۔ میرپور خاص سے مجاہد علی ایس بی۔ کھاناں سے سلیم کامریڈ۔ پاک پتن سے علی محمد (حسن پورہ) ساہیوال سے سرفراز ملک۔ چیمچہ برہ زئی سے ذوالفقار فضل کریم، ملک جاوید محمد خان سرکانی۔ حاصل پور سے نعمان اور یس۔ ڈی جی خان سے موسیٰ خان۔ بہاولپور سے قاضی عدنان احمد، حمیرا کوکب واسطی، آمنہ ملک۔ بہاولنگر سے معظّم علی (چشتیاں)۔ اوکاڑہ سے اظہر الدین، سعید احسن محمود، نعمان بشیر، صاحب خان، راجا احسن، ملک صفدر، اظہر الدین۔ سیالکوٹ سے نوید شہزاد خواجہ، آصف ملک، اقرار الحسن، منہ جیس فلک، نصرت مرزا، محمد رضا، احتشام اسلام الدین، ارباز ملک، لیاقت علی، ضامن رند، ظہیر فرقانی۔ انک سے خالد چوہدری، زبیر اللہ خان، فیض اختر، شاجران، خورشید اختر، زبیر اللہ مروت، فاطمہ ملک، سرفراز گل، شہ اللہ، فرحت باہر زمان، سعید بھٹی، شاد فرارز، سید اختر، سعید خان، فتح شاہ، زبیر اللہ مروت، اکرم خان۔ حافظ آباد سے نعمان حسن خان، فرحت جان، خالد جاوید، شیریں فاطمہ، نسرین رانا، محمد عقیل چٹھہ، محمد ابراہیم، محمد صدیق ستری۔ نواب شاہ سے عزیز حسن، ارجم شاہ، عزیز الدین۔ شہر سلطان سے سنجیدہ احمد، بازخ بخاری، ارشد حسن، نوید انصاری، عباس علی، ارباب خان، راجا یونس۔ میرپور آزاد کشمیر سے کاشف حسین، نعمان سلطان، کمال احمد کمال، احسن بھٹ، نصرت خان، یونس ایاز۔ میانوالی سے احمد علی فوٹی، ایاز علی رند، ملک سرفراز، خیر الدین کھر، ضامن خان اشرفی، عبدالحق (کالا باغ) بکھر سے حسن چنگیزی، غازی شاہ، شاہد حسن خان، نیاز احسن، زاہد اسلم چٹھہ، ملک سرفراز منگیر، زبیر شاہ، تقی بخش۔ ننڈو آدم سے فاطمہ عباسی، نیاز ملکانی، خالد خان چوٹالہ، ناصر بھکیو، نیاز عباس۔ کمالیہ سے محمد کمال، ذیشان مجاہد، ناصر ملک، فہد حسن، ابرار الحق، شاد علی، فہیم عثمانی، فردوس بشیر، ابرار خان اعظم، ظہیر الدین۔ لیٹہ سے شباب الاسلام، شجاعت خان، راجا ابرار، سردار توفیق، انصار حسین، مالک حسن ملک۔ گولار جی سے ارشد خان، شاہ جمال سے فہد مشتاق۔ نارووال سے انعام احسن کمالی۔ مردان سے ابرار خان۔ تربیلہ ڈیم سے حسن بیگ، فہیم اللہ فاروقی۔ نوشہرہ سے فضل محمد۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے سرفراز احسن، صفدر حسن، خالد خان، ناصر انعم، ابرار حسن زئی۔ ڈیرہ غازی خان سے احمد علی واصف احمد۔ لیٹہ سے نذیر احمد گجر (چوہارہ) پشاور سے غازی توفیق، مظہر حسین، مایک اسلم، نوید ملک، نسیم نیاز احمد، خالد کنول، وقار احمد، قصیر حسن، توفیق الاسلام، افضل میو، شادقار، منہال زیدی، ابٹام رضا خان، نعیم شیرازی، فخر السلام، سردار علی مینگل، فرقان اختر، نسیم اچکزئی، بنیش ملک، نسیم فردوس، اربام خان، جویریہ، گلشن خان، نعیم الحسن، فرقان اختر شاہ نواز، اطہر نواز، فہیم فاروقی، ضیاء الحق، اطہر شاہ، ضیاء الحق، جمال شاہ، فراست خان، نوید فہیم، اصغر طور، بخش مجھو، اچکزئی، نذرانہ شاہ، ارباب خان، دروانہ شاہ، نسیم نیاز۔ چشتیاں سے معظّم علی۔ مردان سے محمد انور (بازی جیم)۔ برہ زئی چیمچہ سے ذوالفقار فضل کریم، ملک جاوید محمد خان سرکانی، ممالک غیر سے زاہد بشیر فاروقی (جاپان) احمد انصاری (جرمنی) نصیر خان ناصر (جدہ سعودیہ) حافظ تصدیق بشیر الہندی (سلطنت لومان) انعام ملک (جرمنی) فہد فاروق (نوکیو جاپان)

تلافی

مکرم ومحترم معراج رسول
السلام علیکم

میں نے عورت کو ایک نئے روپ میں بلکہ کئی روپ میں دیکھا ہے
جس نے میری زندگی بدل کر رکھ دی ہے۔ کیسے کیسے اثرات مرتب
کئے ہیں اسے میں قارئین کے سامنے لا رہا ہوں۔

امجد
(راولپنڈی)

بعض اوقات ہم لوگ حالات یا اپنی خواہشوں اور
مصلحتوں کے تحت ایسے فیصلے کر لیتے ہیں جن کا اثر ہماری
اولادوں پر پڑتا ہے اور کبھی کبھی ان فیصلوں کے ایسے
بھیانک نتائج سامنے آتے ہیں کہ زندگی میں پچھتاؤوں کے
سوا کچھ باقی نہیں بچتا۔ میں نے بھی جذبات کی رو میں بہہ کر
ایسا ہی ایک فیصلہ کیا تھا جس کا خمیازہ ایک محرومی کی صورت
میں بھگت رہا ہوں۔ کسی کا دل دکھانے کی سزا مجھے یوں ملی کہ
آج میں اپنے بیٹے کو اپنا نہیں کہہ سکتا اور اس سے دور رہنے
پر مجبور ہوں۔

جیل میرے بچپن کا دوست تھا۔ ہماری دوستی کی ابتدا
اسکول کے زمانہ سے ہوئی۔ جب والد صاحب کا تبادلہ کوئٹہ
سے کراچی ہوا تو ان کی پوسٹنگ ملیر کینٹ میں ہوئی۔ وہیں
ہمیں سرکاری مکان بھی مل گیا اور ہم دونوں بھائیوں کا داخلہ
ملیر کینٹ کے سرکاری اسکول میں کرا دیا گیا۔ یہ آج سے
پچاس سال پہلے کی بات ہے۔ ان دنوں سرکاری اسکولوں کا
معیار بہت اچھا ہوا کرتا تھا اور وہاں بڑی مشکل سے داخلہ ملتا
تھا۔ کیونکہ والد صاحب سرکاری ملازم تھے اور ہم دونوں
بھائیوں کے گزشتہ امتحان میں بہت اچھے نمبر آئے تھے۔ اس
لیے ہمیں داخلہ ملنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ میں جب

کلاس روم میں پہنچا تو پہلا تعارف جیل سے ہی ہوا۔ وہ اس
طرح کہ کلاس میں دوڑ کے ایک ڈیسک پر بیٹھتے تھے۔ جیل
کے ساتھ والی سیٹ خالی تھی۔ لہذا ٹیچر نے مجھے وہاں
بٹھا دیا۔ جیل نے پرجوش مسکراہٹ کے ساتھ میرا خیر مقدم
کیا اور مصافحہ کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ میں نے بھی
اسی گرم جوشی سے جواب دیا لیکن کلاس شروع ہو چکی تھی۔
اس لیے ہمیں باتیں کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ میں نے اپنے
بیک سے رف کا پی ٹکالی اور نوٹس لینے لگا۔ اس کے بعد اگلے
تین پیریڈز میں بھی پڑھائی ہوتی رہی۔ البتہ بریک کے
دوران ہمیں باتیں کرنے کا موقع مل گیا۔ رسمی تعارف کے
بعد اس نے کہا ”تم مجھے بہت اچھے لگے ہو۔ آج سے ہماری
دوستی پکی۔ اب تم روزانہ میرے ساتھ ہی بیٹھنا۔“
”لیکن یہاں تو کوئی اور بیٹھتا ہوگا۔ اسے اعتراض تو
نہ ہوگا؟“

”اس کے اعتراض کرنے سے کیا ہوتا ہے، تم کہہ دینا
کہ سرنے یہاں بٹھایا ہے۔ ویسے بھی وہ لڑکا مجھے بالکل پسند
نہیں۔ اس کے کپڑوں اور جسم سے اتنی بدبو آتی ہے کہ بتائیں
سکتا۔ شاید وہ کئی دن تک نہیں نہاتا، خیر چھوڑو ان باتوں کو۔
آؤ تمہاری کچھ خاطر کروں، آج تم میرے مہمان ہو۔“

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اسکول کی کینٹین میں لے گیا جہاں
اس نے دو پلیٹ چھولوں اور جوس کا آرڈر دیا۔ وہ بے حد
مخلص دوست ثابت ہوا۔ چند ہی دنوں میں ہماری دوستی اور
زیادہ مضبوط ہو گئی۔ البتہ وہ پڑھائی میں کچھ کمزور تھا اور ہوم
ورک نہ کرنے پر اسے روزانہ ہی ڈانٹ پڑتی تھی۔ ایک دن
میں نے اس سے پوچھ ہی لیا کہ وہ ہوم ورک کیوں نہیں
کرتا۔ کیا اسے ٹیچر کی ڈانٹ سننے میں حزمہ آتا ہے تو اس
نے بتایا کہ اسے ہوم ورک کرنے کا وقت ہی نہیں ملتا کیونکہ
اسکول سے چھٹی ہونے کے بعد وہ ایک جنرل اسٹور میں
شام چار سے رات دس بجے تک ملازمت کرتا ہے۔ اس کے
والد ایک معمولی کلرک ہیں اور ان کی تنخواہ سے گھر کا خرچ
پورا نہیں ہوتا۔ وہ چھ بہن بھائی تھے اور سب اسکول میں پڑھ
رہے تھے۔ لہذا والد کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اسے
ملازمت کرنا پڑ رہی تھی۔

جیل کے حالات جان کر مجھے
اس سے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔ میں
نے اسے پیشکش کی کہ اگر صبح کو ہم
دونوں آدھ گھنٹا پہلے اسکول آجائیں تو
وہ میرے ہوم ورک کو اپنی کاپی میں نقل
کر سکتا ہے اور جو کام باقی رہ جائے وہ
انٹرول میں پورا کرے۔ وہ یہ سن کر
خوش ہو گیا اور اگلے روز سے ہی ہم نے
اس پروگرام پر عمل شروع کر دیا۔ اس
طرح کلاس میں بھی اس کی پوزیشن بہتر
ہو گئی اور وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ
توجہ اور نظر آنے لگا۔ البتہ کلاس میں کچھ
لڑکوں کو ہماری دوستی ایک آنکھ نہ بھاتی
تھی۔ مجھ سے تو وہ اس لیے جلتے تھے کہ
میں پڑھائی میں بہت تیز تھا اور ہر
امتحان میں میری پہلی پوزیشن آتی تھی
اور جیل سے وہ اس لیے خار کھاتے تھے
کہ وہ میرا گہرا دوست تھا اور ہر وقت
مائے کی طرح ساتھ چٹا رہتا تھا۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد ہم
دونوں نے ایک ہی کالج میں داخلہ لے
لیا۔ ہماری دوستی اب بھی پہلے کی طرح
مضبوط تھی لیکن تھوڑے دنوں بعد ہی

اس پر کالج کا رنگ غالب آ گیا۔ وہ اکثر پیریڈ گول کر کے
کامن روم میں ٹیبل ٹینس یا کیرم کھیلتا رہتا۔ کچھ آوارہ قسم کے
لڑکوں سے اس کی دوستی ہو گئی تھی۔ ان کے ساتھ وہ کلاس
چھوڑ کر مارنگ شو دیکھنے جانے لگا۔ اس نے سگریٹ نوشی
بھی شروع کر دی تھی میں نے اسے ان حرکتوں سے
باز رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن اس پر میری کسی بات کا اثر
نہیں ہوا۔ بلکہ الٹا وہ مجھ سے شکوہ کرنے لگا کہ میں اس کے بعد
ساتھ ان سرگرمیوں میں کیوں شریک نہیں ہوتا۔ اس کے بعد
میرا کچھ کہنا بے کار تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ ان راستوں پر چل
پڑا ہے جہاں سے واپسی بہت مشکل ہوتی ہے۔

ان سرگرمیوں کا نتیجہ میری توقع کے مطابق نکلا۔ وہ
فرسٹ ایئر کے پانچ میں سے صرف ایک پرچے میں
کامیاب ہو سکا تھا حالانکہ میں نے امتحان سے پہلے اسے
تمام مضامین کے نوٹس دے دیے تھے اور مجھے یہ بھی معلوم تھا



کہ اس نے ان کے کارتوس بنا کر نقل بھی کی تھی۔ اس کے باوجود وہ چار پرچوں میں قتل ہو گیا۔ اس طرح وہ بات درست ثابت ہوئی کہ قتل کے لیے بھی عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے سال دوم میں داخلہ نہ مل سکا اور وہ ایک بار پھر فرسٹ ایئر کی کلاس میں بیٹھنے پر مجبور ہو گیا۔

میں نے انٹرسائنس کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیا اور بی بی اے میں داخلہ لے لیا۔ والد صاحب کی خواہش تھی کہ میں انجینئر بنوں لیکن مجھے بزنس سے دلچسپی تھی۔ میں نے بہت چھوٹی عمر میں یہ بات سمجھ لی تھی کہ خوش حال زندگی گزارنے کے لیے ایک کامیاب بزنس مین ہونا ضروری ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ ایم بی اے کرنے کے بعد کچھ عرصہ کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کروں گا اور اس کے بعد اپنا کاروبار شروع کر دوں گا۔

چار پرچوں میں قتل ہونے کے بعد جیل کو بھی عقل آگئی اور وہ زیادہ سنجیدگی سے پڑھائی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے جیسے تیسے انٹر پاس کیا اور یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ اب اس نے جنرل اسٹور کی ملازمت چھوڑ دی تھی اور ٹیوشن پر گزارہ کر رہا تھا۔ وہ شام کو ایک کوچنگ سینٹر میں بھی جانے لگا تھا جہاں سے اسے محنتور آمدنی ہو رہی تھی۔ ہمارے راستے الگ ہو چکے تھے لیکن دوستی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ہم اب بھی باقاعدگی سے ملتے اور ایک دوسرے کا حال احوال دریافت کرتے۔

اسے یونیورسٹی جاتے ہوئے چھ ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ ایک دن اس نے مجھے بڑے پرجوش انداز میں بتایا کہ اسے اپنی کلاس کی ایک لڑکی سے محبت ہو گئی ہے اور وہ بھی اسے پسند کرتی ہے۔ اس کی بات سن کر میں نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا ”چھ پدی اور چھ پدی کا شور یا۔ ابھی کسی قابل ہوئے نہیں اور عشق کا روگ لگا لیا۔“

”نی الحال ہمارا شادی کرنے کا کوئی پروگرام نہیں۔“ وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ ”پہلے ہم اپنا ماسٹرز مکمل کریں گے بعد میں کوئی اچھی سی ملازمت اور اس کے بعد شادی کے بارے میں سوچا جائے گا۔“

”تب تک تو وہ لڑکی بوڑھی ہو جائے گی کیونکہ تم دس سال سے پہلے ماسٹرز کرنے والے نہیں اور نوکری کا کیا بھروسہ، ملے نہ ملے۔ مجھے تو اس پلان میں خاصے جمول نظر آتے ہیں۔“

”شکل اچھی نہ ہو تو کم از کم آدمی کو بات اچھی کرتی

چاہیے۔ میں جانتا ہوں کہ تم جلیس ہو رہے ہو کیونکہ چھپیں ابھی تک کسی لڑکی نے گھاس نہیں ڈالی۔“

واقعی وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ مجھے کسی لڑکی نے گھاس نہیں ڈالی تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ میں نے خود ہی کسی لڑکی سے دوستی کرنے کی کوشش نہیں کی جب دوسرے لڑکوں کو اپنی گرل فرینڈز کے ساتھ گھومتے ہوئے دیکھتا تو میرے دل میں بھی یہ خواہش ابھرتی کہ میں بھی کسی حسین پری کے ساتھ سیر و تفریح کروں، لاگ ڈرائیو پر جاؤں اور فلمیں دیکھوں لیکن ہر بار یہی سوچ کر خاموش ہو جاتا کہ اگر کسی نے دیکھ لیا تو بڑی بدنامی ہوگی۔ لوگ کیسی کیسی باتیں بنائیں گے۔ والدین اور بہن بھائیوں کی نظروں میں میری عزت و کوڑی کی رہ جائے گی۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے خیالات دل میں جگہ بناتے تو میرا سارا جوش اور ولولہ جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا۔ رفتہ رفتہ میرے ذہن سے صنف نازک کا خیال بالکل نکل گیا اور میں نے اپنی پوری توجہ پڑھائی پر مرکوز کر دی۔

وقت کا پیہ پیہ تیزی سے آگے بڑھتا رہا۔ ہم اپنی تعلیم مکمل کر کے عملی زندگی میں داخل ہو گئے۔ میں نے ایک بزنس فرم جوائن کر لی اور جیل کو بھی ایک لیبارٹری میں ملازمت مل گئی۔ اب اس پر سے ذمے داریوں کا بوجھ کافی کم ہو چکا تھا۔ اس کے چھوٹے بھائی بھی پڑھ لکھ کر کام پر لگ گئے تھے اور وہ خود کو خاصا پرسکون محسوس کر رہا تھا۔ پھر ایک دن اس نے مجھے بتایا کہ اس کی شادی اسی لڑکی سے طے ہو گئی ہے جس سے وہ محبت کرتا تھا۔ اتفاق سے انہی دنوں میری شادی کا بھی غلطہ اٹھا اور نزہت دہن بن کر نے مجھ سے میری مرضی جاننے کی کوشش نہیں کی بس بتا دیا گیا کہ میرا رشتہ نزہت سے طے کر دیا گیا ہے۔ مجھے دے دیے بھی شادی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور میں اسے محض شل انسانی کو آگے بڑھانے کا ایک ذریعہ سمجھتا تھا۔

میرے مقابلے میں جیل زیادہ خوش قسمت رہا کہ اس نے جس لڑکی کو چاہا۔ وہ اسے مل گئی۔ افشاں واقعی بہت خوبصورت تھی۔ کم از کم میں نے اپنی زندگی میں اتنی حسین لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ میری اور جیل کی شادی ایک دو مہینے کے وقفے سے ہوئی۔ شادی کے بعد بھی ہماری دوستی میں فرق نہ آیا اور ہم باقاعدگی سے آپس میں ملتے رہے۔ شروع شروع میں افشاں اور جیل باقاعدگی سے ہمارے گھر آیا کرتے تھے لیکن نزہت نے ہمیشہ ان کے ساتھ سرد مہری کا برتاؤ کیا۔ غالباً وہ احساس کمتری کا شکار تھی کیونکہ افشاں بے حد حسین تھی جبکہ نزہت کو محض قبول صورت ہی کہا جاسکتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے وہ ان کے یہاں جانے سے بھی کتراتے تھے۔ میرے بے حد اصرار پر وہ دو چار مرتبہ چلی تو گئی لیکن وہاں بھی اس کا رویہ بے حد اکھڑا اکھڑا سا رہا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ افشاں اور جیل نے بھی ہمارے یہاں آنا جانا کم کر دیا۔ البتہ میں بڑی باقاعدگی سے جیل کے گھر جاتا رہا اور مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجک نہیں ہے کہ اس کی وجہ افشاں تھی۔ وہ خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی زندہ دل، ہنس مکھ اور خوش مزاج واقع ہوئی تھی۔ جیل کا جگری دوست ہونے کی وجہ سے وہ مجھ سے بڑی بے تکلفی سے پیش آتی اور بعض اوقات مذاق مذاق میں ایسی باتیں کہہ جاتی جنہیں سن کر کوئی بھی مرد شدید قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا تھا۔

مجھے بھی افشاں کا ساتھ اچھا لگنے لگا اور میری آمدورفت پہلے کے مقابلے میں بڑھ گئی۔ میں نے شادی کے بعد ملازمت چھوڑ کر اپنا کاروبار شروع کر دیا تھا اور اسے جمانے کے لیے مجھے زیادہ وقت دینا پڑتا تھا۔ اس کے باوجود میں نے جیل کے یہاں جانا نہیں چھوڑا۔ البتہ نزہت کے لیے میرے پاس بالکل وقت نہیں تھا۔

ہماری شادی کو پانچ سال ہو چکے تھے۔ اس دوران میں دو بچوں کا باپ بن چکا تھا جبکہ جیل ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم تھا لیکن میں نے بھی اس بارے میں اسے متفکر یا پریشان نہیں دیکھا البتہ افشاں کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے اس محرومی کا شدت سے احساس ہے۔ میں یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ ان دونوں کے درمیان فاصلے بڑھتے جا رہے ہیں اور افشاں میری موجودگی میں بھی بعض اوقات کوئی ایسی بات کہہ دیتی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بچہ نہ ہونے کا ذمے دار جیل کو سمجھتی ہے۔ مجھے بھی ان کے دکھ کا احساس تھا چنانچہ ایک دن جب افشاں کسی کام سے باہر گئی ہوئی تھی۔ میں نے جیل سے کہا کہ وہ دونوں اپنا ڈاکٹری معائنہ کیوں نہیں کروا لیتے تاکہ اولاد نہ ہونے کی وجہ معلوم ہو سکے۔

جیل نے مجھے اس طرح گھورا جیسے یہ بات اسے اچھی نہ لگی ہو۔ وہ بے زاری سے بولا ”اس مشورے کا شکریہ۔ ہم یہ کام پہلے ہی کر چکے ہیں۔ سارے ٹیسٹ نارمل

آکس ہاکی

یہ کھیل عام ہاکی سے نکلا ہے اور برفانی گراؤنڈ پر عموماً سرد ممالک میں موسم سرما کے دوران کھیلا جاتا ہے۔ قدرتی برف کے علاوہ مصنوعی برف بھی استعمال ہوتی ہے۔ اس کے گراؤنڈ کو رنگ کہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے بنائے گئے خصوصی ہال یا ان ڈور رنگ میں بھی یہ کھیل کھیلا جاتا ہے اور یہ اہتمام کیا جاتا ہے کہ کھیل کے دوران برف پگھلنے نہ پائے۔ کھلاڑی برف پر پھسلنے والے جوتے پہنے ہوتے ہیں۔ گیند کی جگہ ربز کا ایک ٹھوس پک (puck) ہوتا ہے۔ اس کی موٹائی ایک انچ اور قطر تین انچ ہوتا ہے۔ وزن تقریباً ساڑھے پانچ اونس ہوتا ہے۔ اسٹک کی بلیڈ میں عام ہاکی کی طرح خم نہیں ہوتا۔ دستہ 53 انچ سے بڑا نہیں ہونا چاہیے۔ اسٹک بلیڈ کی انتہائی لمبائی 14.1/2 انچ ہوتی ہے۔ رنگ کا طول عموماً 200 فٹ اور عرض 85 فٹ رکھا جاتا ہے۔ کونوں پر ذرا گولائی رکھی جاتی ہے۔ گول چھ فٹ چوڑا اور چار فٹ اونچا (عام ہاکی سے چھوٹا ہوتا ہے)۔ ایک ٹیم چھ افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔ ایک گول مائنڈر، دو ڈیفینڈر اور تین فارورڈ، لیکن اس بات کی اجازت ہوتی ہے کہ ٹکان یا چوٹ کی وجہ سے کوئی کھلاڑی میدان سے چلا جائے تو اس کی جگہ کوئی اور کھیلنے آجائے۔ ایسے تبادلے کھیل کے دوران کسی بھی وقت ہو سکتے ہیں۔ انہیں متبادل (substitute) کہا جاتا ہے۔ ایک ٹیم ساٹھ منٹ کا ہوتا ہے اور بیس بیس منٹ کے ٹین حصوں میں کھیلا جاتا ہے۔ ٹمرانی کے لیے دو ریفری ہوتے ہیں اور ہر گول پوسٹ کے پیچھے ایک گول بیج ہوتا ہے۔ کھلاڑیوں کو حفاظتی لباس پہننا پڑتا ہے۔ اس کی داغ بیل 25 دسمبر 1958ء کو ان انگریز فوجیوں کے ہاتھوں بڑی جو جیل آئٹریو کے شمال مغربی کنارے پر واقع کنکشن میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ آکس ہاکی کے باقاعدہ مقابلے 1860ء سے شروع ہوئے، اس کھیل کا پہلا ادارہ یا پہلی لیگ کنکشن میں 1885ء میں قائم ہوئی۔ 1920ء سے یہ کھیل سرمائی اولمپک کھیلوں کے پروگرام میں شامل کیا گیا۔ اس کی بین الاقوامی تنظیم 1908ء میں قائم ہوئی تھی۔ 1920ء میں اسے اولمپک کھیلوں میں شامل کر لیا گیا۔ اس کا کپ شیلڈ کپ کہلاتا ہے۔

مرسلہ: یاسمین اختیاری سکھر

ہیں۔ کہیں کوئی خرابی نہیں۔ بس اوپر والے کی مرضی۔ جب مقدر میں ہوگا، اولاد بھی ہو جائے گی۔“

اس کے بعد میں نے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی۔۔۔۔۔ اسے اولاد نہ ہونے کا کوئی غم نہیں تھا یا وہ اسے ظاہر نہیں کرنا چاہ رہا تھا تو میں اپنے آپ کو اس فکر میں ہلکان کیوں کرتا۔ ویسے بھی مجھے یار کی باری سے غرض تھی۔ اس لیے میں نے اس کے رویے کا برا نہیں منایا اور معمول کے مطابق اس کے گھر جاتا رہا۔ افشاں کی مہربانیاں اور نوازشیں بڑھتی جا رہی تھیں اور اب وہ میری خاطر مدارات کے لیے خاصا اہتمام کرنے لگی تھی۔ کبھی بھی یوں بھی ہوتا کہ وہ جمیل کی موجودگی کو نظر انداز کر کے مجھ سے ہی باتیں کیے جاتی اور وہ بھی لائق بنا بیٹھا رہتا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ دونوں آپس میں بہت کم باتیں کرتے ہیں اور اگر جمیل کچھ کہے تو افشاں تڑخ کر جواب دیتی ہے جس میں بدتمیزی کا پہلو نمایاں ہوتا تھا۔

ایک دن میں جمیل کے گھر گیا تو وہ موجود نہیں تھا۔ دروازہ افشاں نے ہی کھولا اور اسے دیکھتے ہی میری سانسیں بند ہونے لگیں۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ پرکشش اور خوب صورت نظر آ رہی تھی۔ اس نے ساڑی اور مختصر سا بلاؤز پہن رکھا تھا جس میں اس کے جسم کے خدوخال پوری طرح نمایاں ہو گئے تھے۔ میں نے اس سے پہلے اسے ساڑی میں نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے اس کا یہ روپ میرے لیے حیران کن تھا۔ وہ شاید نبا کر نکلی تھی۔ اس کے کیلے بالوں سے پانی کے قطرے ٹپک کر بلاؤز کو بھگور رہے تھے۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ جمیل گھر پر نہیں ہے تو معذرت کرتے ہوئے بولا ”کوئی بات نہیں میں پھر آ جاؤں گا۔“

اس نے بے تکلفی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی ”وہ نہیں ہیں تو کیا ہوا، میں تو ہوں۔ ایسی بھی کیا بے مرونی کہ دروازے سے ہی چل دیے۔“

میں ایک معمول کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ وہ مجھے ڈرائنگ روم کی بجائے ٹی وی لاونج تک لے گئی اور ٹی وی آن کرتے ہوئے بولی۔ ”آپ کچھ دیر ٹی وی دیکھیں، میں بال خشک کر کے ابھی آتی ہوں۔“

میں بے دلی سے ریموٹ کا بٹن دبا کر چینل تبدیل کرتا رہا لیکن میرا دل افشاں میں اٹکا ہوا تھا۔ اس روپ میں دیکھنے کے بعد میں اس پر سو جان سے فدا ہو گیا تھا۔ مجھے بالکل بھی یاد نہ رہا کہ وہ میرے عزیز ترین دوست کی بیوی

ہے اور میں خود بھی ایک وفا شعار بیوی کا شوہر اور دو بچوں کا باپ ہوں۔ سچ پوچھیں تو اس میں سارا قصور افشاں کا تھا اس کی بے تکلفی اور بے پاکی نے ہی مجھے اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور کیا تھا۔ اگر وہ اپنے شوہر کی وفادار اور اس سے سو فیصد مخلص ہوتی تو کبھی اس کی غیر موجودگی میں مجھے اندازے کی دعوت نہ دیتی۔

انتظار کے یہ چند منٹ مجھے صدیوں پر بھاری لگ رہے تھے۔ بالآخر کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔ وہ اس شان سے نمودار ہوئی کہ اب اس کے سیاہ چمکیلے بال خشک ہو کر شانوں پر لہرا رہے تھے۔ چہرے پر ہلکا میک اپ کرنے کے بعد اس کی تازگی اور شادابی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ اس نے ہاتھوں میں ایک ٹرے پکڑی ہوئی تھی جس میں دو گلاس اور نچ جوس اور ایک پلیٹ بسکٹوں کی رکھی ہوئی تھی۔ وہ ایک ادا سے لہرائی ہوئی میرے پاس آئی اور ٹرے میز پر رکھتے ہوئے بولی۔

”آپ آرام سے بیٹھ جائیں، اتنی جلدی نہیں جانے دوں گی۔ آج تو موقع ملا ہے مجھے دل کی بات کہنے کا۔“

اس نے کتنی آسانی سے وہ بات کہہ دی جو لاشعوری طور پر میں سننا چاہ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے میں نے اپنے آپ کو ملاہٹ کی اور چاہا کہ اسے بیٹھ روک دوں۔ وہ جو کچھ چاہ رہی تھی وہ ہر لحاظ سے غیر اخلاقی اور غیر شرعی تھا۔ بے شک وہ آسمان سے اتری ہوئی حور تھی لیکن میں اپنے دوست کے گھر میں نقب نہیں لگا سکتا تھا لیکن یہ سب باتیں دماغ سوچ رہا تھا جبکہ دل کا فیصلہ اس کے برعکس تھا۔ میں نے بھی دل کی مانی اور اس کا اگلا جملہ سننے کے لیے ہمت تن گوش ہو گیا۔

اس نے بسکٹ کی پلیٹ میری طرف بڑھائی اور بولی ”اس دنیا میں آپ واحد شخص ہیں جس سے میں دل کی بات کہہ سکتی ہوں۔ اس لیے میں نے بہت سوچ سمجھ کر اپنا مسئلہ آپ سے شیئر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ امید ہے کہ آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔“

میرے رگ و پے میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ مجھ پر اتنا بھروسہ کر رہی تھی تو مجھے بھی اس کی حوصلہ افزائی کے لیے کچھ کہنا چاہئے تھا۔ اس لیے میں نے اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”آپ بلا تکلف اپنے دل کی بات کہہ سکتی ہو۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے اعتماد کو مجھیں نہیں پہنچاؤں گا۔“

وہ اپنی ساڑی کا پتلو درست کرتے ہوئے بولی۔ ”مجھے آپ سے یہی امید تھی۔ میرا خیال ہے کہ اب مجھے اصل موضوع کی طرف آ جانا چاہیے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں۔ میری شادی کو پانچ سال ہو گئے ہیں اور میں ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم ہوں۔ شروع کے ایک دو سال تو میں نے کچھ خیال نہیں کیا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ احساس محرومی بڑھتا جا رہا ہے۔ آپ کی شادی بھی جمیل کے ساتھ ہی ہوئی تھی اور آپ ماشا اللہ دو بچوں کے باپ بن چکے ہیں۔ میں اولاد کی خواہش میں پاگل ہوئی جا رہی ہوں لیکن لگتا ہے کہ یہ خواہش کبھی پوری نہ ہو سکے گی۔“

”مایوسی گناہ ہے۔ خدا کی ذات پر بھروسہ رکھیں۔ اس کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ اللہ نے چاہا تو آپ کی خواہش جلد پوری ہوگی۔“

”آپ حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔ خدا کی ذات پر تو بھروسہ ہے لیکن جب بندہ خود ہی کچھ کرنے کے قابل نہ ہوتا۔۔۔۔۔“

یہ کہہ کر وہ معنی خیز انداز میں مسکرانے لگی۔ میں اس کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس لیے حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ”میں کچھ سمجھا نہیں آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں۔“

”امجد صاحب! میں فارسی میں نہیں اردو میں بات کر رہی ہوں۔“ وہ چڑ کر بولی۔ ”آپ کے دوست جمیل صاحب اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں ہیں۔“

مجھے ایسا لگا جیسے میرے بہت قریب کوئی دھماکا ہوا ہو۔ گویا جمیل نے مجھ سے جھوٹ کہا تھا کہ دونوں میاں بیوی کے ٹیٹ کی رپورٹ تارل آئی ہے۔ جب میں نے یہی بات افشاں کے سامنے دہرائی تو وہ بولی ”مرد بھی اپنی کمزوری کا اعتراف نہیں کرتا۔ انہوں نے بھی ان رپورٹس کو جھٹلادیا اور ایک کے بعد دوسری لیبارٹری سے ٹیٹ کرواتے رہے لیکن ہر رپورٹ کا نتیجہ ایک ہی تھا۔ اس کے علاوہ گزشتہ چار سال سے اپنا علاج بھی کروا رہے ہیں لیکن کوئی بہتری نظر نہیں آئی۔“

اس کی بات سن کر میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بولا ”پھر تو صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اس دنیا میں ہزاروں لاکھوں لوگ بے اولاد ہوں گے لیکن وہ بھی صبر شکر کے ساتھ زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں۔“

”مجھ میں اتنا صبر نہیں“ وہ تڑخ کر بولی ”مجھے ہر

آیت الکرسی

قرآن حکیم کی سورۃ البقرہ کی 255 ویں

آیت، جو از روئے حدیث بڑی فضیلت اور عظمت والی ہے۔ اس میں توحید ذات و عظمت، صفات الہی بیان فرمائی گئی ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور سب کو قائم رکھنے والا اور ہر عیب و جملہ نقائص سے منزہ ہے۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اسی کا ہے۔ اس کے اذن کے بغیر کوئی کسی امر کی سفارش نہیں کر سکتا۔ وہی ذرے ذرے کا جاننے والا ہے اور جب تک وہ خود نہ چاہے کوئی مخلوق اس کے علم میں سے ایک چیز کو بھی نہیں جان سکتی۔ اس کی کرسی (علم و قدرت) آسمانوں اور زمین کو گھیرے ہوئے ہے۔ ان کی حفاظت سے وہ نہیں ٹھکتا اور وہی اونچی شان اور عظمت والا ہے۔ مسلمان یہ آیت بالخصوص خوف و خطر کے وقت پڑھتے ہیں۔ اکثریت اسے سوتے وقت بھی پڑھتی ہے۔ ہر نماز کے بعد پڑھنے کی بھی بڑی فضیلت اور تاکید ہے۔

آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس مال یا اولاد پر آیت الکرسی کو پڑھ کر دم کرو گے یا لکھ کر مال میں رکھ دو گے یا بچے کے گلے میں ڈال دو گے شیطان اس مال و اولاد کے قریب بھی نہیں آئے گا۔

آیت الکرسی کے بارے میں حضور ﷺ نے حضرت ابی بن کعبؓ سے فرمایا اے ابو منذر! کیا تمہیں معلوم ہے کہ قرآن کریم کی کون سی آیت عظیم الشان ہے؟ انہوں نے عرض کی: اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ حضورؐ نے مکرر سوال کیا: تمہیں کچھ خبر ہے کہ قرآن کریم کی کون سی آیت عظیم الشان ہے؟ عرض کیا: اللہ لا الہ الا هو الہی القیوم۔ یہ سن کر آپؐ نے حضرت ابی بن کعبؓ کے سینے پر ہاتھ مار کر فرمایا: اے ابو منذر! تمہیں یہ دولت علم مبارک ہو۔

مرسلہ: شفیق عطاری، حیدر آباد

”یہ کیسے ممکن ہے۔ جب آپ کے شوہر اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں تو آپ کی یہ آرزو کس طرح پوری ہو سکتی ہے۔“

”بات صرف اولاد کی ہی نہیں۔ اب میں بے شرم ہو کر آپ کو بتا رہی ہوں کہ وہ ناکارہ ہیں۔ ہر رات ^{مفتی} اور بڑھ جاتی ہے میں انگاروں پر لوٹتی رہتی ہوں اور وہ مزے کی نیند سوتے ہیں، خدا جانے مجھے کس جرم کی سزا مل رہی ہے۔“

”اس کا ایک ہی حل ہے کہ آپ جمیل سے طلاق لے کر کسی دوسرے شخص سے شادی کر لیں۔“

وہ تہقہہ مار کر ہنسی اگر یہ اتنا ہی آسان ہوتا تو بہت پہلے طلاق لے چکی ہوتی۔ آپ جانتے ہیں کہ اس معاشرے میں مطلقہ عورت کا کیا مقام ہے۔ آج کل تو کنواری لڑکیاں اچھے رشتوں کے انتظار میں بوڑھی ہو جاتی ہیں تو مجھ طلاق یافتہ کو کون پوچھے گا۔ جمیل کا گھر میرے لیے ایک پناہ گاہ ہے۔ یہاں سے نکلنے کے بعد میرا کوئی ٹھکانا نہیں ہوگا۔ ماں باپ مر چکے ہیں۔ بھائی اپنی دنیا میں مگن ہے اور بھابھ تو شاید ایک دن بھی مجھے ساتھ رکھنا گوارا نہ کرے۔ آپ ہی بتائیں امجد صاحب کہ اگر میں نے جمیل سے طلاق لے لی تو میرا ٹھکانا کہاں ہوگا۔ کون کرے گا مجھ سے شادی؟

جی میں آیا کہ اپنی خدمات پیش کر دوں لیکن مجھ میں اتنی بڑی بات کہنے کی ہمت نہیں تھی۔ اس نے میری یہ مشکل خود ہی آسان کر دی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور لہرائی بل کھاتی میرے برابر میں آ کر بیٹھ گئی پھر اس نے بڑے ناز سے میری گردن میں اپنی بانہیں ڈال دیں اور سرگوشی کے سے انداز میں بولی ”میں آپ کو کیسی لگتی ہوں؟“

اس کی قربت نے مجھ پر ایسا نشہ طاری کیا کہ اپنی
سدھ بدھ بھلا بیٹھا اور سرشاری کے عالم میں بولا۔ ”بہت
اچھی۔“

”آپ مجھے پسند کرتے ہیں نا۔“ اس نے دوسرا تیر چلایا۔

”ہاں“ میں حقیقت بیان کیے بغیر نہ رہ سکا۔
 ”پھر آپ مجھ سے شادی کیوں نہیں کر لیتے؟“
 اس کا یہ دواؤ اتنا جارحانہ تھا کہ میں ہکا بکا رہ گیا اور مجھ
 سے فوری طور پر کوئی جواب بن نہ پڑا۔ وہ جذباتی انداز میں

میں نے اپنے آپ کو اس سحر سے آزاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ کیسے ممکن ہے کہ میں اپنے ہی دوست کے گھر میں نقب لگاؤں۔ دوسری بات یہ کہ میں شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ ہوں۔ دوسری شادی کیسے کر سکتا ہوں، ورنہ کیا کہے گی۔“

”آپ کو دیتا اور اپنے دوست کا بہت خیال ہے، میں اس آگ میں جل رہی ہوں، اس کا آپ کو کوئی احساس نہیں۔ دوسری شادی کرنا کوئی جرم نہیں۔ مذہب نے بھی اس کی اجازت دے رکھی ہے اور آپ تو ایک نیک مقصد کی خاطر یہ شادی کریں گے۔ آپ کی وجہ سے میری پیاسی زندگی سیراب ہو جائے گی اور میں ماں بننے کا فخر حاصل کر سکوں گی۔“

”لیکن میں جمیل کا سامنا کیسے کر سکیں گا؟“ میں نے تقریباً ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

”جمیل کا خوف دل سے نکال دیں۔ میں طلاق کے بعد عدت گزارنے اپنے بھائی کے گھر چلی جاؤں گی۔ پھر میں اور آپ کسی دوسرے شہر جا کر شادی کر لیں گے یہ شادی خفیہ ہوگی اور میں اپنے بھائی کو بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گی۔۔۔۔۔ بہانہ بنادوں گی کہ مجھے اسلام آباد میں ملازمت مل گئی ہے۔ ویسے بھی اسے میری کون سی پرواہ ہے جو وہ زیادہ سوچ بچار کرے گا۔ کراچی واپس آنے کے بعد آپ مجھے ایک علیحدہ گھر لے کر دیں گے۔ آپ کے کاروبار کی نوعیت ایسی ہے کہ ہفتے میں دو تین راتیں گھر سے باہر گزارنا کوئی مسئلہ نہیں۔“

”لیکن زیادہ عرصہ تو اس شادی کو نہیں چھپایا جاسکتا۔“

”کیوں! اگر میں اور آپ چاہیں تو بھی کوئی اس شادی کے بارے میں نہیں جان پائے گا اور ویسے بھی آپ کو جمیل سے اتنا ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ آپ کے تعلقات ختم ہو جائیں گے، تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ زندگی کے سفر میں لوگ ملتے اور بچھڑ جاتے ہیں لیکن زندگی آگے بڑھتی رہتی ہے۔ اگر وہ کوئی شکوہ شکایت کرے تو کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے میری خواہش کے احترام میں مجھ پر یہ احسان کیا تھا۔ آخر مجھے کسی نہ کسی سے تو شادی کرنا ہی تھی۔“

یہ کہہ کر وہ مجھ سے لپٹ گئی اور خمار آلود لہجے میں بولی "اگر آپ نے انکار کیا تو میں خودکشی کر لوں گی۔ روز مرنے اور روز جینے سے تو بہتر ہے کہ آدمی ایک ہی دفعہ میں اپنی زندگی کا خاتمہ کر لے لیکن یاد رہے کہ میرا خون آپ کی گردن پر ہوگا۔"

اس واضح دھمکی کے بعد میرے پاس اقرار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ پھر سب کچھ ویسے ہی ہوا جیسا کہ اس نے بیان کیا تھا۔ افشاں نے اپنے منصوبے پر عمل کرنے میں بالکل بھی دیر نہیں لگائی اور اگلے روز ہی جمیل سے طلاق کا مطالبہ کر دیا جسے سن کر وہ ہٹکا پکڑا رہ گیا۔ اس نے پہلے تو افشاں کو منانے اور سمجھانے کی کوشش کی لیکن جب وہ نہ مانی تو اس نے طلاق دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر افشاں نے اسے دھمکی دی کہ وہ ضلع کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے گی اور جب اس سے وجہ پوچھی جائے گی تو وہ جمیل کا پول کھول دے گی۔ اس طرح اس کی مردانگی کا بھرم نکل جائے گا اور وہ دنیا میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔ یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی اور جمیل نے خاموشی سے طلاق نامہ پر دستخط کر دیے۔

افشاں روتی بیٹتی بھائی کے گھر چلی گئی جہاں بھابھ
نے کڑوے کیلے لہجے میں اس کا استقبال کیا اور یہاں تک کہہ
دیا کہ ان لوگوں نے کوئی یتیم خانہ نہیں کھول رکھا ہے۔
افشاں اپنی ساری کشتیاں جلا کر آئی تھی۔ اس لیے ترکی بہ
ترکی جواب دیتے ہوئے بولی۔ ”مجھے صرف عدت کے
دوران سر چھپانے کے لیے ٹھکانا چاہیے اس کے بعد اپنا
انتظام کر لوں گی۔“ پھر اس نے اپنے پرس سے نوٹوں کی
گڈی نکالی اور بھابھ کی طرف پھینکتے ہوئے بولی۔ ”میں
خود کسی کا احسان لینا نہیں چاہتی۔ اس لیے کچن کے خرچ میں
اپنا حصہ ڈال رہی ہوں، ضرورت پڑے تو اور لے لینا۔“

اس دوران افشاں نے مجھ سے ملنے سے گریز کیا البتہ ٹیلی فون پر بات ہوتی رہی۔ عدت ختم ہونے کے بعد اس نے مجھے یاد دلایا کہ وہ میرے ساتھ دوسرے شہر جانے کے لیے تیار ہے۔ میں اسے پروگرام سے مطلع کر دوں کہ کب اور کس وقت انٹرپورٹ پہنچنا ہے۔ افشاں کے لیے اس پروگرام پر عمل کرنے میں کوئی دشواری نہ تھی۔ اسے صرف بھائی سے جھوٹ بولنا اور ایک بیگ لے کر انٹرپورٹ روانہ ہونا تھا۔ اصل مشکل تو میرے ساتھ تھی۔ دوسری شادی کرنے کے لیے پہلی بیوی سے اجازت لینا ضروری ہوتا

ہے۔ اس کے بغیر قاضی صاحب نکاح نہیں پڑھا سکتے اور
میں نزہت سے اچانک اور کسی وجہ کے بغیر یہ مطالبہ نہیں
کر سکتا تھا کہ وہ مجھے دوسری شادی کی اجازت دے دے۔
کوئی بھی عورت اپنی خوشی سے ایسا نہیں کرتی۔ لوگ جبراً
زبردستی، خوشامد یا دھوکے سے کاغذ پر دستخط کروا لیتے ہیں۔
نزہت کامیکا بہت بڑا تھا اور اس کے خاندان میں کئی بااثر
لوگ بھی تھے جو میرے لیے مشکلات پیدا کر سکتے تھے۔ ایک
ہنگامہ کھڑا ہو جاتا اور مجھے لینے کے دینے پڑ جاتے چنانچہ میں
نے اسے دھوکے میں رکھ کر دوسری شادی کی اجازت لینے کا
پروگرام بنایا۔

اے میری خوش قسمتی سمجھ لیجیے کہ نزہت زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی۔ اس نے میٹرک کرنے کے بعد پڑھنا چھوڑ دیا تھا اور ماں سے امور خانہ داری کی تربیت حاصل کرنے لگی تھی۔ وہ انگریزی بس واجبی سا جانتی تھی۔ چنانچہ میں نے اس کے نام سے ایک پلاٹ خریدنے کے کاغذات تیار کروائے اور اسی کے درمیان اجازت نامہ والا کاغذ بھی رکھ دیا پھر ایک روز صبح کو دفتر جاتے ہوئے وہ قائل نزہت کے سامنے رہی اور بولا ”تمہارے نام سے ایک پلاٹ خرید رہا ہوں۔ بڑی موقع کی جگہ ہے سال دو سال بعد بیچوں گا تو اچھا خاصا منافع مل جائے گا۔ نہیں تو پڑا رہے، بچوں کے کام آئے گا۔“

نزہت یہ سن کر نہال ہو گئی۔ اس کے لیے یہ احساس ہی بڑا دل خوش کن تھا کہ مجھے گھر اور بیوی بچوں کا کتنا خیال ہے چنانچہ اس نے خوشی خوشی ان کاغذات پر دستخط کر دیے اور میں نے ایک اہم مرحلہ سر ہونے پر اطمینان کا سانس لیا۔ دوسرے دن ناشتے کی میز پر میں نے اعلان کیا کہ کاروباری سلسلے میں ایک ماہ کے لیے سنگاپور جا رہا ہوں۔ میرے بیوی بچوں کے لیے یہ کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ میرا اپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار تھا اور اس سلسلے میں اکثر سنگاپور، ہانگ کانگ اور ملائیشیا وغیرہ کا چکر لگاتا رہتا تھا۔ اس لیے انہوں نے اس پر سختی سے توجہ نہیں دی۔ البتہ نزہت کو دورے کی غیر معمولی طوالت پر تشویش ہوئی اور وہ بولی ”ہیلے تو آپ بھی اتنے دنوں کے لیے باہر نہیں گئے۔“

اس مرتبہ ایسا کیا خاص کام آن پڑا؟“
 ”نزہت بیگم! تم ان باتوں کو نہیں سمجھو گی۔ آم کھاؤ، پیڑ
 گننے کی کیا ضرورت ہے۔ دراصل یہ ایک بہت بڑا آرڈر ہے
 اور اس کے لیے وہاں کئی لوگوں سے ملاقاتیں کرنا ہیں۔ ممکن

ہے کہ اس سے بھی زیادہ دن لگ جائیں لیکن تم فکر نہ کرو۔ میں جلد از جلد کام نمٹا کر واپس آنے کی کوشش کروں گا۔“

بروگرام کے مطابق میں اور افشاں وقت مقررہ پر انٹر پورٹ پہنچ گئے۔ افشاں اس وقت انتہائی ماڈرن لباس میں تھی اور بالکل ایک نوجوان لڑکی نظر آرہی تھی۔ جب جہاز ٹیک آف کرنے لگا تو وہ میرے پہلو میں سمٹتے ہوئے بولی ”اچھا! تمہیں اپنے فیصلے پر کوئی پچھتاوا تو نہیں ہو رہا۔“

”پچھتاوا کیسا میری جان!“ میں نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ”یہ تو میری خوش قسمتی ہے کہ دنیا کی حسین ترین عورت میری زندگی میں آنے کے لیے بے تاب ہے۔ ایک مرد کو اس سے زیادہ اور کیا چاہیے۔“

”اتنا نہ بناؤ کہ میں اپنے آپے میں نہ رہوں۔“ وہ اٹھلاتے ہوئے بولی۔ ”اچھا، یہ بتاؤ کہ جب تم نے پہلی بار مجھے دیکھا تو دل میں کیا خیال آیا؟“

”یہی کہ کاش تم جیل کی بجائے میری بیوی ہوتیں۔“

”پھر تم نے اس کا اظہار کیوں نہیں کیا۔ حالانکہ ہم آپس میں کافی بے تکلف ہو چکے تھے۔“

”کیسے کرتا۔ تم کسی اور کی امانت تھیں اور میں امانت میں خیانت کو جرم سمجھتا ہوں۔“

”اب میں تمہیں ایک راز کی بات بتاتی ہوں اور وہ یہ کہ میری پہلے ہی روز سے تم پر نظر تھی۔ یہ تو طے تھا کہ مجھے جیل سے ہر صورت میں طلاق دینی ہے کیونکہ اس کے ساتھ رہ کر میں اپنی زندگی کو جہنم نہیں بنا سکتی تھی۔ اسی لیے میں تم سے بے تکلف ہوتی چلی گئی اور میں نے ہر ممکن کوشش کی کہ تمہیں اپنے قریب لاسکوں پھر وہ دن بھی آگیا جب میں نے تمہاری نگاہوں میں اپنے لیے پسندیدگی کی جھلک محسوس کی۔ عورت ان نگاہوں کا مفہوم بہت جلد سمجھ لیتی ہے۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ تمہارے دل میں میری محبت کا دیا روشن ہو گیا ہے تو میں نے تمہیں اپنا محرم راز بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے غلط تو نہیں کیا نا؟“

”بالکل نہیں میری جان۔ تمہیں ایسا کرنے کا حق تھا۔ ہر شخص اپنی بہتری کے لیے سوچتا ہے۔ اگر تم نے ایسا سوچا تو بالکل غلط نہیں کیا۔ میں بھی تمہارے بارے میں بہت کچھ سوچتا تھا لیکن بیوی بچوں کی محبت آڑے آجاتی تھی۔“

”اس لیے کہ تم بنیادی طور پر شریف آدمی ہو۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو میری بے تکلفی دیکھ کر گمراہ ہو سکتا تھا اور عین ممکن ہے کہ وہ اپنی ناجائز خواہشات کی تکمیل کے لیے

مجھے بھی غلط راستے پر لگا دیتا۔ میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی کہ تم مجھے جائز طریقے سے اپنا شریک زندگی بنارہے ہو۔“

غرضیکہ اسی طرح کی باتوں میں ہمارا سفر کٹ گیا اور ہم اسلام آباد پہنچ گئے۔ میں نکاح نامہ کے بغیر افشاں کے ساتھ کسی ہوٹل میں ٹھہرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس لیے اپنے ایک دوست کے گھر ٹھہرنے کا پروگرام بنایا۔ میں نے اسے اپنی آمد کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ اس سے میرے کاروباری روابط تھے اور وہ میری ذاتی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ میں نے اس سے کہہ دیا کہ شام تک وہ قاضی اور گواہوں کا بندوبست کرے تاکہ نکاح کی کارروائی اسی روز مکمل ہو جائے۔

تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد میں، افشاں کو لے کر بازار چلا گیا جہاں سے اس نے اپنے لیے عروسی جوڑا، کچھ دیگر ملبوسات، جوتے اور میک اپ کا سامان خریدا، اس نے ضد کی کہ میں بھی اس موقع کے لیے کوئی اچھا سا شلو اور قمیص کا سوٹ پسند کر لوں۔ واپس آنے کے بعد اس نے ایک بیوی پارلر میں فون کر کے اپنی بکنگ کروائی اور عصر کے بعد وہ میرے دوست کی بیوی کے ساتھ دلہن کا میک اپ کروانے بیوی پارلر چلی گئی۔

جب وہ دلہن بن کر واپس آئی تو اس پر نگاہ نہیں ٹھہر رہی تھی۔ یقین جانے، میں نے اپنی زندگی میں اتنی خوبصورت دلہن نہیں دیکھی تھی۔ میرے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے اور میں اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھ رہا تھا۔ مغرب کے بعد ہمارا نکاح ہو گیا۔ میرے دوست نے اس موقع پر ہلکی پھلکی ضیافت کا اہتمام کیا تھا۔ البتہ میں نے اسے تصویریں کھینچنے اور مووی بنانے سے منع کر دیا۔ رات گیارہ بجے کے قریب سب مہمان رخصت ہو گئے تو میں نے بھی جلد عروسی کی راہ لی۔

وہ میری زندگی کی یادگار ترین رات تھی۔ گوکہ میں اس سے پہلے بھی سہاگ رات مناجا تھا لیکن دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہی جو بلیک اینڈ وائٹ اور رنگین فلم میں ہوتا ہے۔ اس رات افشاں نے مجھے زندگی کی حقیقی مسرتوں سے آشنا کیا اور صبح اس کے چہرے کی شادابی دیکھ کر مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ اس کی برسوں کی پیاس بجھ چکی ہے۔

وہ ایک مہینا یوں گزرا کہ ہر روز عید اور ہر رات شب

برات کے مانند تھی۔ اپنے شہر واپس جانے کو جی تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن زیادہ دیر رکنا بھی محال تھا۔ میں نے واپسی سے ایک ہفتہ قبل اپنے منیجر کو فون کر کے ڈیفنس کے علاقے میں ایک اپارٹمنٹ کرائے پر لینے اور اسے ویل فرنڈ کرنے کے لیے کہہ دیا تھا۔ میں، افشاں کو انٹر پورٹ سے براہ راست اسی اپارٹمنٹ میں لے جانا چاہ رہا تھا۔ افشاں نے وہ اپارٹمنٹ دیکھا تو خوش ہو گئی۔ میں نے اس کے لیے ایک محل وقتی ملازمہ اور اوپر کا کام کرنے کے لیے ایک لڑکے کا بندوبست بھی کر دیا۔ افشاں کی خواہش پر اسے ایک نئی گاڑی بھی لے کر دی۔ اسے ڈرائیونگ نہیں آتی تھی لہذا اس کے لیے علیحدہ سے ڈرائیور رکھنا پڑا۔ اس طرح میرے اخراجات میں کافی اضافہ ہو گیا لیکن افشاں نے جو خوشی مجھے دی تھی اس کے مقابلے میں یہ کچھ بھی نہیں تھے پھر میری مالی حیثیت اتنی مستحکم تھی کہ میں انہیں برداشت کر سکتا تھا۔

کراچی واپس آنے کے بعد پہلی خبر یہ ملی کہ جیل، افشاں سے جدائی کا صدمہ برداشت نہ کر سکا اور ملک چھوڑ کر چلا گیا۔ اسے شاید دینی یا قطر میں ملازمت مل گئی تھی۔ اس کے جانے کی خبر سن کر میں نے سکون کا سانس لیا۔ وقتی طور پر اس سے سامنا ہونے کا خطرہ ٹل گیا تھا لیکن اس سے بڑا خطرہ نزہت کی شکل میں باقی تھا۔ اگر اسے میری دوسری شادی کی ذرا سی بھی بھٹک مل جاتی تو وہ میرا جینا حرام کر دیتی۔ گوکہ اب گھر سے میری دلچسپی برائے نام رہ گئی تھی اور میرا زیادہ وقت افشاں کے پاس ہی گزرتا تھا لیکن اس کے باوجود میں نے نزہت کے ساتھ اپنا رویہ حیرت انگیز طور پر تبدیل کر لیا۔ حالانکہ افشاں سے شادی کرنے کے بعد وہ میرے دل سے بالکل اتر چکی تھی لیکن میں نے اسے مطمئن رکھنے کے لیے اس کی ناز برداری شروع کر دی تاکہ اس کے دل میں کسی قسم کا شک نہ آئے۔ میں نے گھر کے معاملات میں بھی دلچسپی لینا شروع کر دی۔ ہفتے میں ایک بار نزہت اور بچوں کو باہر کھانے پر لے جانے لگا۔ پورے گھر کا رنگ و روغن، فرنیچر اور سیٹنگ بدل ڈالی۔ نزہت کو نیائی وی اور ڈی وی ڈی لا کر دیا۔ اسے فلمیں دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ بھی میرے اس التفات پر بہت حیران تھی لیکن منہ سے کچھ نہیں بولی۔

افشاں سے میری شادی کو دو ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ اس نے مجھے باپ بننے کی خوش خبری سنائی۔ اصولاً تو مجھے خوش ہونا چاہیے تھا لیکن اس خبر کو سن کر میں کچھ پریشان ہو گیا۔ اگر یہ بچہ نزہت کی کوکھ سے جنم لیتا تو میرے لیے کوئی

آک (Calatris)

اس قسم کے پودے عموماً جھاڑیوں اور سخت قسم کی بیلوں پر مشتمل ہیں۔ البتہ بہت سی دوائی بوٹیاں بھی اس قسم میں شامل ہیں۔ ان پودوں کی شاخوں اور پتوں سے دودھ جیسا رس نکلتا ہے۔ یہ تمام پودے زیادہ تر استوائی خطے کی پیداوار ہیں۔ براعظم افریقہ میں سب سے زیادہ پائے جاتے ہیں اور ان کی بہت سی اقسام طبی اہمیت رکھتی ہیں۔ کچھ اقسام رنگ بنانے کے کام آتی ہیں بعض اقسام سے رستے بنانے کے لیے ریشہ حاصل کیا جاتا ہے۔ ایک قسم کے آک کے رس سے تیروں کو زہر آلود کیا جاتا ہے۔ دوسری قسم کے آک کا زہر مچھلیاں مارنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ پاکستان میں خود رو ہوتا ہے۔

مرسلہ: نازش علی اخوند، کوہاٹ

مسئلہ نہیں تھا لیکن افشاں کی اولاد آگے چل کر میرے لیے مسائل پیدا کر سکتی تھی۔ سب سے بڑا مسئلہ تو وراثت کا پیدا ہوتا۔ ظاہر ہے کہ وہ میری اولاد ہوتی اور میری جائداد اور اثاثوں میں اس کا بھی برابر کا حصہ ہوتا۔ میں ایک خاص مدت تک اس شادی کو خفیہ رکھ سکتا تھا لیکن بچے کے سن بلوغت کو پہنچنے کے بعد یہ ممکن نہ تھا۔ میں دل ہی دل میں دعا مانگنے لگا کہ لڑکی پیدا ہوتا کہ میں اسے پال پوس کر اس کی شادی کر کے چپکے سے رخصت کر دوں اور میرے گھر والوں کو اس کا پتا بھی نہ چلے لیکن میری یہ دعا قبول نہیں ہوئی اور افشاں ایک لڑکے کی ماں بن گئی۔

افشاں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ میری حد درجہ احسان مند تھی اور بار بار یہی کہتی ”آپ نے زندگی کی سب سے بڑی خوشی دے کر مجھے خرید لیا ہے۔ میں اس احسان کا بدلہ مر کر بھی نہیں چکا سکتی۔“

”مریں تمہارے دشمن۔“ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا ”تم نے جو خوشی مجھے دی ہے اس کے مقابلے میں تو میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔“

”یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ ماں بننا میرا پرانا خواب تھا جس کی تعبیر مجھے آپ سے شادی کر کے ملی۔“

اس نے بڑے چاؤ سے بچے کا نام ارمان رکھا۔ اس کا

برسوں کا ارمان جو پورا ہوا تھا۔ اب وہ بچہ ہی اس کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ میں بڑی مشکل سے اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر اس سے ملنے جاتا لیکن وہ مجھ پر کوئی توجہ نہیں دیتی بلکہ میری موجودگی میں بچے میں ہی مگن رہتی۔ یہاں تک کہ اگر وہ سو رہا ہوتا، تب بھی اسی کی باتیں کرتی رہتی۔ مجھے ویسے بھی اس بچے سے کوئی خاص انسیت نہ تھی لیکن اب میں اس سے حسد محسوس کرنے لگا۔ وہ میرے اور افشاں کے درمیان ایک دیوار بنتا جا رہا تھا۔ افشاں کے رویے سے بھی یہی ظاہر ہوتا تھا کہ جیسے اس کا مقصد پورا ہو گیا ہو اور اب اسے میری ضرورت نہیں رہی۔

میرا گھر سے مسلسل غائب رہنا رنگ لایا اور نزہت کی آنکھوں میں شک کے سائے لہرانے لگے۔ وہ خود تو کچھ نہ بولی لیکن بچوں کو آگے کر دیا۔ میرا بیٹا نعمان خوب باتیں کرنے لگا تھا۔ ایک دن صبح ناشتے کی میز پر بول پڑا "بابا، آپ روزانہ رات کو اتنی دیر سے گھر کیوں آتے ہیں۔ بلکہ کبھی کبھی تو رات کو بھی نہیں آتے۔"

اس کی بات سن کر میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ یہ چھوٹا سا بچہ اتنی بڑی بات نہیں کہہ سکتا۔ ضرور کسی نے اس کے منہ میں اپنی زبان ڈال دی ہے۔ میں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "کیا کروں بیٹا، مجبوری ہے۔ کام ہی اتنا زیادہ ہوتا ہے۔"

"لیکن آپ دفتر میں بھی تو نہیں ہوتے۔ ممانے کئی بار فون کر کے پتا کیا ہے۔"

میں نے گھور کر نزہت کی طرف دیکھا۔ گویا وہ میری جاسوسی کر رہی تھی۔ جی چاہا کہ ابھی اس کی طبیعت صاف کر دوں لیکن بچوں کے سامنے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا البتہ اسے سنانے کی خاطر نعمان سے کہا۔ "میں ہر وقت دفتر میں نہیں بیٹھا رہتا، دفتر سے باہر بھی بہت سے کام ہوتے ہیں۔ لوگوں سے ملنا، میٹنگوں میں جانا اور کاروباری ڈرائیونڈ کرنا۔ تم ابھی بچے ہو، ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔"

نزہت کے چہرے پر ایک سایہ سا آکر گزر گیا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اسے میرے جھوٹ پر یقین نہیں آیا۔ مگر مجھے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ البتہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گھر میں ایک بار پھر تناؤ کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ وہ التفات اور دلچسپی جو افشاں سے شادی کے بعد میں نے مصنوعی طور پر اختیار کی تھی، فضا میں دھوئیں کی طرح تحلیل ہو گئی اور ہم دونوں ایک بار پھر پرانی ڈگر پر واپس آ گئے۔ ادھر افشاں

کے رویے میں بے اعتنائی غالب آتی جا رہی تھی۔ پہلے وہ مجھے دیکھ کھل اٹھتی تھی لیکن اب یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ مجھ سے اپنا فرض نبھاتی ہو۔ مجھے ہرگز اس سے اس رویے کی امید نہیں تھی جس کی خاطر میں یہ مشکل جھیل رہا تھا اسی نے مجھ سے نظریں چرا کر شروع کر دی تھیں اور سچ تو یہ ہے کہ میں خود بھی دو کشتیوں کی سواری سے تنگ آ چکا تھا۔ آخر کب تک نزہت اور بچوں سے جھوٹ بول کر گھر سے دور رہنے کے بہانے بناتا رہتا۔ نزہت کے انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے مجھ پر شک ہو گیا ہے۔ وہ میری ٹوہ لینے کی خاطر دفتر تک پہنچ گئی ہے، ایک دن افشاں کے اپارٹمنٹ تک بھی پہنچ جائے گی۔ اس خطرے سے بچنے کے لیے میرے پاس دو ہی راستے تھے۔ ایک تو یہ کہ افشاں سے شادی کا راز افشاں کر دوں۔ بعد میں جو ہوگا دیکھا جائے گا اور دوسرے یہ کہ کسی طرح افشاں سے جان چھڑا لوں لیکن مجھے یہ سب کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی افشاں نے خود ہی میری مشکل آسان کر دی۔

ایک دن میں معمول کے مطابق افشاں سے ملنے گیا تو ڈرائنگ روم میں سائیڈ ٹیبل پر رکھی ایش ٹرے میں سگریٹ کے ٹکڑے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں نے افشاں سے پوچھا "یہ سگریٹ کے ٹکڑے..... کیا کوئی آیا تھا؟"

"ہاں؟ میں تمہیں بتانے ہی والی تھی۔ میرا کزن امریکا سے آیا ہوا ہے۔ وہی مجھ سے ملنے آیا تھا۔ جلدی میں تھا اس لیے چلا گیا۔ کہہ رہا تھا امجد بھائی سے پھر مل لوں گا۔"

"اچھا، لیکن تم نے پہلے بھی اپنے کسی ایسے کزن کا تذکرہ نہیں کیا جو امریکا میں رہتا ہو؟"

"امجد! تمہیں معلوم ہے کہ جمیل سے طلاق لینے کے بعد میں نے اپنے خاندان والوں سے ملنا چھوڑ دیا ہے۔ اس لیے میں نے کبھی ان کا تذکرہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ نہ جانے ارشد کو میرا پتا کس طرح معلوم ہو گیا۔"

میں بچہ نہیں تھا کہ وہ جھوٹ بول کر مجھے مطمئن کر دیتی۔ میرے نیچر کے علاوہ کسی کو اس اپارٹمنٹ کے بارے میں علم نہیں تھا اور نہ ہی کوئی یہ جانتا تھا کہ افشاں میری بیوی ہے۔ یقیناً وہ پہلے سے ارشد سے رابطے میں تھی۔ تاہم میں نے زیادہ کریدنا مناسب نہ سمجھا جو بھی حقیقت ہوگی سامنے آ جائے گی۔

مجھے زیادہ دن انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اس واقعہ کے پندرہ دن بعد ہی افشاں نے دھماکا کر دیا جب میں اس سے

ملنے پہنچا تو وہ خلاف معمول بڑی لگاوٹ سے پیش آئی۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ بولی "تم نے مجھ پر اتنے احسان کیے ہیں، اب ایک احسان اور کر دو۔"

"وہ کیا؟" میں چونکتے ہوئے بولا۔

"مجھے طلاق دے دو۔" اس نے اتنی آسانی سے کہہ دیا جیسے نئے سوٹ کی فرمائش کر رہی ہو۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو۔ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔"

"میں ہوش و حواس میں رہ کر اتنی بڑی بات کہہ رہی ہوں۔" وہ رساں سے بولی۔ "تم اتنے اچھے انسان ہو کہ تم سے بے ایمانی نہیں کر سکتی۔ ارشد اگر واپس نہ آتا تو یہ کسی یہ مطالبہ نہیں کرتی۔ لیکن اب میں مجبور ہوں۔"

"یہ کیسی مجبوری ہے کہ تم اپنا ہنستا ہنسا گھر اجاڑ رہی ہو۔"

"میرا خیال ہے کہ تم پوری بات سن لو، اس کے بعد نہیں فیصلہ کرنے میں آسانی رہے گی۔" وہ میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "ارشد میرا تایا زاد

ہے۔ ہم دونوں میں بچپن سے گہری دوستی تھی جو جوان ہونے پر محبت میں بدل گئی۔ ارشد مجھے دیوانہ وار چاہتا تھا اور اس نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں اسے نہ تو وہ

کبھی شادی نہیں کرے گا۔ تایا کی مالی حیثیت بہت کمزور تھی۔ اس لیے مجھے ڈر تھا کہ شاید امی ابو اس رشتے کو قبول نہ کریں کیونکہ وہ مجھے ایک محفوظ مستقبل دینے کے خواہش مند

تھے۔ میرا خدشہ درست ثابت ہوا۔ ارشد ایم بی اے کرنے کے بعد دو سال تک ملازمت کی تلاش میں بھٹکتا رہا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ تایا جی کرانے کے مکان میں رہتے تھے اور

ارشد پر چار بہنوں کی بھی ذمہ داری تھی۔ اس لیے جب تایا نے امی سے ارشد کی بات چھیڑی تو ہماری طرف سے

صاف انکار ہو گیا۔ امی کا کہنا تھا کہ افشاں بچپن سے ناز و نعم میں پلی ہے۔ ارشد ابھی اپنا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں، وہ

افشاں کو پر آسائش زندگی کیسے دے سکتا ہے۔

ارشد کا دل ٹوٹ گیا اور اس نے ملک سے باہر جانے کی تیاری شروع کر دی۔ دوستوں سے قرض ادھار لے کر وہ امریکا چلا گیا۔ جانے سے پہلے مجھ سے ملنے آیا تو اس نے

صاف کہہ دیا کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے مجھے کسی اور کی

دکھن بنا نہیں دیکھ سکتا۔ اس لیے ملک چھوڑ کر جا رہا ہے۔ امریکا جانے کے بعد اس نے کچھ عرصہ چھوٹی موٹی نوکریاں

کیں پھر اسے معقول ملازمت مل گئی۔ اب وہ گرین کارڈ

ہولڈر ہے، چاروں بہنوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ تایا اور تایا کی اب اس دنیا میں نہیں رہے اور ارشد بھی تنہا زندگی گزار رہا ہے، وہ مسلسل مجھ سے رابطے میں رہا اور میری اس سے ہفتے میں ایک دو مرتبہ بات ہوتی رہتی ہے۔ وہ میری زندگی کے ہر پہلو سے اچھی طرح واقف ہے۔ جمیل سے شادی، طلاق، تم سے شادی اور ارمان کی پیدائش، اسے یہ بھی معلوم ہے کہ تم نے میری خوشی کی خاطر اپنے گھر کا سکون برباد کر دیا ہے۔ یہ اسی کا مشورہ ہے کہ میں تمہیں اس بندھن سے آزاد کر دوں۔ وہ مجھ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہے۔"

"لیکن میرا بچہ، اس کا کیا ہوگا۔"

"اس نے میری کوکھ سے جنم لیا ہے۔ اس لیے وہ میرا بچہ ہے۔ ویسے بھی سات سال تک اس پر میرا قانونی حق ہے۔ بہتر ہوگا کہ تم بچے سے دستبردار ہو جاؤ۔ کیونکہ تم اسے

سنجھال سکتے ہو، نہ اسے اپنے گھر لے جاسکتے ہو۔ مستقبل میں پیدا ہونے والی پیچیدگیوں سے بچنے کا یہی ایک طریقہ

ہے کہ تم ارمان کو میرے پاس رہنے دو، ارشد اسے اپنا نام دینے کے لیے تیار ہے۔"

اس کی تجویز ہر لحاظ سے معقول تھی اور اس پر عمل کرنے کے بعد میں اپنی پرسکون دنیا میں واپس لوٹ جاتا اور نہ میرے

لیے کئی مسائل پیدا ہو سکتے تھے۔ میں نے اسے طلاق دینے پر آمادگی ظاہر کر دی لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی رکھ دی کہ میں

جب چاہوں ارمان سے مل سکتا ہوں اور صرف اس کی وجہ سے وہ میرے ساتھ تاحیات رابطے میں رہے گی۔

افشاں نے مجھے یقین دلایا کہ میں نے اس پر جو احسانات کیے ہیں اس کے مقابلے میں یہ شرط کچھ بھی نہیں

اور وہ ہمیشہ اس کی پاسداری کرے گی۔ اس نے فوراً فون کر کے ارشد کو بلا لیا اور جب اسے معلوم ہوا کہ میں افشاں کو

طلاق دینے پر آمادہ ہو گیا ہوں تو وہ گرم جوشی سے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔ "امجد صاحب! پہلے آپ افشاں کے

محسن تھے۔ اب میرے بھی بن گئے ہیں۔ آپ نے دو زندگیوں کو تباہ ہونے سے بچالیا ہے۔ ہم آپ کے اس

احسان کی قیمت بھی نہیں چکا سکیں گے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن ایک سوال ابھی تک میرے ذہن میں کھٹک رہا ہے اور وہ یہ کہ جب آپ دونوں رابطے

میں تھے تو جمیل سے طلاق ہونے کے بعد آپ نے افشاں سے شادی کیوں نہیں کی؟"

"اس کی دو تین وجوہات ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ اس

وقت اباجی حیات تھے اور اپنی بے عزتی نہیں بھولے تھے۔ وہ کبھی بھی افشاں سے شادی کرنے کی اجازت نہ دیتے۔ دوسری بات یہ کہ افشاں مجھ سے رابطے میں ضرور تھی لیکن اسے یہ یقین نہیں تھا کہ میں کبھی اس کی زندگی میں آسکوں گا۔ وہ آپ کو پسند کرنے لگی تھی۔ جب میں نے اس کی چاہت دیکھی تو آپ سے شادی کرنے کا مشورہ دیا کیونکہ اس وقت میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا اور افشاں کو فوری طور پر ایک سہارے کی ضرورت تھی۔ اب میں اپنے فیصلے کرنے میں آزاد ہوں اور افشاں کو خوشی اپنا رہا ہوں۔“

تمام معاملات بخیر و خوبی طے پا گئے۔ افشاں اپنے بھائی سے مکمل طور پر قطع تعلق کر چکی تھی۔ لہذا میں نے اسے پیشکش کی کہ وہ اپنی عدت پوری ہونے تک اس اپارٹمنٹ میں رہ سکتی ہے۔ میں اس دوران اس کی ضروریات کا خیال رکھوں گا بلکہ میری خواہش ہے کہ نکاح کی رسم بھی اسی اپارٹمنٹ میں ہو اور میں بھی اس میں شرکت کروں۔“

افشاں اور ارشد نے میری سب باتیں مان لیں اور اس طرح میں افشاں کی زندگی سے نکل آیا۔ عدت کا عرصہ پورا ہونے کے بعد ان دونوں نے نکاح کر لیا اور ارشد نے افشاں کو اپنے ساتھ امریکا لے جانے کی تیاری شروع کر دی کیونکہ وہ خود گرین کارڈ ہولڈر تھا۔ اس لیے افشاں کو ویزا ملنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ میں خود انہیں چھوڑنے اٹھ پورٹ گیا۔ اس روز شاید پہلی بار میرے دل میں شدید خواہش ہوئی کہ ارمان کو گود میں لے کر خوب پیار کروں۔ لیکن میں نے اس خواہش پر قابو پا لیا۔ میں عین وقت پر کسی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

افشاں کے جانے کے بعد زندگی اپنی پرانی ڈگر پر لوٹ آئی اور کوئی نہ جان سکا کہ وہ کبھی میری زندگی میں آئی تھی۔ البتہ اس نے وعدے کے مطابق مجھ سے رابطہ رکھا اور ہفتے میں ایک آدھ بار ہماری بات ہو جاتی تھی۔ وہ مجھے ارمان کے بارے میں ایک ایک بات بتاتی اور میں مطمئن تھا کہ میرے بیٹے کی پرورش مناسب انداز میں ہو رہی ہے۔ وقت تیزی سے گزرتا رہا اور میرے بچے جوان ہو گئے۔ اب مجھے ان کی شادیوں کی فکر ستانے لگی تھی۔ نعمان تو لڑکا تھا۔ اس کے لیے ایک سے ایک اچھی لڑکی مل سکتی تھی لیکن افشین کے لیے مناسب برعلاش کرنا ایک مشکل مرحلہ تھا۔ اس سلسلے میں ہم نے کئی جاننے والوں سے کہہ رکھا تھا لیکن ابھی تک کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ رشتے تو کئی آئے

لیکن ان میں کوئی بھی ہمارے معیار کا نہیں تھا۔

افشاں سے رابطہ برائے نام رہ گیا تھا۔ میں ان کی مصروفیات میں الجھتا رہتا تھا اور وہ بھی باقاعدگی سے اپنا دوش نبھانے میں ناکام رہی تھی پھر ایک روز اس نے فون پر مجھے بتایا کہ ارمان کی تعلیم مکمل ہو چکی ہے اور وہ لوگ غیر ملکی پاکستان مستقل طور پر آ رہے ہیں۔ مجھے یہ خبر سن کر کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی۔ نہ جانے میں کیوں یہ چاہتا تھا کہ ارمان ہمیشہ امریکا میں ہی رہے اور کبھی پاکستان واپس نہ آئے۔

انہی دنوں مجھے اپنے کام کے سلسلے میں جکار تھ پڑ گیا۔ ہم اپنی کمپنی کا ایک آفس وہاں بھی کھول رہے تھے۔ اس سلسلے میں مجھے وہاں کم از کم دو ماہ قیام کرنا تھا۔ غیر موجودگی میں وہ لوگ پاکستان آئے لیکن ان کا مجھ سے رابطہ نہ ہوسکا۔ کافی عرصے تک افشاں نے مجھے فون نہیں کیا۔ مجھے بھی اس کی کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ بس کبھی کبھار ارمان کو دیکھنے کو دل چاہتا۔ نہ جانے جوان ہو کر اس نے کیسا روپ نکالا ہوگا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ جب بھی افشاں مجھے فون کرے گی تو میں اس سے کہوں گا کہ وہ ارمان کو مجھ سے ملوادے تاکہ میں ایک نظر اپنے بیٹے کو دیکھ سکوں لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اس سے پہلے ہی ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ہم سب کی پرسکون زندگی میں پچھل مچادی۔

مجھے جکار تھ سے آئے ہوئے ایک ہفتہ ہی ہوا تھا کہ نزہت نے مجھے اطلاع دی کہ کچھ لوگ افشین کو دیکھنے کے لیے آنا چاہ رہے ہیں۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ ان خاتون نے افشین کی سبکی اور جنت کی شادی میں اسے دیکھا اور اپنے بیٹے کے لیے پسند کر لیا، پھر انہوں نے ارشد کی والدہ سے ہمارے گھر کا نمبر لیا اور نزہت سے بات کر کے اپنا مدعا بیان کر دیا۔ اب وہ اپنے شوہر اور بیٹے سمیت ہمارے گھر آنا چاہ رہی تھیں تاکہ سب لوگ ایک دوسرے کو اچھی طرح دیکھ لیں اور بات آگے بڑھائی جائے۔ نزہت کو میری مصروفیات کا علم تھا۔ اس لیے وہ مجھ سے پوچھے بغیر انہیں کوئی وقت نہیں دے سکتی تھی۔ اب وہ مجھ سے سبکی جانا چاہ رہی تھی کہ ان لوگوں کو کیا جواب دیا جائے۔ میں افشین کی شادی کے لیے بہت فکر مند تھا اور کوئی موقع ضائع نہ کرنا چاہتا تھا چنانچہ میں نے نزہت سے کہہ دیا کہ وہ ان لوگوں کو آنے والے اتوار شام پانچ بجے چائے پر بلا لے۔ اگر کوئی خاص مصروفیت نہ ہو تو اتوار کا دن میں بالعموم گھر پر ہی گزارتا تھا۔ یہ میرا ہمیشہ سے اصول چلا آ رہا تھا کہ

پختہ میں چھ دن کام اور ایک دن مکمل آرام۔ اس روز تو وہ بھی خاص مہمان آرہے تھے، اس لیے میں نے گھر پر رہنے کو ترجیح دی۔ نزہت سے میں نے کہہ دیا تھا کہ اپنی سہیلی میں ہوں جب مہمان آجائیں تو مجھے بلا لیا جائے۔

وہ لوگ وقت کے بڑے پابند تھے۔ ٹھیک پانچ بجے نزہت نے موبائل پر مجھے ان کے آنے کی اطلاع دی۔ میں نے زیر مطالعہ کتاب بند کر کے ایک طرف رکھی اور دیوار پر لگے آئینے میں اپنا جائزہ لے کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے جیسے ہی ڈرائنگ روم میں قدم رکھا حیرت سے بری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ سامنے والے صوفے پر افشاں اور ارشد بیٹھے ہوئے تھے جبکہ دائیں ہاتھ والے صوفے پر ایک لڑکا ساڑ کا براجمان تھا۔ یقیناً وہ ارمان ہی ہوگا۔

میرے قدم زمین میں گڑ گئے اور میں پتھر کے مجسمہ کی طرح اپنی جگہ پر ساکت ہو گیا۔ افشاں بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ شاید وہ نہیں جانتی تھی کہ جس گھر میں بیٹے کا رشتہ لے کر جا رہی ہے وہ میرا ہے اور میں افشین کا باپ ہوں۔

نزہت نے میری جانب دیکھا اور بولی ”ارے، آپ دروازے میں ہی کیوں رک گئے۔ اندر آجائیں تاکہ سب لوگوں سے آپ کا تعارف کروادوں پھر وہ افشاں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی ”یہ افشین کے ڈیڈی ہیں، بہت معروف رہتے ہیں۔ ان کے پاس ہم لوگوں کے لیے بھی وقت نہیں ہوتا۔“

افشاں اچانک ہی صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر ارمان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی ”چلو بیٹا شاید ہم لوگ غلط جگہ پر آ گئے ہیں۔“

”ارے، یہ کیا ہوا؟“ نزہت چپکتے ہوئے بولی۔ ”کہاں تو آپ ہمارے گھر آنے کے لیے اتنی بے تاب ہو رہی تھیں اور اب میرے شوہر کو دیکھتے ہی یوں ہلکا رہی ہیں جیسے یہ کوئی بھوت ہیں۔“

”آپ جو چاہے سمجھ لیں لیکن اب میں یہاں ایک ٹکڑ بھی نہیں رگ سکتی۔“

”اب آ ہی گئی ہیں تو کم از کم اس ڈرامے کا ڈراما سکرین ہی دیکھتی جائیں۔“ نزہت عجیب سے انداز میں بولی۔

”کیسا ڈراما؟ تم ہوش میں تو ہو، گھر آئے مہمانوں سے اس طرح بات کی جاتی ہے۔“ میں نے براہِ خلعت کی۔

آئینی روایات

آئینی روایات قانون کی خشک ہڈیوں پر گوشت کی فراہمی کا کام کرتی ہیں۔ وہ نظریات کے فروغ کے ساتھ ہوتی ہیں۔ ایک آئین خود کوئی کام نہیں کرتا، کوئی شخص اس کا کام کرتا ہے۔ یہ قومی تعاون کا ایک آلہ ہے اور تعاون کا جزو، یہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ آلہ۔ آئینی روایات وہ قوانین ہیں جو تعاون کو متاثر کرنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ آئین کے اثرات بھی قومی زندگی کے حالات کی تبدیلیوں کے ساتھ بدلنے چاہئیں۔ نئی ضروریات کا تقاضا، نئے انداز اور نئی سمتیں ہیں۔ آدمی نئی ضروریات سے مطمئن ہونے کے لیے پرانے قانون سے کام لیتا ہے۔ روایت ہر ایک تنہا نظیر سے بھی وجود میں آسکتی ہے یا ایک بار پھر یہ متعلقہ فریقین کے مابین ایک معاہدے کا نتیجہ بھی ہو سکتی ہے جو انہیں ایک مضبوط جوڑ کے طور پر منظور ہوتی ہے۔

آئینی روایت کو ایک سخت اور موثر قانون کے طور پر استعمال کرنے کی روایت کینیڈا سے ملتی ہے۔ کینیڈا کی حکومت نے 1980ء کے عشرے کے اوائل میں آئین کی ذمہ داری برطانوی حکومت سے کینیڈا کی حکومت کو منتقل کرنا چاہی، تاہم صوبوں کے ساتھ اس کے تصفیے پر معاہدہ نہیں ہو سکا۔ جب حکومت نے اس کے بغیر کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا تو چند صوبوں نے حکومت کی اس کارروائی کی قانونی حیثیت کو چیلنج کر دیا۔ سپریم کورٹ نے قرار دیا کہ کسی آئینی ترمیم میں صوبوں کی رضا مندی حاصل کرنے کا طے شدہ قانون یا رول نہیں ہے، یہ روایت میں ہے جس سے ایسی رضا مندی حاصل کی جاسکتی ہے حکومت نے اس طرح اپنے منصوبوں میں تاخیر کی اور مزید بات چیت کی جس پر دس میں سے نو صوبے وفاقی تجاویز پر نظر ثانی پر رضا مند ہو گئے جس نے 1983ء کے کینیڈا کے آئین کی بنیاد کو تشکیل دیا۔

مرسلہ: اکبر سجانی، کراچی

ہر انسان اپنے حصے کی ڈیوٹی نبھانے کے لیے ہی اس دنیا میں آتا ہے۔ اس کا ادراک اس ہستی کی قربانی سے ہوا۔ اس نے کتنی بڑی قربانی دی۔ یہی میں آج کہانی کی شکل میں سناتے آیا ہوں۔ یہ میرا خراج عقیدت ہے۔ پلیز اسے ضرور شائع کریں۔

عدنان

(سیالکوٹ)

ڈیوٹی



میں نے کتاب کھولی تو اس نے وہ کتاب میرے
انہ سے چھین لی۔

میں حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے
سکراتے ہوئے کہا۔ ”یہ آپ کیا کتاب لے کر بیٹھ گئے؟“

”اریہ، میرا خیال ہے کہ میں تمہارا ٹیوٹر ہوں اور
میں ٹیوٹن پڑھانے آیا ہوں۔“ میں دھیمے لہجے میں بولا۔

”تو آج یہ میرا پہلا دن ہے۔“
”تو کیا ہوا۔ یہاں کون آپ سے ٹیوٹن پڑھنے کے

گا اور میں یہ زیادتی نہیں ہونے دوں گی۔“

”جب تم جان ہی گئی تھیں کہ میں نے افشاں سے
شادی کر لی ہے تو کوئی احتجاج کیوں نہ کیا؟ اچھا ہوتا کہ
بات اسی وقت کھل جاتی اور میں ارمان کو بیاہنے کا دہلیز
کہہ سکتا۔“

”یہی تو میں نہیں چاہتی تھی۔ جس طرح آپ نے
سے بے وفائی کر کے افشاں سے شادی کی اور مجھے اذیت میں
بتلا کیا اسی طرح میں بھی خاموش رہ کر آپ کو ہمیشہ ہمیشہ
لیے اذیت دینا چاہ رہی تھی تاکہ آپ بھی ارمان کو اپنا بیٹا نہ
سکیں۔ میرا دکھ تو عارضی تھا جو افشاں کے جانے کے بعد
ہو گیا لیکن آپ گزشتہ پچیس سالوں سے یہ اذیت سہہ رہے
ہیں اور اگر آج یہ لوگ میرے دروازے پر نہ آتے تو شاید آپ
ساری عمر بیٹے سے جدائی کا دکھ برداشت کرتے رہتے۔“

”جب تم سب کچھ جاننے کے بعد اتنا عرصہ خاموش
رہیں تو پھر آج.....“

”یہ سب میں آپ کی بیٹی کے کہنے پر کر رہی ہوں۔“
وہ میری بات کا منہ ہوتے ہوئے بولی۔ ”جب اسے معلوم ہوا کہ
ارمان آپ کا بیٹا اور اس کا بھائی ہے تو اس نے مجھے مجبور کیا
کہ میں اس حقیقت کو آپ پر ظاہر کر دوں تاکہ آپ اس
خوف سے آزاد ہو سکیں جس نے گزشتہ پچیس برسوں سے
آپ کو بیٹے سے دور کر رکھا ہے۔“ پھر وہ افشاں سے مخاطب
ہوتے ہوئے بولی۔ ”آپ لوگ افشین کو دیکھنے آئے تھے۔
میں آپ کو اس سے ضرور ملواؤں گی تاکہ وہ بھی اپنے بھائی
سے مل سکے۔ امجد نے آپ پر جو احسان کیا تھا اس کی
قیمت یوں چکا سکتی ہیں کہ ارمان کو اس کے باپ کا نام دے
دیں تاکہ وہ اپنے حق اور رشتوں سے محروم نہ رہے۔ بے
شک وہ آپ کے ساتھ ہی رہے لیکن اسے یہ معلوم ہوا
چاہیے کہ وہ ارشد کی نہیں بلکہ امجد کی اولاد ہے اور آپ
لوگوں نے اپنے مفاد کی خاطر اس سے جو دھوکا کیا ہے اس کی
تلافی ہو سکے۔“

افشاں کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس
نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ میرے پیروں کی زنجیر کٹ چکی
تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر ارمان کو گلے لگا لیا۔ میں سوچ
بھی نہیں سکتا تھا کہ نزہت اتنے اعلیٰ ظرف کی مالک ہوگی۔
اس نے مجھ پر جو احسان کیا، شاید اس کی قیمت بھی نہ
چکا سکوں۔

”مہمان۔۔۔ اودہ طہر یہ انداز میں بولی۔ ”میں ان
مہمانوں کی حقیقت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ یہ وہی
افشاں ہیں تا جنہوں نے میرے حق پر ڈاکا ڈالا تھا۔ آپ
سمجھتے ہیں کہ مجھے کچھ خبر نہیں جبکہ میں نے تو آپ کی حرکات و
سکنت پر اس وقت سے نظر رکھی ہوئی تھی جب آپ نے
افشاں کے گھر ضرورت سے زیادہ آنا جانا شروع کر دیا تھا۔
میں نے آپ ہی کے دفتر کے کچھ لوگوں کو آپ کی جاسوسی پر
مامور کر دیا تھا۔ جب آپ کی افشاں سے شادی ہوئی تو میں
خوب پھوٹ پھوٹ کر روئی لیکن رونے سے میرا سہاگ تو
واپس نہیں مل سکتا تھا لہذا میں نے خاموشی اختیار کر لی اور
فیصلہ کر لیا کہ جب تک آپ خود مجھے دوسری شادی کے
بارے میں نہیں بتائیں گے اس وقت تک میں بھی اس کا
تذکرہ نہیں کروں گی۔ پھر جب میں نے افشاں اور ارشد کی
شادی کی خبر اور امریکا جانے کے بارے میں سنا تو میرے
دل کو قہر آگیا اور مجھے یوں لگا جیسے میرے سینے پر سے کوئی
بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا ہے۔ قدرت کا یہ کیسا انصاف تھا کہ
آپ اپنے بیٹے کو اپنا نہیں کہہ سکتے تھے اور افشاں چکنی چڑی
باتیں کر کے اسے آپ سے دور سات سمندر پار لے گئی، اور
آج وہ آپ کے بیٹے کا رشتہ آپ کی بیٹی کے لیے لے کر آئی
ہے۔ چاہے انجانے میں ہی سہی۔ جب انہوں نے ہمارے
گھر آنے کی خواہش ظاہر کی تو میں نے اپنے ذرائع سے ان
کا حدود دار بعد معلوم کرنے کی کوشش کی اور مجھے پتا چل گیا کہ
افشاں آپ کی سابقہ بیوی ہیں اور ارمان آپ کا بیٹا ہے۔
میں چاہتی تو یہ حقیقت جان لینے کے بعد افشاں کو یہاں
آنے سے منع کر سکتی تھی لیکن میں اس ڈرامے کا ڈراما سین
دیکھنا چاہ رہی تھی۔ اس کے علاوہ میری خواہش تھی کہ حقدار
اپنے حق سے محروم نہ رہ جائے۔“

”کیسا حق اور کون حقدار؟“ میں نے جھلاتے ہوئے کہا۔
”میں ارمان کی بات کر رہی ہوں۔ آج تک آپ
نے ساری دنیا سے یہ بات چھپائے رکھی کہ ارمان آپ کا بیٹا
ہے بلکہ آپ نے تو سرکاری کاغذوں مثلاً شناختی کارڈ یا
پاسپورٹ اور میٹرک کے سرٹیفکیٹ میں ولدیت کے خانے
میں اپنی بجائے ارشد کا نام لکھوا دیا تھا جو شرعی لحاظ سے گناہ
اور قانون کی نظر میں جرم ہے۔ اگر اس کے شناختی کارڈ اور
دیگر دستاویزات میں ولدیت کے خانے میں ارشد کی
بجائے آپ کا نام نہیں درج کیا گیا تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے
آپ کی دولت اور جائیداد میں اپنے حصے سے محروم رہ جائے

لے بیٹھا ہے۔
”تو پھر کس لیے بیٹھی ہو؟“

”آپ سے باتیں کرنے کے لیے۔“ اس نے بڑی بے خوفی اور بے باکی سے کہا۔
”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔“

”ایک سال انتظار کیا ہے آپ کا۔“ اس نے بتایا۔
”تب جا کر آج آپ میرے سامنے بیٹھے ہیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس گھر میں کتنے ٹیوٹرائے اور واپس چلے گئے۔“
”ہاں، یہ بات مجھے معلوم ہو چکی ہے۔“ اس نے کہا۔
”وہ لوگ اس لیے نہیں بھاگے کہ انہیں پڑھانا نہیں آتا تھا بلکہ انہیں میں نے بھگایا ہے کیونکہ میں آپ سے پڑھنا چاہتی تھی۔ اسی لیے امی کو بار بار آپ کے گھر بھیجتی تھی۔“

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اس کی امی کئی بار میرے پاس آ چکی تھیں کہ میں ان کی بیٹی اریہ کو پڑھا دوں جبکہ میں اس لیے انکار کرتا رہا تھا کہ میرے پاس اور بھی ٹیوشن تھیں اور اتنا وقت نہیں تھا کہ میں کوئی اور ٹیوشن دیکھ سکوں۔

وہ لوگ میرے ہی محلے میں رہتے تھے یا میں ان کے محلے میں تھا۔ فرق یہ تھا کہ ان کا مکان بہت خوبصورت بنا ہوا تھا جبکہ میرا مکان اپنی اور بیکل حالت میں تھا۔ وہ دراصل کوارٹرز کا سلسلہ تھا۔ سارے کوارٹرز ابتدا میں ایک ہی جیسے تھے لیکن جن کے پاس پیسے آتے گئے انہوں نے پرانی تعمیر تروا کر نئے انداز کے گھر بنوا لیے۔ چونکہ ہمارے حالات ایسے نہیں تھے اس لیے ہمارا کوارٹر ویسا ہی رہا۔ ہاں اگلے حصے میں تھوڑی بہت تبدیلی ہو گئی تھی لیکن پھر بھی وہ محلے کے دوسروں کوارٹرز کی طرح شاندار نہیں پایا تھا۔

والد صاحب کا انتقال ہو چکا تھا۔ اب گھر میں صرف میں تھا، میری چھوٹی بہن تھی اور ماں تھی۔ ہم تین افراد تھے اور میں زندگی کی جدوجہد میں رات دن مصروف رہتا تھا۔ صبح ایک دفتر میں ملازمت اور شام کو ٹیوشن۔ نہ جانے اس لڑکی نے کب مجھے دیکھا ہوگا اور کب سے اس کے دل میں یہ خواہش ہو گئی کہ وہ اگر پڑھے گی تو مجھ سے ورنہ کسی سے نہیں۔ خدا جانے اس جذبے کا کیا نام ہو سکتا تھا۔

”دیکھو اریہ۔“ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”میں ایک محترم اور باوقار روپ میں تمہارے گھر آیا ہوں یعنی تمہارا استاد بن کر۔ اور یہ بہت مقدس رشتہ ہوتا

ہے۔ اس کو ان باتوں سے تباہ نہ کرو۔“

”ارے رہنے دیں۔ آج اسی سی باتوں پر دھیان دیتا ہے۔ زمانہ بہت بدل گیا ہے سجاد صاحب۔“
”دیکھو، میں تمہارے حوالے سے کسی قسم کی بدنامی نہیں چاہتا۔“ میں نے کہا۔ ”اگر کسی کو بھی یہ پتا چل گیا کہ میں جہاں پڑھانے جاتا ہوں وہاں کی لڑکیوں سے اس کی باتیں کرتا ہوں تو میری ساکھ خراب ہو جائے گی۔ ختم ہو جائیں گی۔ میں ویسے ہی غریب آدمی ہوں۔“
”حد ہو گئی۔ تو یہ باتیں بتانے کوں جا رہا ہے۔“
”یہ بتاؤ تم مجھ سے چاہتی کیا ہو؟“
”آپ کا پیار۔ آپ کی توجہ۔“
”اریہ..... تم شاید پاگل ہو گئی ہو۔“
”کچھ بھی سمجھ لیں۔ میں اس سے کم میں سمجھ سکتی۔“

”فرض کرو میں نے یہ ٹیوشن چھوڑ دی تو۔“
آپ چھوڑ کر دیکھیں۔ میں ایسا ہنگامہ کھڑا کر دوں کہ آپ پورے محلے میں تماشابن جائیں گے۔“
میں نے اندازہ کر لیا کہ اس کے تیور واقعی ایسے ہی ہیں۔ وہ ایسی لڑکی تھی کہ کسی کے ساتھ کچھ بھی کر سکتی تھی اور ایسوں کو بہت حکمت عملی کے ساتھ ہینڈل کرنا چاہئے۔ اس لیے میں نے اریہ سے کہا۔ ”ٹھیک ہے اریہ..... لیکن تم مجھے موقع دو گی کہ میرے بھی دل میں تمہاری محبت ہو سکے۔ اس کے لیے وقت درکار ہوگا۔ میں تمہیں پڑھانے کے لیے آتا رہوں گا۔ لیکن شرط یہ ہوگی کہ تم مجھ سے پڑھتی بھی رہو گی۔“

”اوکے۔“ اس نے میری بات سے اتفاق کر لیا۔ پھر میری طرف دیکھ کر عجیب انداز سے دریافت کیا۔ ”ایک بات تو بتائیں۔ آپ مجھے کوئی خراب لڑکی تو نہیں سمجھ رہے۔“
”نہیں تو۔“ میں نے جلدی سے گردن ہلا دی۔ ”تم صرف جذباتی ہو، خراب نہیں ہو۔“

”بالکل یہی بات ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میں ایک پاگل قسم کی لڑکی ہوں۔ میں صرف محبت کرنا جانتی ہوں۔ اس کے علاوہ میرے دل میں اور کوئی بات نہیں اور میں نے آپ سے مذاق نہیں کیا بلکہ محبت کی ہے اور آج سے تم میری بوسوں سے۔“

پھر اس نے جو کچھ بتایا اس نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ وہ جب نوں میں تھی اس وقت سے وہ مجھے پسند کرنے لگی

تھی۔ راستے میں آتے جاتے مجھے دیکھا کرتی۔ ظاہر ہے اس وقت میں نے اس کی طرف دیکھا بھی ہوگا تو دھیان کہاں رہا ہوگا۔ اس محلے میں اور بھی نہ جانے کتنی لڑکیاں ہوں گی۔ بہر حال وہ مجھے دیکھتی رہی اور آہستہ آہستہ میری بات اس کے دل میں جگہ پاتی گئی۔ وہ ایک طرف اس محبت میں جھلا ہو گئی تھی۔ اس کے لیے یہ بہت بڑی بات تھی کہ میں اس کے محلے میں اس کی نگاہوں کے سامنے رہتا تھا۔
وہ کا پیوں پر میرا نام لکھتی رہتی۔ میٹرک کے بعد اس نے کامرس لے لیا تھا۔ یہ سب اس کی پلاننگ کا حصہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ میں بی کام کر رہا ہوں اور ٹیوشن پڑھایا کرتا ہوں۔ وہ مجھ سے قریب ہونے کے لیے ٹیوشن کے لیے رزروٹھنڈنے لگی اور ایک خاص ترکیب سے بالآخر مجھ کو اپنے محلے میں کامیاب ہو گئی یا اس نے اپنی حکمت عملی سے اپنی طرف متوجہ کیا۔

میں نے ایسی زبردستی کی محبت کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ اریہ میں کسی قسم کی کوئی لڑائی یا خامی ہو۔ وہ اچھی خاصی خوش شکل لڑکی تھی لیکن اس کا انداز حیرت انگیز تھا۔
مجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کس طرح اسے ہینڈل کروں۔ اس نے یہ کہہ دیا تھا کہ میں نے اگر ٹیوشن چھوڑ دی تو وہ میرے لیے مصیبت کھڑی کر دے گی اور اس سے کوئی چیز بھی نہیں تھا۔

دوسری طرف یہ خطرہ تھا کہ اگر اس کے گھر والوں کو یا کسی اور کو یہ معلوم ہو گیا تو پھر میرا کیا بنے گا۔ میری کیا پوزیشن ہوگی۔ یہ سب باتیں دل ہولائے دیتی تھیں لیکن اریہ کو ان باتوں کی پروا ہی نہیں تھی۔ میں جب اس کے پاس ہوتا تو وہ لہک لہک کر مجھ سے باتیں کیا کرتی۔ مجھے دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھتی اور کسی دن میں نہیں جا پاتا تو دوسرے دن باقاعدہ لڑنے لگتی۔

ایک دن اس نے مجھ سے کہا۔ ”عدنان، مجھے آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔“
”ہاں کہو۔“

”آپ برا تو نہیں مانیں گے۔“ اس نے پوچھا۔
”تم بتاؤ تو سہی کیا بات ہے؟“
”مجھے یہ معلوم ہے کہ آپ کے گھر کے معاشی حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ اس لیے آپ ٹیوشن پڑھاتے ہیں۔“
”ظاہر ہے لیکن اس سے تمہارا کیا واسطہ؟“

”میں آپ کو کسی چھوٹے موٹے کاروبار کے لیے کچھ رقم دینا چاہتی ہوں۔“ اس نے کہا۔
”کیا؟“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
”ہاں، میرے پاس پچاس ہزار روپے رکھے ہوئے ہیں وہ آپ لے لیں۔“ اس نے کہا۔
یہ بات اب سے دس بارہ سال پہلے کی ہے۔ اس وقت کے پچاس ہزار روپے آج کے حساب سے کم از کم پانچ چھ لاکھ ہوتے تھے۔ ”اریہ اتنے پیسے تمہارے پاس کہاں سے آئے؟“
”کہیں سے بھی آئے ہوں۔ یہ آپ کا دوسرا نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔ ”ویسے میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ یہ صرف اور صرف میرے پیسے ہیں۔ اس میں کسی اور کا کوئی حق نہیں ہے۔“
”تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تم سے اتنے روپے لے لوں گا۔“

”آپ کو لینے پڑیں گے کیونکہ میں نے قسم کھا رکھی ہے کہ میں یہ پیسے ہر حال میں آپ کو دوں گی۔“ اس نے بتایا۔ ”اور اگر آپ نے نہیں لیے تو آپ میری ضد سے واقف ہیں۔ میں چھت سے کوڈ کر اپنی جان دے دوں گی۔“
میں پریشان ہو گیا۔ کیا وہ لڑکی میرا امتحان لے رہی تھی یا مجھے بے وقوف بنا رہی تھی۔ خدا جانے اس کے دل میں کیا بات تھی۔ میں نے اس وقت یہ سوچا کہ اس کے والدین کو اس صورت حال سے آگاہ کر دیا جائے تو بہتر ہوگا لیکن ایسا محسوس ہوا جیسے اریہ نے میرے خیالات پڑھ لیے ہوں۔ اس لیے وہ چمک کر بولی۔ ”دیکھیں عدنان، آپ میرے والدین کو یہ سب نہیں بتائیں گے۔“
”تمہیں کیسے اندازہ ہوا۔“

”آپ کے تاثرات بتا رہے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”اگر آپ نے ایسا کیا تو شاید آپ کا تو کچھ نہیں بگڑے لیکن میں اپنی جان سے چلی جاؤں گی۔ میرے لیے سوائے موت کے اور کوئی راستہ نہیں ہوگا۔“

”یہ تم ہر وقت موت موت کیوں کرتی رہتی ہو۔“
”اس لیے کہ میں جس راہ پر چل نکلی ہوں اس پر زندگی نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اس بار اس کے لہجے میں بے پناہ اداسی اور دکھ تھا۔“ میں خوب اچھی طرح جانتی ہوں کہ اس جنونی محبت کا انجام کیا ہونے والا ہے لیکن میں مجبور ہوں۔ میں اپنے آپ کو روک نہیں سکتی اور

روکنا بھی نہیں چاہتی۔“

”اریہہ..... میں ایک بار پھر تم سے پوچھ رہا ہوں کہ تم چاہتی کیا ہو؟“

”محبت۔“ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس وقت وہ ایک سرشاری کی کیفیت میں تھی۔ ”بس مجھے آپ کی محبت کے سوا اور کچھ نہیں چاہئے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے کہ ہم کبھی ایک ہو سکیں گے؟“

”نہ ہوں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ اس نے کہا۔ ”محبت کو نفع و نقصان کی پروا نہیں ہوتی۔ اس کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ ہم نہ بھی مل سکتے تو بھی محبت تو قائم رہے گی نا۔“

”خدا جانے تم نے ایسی باتیں کہاں سے سیکھ لی ہیں۔“

”خود محبت سے۔“ اس نے کہا۔ ”یہ محبت سب سے بڑی استاد ہے۔“

”دیکھو، تمہارے اپنے خاندان میں تمہارے ارد گرد نہ جانے کتنے نوجوان ہوں گے جو مجھ سے زیادہ خوبصورت اور جن کے حالات مجھ سے کہیں بہتر ہوں گے۔ اس لیے تم.....“

اس نے اچانک میری بات کاٹ دی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ وہ بھر کر بولی۔ ”کیا خیال ہے آپ کا۔ کیا میں صرف اس لیے اپنی محبت کا گلا گھونٹ دوں کہ آپ کے مالی حالات اچھے نہیں ہیں۔ ایسا کبھی سوچے گا بھی نہیں۔“

وہ لڑکی مجھے حیران کیے جا رہی تھی۔

کئی دنوں کے بعد اس نے پھر پیسوں کی بات چھیڑ دی۔ ”آخر آپ مجھ سے پیسے لے کیوں نہیں رہے۔ آپ یقین کریں کہ اگر آپ نے انکار کیا تو یہ سارے نوٹ کسی کنویں میں پھینک دوں گی۔“

میں نے پھر کسی طرح اسے ٹالنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی بات پر اڑی رہی اور بالآخر میں نے اس سے وعدہ کر ہی لیا ”ٹھیک ہے، میں تم سے پیسے لے لوں گا لیکن ایک ہفتہ ٹھہر جاؤ۔“

”وہ کیوں؟“

”میں اپنے طور پر یہ سوچ لوں کہ مجھے ان پیسوں سے کیا کاروبار کرنا چاہئے۔“ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ مطمئن ہو گئی۔ ”آپ اچھی طرح دیکھ لیں۔“

اب میں ایک نازک موڑ پر... آکھڑا ہوا تھا۔ میری عزت داؤ پر بھی لگ سکتی تھی۔ میں اس سلسلے میں اپنی امی سے

بھی مشورہ نہیں لے سکتا تھا۔ وہ نہ جانے اریہہ کے گھر کیا کہہ دیتیں اور وہ پاگل لڑکی ممکن تھا کہ اپنی جان بچا کر کھیل جاتی۔ میں نے اتنے دنوں میں یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ عام لڑکیوں سے بہت مختلف ہے۔ اس میں ایک پراسرار سی کشش تھی۔

کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ وہ مجھ سے سیریس ہو گئی تھی لیکن وہ بات کیا ہو سکتی تھی وہ میں نہیں سکا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں نعمت اللہ صاحب سے ملنے کا ارادہ کر لیا۔

نعمت اللہ صاحب میرے ابو کے جاننے والے تھے وہ ایک دانش ور بھی تھے اور ساتھ ہی روحانیت کے مرتے بھی فائز تھے۔ ابو کے حوالے سے مجھ سے بہت پوچھا کرتے تھے۔ میں کبھی کبھی ان کے پاس جا کر بیٹھ جاتا تھا۔ ان کی محفل میں ادیبوں، شاعروں، دانش ور اور اہل تصوف کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ ادب، فلسفے اور روحانیت سے لے کر ہر موضوع پر باتیں ہوا کرتیں۔

ان سے مشورہ لینے میں کوئی قباحت نہیں تھی۔ مجھے امید تھی کہ وہ ایسا مشورہ دے سکتے ہیں جو میرے لیے سہارا بنے۔ ان سے کوئی تکلف بھی نہیں تھا۔ میں بہت آزادی سے انہیں اریہہ کے بارے میں بتا سکتا تھا۔

بہر حال جب میں ان سے ملنے پہنچا تو وہ مجھے دیکھ کر خوش ہو گئے۔ ”صاحب زادے خیریت سے تو ہو۔ اس طرح کہاں غائب ہو جاتے ہو۔“

”جناب بس مصروفیت کی وجہ سے آنا نہیں ہوا۔“ میں نے بتایا۔ ”معموم روزگار آنے جانے کی فرصت نہیں دیتا۔“

”یہ بھی ایک عبادت ہے میاں اور بہت بڑی عبادت۔“ انہوں نے کہا۔ ”خیر تم بیٹھو، تم سے ابھی باتیں ہوں گی۔“

میں ایک طرف مودب بیٹھ کر ان کی باتیں سننے لگا۔ اس وقت وہ لوگ کسی ادبی واقعے کا ذکر کر رہے تھے۔ مشاعرہ ہو رہا تھا۔ ایک صاحبزادے تشریف لائے اور خدا کرنے لگے کہ انہوں نے بھی ایک شعر کہا ہے اور وہ اسے سناتا جا رہے ہیں۔ لوگوں نے کہا میاں تم ابھی بچے ہو تم جاؤ۔ لیکن وہ جب زیادہ ضد کرنے لگے تو انہیں شعر سننے کی اجازت دے دی گئی۔

اس سچے نے اپنا شعر سنایا اور وہ شعر ایسا تھا کہ جب تک اردو زبان زندہ ہے وہ شعر زندہ رہے گا۔ وہ شعر تھا۔

”عدنان صاحب، آج آخری دن ہے۔ کل میں اپنے پچاس ہزار کے نوٹوں کو جلا رہی ہوں۔ آج آپ نے نہیں لے تو میں اپنی دھن کی بکی لڑکی

دل کے پھپھو لے جل اٹھے سینے کے داغ سے اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے یہ تھادہ واقعہ جو نعمت اللہ صاحب کے سامنے سنایا گیا

نعمت اللہ صاحب نے اس پر تبصرہ کیا۔ ”آپ لوگ جانتے ہیں کہ اس واقعے نے ہمیں کیا بتایا ہے۔ اس صاحبزادے کو اس کا اسی سال انتقال ہو گیا تھا۔ یعنی اس صاحبزادے کو

اپنی طرف سے یہ ڈیوٹی دی گئی تھی کہ وہ دنیا میں جائے۔ شعر کہے اور اپنی ذمہ داری پوری کر کے واپس لے۔ تو اس نے اپنی یہ ذمہ داری نبھادی تھی۔“

اس تبصرے کے بعد اور بھی واقعات بتائے گئے کہ ارح فلاں شخص نے فلاں کام کیا اور اس کے بعد مر گیا وہ اپنی ڈیوٹی انجام دے چکا تھا۔

ان حضرات کے درمیان بحث ہوتی رہی۔ مجھے چونکہ یہی تھی اس لیے میں نے نعمت اللہ صاحب سے طلب کر لی۔ ”بیٹے، تم ایک دو دن بعد میرے پاس آنا۔“ انہوں نے کہا۔

”جی ہاں، ضرور حاضر ہوں گا۔“

”میں گھر واپس آ گیا۔ اریہہ والے مسئلے کا اب تک حل سامنے نہیں آیا تھا۔“

میں اب خود بھی آہستہ آہستہ اس کی محبت کو اپنے دل میں گھسیٹنے لگا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ حالات نے بھی مجھے سوچنے کی اجازت نہیں دی تھی لیکن میں انسان

نہیں ہوں۔ میرے اپنے بھی جذبات ہو سکتے تھے۔ اور ایک لڑکی جب اس طرح والہانہ محبت کر رہی ہو تو

کا اثر تو ہونا ہی تھا۔ اریہہ مجھے بے پناہ متاثر کرنے لگی۔ میں نے اس دوران میں دیکھ بھی لیا تھا کہ وہ فلرٹ کرتی تھی اور نہ ہی مذاق کر رہی تھی۔ وہ واقعی مجھ سے عشق لے لگی تھی۔

ان سب کے باوجود اس کی وہ تسکین مجھ سے ہضم نہیں ہو سکتی تھی۔ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ میں مشورے سے نعمت اللہ صاحب کے پاس گیا تو تھا لیکن ان سے ملنے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ

میں ان کا ان کے پاس لیکن اس دوران میں ایک اور

احمد شاہ پطرس بخاری

اصل نام احمد شاہ اور قلمی نام پطرس بخاری۔ یکم اکتوبر 1898ء کو پشاور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پشاور ہی میں حاصل کی۔ والد کا نام سید اسد اللہ شاہ تھا۔ پطرس بخاری اعلیٰ درجے کے مزاج نگار تھے۔ انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی میں ایم اے کیا۔ ”راوی“ میگزین کے ایڈیٹر رہے۔ انگریزی میگزین ”سول اینڈ ملٹری گزٹ“ میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ عہدوں کا کالج کیمرج سے انگریزی ادبیات کا امتحان پاس کیا۔ 1937ء میں آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہوئے پھر ترقی کرتے ہوئے کنٹرولر جنرل بن گئے۔ اسی دوران نشر و اشاعت اور پبلیٹی کے کئی کام سرانجام دیے۔ 1950ء میں وزیراعظم لیاقت علی خان کے ساتھ امریکا گئے کچھ عرصہ بعد اقوام متحدہ کا نمائندہ مقرر کر دیا گیا۔ 1955ء میں اقوام متحدہ کے شعبہ اطلاعات میں ڈپٹی سیکریٹری جنرل مقرر کر دیا گیا۔ اس کے منصب پر فائز ہونے والے پہلے ایشیائی تھے 5 دسمبر 1958ء کو نیویارک میں حرکت قلب بند ہونے سے انتقال کر گئے۔

مرسلہ: حبیب الرحمن
سینئر جیل کوٹ لکھپت لاہور

ہوں اور آپ جانتے ہیں کہ میں یہ کرگزروں گی۔“

اس بے وقوف لڑکی کے پیسوں کو بچانے کے لیے میں نے فوراً ہاں کر دی۔ ”ٹھیک ہے، تم مجھے پیسے دے دینا۔“

اور اس وقت میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر خوشی کا ایسا تاثر آ گیا تھا جیسے میں نے اسے دنیا بھر کی دولت دے دی ہو۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ مجھ سے لپٹ جاتی۔ یہ عجیب بات تھی۔ میں اسے دے نہیں رہا تھا، اس سے لے رہا تھا اور اس کا یہ حال تھا کہ وہ خوشی سے نہال ہوئے جا رہی تھی۔

وہ اسی وقت دوڑتے ہوئے اندر چلی گئی۔ بہر حال میں نے یہ سوچا تھا کہ وقتی طور پر اس کے پیسے رکھ لوں گا۔ اس کے بعد کسی بہانے اسے واپس کر دوں گا یا اس کے والدین کو ساری صورت حال سے آگاہ کر دوں گا۔ اسی طرح میں اپنے فرض سے سبکدوش ہو سکتا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ اندر سے ایک پوٹلی لے کر آ گئی۔ ”یہ لیں۔“ اس نے وہ پوٹلی میرے سامنے رکھ دی۔ ”اس میں

پورے پچاس ہزار ہیں۔ اور ہاں ایک بات بتا دوں، آپ اسے واپس کرنے کی مت سوچیے گا اور ایک بار پھر کہہ رہی ہوں کہ اگر آپ نے کسی کو بھی بتایا تو وہ میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔ میں چھت سے کود کر یا زہر کھا کر اپنی جان دے دوں گی۔“

”آخر تم کس قسم کی لڑکی ہو اریہ۔“

”پاگل اور جنونی ہوں۔ بس ایک محبت کر لی ہے اور اس محبت کو اپنی آخری سانسوں تک نبھانا چاہتی ہوں۔“

میں جان گیا تھا کہ اریہ اپنے روپے واپس نہیں لے گی۔ اس نے پچاس ہزار میرے حوالے کر دیے ہیں۔ خدا جانے یہ کیسا جذبہ تھا جس کی کوئی توجیہ پیش نہیں کی جاسکتی تھی۔ کئی دنوں تک سوچنے کے بعد میں نے ان روپوں سے کاروبار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس زمانے کے پچاس ہزار خاصی بڑی رقم ہوا کرتی تھی اور کوئی باعزت کاروبار کیا جاسکتا تھا۔

لہذا میں نے دوسرے محلے میں جا کر کرائے پر ایک دکان لی اور اس میں ایک جنرل اسٹور کھول لیا۔ میں نے اس اسٹور کا نام اریہ اسٹور رکھا تھا اور اس کی دیکھ بھال اور اسے چلانے کے لیے اعتماد کا ایک آدمی بھی رکھ لیا تھا۔ میں نے جب یہ خبر اریہ کو سنائی تو وہ خوشی سے نہال ہو گئی تھی۔ ”ہاں، یہ آپ نے عقل مندی کی۔ اب آپ کے حالات بدل جائیں گے۔“

”میں نے ایک دوسری عقل مندی بھی کی ہے۔“

میں نے بتایا۔

”وہ کیا ہے؟“

”اس اسٹور کا نام اریہ جنرل اسٹور ہے۔“

”کیا.....!“ وہ اور خوش ہو گئی تھی۔ ”آپ نے ایسا کیوں کیا؟“

”اس لیے کہ وہ اسٹور تمہارا ہے اریہ۔“ میں نے کہا۔ ”اس میں جو کچھ بھی ہے وہ تمہاری امانت کے طور پر رکھا ہوا ہے اور جب تم چاہو اپنی امانت مجھ سے واپس لے سکتی ہو۔“

”نہیں، اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔“ اس نے جذباتی ہو کر میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔

پتا نہیں ایسی باتوں سے اس کا کیا مطلب تھا۔ بہر حال وہ مجھ سے پوچھتی رہتی تھی کہ اسٹور کیسا چل رہا ہے اور جب میں اسے بتاتا کہ بہت کامیاب جا رہا ہے تو وہ خوش ہو جاتی۔

اور یہ سچ بھی تھا۔ اسٹور بہت کامیابی سے چلتا تھا۔ گاہکوں کا سلسلہ بندھا رہتا تھا۔ مجھے اسٹور سے کرنے کے لیے دوڑ کے رکھنے پڑے تھے اور شاید یہ کام کی بے پناہ محبت اور اس کے خلوص کا نتیجہ تھا کہ دو مہینوں بعد میں نے برابر والی دکان بھی حاصل کر لی تھی اور دو دکانوں کو ایک کر دیا گیا تھا۔ اب وہ واقعی ایک بڑی دکان بن گئی تھی۔

گھر کے حالات بہت تیزی سے بدلنے لگے تھے۔ یہ سب ایک پاگل اور جنونی لڑکی کی محبت کی وجہ سے ہوا تھا۔ جسے میں صرف ٹیوشن پڑھانے گیا تھا لیکن اس نے میرے دل پر اپنی حکمرانی قائم کر لی تھی۔ اس نے ایسا سہارا دیا تھا جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بہر حال میرے دل میں اس لڑکی کی محبت اور اسے ہو گئی تھی۔

اور ایک دن اچانک زندگی چلتے چلتے رک گئی۔ سب کچھ ٹھیک جا رہا تھا۔ اریہ کی بے پناہ محبت مجھے مکمل طور پر اپنے حصار میں لے لیا تھا کہ اچانک ایک رات مجھے ہتا چلا کہ وہ اسپتال میں ایڈمٹ ہو گئی ہے، اس حالت ٹھیک نہیں ہے۔

میں پاگلوں کی طرح دوڑتا ہوا اسپتال پہنچ گیا۔ وہ اس کے ماں باپ اپنی روتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ہوتے تھے۔ ”وہ تم ہی کو یاد کر رہی ہے۔“ اس کی ماں نے بتایا۔ ”آخر ہوا کیا ہے۔“ میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”اپنیڈکس“ اس کی ماں نے کہا۔ ”اس کا اپنیڈکس پھٹ گیا ہے۔ اس پاگل لڑکی نے سب کچھ چھپائے رکھا۔“

کے درد تو اکثر ہوتا رہتا تھا لیکن اس نے کبھی توجہ نہیں دی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نے ایسی بے پروائی کی کیوں۔“

میں اس کمرے میں چلا گیا جہاں وہ لیٹی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ ہوش میں تو تھی لیکن جیسے اس کے بدن سے ہوا نچوڑ لیا گیا ہو۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک دھیمی دھیمی مسکراہٹ آ گئی۔ ”اریہ یہ کیا ہوا۔“ میں بے تاب ہو کر اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس وقت مجھے اس کی پروا نہیں تھی کہ اس کے گھر کے لوگ بھی اس کمرے میں موجود تھے۔ ”تار اریہ، یہ سب تم نے کیوں کیا؟“

”بس ایسا تو ہونا ہی تھا۔“ وہ دھیرے سے بولنے لگی۔ ”بس آپ سے ایک بات کہنا ہے۔“

”ہاں کہو۔“

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم

ایک پرانا واقعہ کہانی کی شکل میں بھیج رہی ہوں۔ امید ہے پسند آئے گا۔ اگر پسند آجائے تو شائع ضرور کریں۔

آصفہ ضیا احمد
(حیدر آباد)

جس طرح پتھر پر کندہ کی ہوئی عبارت کو کوئی نہیں
مٹا سکتا اسی طرح زندگی میں کچھ واقعات اس طرح رونما
ہوتے ہیں جو ہمیشہ کے لیے ذہنوں پر ثبت ہو کر انمٹ نقوش
چھوڑ جاتے ہیں۔

یہ واقعہ میری عزیز ترین دوست تہنیت سے تعلق رکھتا
ہے۔ ہم دونوں کا بچپن ساتھ ہی گزرا اور پھر اسکول اور کالج
میں بھی ہم دونوں ہر وقت ساتھ ساتھ ہوتے اس لیے کالج
میں کوئل کی جوڑی کے نام سے پکارے جاتے تھے۔



مسکرائے۔ ”قبلہ! میں بہت بے چین ہو کر آپ کے
آیا ہوں۔“ میں نے کہا۔
”خدا تمہاری بے چینیوں کو دور کرے۔“ وہ دیر
سے بولے۔ ”تم بتاؤ کیا بات ہے۔“
میں نے انہیں اریہ، اس کی محبت، اس کی
اس کی موت اور اپنے کاروبار کی ترقی کے بارے میں
کچھ بتا دیا تھا۔ ”اب فرمائیں جناب، میں کس طرح
حاصل کروں، کیا کروں میں۔ آخر اس نے میرے
ایسی نیکی کیوں کی۔ اتنی شدید محبت کیوں کی۔ پھر
جلدی مر کیوں گئی؟“
”ان تمام سوالوں کے جواب بہت آسان
نعمت اللہ صاحب نے کہا۔ ”مجھے بہت اچھی طرح یاد
کہ اس بار جب تم یہاں آئے تھے تو ایک ایسے
بارے میں گفتگو ہو رہی تھی جس نے وہ شعر کہا تھا۔ ”کوئل
پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے۔“
”جی جناب، بہت اچھی طرح یاد ہے۔ پھر اس
موت واقع ہو گئی تھی۔“
”جانتے ہو کیوں؟ اس لیے کہ اس نے اپنی
پوری کردی تھی۔“ نعمت اللہ صاحب نے کہا۔ ”خدا نے
صرف اس ڈیوٹی کے لیے زمین پر بھیجا تھا کہ وہ جا
پوری دنیا کو اس شعر کا تحفہ دے اور واپس آ جائے۔
یہی کیفیت اس بچی کی تھی۔ خدا اس کی مغفرت فرمائے۔
کی بھی یہی ڈیوٹی تھی کہ وہ پیدا ہو، بڑی ہو، تم سے
کرے اور تمہاری زندگی سنوار کر واپس چلی جائے۔
نے اپنی ڈیوٹی پوری کر دی تھی اس لیے وہ واپس چلی گئی۔
میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ میری
میں سب کچھ آ گیا تھا۔ وہ معصوم لڑکی اس ڈیوٹی کے لیے
میں آئی تھی۔ صرف میرے لیے اور میری ترقی کے لیے
اس نے اپنا کام کر دکھایا تھا اور اب مجھے اس سے وفا
تھی، سو وہ وفا آج تک نبھا رہا ہوں۔ میں نے اس کی محبت
کو اپنے سینے سے لگا کر رکھا ہے۔ میرا سارا کاروبار اسی
نام پر ہے۔ اریہ بزنس گروپ ہے میرا۔ میری بیوی
یہ پوچھتی ہے کہ اریہ کون ہے تو میں مسکرا کر خاموش رہتا
ہوں۔ ہاں، میں نے اپنی بچی کا نام اریہ رکھا ہے۔ میں اس
سے بے پناہ محبت کرتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ میری محبت
یہ سفر جاری ہے۔

”آپ پھر وعدہ کریں کہ آپ کسی کو بھی ان روپوں
کے بارے میں نہیں بتائیں گے۔“
”ہاں، میں نہیں بتاؤں گا لیکن تم بہت جلد ٹھیک
ہو جاؤ گی۔“
اس وقت اس کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ نمودار
ہو گئی جیسے وہ دنیا کی بے ثباتی کا مذاق اڑا رہی ہو۔ میں کچھ
دیر تک اس کے پاس بیٹھا رہا پھر آنکھوں میں آنسو لیے اس
کے کمرے سے باہر آ گیا۔
ڈاکٹروں نے یہ بتایا تھا کہ اس کی حالت سیریس
ہے۔ اپینڈکس کا پھٹ جانا کوئی معمولی بات نہیں ہوتی اور یہ
مرض اسے یقیناً بہت دنوں سے ہو گا لیکن نہ جانے کیوں اس
نے برداشت کیے رکھا اور کسی کو اپنی تکلیف کی خبر بھی نہیں
ہونے دی اور جب درد کی شدت سے بے ہوش ہو گئی تو پھر
گھر والے اسے اٹھا کر اسپتال لے آئے تھے لیکن بہت دیر
ہو چکی تھی۔
دوسرے دن اس کا انتقال ہو گیا۔
میں سن ہو کر رہ گیا تھا۔ شاید اس کے گھر والوں کو اس
کی موت کا اتنا دکھ نہ ہوا ہو گا جتنا مجھے ہوا تھا۔ وہ میری محبت
تھی اور محبت بھی ایسی کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔
ہم کبھی ایک دوسرے کے ساتھ باہر نہیں گئے۔ کسی
ہوٹل، کسی پارک میں نہیں ملے۔ ایک دوسرے سے محبت
بھری باتیں نہیں کیں۔ ان میں سے کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا۔
پھر بھی یہ محبت تھی اور وہ بھی ایسی کہ جس قسم کی محبت کی صرف
داستانیں سنی جاتی ہیں۔ وہ لڑکی محبت نہیں بلکہ اپنے عشق کی
انتہا پر تھی اور انتہا موت ہی ہوا کرتی ہے سو وہ بھی مر گئی۔
میں کئی مہینوں تک سو گوار رہا۔ پھر میں نے اس کی
نشانی میں اپنا دل لگا لیا۔ یعنی اریہ جنرل اسٹور اور وہ ترقی
کرتا چلا گیا۔ میں نے اس اسٹور سے پھر ایک ہوٹل بھی کھول
لیا تھا۔ جس کا نام بھی اریہ کافی ہاؤس تھا۔
اب معیار زندگی بالکل بدل چکا تھا۔ اس زمانے میں
میرے پاس ایک گاڑی آ گئی تھی۔ کافی ہاؤس کے بعد میں
نے ہوزری کے کام میں ہاتھ ڈالا اور اس میں بھی کامیابیاں
ملنے لگیں۔
پھر ایک سپورٹ اپورٹ اور نہ جانے کیا کیا۔ یہ سب
تو بعد میں ہوا تھا لیکن اس کی ابتدا اریہ جنرل اسٹور ہی سے
ہو گئی تھی۔ ایک دن میں پھر موقع نکال کر نعمت اللہ صاحب
کے پاس پہنچ گیا تھا اور وہ اس دن اکیلے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ

میرا تعلق ایک آسودہ حال گھرانے سے تھا جبکہ تہنیت کے والد کسی دفتر میں کلرک تھے۔ ان کا خاندان کل پانچ افراد پر مشتمل تھا۔ تہنیت کے والدین، خود تہنیت اور اس کے دو چھوٹے بھائی سرد اور سعد، تہنیت کے والد جو کہ جیلانی صاحب کے نام سے پکارے جاتے تھے نہایت نیک اور شریف انسان تھے۔ یہی حال تہنیت کی والدہ کا بھی تھا وہ نہایت سادہ، سلیقہ مند اور کفایت شعار خاتون تھیں۔ خود بھی گھر میں سلاکی اور کشیدہ کاری کر کے اتنا پیسہ پس انداز کر لیتی تھیں کہ وقت ضرورت کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلاتا پڑے۔ تہنیت اور اس کے دونوں بھائیوں کا تعلیمی ریکارڈ بہت اچھا تھا اور حالات کے پیش نظر تینوں نے محلے کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کیا اور درس و تدریس کا یہ سلسلہ بڑا کامیاب رہا۔ تینوں بہن بھائی بڑی محنت اور لگن سے بچوں کو پڑھاتے تھے اس لیے روز بروز بچوں کی تعداد بڑھنے لگی اور اس طرح اس کنبے کی معاشی حالت کافی بہتر ہو گئی۔

میں اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی اور خاندان بھر کی لاڈلی تھی کیونکہ ہمارے خاندان میں ماشا اللہ بیٹے تو سب کے تھے مگر بیٹیوں کی بہت کمی تھی۔ میرے تایا، چچا اور چھو بیوں کے بہت سارے بیٹوں میں میں ایکلی بہن تھی اس لیے سب ٹوٹ کر چاہتے تھے۔ جیسے ہی میں نے B.Sc کیا میرے تایا ابو اور تائی امی بہا و پور سے ہمارے گھر آن دھمکے۔ ویسے تو وہ ہمیشہ آتے جاتے رہتے تھے لیکن اس بار وہ محض ملاقات یا ملنے ملانے کی غرض سے نہیں آئے تھے بلکہ اپنے اکلوتے بیٹے سفیان کا رشتہ لے کر آئے تھے اور مجھے اپنی بہو بنانا چاہتے تھے۔ لیکن میرے والد نے انہیں صاف صاف جواب دے دیا کہ میں اپنے جگری دوست کے بیٹے کے ساتھ اپنی بیٹی کا رشتہ طے کر چکا ہوں۔ مصروفیت کی بنا پر میں آپ لوگوں کو بتا نہیں پایا پھر سوچا کہ وقت آنے پر خود ہی سارے خاندان کو علم ہو جائے گا۔ بہر حال میں معذرت چاہوں گا۔

تایا ابو میرے ابو کے جواب پر سخت برہم ہوئے۔ تائی امی بھی شاکی لہجے میں گویا ہوئیں۔ ”آپ لوگوں نے سگے بھتیجے کے ہوتے ہوئے دوست کے بیٹے کو ترجیح دی۔ یہ امید نہیں تھی آپ لوگوں سے۔“

ابو اور امی نے خاموشی اختیار کی کیونکہ اسی میں دونوں کی عافیت تھی۔ ماحول میں کافی گرما گری پیدا ہو گئی تھی۔

ابو دراصل تایا ابو کے مزاج سے خائف رہتے تھے۔ حقیقی بھائی تھے اس لیے انہیں علم تھا کہ تایا ابو کا جب بار چڑھتا تو پھر انہیں سنبالنا مشکل ہو جاتا تھا اور اس وقت بھی یہی ہوا، ابو کی زبان سے انکار سن کر وہ ایک دم چراغ ہو گئے اور اب وہ مزید قیام کے لیے تیار نہیں تھے۔ حالانکہ میری اور امی کی بہت کوشش تھی کہ وہ لوگ کچھ دن اور ٹھہرتے۔ مگر کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ شوہر کا اشارہ پا کر تائی امی اپنا سامان سمیٹنے لگیں اور ہم لوگ خاموش تماشا بنے دیکھتے رہے۔ اس روز موسم بڑا خوشگوار ہو رہا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا آسمان چل رہی تھی۔ لیکن میرے دل کا موسم اس وقت خراب ہو رہا تھا کیونکہ امی اور ابو کے بعد اگر میں کسی کو چاہتی تھی تو وہ تھے تایا ابو اور تائی امی اور سفیان بھائی کو تو میں اپنا حقیقی بھائی سمجھتی تھی۔ اس لیے ابو کے انکار کی وجہ سے میں خوش اور مطمئن تھی۔ اچانک موسم نے رنگ دکھانا شروع کیا اور بادلوں کی رم جھم شروع ہو گئی اور پھر موسم کی پہلی بارش ہو گئی۔ اسی اثنا میں تہنیت پانی میں شرابور اپنے چھوٹے بھائی سعد کے ساتھ داخل ہوئی۔ دونوں دراصل بازار جا رہے تھے کہ بارش نے آلیا۔ پانی میں تر ہو جاؤں باختر سے جب دونوں میرے گھر میں داخل ہوئے تو سامنے ہی تخت پر تائی امی بیٹھی ہوئی تھیں۔ جیسے ہی ان کی نظر تہنیت پر پڑی تو نگاہیں وہیں جم کر رہ گئیں اور مجھے بے اختیار یہ شعر یاد آ گیا۔

تم کو دیکھا تو نظریں یہ کہنے لگیں
ہم کو چہرے سے ہٹا گوارا نہیں
یہ بات میں آپ کو بتانا ہی بھول گئی کہ تہنیت کافی خوش شکل اور خوبصورت نقوش کی مالک تھی۔ اور پھر سب کچھ اچانک ہو گیا۔ تائی امی نے تایا ابو کو فوراً رام کیا کہ آپ کی بیٹی نہ سہی اس کی سہیلی کیا بری ہے۔ کیوں نہ ہم اسے اپنی بہو بنالیں لیکن تایا ابو کو جب تہنیت کے معاشی حالات کا علم ہوا تو وہ اس رشتے کے لیے خطمی تیار نہ تھے کیونکہ سب کو اس بات کا علم تھا کہ تایا ابو اپنے سے چھوٹے لوگوں سے ملنا جانا بھی پسند نہیں کرتے تھے تو پھر بھلا رشتے داری کیسے طرح طرح کرتے۔ لیکن تائی امی کی ضد کے آگے ان کی ایک نہ رہی اور سفیان بھائی کی مرضی معلوم کرنے کے بعد یہ رشتہ آفاقہ طے پا گیا اور پھر چٹ مکنی پٹ بیاہ کے مصداق تہنیت میری بھائی بن کر تائی اماں کے گھر آ گئی۔ یہ سب کچھ تو ہو گیا لیکن

میرے ابو اس رشتے کے سخت خلاف تھے۔ انہوں نے امی سے یہی کہا کہ تہنیت کے والدین کو منع کریں اس رشتے کے لیے۔ لیکن امی چڑھ گئیں اور انہوں نے تیز لہجے میں کہا ”آخر سفیان میں کیا خرابی ہے؟“ ابو نے متانت سے کہا۔ ”سفیان تو میرا ہے لیکن بھائی کا تمہیں پتا ہے وہ دولت کے دلدادہ ہیں اور اس لحاظ سے تہنیت کا گھرانہ ان کے ترازو میں نہ تلے گا اور یہ سیدھے سادے شریف لوگ ان کا مقابلہ نہ کر پائیں گے۔“ لیکن امی نے ابو کی ایک نہ سنی اور بڑھ چڑھ کر اس کا رخیر میں حصہ لیا۔

میں بھی بہت خوش تھی۔ تائی امی کے ساتھ مل کر شادی کی ساری شاینگ میں نے ہی کروائی۔ تایا ابو بھی وقت کی واکت کو دیکھتے ہوئے خواتین کے سامنے خاموش ہی رہے۔ اس طرح تہنیت کی شادی ہوئی اور اس کے کچھ عرصے بعد میں بھی پیادیس سدھاری۔

یادش بخیر میں آپ کو بتا ہی چکی ہوں کہ ہم دونوں بچپن سے ہی ایک جان دو قالب تھے اور اب تو رشتہ داری بھی قائم ہو گئی تھی۔ وہ جب بھی سفیان بھائی کے ساتھ میکے آتی تو پہلے میرے والدین سے آکر ملتی اور پھر اپنے والدین اور بھائیوں سے ملنے جاتی۔ فون اور موبائل سے بھی ہم دونوں گفتگوں باتیں کرتے۔ سسرال سے اسے کوئی شکایت نہیں تھی بس دے دے الفاظ میں اس نے مجھے یہ ضرور بتایا کہ تایا ابو کی امیر کنبہ بہو کے خواہش مند تھے اور وقتاً فوقتاً اپنا غصہ بھی بیوی پر اور بھی بیٹے پر نکالتے رہتے ہیں اور جب دونوں پر بس نہیں چلتا تو تختہ مشت پجاری تہنیت بنتی تھی۔ وہ خسر کا احترام تو بہت کرتی تھی مگر ان کے سائے سے بھی ڈرتی تھی۔

تایا ابو ریٹائرڈ فاریسٹ آفیسر تھے۔ جانور پالنے کا تو انہیں دیوانگی کی حد تک شوق تھا۔ بقول تائی امی، انسانوں سے تو ڈھنگ سے بات کرتے نہیں اور جانوروں کو یوں گلے لگاتے ہیں جیسے وہ ان کے اپنے ہوں۔ تایا ابو کا لان بھانت بھانت کے جانوروں سے بھرا پڑا تھا۔ جب بھی میں تایا ابو کے گھر جاتی تو ان کے رنگ برنگے جانوروں سے مل کر بہت مزہ آتا۔ خاص طور سے ان کی پالی ہوئی ایک بھدرا بھجے بہت اچھی لگتی تھی۔ اس کی خاصیت یہ تھی کہ وہ ہر کسی کی اتنی محفل اتارتی تھی کہ عقل حیران رہ جاتی تھی۔ بھدرا بھجے ایک زنجیر سے بندھی رہتی اور زنجیر کو درخت کے تنے سے باندھ دیا جاتا۔ تایا ابو کے حکم پر کبھی کبھی اسے آزاد

آنرل ہاور، ڈوائسٹ ڈیوڈ

1890-1969ء امریکی جنرل اور مدبر، امریکا کے 34 ویں صدر۔ ڈینی سن (ٹیکساس) میں پیدا ہوئے۔ 1915ء میں فوج میں بھرتی ہوئے۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہونے پر امریکی چیف آف اسٹاف، جنرل مارشل کے آفس میں بریگیڈیئر جنرل کی حیثیت سے جنگی منصوبہ بندی کے سربراہ مقرر ہوئے۔ جون 1942ء میں یورپ میں امریکی افواج کے کمانڈر بنادیے گئے۔ نومبر 1942ء میں شمالی افریقا پر اتحادی فوجوں کے حملے کی قیادت کی۔ جنوری 1943ء میں مغربی یورپ میں مصروف پیکار اتحادی افواج کے سپریم کمانڈر بنائے گئے۔ 1944ء میں جنرل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ 6 جون 1946ء کو فرانس پر حملہ کیا اور پھر مغربی یورپ اور جرمنی پر حملوں کی کمان کی۔ 1945ء تا 1948ء امریکی افواج کے چیف آف اسٹاف رہے۔ بعد ازاں ریٹائر ہو کر کولمبیا یونیورسٹی کے صدر بنے۔ 1950ء میں نیو کی افواج کے کمانڈر بنائے گئے۔ 1953ء میں مستعفی ہو گئے۔ کیونکہ 1952ء میں، ری پبلکن پارٹی کے امیدوار کی حیثیت سے، صدارتی انتخاب میں حصہ لیا تھا اور ڈیموکریٹک پارٹی کے امیدوار ایڈلائی اسٹیونسن کو ہرا دیا تھا۔ 1956ء میں دوبارہ انتخاب لڑا اور اس مرتبہ بھی ایڈلائی اسٹیونسن کو شکست دی۔ ان کی پہلی مدت صدارت کا اہم واقعہ کوریا میں گفت و شنید کے ذریعے جنگ بندی ہے۔ 1960ء میں ایک بلند پرواز امریکی جاسوسی طیارہ یوٹوروس نے مار گرایا اور اس کے پائلٹ فرانسس گیری پاورز کو پکڑ لیا۔ چند دیگر واقعات سے آنرل ہاور کی ساکھ کو سخت دھچکا لگا اور وہ 1961ء میں عملی سیاست سے ریٹائر ہو گئے۔ ویت نام میں ایٹمی اسلحہ استعمال کرنے کے زبردست حامی تھے۔ نہرو سٹریٹ کے مسئلے کو حل کرانے میں مصر کی عملی مدد کی اور متحارب گروپوں میں جنگ بندی کرائی۔

مرسلہ: ارشد احمد کامونگی

بھی کر دیا جاتا اور پھر بندریا کوٹھی کے لان میں چھلانگیں مارتی ایک جگہ سے دوسری جگہ کودتی پھاندتی رہتی۔ کبھی کبھی کمروں میں بھی آجاتی اور پھر ملازمین اسے پکڑ دھکڑ کر پابہ زنجیر کر دیتے۔ تہنیت اور سفیان بھائی کی شادی کے بعد میں جب بھی تایا ابو کے گھر گئی ان کے جانوروں میں اضافہ ہی نظر آیا۔

تہنیت کا اور میرا ٹیلی فونک رابطہ قائم تھا۔ اچانک ایک دن اس نے خبر سنائی کہ اس کے تمام طلائی اور نقرئی زیورات چوری ہو گئے اور اس چوری سے تہنیت کا جو حشر ہوا سوالگ لیکن تایا ابو نے اس غریب کا ناطقہ ہی بند کر دیا۔ وہ علی الاعلان کہہ رہے تھے کہ اس چوری میں خود تہنیت کا ہی ہاتھ ہے اور اس نے خود اپنا تمام زیور بھائیوں کے ہاتھ سے اپنے ماں باپ کے گھر بھجوا دیا ہے کیونکہ اسی روز تہنیت کے دونوں چھوٹے بھائی اس سے ملنے اس کی سرال گئے تھے اور کچھ گھنٹے قیام کرنے کے بعد وہاں سے نکل گئے تھے۔ یہ خبر سننے ہی میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی کیونکہ میں تایا ابو کو اچھی طرح جانتی تھی۔ ان کی نظر میں انسان سے زیادہ قیمتی سونا چاندی تھا۔ میں نے فوراً تہنیت سے ٹیلی فونک رابطہ کیا۔ تہنیت نے آنسوؤں اور سسکیوں کے درمیان سارا واقعہ مجھے کچھ اس طرح سنایا ”میں اور سفیان ایک شادی کی تقریب میں گئے تھے۔ رات گئے واپسی ہوئی۔ کپڑے تبدیل کیے اور تمام جیولری اتار کر جیولری بکس میں رکھ دی جس کی مالیت لاکھوں کی تھی۔ دوسری صبح ہم دونوں میاں بیوی دیر سے جاگے اور اسی اثنا میں سرمد اور سعد مجھ سے ملنے کے لیے آگئے۔ کافی عرصے بعد دونوں کو دیکھا تھا اس لیے سارے کاموں کو پس پشت ڈال کر امی ابو کی خیریت دریافت کرنے بیٹھ گئی اور پھر ان کی خاطر تواضع میں لگ گئی۔ وہ دونوں اپنے کسی دوست کی شادی میں آئے تھے اس لیے تھوڑی دیر میرے اور سفیان کے پاس بیٹھ کر دونوں اجازت لے کر اٹھ گئے۔ جب میں سارے کاموں سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں گئی تو ڈرینک ٹیبل پر سے جیولری بکس غائب تھا۔ سارا گھر تلاش کر لیا مگر پتا نہیں اس ڈبے کو زمین نکل گئی یا آسمان کھا گیا۔ کمرے کی تمام کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں جو کہ لان کی طرف کھلتی تھیں اور لان میں تمہیں تو علم ہے کہ تمام جانوروں کے پنجرے ہیں۔ اگر کوئی چور باہر سے آتا تو جانور ضرور شور مچاتے اور چور، گیٹ پر موجود چوکیدار کی تیز نظروں سے بھی نہیں بچ سکتا

تھا۔ میرا دماغ کام نہیں کر رہا ہے کہ چور آخر کس راستے سے آیا ہوگا۔ سرمد اور سعد آئے ضرور مگر تم اچھی طرح میرے والدین اور بھائیوں کو جانتی ہو پتا نہیں ڈیڈی کیوں میرے بھائیوں پر شک کر رہے ہیں۔ میں نے قطع کلائی کر کے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تہنیت خدا کے لیے اسے آپ کو سنبھالو۔ کیا مجھے علم نہیں کہ تمہارے والدین اور بھائی کیسی عادات و خصائل کے مالک ہیں۔ تایا ابو کے مزاج کا تو تمہیں پتا ہے۔ ابو نے اسی وجہ سے میرا رشتہ اس گھر میں نہیں کیا اور یقین کرو تمہیں بھی وہ مجھ سے کم نہیں سمجھتے اور اسی لیے تمہاری شادی کے وقت وہ امی سے یہی کہتے رہے کہ تہنیت کے والدین کو منع کر دو اس رشتے کے لیے مگر مجھے امی اور تائی امی کو تم اس قدر پسند تھیں کہ ہماری زبانوں کو ہال لگ گیا تھا پھر ہم لوگوں نے یہ بھی سوچا کہ جس کے سر پر بندھ رہا ہے بذات خود وہ تو ایک نیک، شریف، تعلیم یافتہ اور مثالی انسان ہے بس یہی سوچ تمہاری شادی کا محرک بنی۔ میں اور امی تمہاری شادی میں پیش پیش رہے۔ اس طرح تم ہمارے خاندان میں شامل ہو گئیں۔“ بہر حال کافی تسلی دلا سادے کر میں نے تہنیت کو خاموش کیا۔

دوسرے ہی روز میں ... معتمد (میرے شوہر نامدار) کے ساتھ تایا ابو کے گھر جا پہنچی۔ میری امی اور ابو بھی وہیں براجمان تھے۔ وہ لوگ بھی چوری کی خبر سن کر ہی آئے تھے۔ جب ہم دونوں میاں بیوی پہنچے تو سارے گھر پر موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ گھر کے ملازمین کے چہروں سے بھی خوف اور دہشت عیاں تھی کیونکہ اتنی بڑی ڈکیتی کے بعد پولیس کے احاطہ تفتیش میں وہ لوگ بھی شامل تھے۔ سب ایک دوسرے کو شک بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ تو بھلا ہوسفیان بھائی کا جنہوں نے پولیس سے صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا ”ہمارے تمام ملازمین قابل اعتبار اور ایماندار ہیں“ سرمد اور سعد کے لیے بھی ان کا بیان شستہ، صاف ستھرا اور شکوک و شبہات سے مبرا تھا۔ انہوں نے تایا ابو سے بھی سخت الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ وہ ان کی سرال والوں کی توہین کریں گے تو وہ بیوی کو لے کر فوراً اس گھر سے نکل جائیں گے اور پھر کبھی مڑ کر بھی نہیں دیکھیں گے۔ تایا ابو بیٹے کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھے۔ جو زبان سے کہتا ہے وہ کر کے دکھاتا ہے اس لیے انہوں نے بالکل چپ سادہ کی تھی۔ تائی امی نے بھی بہو کی حالت دیکھ کر تایا ابو کو کھری کھری سنا دی تھی کہ جب سے تہنیت بیاہ کر آئی ہے اس نے

بیٹیوں کی طرح ہماری خدمت کی ہے۔ گھر میں اتنے سارے ملازمین کی موجودگی میں ہمارا ہر چھوٹا بڑا کام اپنے ہاتھوں سے انجام دیتی ہے۔ اگر زیور چوری ہو گیا تو اس میں اس کا کیا قصور..... بیٹے، بہو کی زندگی اور خوشیوں سے زیادہ تو نہیں ہے دولت۔ اللہ تعالیٰ میرے بیٹے کے قوت بازوؤں میں اضافہ کرے وہ اس سے زیادہ کمالے گا۔ آپ آئندہ میری بہو کو کچھ نہیں کہیں گے ورنہ میں بھی ان دونوں کے ساتھ اس گھر سے ہمیشہ کے لیے نکل جاؤں گی پھر رہیے اپنے ان جانوروں کے ساتھ۔“

تانی امی کی دی ہوئی خوراک نے ایسا کام کیا کہ تانی ابو کے تو جیسے ہونٹ ہی سل گئے اور تہنیت نے سکون کا سانس لیا۔

دو چار دن تانی ابو کے گھر قیام کے بعد ہم لوگوں نے واپسی کا قصد کیا۔ امی ابو کا ارادہ دوسرے دن نکلنے کا تھا۔ ہم دونوں میاں بیوی کو صبح چار بجے کی گاڑی سے نکلنا تھا اس لیے میں نے رات ہی میں اپنا سارا سامان سمیٹ کر پیک کر لیا تھا۔ تھوڑی سی نیند لینے کے بعد تقریباً رات میں تین بجے میں نے بستر چھوڑ دیا۔ کیونکہ معظم کی دفتر کی چھٹی ختم ہو رہی تھی اور دوسرے دن انہیں ڈیوٹی اینڈ کرنا تھی۔ اس لیے ہم یہ گاڑی مس نہیں کر سکتے تھے۔ سارے گھر پر سناٹا طاری تھا۔ سب گہری نیند کے مزے لوٹ رہے تھے۔ خاموشی، چاندنی رات اور موتیا کے پھولوں کی خوشبو بڑا خوب صورت منظر تھا۔ میں جچی نیند سے اٹھی تھی اس لیے آنکھیں ملتے ہوئے کھڑکی کھول کر لان کا نظارہ کرنے لگی اور پھر اچانک میری نظریں ایک جگہ جا کر منجمد ہو گئیں۔ میری آنکھوں نے جو حیرت انگیز اور ناقابل یقین منظر دیکھا وہ میرے لیے کسی عجوبے سے کم نہ تھا۔ تہنیت کے زیورات و گہنوں کا چور میرے سامنے تھا۔ زیورات کا ڈبا بالکل کھلا پڑا تھا اور تمام زیورات چاند کی روشنی میں اپنی آب و تاب دکھا رہے تھے۔ تانی ابو کی لاڈلی بندریا کے سامنے ایک آئینہ رکھا ہوا تھا اور تہنیت کے سارے زیورات وہ باری باری ڈبے میں سے نکالتی جاتی اور پھر خوش ہو کر اپنی بیٹی چمکانی اور پکین پکین کر آئینے میں دیکھ کر مزید خوش ہو کر عجیب عجیب سی آوازیں نکال کر اپنے حسن کو نہارنی۔ اور میں، میں تو اپنی پلکیں ہی جھپکاتا بھول گئی۔ جب ذرا ہوش آیا تو میں نے فوراً تانی ابو اور تانی امی کے کمرے کی طرف دوڑ لگائی اور چیخ چیخ کر دونوں کو جگا دیا اور کہا ”میں نے چور کا سراغ لگالیا

ہے جلدی چلیں۔ آپ کا چور لان میں چوری شدہ مال کی نمائش کر رہا ہے۔ اور خود ہی شور مچا چکا کہ اپنی چوری کا ڈھنڈورا پیٹ رہا ہے۔“

”تانی امی اور تانی ابو اچانک ہی نیند سے بیدار ہوئے تھے اس لیے پہلے تو کچھ سمجھ ہی نہ پائے۔ جب ذرا اوسان بحال ہوئے تو دونوں نے یک زبان ہو کر کہا ”کہاں ہے چور؟“

میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”آپ دونوں میرے ساتھ لان میں تو چلیے۔“ اور ہم لوگوں کی باتوں اور شور و غل کی آواز سے تقریباً گھر کے سب ہی افراد بیدار ہو گئے تھے اور اپنے اپنے کمروں سے نکل کر ٹی وی لانچ میں آگئے تھے۔ چور باہر لان میں موجود ہے یہ سن کر سب کی نیند ہوا ہو گئی تھی اور جب میں نے انہیں چور کا دیدار کروایا تو سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور زبانیں گنگ ہو گئیں اور پھر جوہنی اور تہنیتوں کا طوفان اٹھا تو سرونٹ کو ارٹرز میں سوئے ہوئے ملازمین بھی ہڑبڑا کر اٹھ گئے اور سب ہی اس چور کو دیکھ کر محفوظ ہوئے۔ بندریا نے جب دیکھا کہ اس کے آس پاس ہلچل سی ہو رہی ہے تو وہ چونکا ہو گئی اور تمام زیورات اتار کر بکس میں رکھنے لگی۔ ہم سب خاموش ہو کر اس کا تماشا دیکھنے لگے کہ آخر یہ کرتی کیا ہے۔ زیورات ڈبے میں رکھنے کے بعد اس نے فوراً زمین اپنے پنجوں سے کھودنا شروع کی اور زیورات کا ڈبا و آئینہ گڑھے میں اتار دیا اور پھر اوپر سے مٹی بچھا کر زمین برابر کرنے کے بعد اطمینان سے پیر پھیلا کر بیٹھ گئی۔

ہماری ٹرین کا ٹائم ہو رہا تھا اس لیے میں نے تانی ابو کے قریب جا کر کہا ”اچھا تانی ابو ہم دونوں کو تو اب اجازت دیجئے۔ دیکھیے آپ کا چور بھی گرفتار کروا دیا۔“

”تانیابو دم و شرمسار ایک طرف کھڑے تھے۔ وہ بجائے اس کے کہ میری بات کا جواب دیتے تہنیت کی طرف بڑھے اور بے اختیار تہنیت کو گلے لگالیا اور کہا ”بیٹا مجھے معاف کر دو میں نے تمہارا بہت دل دکھایا ہے۔ میں واقعی بہت شرمندہ ہوں۔“

تہنیت پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری تھی۔ وہ تانی ابو کے گلے لگ کر ذرا دو قطار رو رہی تھی، گھر کے سب افراد کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں مگر یہ آنسو خوشی اور مسرت کے تھے۔



ڈراما

جناب معراج رسول صاحب
السلام علیکم

کچھ لوگ جھوٹ بول کر، مذاق اڑا کر سمجھتے ہیں کہ ہم نے مقابل سے لطف لیا لیکن یہ نہیں جانتے کہ اس کا اثر دوسرے پر کیا پڑا۔ میرے ساتھ اس شخص نے ایک کھیل کھیلا جو میری نجات کا ضامن بن گیا۔ میری زندگی بدل گئی۔ آپ بھی ملاحظہ کریں۔

ابرار
(کراچی)

دے دیے۔ اس نے بڑے ادب سے میرے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور سینے پر ہاتھ باندھ کر گردن جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ میری حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کی یہ حرکت میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ کون تھا وہ، اس نے مجھ سے ایسی عقیدت کا اظہار کیوں کیا تھا۔ ”حضرت۔“ اس نے میری طرف دیکھا۔ ”آپ

میں پارک میں آ کر اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھا تھا کہ ایک آدمی میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک مہذب آدمی تھا۔ بہت سلیقے کا لباس اور بہت سلیقے کی کنگ۔ اس نے آتے ہی بہت ادب سے سلام کرتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھا دیے۔ میں نے کچھ حیران ہو کر اپنے ہاتھ اس کے ہاتھ میں

میرے لیے دعا کیجئے گا۔“

”دعا! تم کیا کہہ رہے ہو۔ کیسی دعا اور میں تو ایک گناہگار بندہ ہوں بھائی۔ یہ تم کس سے دعا کے لیے کہہ رہے ہو۔“

”آپ ہی سے کہہ رہا ہوں حضرت!“ اس نے کہا۔
”میں جانتا ہوں کہ آپ کا کیا مقام ہے۔ اسی لیے آپ سے درخواست کر رہا ہوں۔“

میں نے اس سے جان چھڑانے کے لیے کہہ دیا۔ ”ٹھیک ہے۔ کروں گا دعا۔“

وہ بہت ادب سے دوبارہ میرے ہاتھوں کو چوم کر ایک طرف چلا گیا۔ اس نے ذرا سی دیر میں مجھے پریشان کر کے رکھ دیا۔ وہ میرے ساتھ کوئی ڈراما بھی نہیں کر رہا تھا۔ کیونکہ بہت ہی معقول انسان دکھائی دیتا تھا۔ بہر حال میں نے اس کے خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔

نسرین کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔ میں نے اسے اس پارک میں بلایا تھا۔ وہ عام طور پر مجھ سے اسی پارک میں ملا کرتی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت نہیں کرتے، اور نہ ہی ہمارے درمیان کوئی سنجیدہ رشتہ تھا۔ ہمارے درمیان صرف جسمانی تقاضوں کے رشتے تھے۔ ہم دونوں ہی اس بات سے واقف تھے۔ نسرین کے لیے نہ تو میں اکلوتا تھا اور نہ ہی میرے لیے نسرین اکلوتی تھی۔

ہم دونوں نے اپنے اپنے طور پر اس معاملے میں ایک دوسرے سے ملے کر رکھا تھا۔ اس سلسلے میں ہمارا فلسفہ یہ تھا کہ جو وقت ایک دوسرے کے ساتھ گزر رہا ہو اسے پورے خلوص کے ساتھ گزارلو۔ اس چکر میں نہ پڑو کہ یہ میرے بعد کہاں جاتا ہے، یا کہاں جاتی ہے۔

یہ سب مت سوچو۔ اس نے تم کو اپنے دو گھنٹے تو بھر پور دے دیے نا۔ بس اسی کو سب کچھ جان لو اور خوش رہو، تو ہمارے درمیان اس قسم کے تعلقات تھے۔

نسرین اپنے وقت پر آگئی تھی۔ میں نے جب اسے ہاتھ چومنے والے نوجوان کی کہانی سنائی تو وہ بہت دیر تک ہنستی رہی۔

”ارے واہ“ تم تو پیر بابا ہوتے جا رہے ہو۔“ اس نے کہا۔

”ختم کرو۔“ میں اکتا کر بولا۔ ”اس کو غلط فہمی ہوئی

ہوگی۔ اس نے کسی اور کے دھوکے میں مجھ سے بات کر لی ہوگی۔“

ہم وہاں سے اٹھ کر ساحل کی طرف آ گئے۔
میرے پاس اپنی گاڑی تھی۔ اس لیے آنے جانے میں دشواری نہیں ہوتی تھی۔ جس کو بھی چاہا گاڑی میں بٹھایا اور کہیں بھی روانہ ہو گئے۔

میرا اپنا ایک کاروبار تھا جو کامیابی سے چل رہا تھا، میں نے کلفٹن جیسے علاقے میں اپنا ایک شاندار اپارٹمنٹ لے رکھا تھا۔

ایسے علاقوں میں رہنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی ڈسٹرب نہیں کرتا۔

آپ کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں، کیا کرتے ہیں، یہ آپ کے یہاں اتنے لوگوں کی آمد و رفت کیوں ہوتی ہے۔ آپ کی اتنی لڑکیوں سے کیوں جان پچان ہے، وغیرہ وغیرہ۔ لوگوں کو ایک دوسرے سے کوئی مطلب ہی نہیں ہوتا۔ اس لیے آرام سے گزرتی رہتی ہے۔

میں اپنی دوست لڑکیوں کو اپنے اپارٹمنٹ میں ہی لے جاتا تھا۔ میری کچھ دوست لڑکیوں کو پینے کی بھی عادت تھی۔ ان میں سے ایک نسرین بھی تھی۔

وہ کم بخت بی لینے کے بعد بری طرح بہک جایا کرتی۔ اسی لیے اس کی رات اسی اپارٹمنٹ میں گزرتی۔ اور صبح جب اس کے ہوش ٹھکانے آتے تو پھر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو جاتی۔

لیکن اس رات وہ زیادہ دیر نہیں رہی تھی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے گلاس اور بوتلیں وغیرہ ایک طرف رکھیں اور اپنے کمرے میں آکر لیٹ گیا۔

عام طور پر میں جلدی سو جایا کرتا ہوں، میرا مطلب ہے کہ جب میرے ساتھ کوئی نہیں ہوتا تو بستر پر گرتے ہی نیند آ جاتی ہے۔ لیکن اس رات نیند ہی نہیں آرہی تھی۔ ایک انجانائی سی بے چینی تھی۔ نہ جانے کیوں۔

یہ میرا تجربہ ہے کہ جب آپ کے ساتھ اس قسم کی بے چینی اور بے کیفی کی صورت حال ہو تو اس کو تلاش کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ آنکھیں بند کر کے آپ یہ سوچنا شروع کر دیں کہ آج آپ نے کیسا دن گزارا۔ کہاں کہاں گئے۔ کن لوگوں سے ملے۔ دن بھر کیا کرتے رہے۔ پھر اس طرح بھٹکتے ہوئے اچانک وہ وجہ آپ کے سامنے آ جاتی ہے جس نے آپ کو بے چین کر رکھا تھا۔

میں نے بھی اپنے آپ کو دہرانا شروع کر دیا۔ لیکن ایسی کوئی وجہ سامنے نہیں آ سکی جو میری بے چینی کا سبب بن رہی تھی۔ سوائے اس نوجوان کے آنے اور میرا ہاتھ چوم کر چلے جانے کے۔ اور یہ بھی کوئی ایسی بات تو نہیں تھی جو مجھے اس طرح بے چین رکھتی۔

دوسری صبح میں دیر سے دفتر پہنچا تھا۔ میں نے ایک جزوقتی ملازمہ رکھی ہوئی تھی جو صبح آکر ناشتا بنا دیا کرتی اور ضروری کام کر کے چلی جاتی تھی۔

دوپہر اور رات کے کھانے کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ دفتر میں، یا کہیں اور، کسی اور کے ساتھ یا کسی اور کے ساتھ، ہم جیسوں کے لیے ایک ہی بات کہی جاسکتی تھی۔ ”یہ اعجاز تھا حسن آوارگی کا۔ جہاں بھی گئے داستان چھوڑ آئے۔“

دفتر سے اٹھنے ہی والا تھا کہ ایک دوست شاکر کا فون آ گیا۔ وہ میرا دوست بھی تھا اور ہم مشرب بھی۔ ہم ایک ساتھ بہت کچھ کیا کرتے تھے۔ وہ مجھے بتا رہا تھا۔ ”یار، آج ایک اسپیشل مہمان ہے میرے ساتھ۔“

میری ساری کوفت اس کی بات سن کر دور ہو گئی۔ اسپیشل مہمان وہ کسی خوبصورت لڑکی کو کہا کرتا تھا۔ ”تو پھر۔“ میں نے پوچھا۔ ”کیا کہیں لٹچ کا ارادہ ہے۔“

”ہاں۔ ہم کے والٹ پہنچ رہے ہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”تم بھی وہیں پہنچ جاؤ۔“

میں بھی کے والٹ پہنچ گیا۔ یہ ایک ڈھنگ کا ریستوران تھا جہاں ڈھنگ کے لوگ آیا کرتے تھے۔ ڈھنگ کے کھانے ہوتے اور ڈھنگ کی قیمت بھی وصول کی جاتی تھی۔

شاکر کے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی کو دیکھ کر دل خوش ہو گیا تھا۔ وہ تیکھے نقوش کی ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ شاکر نے میرا بہت لمبا چوڑا تعارف کراتے ہوئے اس کے بارے میں بتایا۔ ”یہ ریما ہیں۔ دوستوں کی دوست۔ ان کی اپنی ایک بوتیک ہے اور نئی لڑکیوں کو ماڈلنگ کے چانس دیا کرتی ہیں۔“

”اوہ“ پھر تو ان سے ڈرنا چاہیے۔“ میں نے کہا۔

”وہ کیوں؟“ ریما نے پوچھا۔
”وہ اس لیے کہ آپ جیسوں کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں۔“ میں مسکرا کر بولا۔ ”بہت تعلقات ہوتے ہیں آپ لوگوں کے۔“

”ہوتے تو ہیں لیکن دوستوں کے لیے۔“ وہ بھی

آئن اسٹائن، ایلبرٹ

1879-1955ء امریکی ماہر

طبیعیات اور سائنسی مفکر۔ جرمنی کے ایک شہر اولم میں پیدا ہوا۔ زیورخ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ 1905ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ 1905ء میں ہی اس نے نظریہ اضافیت Theory of Relativity پر اپنا مشہور زمانہ مقالہ شائع کیا، جس سے طبیعی کائنات میں نئی راہیں کھلیں۔ اس نے کہا کہ روشنی تمام اطراف میں مساوی رفتار سے سفر کرتی ہے، خواہ دیکھنے والے کی حرکت کچھ بھی ہو نیز کوئی ایک نقطہ حرکت کا صفر نہیں ہوتا، کیونکہ حرکت کا انحصار دیکھنے والے پر ہے۔ اس کے علاوہ زمان بھی اضافی ہے اور اس کا انحصار دیکھنے والے پر ہی ہے۔

آئن اسٹائن نے کچھ عرصہ زیورخ اور پراگ میں درس و تدریس میں گزارا، پھر 1913ء میں برلن یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر ہوا۔ اس نے طبیعیات میں اور کئی اہم دریافتیں کیں۔ 1921ء میں طبیعیات کا نوبل انعام حاصل کیا۔ 1933ء میں یہودیوں پر نازیوں کے مظالم کے باعث، ریاست ہائے متحدہ امریکا کی شہریت حاصل کر لی اور پرنسٹن یونیورسٹی میں اعلیٰ ریاضیات کا پروفیسر مقرر کیا گیا۔ اسی کی تحریک پر امریکا میں جوہری توانائی پر کام شروع ہوا۔

مرسلہ: شہزاد منظر کراچی

مسکرا دی تھی۔

”سرکار، آپ سے صرف دعا کی درخواست ہے۔“

اس نے کہا۔

”اچھا اچھا کر دوں گا دعا۔ اب جان چھوڑو۔“

اس نے اچانک میرا ہاتھ تھاما۔ ہتھیلی کی پشت پر بوسہ دیا اور اٹھے قدموں چلتا ہوا واپس ہو گیا۔ اس پاس کے لوگ بھی بہت حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

میرا یہ حال تھا کہ میں بہت خفت سی محسوس کر رہا تھا۔ اس آدمی نے تو میرا تماشا ہی بنا کر رکھ دیا تھا۔

”یار، یہ کیا چکر ہے۔“ شاکر نے میرے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے پوچھا۔

”یار، مجھے خود نہیں معلوم۔“ میں نے کہا۔ ”یہ ایک بار پہلے بھی اسی قسم کی حرکت کر چکا ہے۔ اس وقت میں ایک پارک میں بیٹھا تھا اور یہ نہ جانے کہاں سے ٹپک پڑا تھا۔“

”کچھ بھی ہو، اس کے انداز میں بناوٹ نہیں تھی۔“ ریمانے کہا۔ ”اس کے ہر انداز سے آپ کے لیے عقیدت کا اظہار ہو رہا تھا اور وہ مجھے کوئی دیوانہ بھی نہیں معلوم ہوتا تھا۔“

”خیر، اب جہنم میں بھیجو اس کو۔“ میں جھلا کر بولا۔ ”چلو، یہاں سے چلتے ہیں۔“

”ابرار صاحب، میں آپ کے ساتھ نہیں جاسکوں گی۔“ ریمانے کہا۔ ”مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔“ پھر اس نے شاکر کی طرف دیکھا۔ ”شاکر صاحب، سامنے ٹیکسی کھڑی ہے میں اس میں چلی جاتی ہوں۔“

اس سے پہلے کہ شاکر کچھ کہہ سکتا۔ وہ ٹیکسی میں بیٹھ چکی تھی۔

”ابے یہ کیا تماشا ہو گیا۔“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”یہ اچانک کیوں چلی گئی۔“

”اب تو یہ میرے ہاتھ سے بھی گئی۔“ شاکر دانت پیسنے لگا تھا۔ ”اور ولی اللہ بننے کی کوشش کرو۔ اس طرح کوئی تمہارے پاس نہیں آئے گی۔“

”ارے بابا، اس میں میرا کیا قصور ہے۔“ میں غصے سے بولا۔ ”میں تو اس کم بخت کو جانتا بھی نہیں ہوں۔ خواہ مخواہ ڈراما بازی کرتا پھر رہا ہے۔“

”یاد رکھو، پیارے، وہ اس طرح تمہاری ہوا اکھاڑ رہا ہے۔“

”فکر مت کرو، اس بار وہ سامنے آیا نا تو گھونے مار مار کر بے ہوش کر دوں گا۔“ میں نے کہا۔

بہر حال بہت بے کیف ہو کر اپنے اپارٹمنٹ واپس

ذرا سی دیر میں ہم بے تکلف ہو گئے۔ یا تو اس کا اپنا انداز ہی ایسا تھا، ذرا سی دیر میں کھل مل جانے والا اور کچھ میرا اپنا، ستر تھکا کہ میں بہت جلد بے تکلف کر لیا کرتا۔

کھانے کے بعد شاکر نے مجھ سے کہا۔ ”اچھا یار مجھے تو یہاں سے نکل کر ایک ضروری مینٹنگ میں جانا ہوگا۔ تم ایسا کرنا ریمانے کو ان کے گھر ڈراپ کر دینا۔“

”کیوں نہیں، سر آنکھوں پر۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن میری ایک بری عادت ہے۔“

”چلیں، وہ بھی بتادیں۔“ ریمانے پوچھا۔

”وہ عادت یہ ہے کہ جس کو بھی اپنی گاڑی میں لفٹ دیتا ہوں اس کو کچھ دیر کے لیے اپنے اپارٹمنٹ میں مہمان ضرور بناتا ہوں۔“

”ارے یہ کون سی بات ہوئی۔“ شاکر نے کہا۔ ”تم لے جانا ان کو، کیوں ریمانے تمہیں تو کوئی اعتراض نہیں ہے نا۔“ اس نے ریمانے سے پوچھا۔

”نہیں تو۔“ ریمانے مسکرا دی۔ ”اس میں کس بات کا اعتراض۔ اچھا ہے اس بہانے ابرار صاحب کا اپارٹمنٹ بھی دیکھ لوں گی۔“

ہم تینوں ہی ایک ساتھ ریسٹوران سے باہر نکلے تھے۔ ہم پارکنگ کی طرف جا رہے تھے کہ اچانک نہ جانے کس طرف سے وہی نوجوان نمودار ہوا جو ایک شام مجھے پارک میں ملا تھا۔

وہ میرے پاس آ کر ادب سے جھک کر بولا۔ ”سرکار، امید ہے آپ نے اس خاکسار کے لیے دعا ضرور کر دی ہوگی۔“

ہم تینوں ہی پریشان ہو کر رک گئے تھے۔ خاص طور پر میں تو بہت خفت سا محسوس کر رہا تھا۔

”حضور، ایک بار پھر آپ سے دعا کی درخواست کرتا ہوں۔“

”ارے بھائی، تم کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔“ میں غصے سے بولا۔ ”جاؤ کسی پیر فقیر سے دعا کرواؤ۔ میری دعا تمہارے کس کام آئے گی۔“

”سرکار، آپ کی دعا سے میری عاقبت سنور جائے گی۔“ اس نے کہا۔ ”یہ تو میں جانتا ہوں کہ سرکار کا کیا مرتبہ ہے۔ اوروں کو آپ کے بارے میں کیا معلوم؟“

”ارے بھائی، میرا کوئی مرتبہ درجہ نہیں ہے۔“ میں جھلا کر بولا۔ ”تم اس طرح مجھے پریشان مت کیا کرو۔“

آگیا تھا۔

اگر اس کم بخت کا یہ ڈراما نہیں ہوتا تو اس وقت ریمیا میرے ساتھ ہوتی۔ اس کے ساتھ گپ شپ ہو رہی ہوتی۔ بوتل کھل چکی ہوتی لیکن اس نے تو میرا کیاڑا ہی کر کے رکھ دیا تھا۔

خدا جانے کیوں میرے پیچھے پڑ گیا تھا۔ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میں اس کے لیے دعا کروں۔ پتا نہیں اس نے مجھ میں کیا دیکھ لیا تھا کہ اس قسم کی بات کر رہا تھا۔ میں تو اس قابل ہی نہیں تھا۔ جس شخص کی راتیں شباب اور شراب میں گزرتی ہوں وہ کسی کے لیے کیا دعا کر سکتا ہے اور اس کی دعا کس کھاتے میں ہوگی۔

وہ رات بھی بہت بے چینی کی تھی۔ بہت دیر تک سوچتا رہا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ اس نوجوان کو دیکھ کر یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ سیریس ہے یا مجھے بے وقوف بنا رہا ہے۔ اور بے وقوف کیوں بنانے لگا۔ میرا تو اس سے کوئی واسطہ ہی نہیں تھا۔ میں تو اسے جانتا بھی نہیں تھا۔ پھر وہ ایسا کیوں کر رہا تھا۔

اسی ادھیڑ بن میں کئی دن گزر گئے۔ حیرت انگیز طور پر ان دنوں میری کوئی ایکٹیوٹی ہی نہیں رہی۔ دفتر جاتا اور وہاں سے گھر واپس آ جاتا۔ شاکر تک سے ملنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔

ایک دن وہ نوجوان مجھے پارکیٹ میں دکھائی دے گیا۔ اس کی توجہ میری طرف نہیں تھی۔ لیکن میں نے اس کو دیکھ لیا تھا، میں فوراً ہی اس کے پاس پہنچ گیا۔

اس وقت بھی وہ دوسری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے متوجہ کرنے کے لیے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور جیسے اسے گرنٹ سا لگ گیا ہو۔ ”سرکار، حضرت، آپ، آپ یہاں، سرکار آپ نے مجھے اس قابل سمجھا کہ خود میری طرف متوجہ ہو گئے۔“

”ارے بھائی، تم نے یہ کیا تماشا لگا کر رکھا ہے۔“ میں نے غصے سے پوچھا۔ ”میں تو ایک عام سا آدمی ہوں۔ اور تم میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔“

”نہیں سرکار، نہیں۔ آپ عام آدمی نہیں ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔“

”کیا بکواس ہے یہ؟“ ”سرکار، میرے خواب جھوٹے نہیں ہو سکتے۔“ اس

نے بتایا۔

”کیسے خواب؟“

”جو میں آپ کے لیے بار بار دیکھتا آیا ہوں۔“

”آؤ میرے ساتھ۔“ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”یہاں نہیں، کہیں اور چل کر بات کرتے ہیں۔“

”میں اسے لے کر ایک طرف چل پڑا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے کسی غلام کے سے انداز میں سر جھکائے چلا آ رہا تھا۔ میں اسے اپنے ساتھ ایک ہوٹل میں لے آیا تھا۔

”چلو بیٹھ جاؤ۔“ میں نے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

”نہیں سرکار، میری اتنی جرات کہاں کہ میں آپ کے سامنے بیٹھ سکوں۔“

”ڈراما کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بیٹھ جاؤ۔“

وہ اس طرح بیٹھ گیا جیسے کسی بادشاہ نے اسے اپنے سامنے بٹھالیا ہو۔ ”ہاں اب بتاؤ یہ کیا سلسلہ ہے۔“ میں نے پوچھا۔ ”لیکن سب کچھ ٹھیک ٹھیک بتانا۔“

پھر اس نے جو کچھ بتایا وہ بہت حیرت انگیز تھا۔ اس نے کہا۔ ”سرکار..... میں پچھلے ایک مہینے سے آپ کو خواب میں دیکھتا آ رہا ہوں۔ بار بار کسی نہ کسی طرح، کسی انداز میں آپ کی شکل دکھائی جاتی ہے۔ اور ایک آواز بھی سنائی دیتی ہے کہ ان کا دامن تھام لے۔ ان کا دامن تھام لے۔ جب آپ کی صورت میرے ذہن میں پختہ ہوگئی تو پھر میں نے جان لیا کہ آپ ہی کی دعا میرے کام آ سکتی ہے۔ میں نے آپ کی تلاش شروع کر دی پھر آپ اس شام مجھے پارک میں مل گئے۔ میں نے آپ سے دعا کی درخواست کر دی۔ بس اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں بتا سکتا۔“

”کمال ہے۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔

”نوجوان نام کیا ہے تمہارا۔“

”جمال احمد۔“ اس نے بتایا۔

”دیکھو جمال، میں ایک انتہائی گناہگار انسان ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے، تم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہوگا کہ میری صحبت کیسی ہے۔ میں کن لوگوں کے درمیان رہتا ہوں۔“

”سرکار، میں یہ سب نہیں جانتا۔ مجھے تو آپ کی شکل میں ایک روشنی دکھائی جاتی رہی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ آپ میں ایسی کون سی بات ہے لیکن مجھے یہی حکم ملتا رہا ہے۔ اور اس کا ایک ہی مطلب سمجھ میں آتا ہے کہ خدا آپ کی الٹی

سیدھی حرکتوں کے بعد بھی آپ پر بہت مہربان ہے۔“

اس وقت میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نوجوان نے یہ کیا کہہ دیا تھا کہ خدا میرے گناہوں کے باوجود مجھ پر مہربان ہے۔

وہ تو اپنی عادت کے مطابق مجھ سے اجازت لے کر وہاں سے چلا گیا۔ لیکن میں ایک سکتے کے عالم میں وہاں بیٹھا رہ گیا تھا۔ بہت دیر تک۔

مجھے ہوش ہی نہیں رہا تھا کہ میں کہاں بیٹھا ہوں۔ اور کتنی دیر بیٹھا رہا ہوں۔ کچھ ایسی کیفیت ہو رہی تھی جو بیان ہی نہیں کر سکتا۔

پھر جب بیرے نے آ کر مجھے متوجہ کیا تو میں اس کیفیت سے باہر آ گیا۔ میں نے بیرے کو ہل کی رقم دی اور ہوٹل سے باہر آ گیا۔ میرا رخ قریبی مسجد کی طرف تھا۔ نہ جانے کتنے برسوں کے بعد میں مسجد کی طرف جا رہا تھا۔

نہ جانے کتنے برسوں کے بعد میں نے وضو کیا تھا اور کتنی صدیوں کے بعد سجدے میں گر تھا۔ پورے بدن پر لرزہ طاری تھا اور میں روئے جا رہا تھا، روئے جا رہا تھا۔

مسجد سے باہر آیا تو دل کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ آنسو تھے کہ آنکھوں میں چلے آ رہے تھے۔ میرے خدا! میں جس کے احکام کی نافرمانی کرتا رہا، خلاف ورزی کرتا رہا، اس نے مجھے کس طرح یاد کرایا تھا۔

انہی خیالات میں ڈوبا اپنے اپارٹمنٹ واپس آ گیا۔ یہاں ایک ترغیب میرے انتظار میں تھی۔ شاکر اپنے ساتھ پھر اپنی کسی دوست کو لے کر آیا تھا۔ ”کہاں رہ گئے تھے یار۔“ اس نے پوچھا۔ ”میں تو بہت دیر سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“

”شاکر، اب شاید میں اتنی دور نکل گیا ہوں کہ واپس نہ آ سکوں۔“ میں نے کہا۔ ”اس لیے بہتر یہی ہے کہ تم جس کو لے کر آئے ہو، اس کو لے کر واپس چلے جاؤ۔“

”میرے یار، اس سے مل تو لو۔“ شاکر نے کہا۔ ”اب ایسی بھی کون سی بات ہوگئی ہے۔“

”بہت کچھ ہو گیا ہے شاکر۔“ میں ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ”جو شاید تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔“

وہ بہت دیر تک میرا مذاق اڑاتا رہا۔ پھر مایوس ہو کر اس لڑکی کو لے کر واپس چلا گیا۔

اس دن کے بعد سے میری کیفیت عجیب ہوگئی تھی۔ زندگی اور دفتر کے معاملات تو اسی طرح چل رہے تھے لیکن

آنکھل ٹاور

پیرس (فرانس) کے چوک میں واقع ایک مینار جو ایک فرانسیسی انجینئر آنکھل الیکزنڈر گسٹاف نے بنایا تھا۔ اسی نے نہر پائامہ کا خاکہ تیار کیا تھا۔

یہ دنیا کے اونچے اونچے میناروں میں سے ایک ہے۔ بلندی 984 فٹ ہے۔ مینار کی بنیاد پتھر کی ہیں جو کہ چار جھکے ہوئے ستونوں کے نیچے ہیں جو 187 فٹ کی بلندی پر باہم ملتے ہیں۔ زیریں حصہ اڑھائی مربع ایکڑ رقبے میں پھیلا ہوا ہے اور ابتدائی حصہ 54 ڈگری کے زوایے پر اوپر اٹھتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ بلند ہوتا جاتا ہے۔ پہلی منزل 5860 مربع گز میں پھیلی ہوئی ہے۔

دوسری منزل پر اس کی چوڑائی 3 ہزار مربع گزرہ جاتی ہے۔ آخری منزل تیسری ہے اور اس پر بیک وقت آٹھ سو افراد آ سکتے ہیں۔ آنکھل ٹاور کی تعمیر کا کام 28 جنوری 1887ء کو شروع ہوا اور تکمیل 31 مارچ 1889ء کو ہوئی۔ اس کے اوپر سے پورا پیرس نظر آتا ہے۔ اس کی تعمیر میں فولاد اور کنکریٹ استعمال کیا گیا ہے۔ اس پر فرانس کے ٹیلی ویژن سسٹم کا سب سے بڑا ٹرانسمیٹر نصب ہے۔

1930ء تک یہ دنیا کی بلند ترین عمارت تھی۔

1964ء میں آنکھل ٹاور کو فرانس کی وزارت ثقافت نے ایک تاریخی یادگار قرار دیا۔

1981ء میں صد سالہ تقریب کے لیے مینار کی مرمت اور آرائش کی گئی اور اس پر چار کروڑ 40 لاکھ ڈالر خرچ ہوئے۔ مینار کی حفاظت کو بہتر بنانے کے لیے اس میں آگ بجھانے کے آلات اور ریت چھڑکنے کی بالٹیاں لگائی گئیں۔ دوسرے فرش پر موجود ایک ریسٹوران کو ہٹا دیا گیا۔ وسط میں ایک ایسی لفٹ لگائی گئی جو کمپیوٹر کے ذریعے چلتی ہے۔ اس مینار کو سو سال کے اندر 10 کروڑ افراد نے دیکھا۔

مرسلہ: تاجید سلطان، شیخوپورہ

مارچ 2013ء

جناب ایڈیٹر صاحبہ
آداب عرض

ہر انسان کے ساتھ اس کی قسمت ہوتی ہے۔ میرے ساتھ بھی میری قسمت ہے لیکن میری قسمت کتنی کالی ہے اسی کا دکھڑا سنانے کے لیے آج میں حاضر ہوئی ہوں۔ امید ہے آپ اور آپ کے قارئین ضرور سنیں گے۔ عورت قسمت کی کیسی بیٹی ہوتی ہے اسی کا ذکر کرنے کی کوشش کی ہے۔

زلیخا
(فیصل آباد)



بہت ہی پیاری صورت تھی اُس کی۔
جب وہ صرف تین برس کی تھی تو میں اسے اپنے
ساتھ جیل لے کر آئی تھی۔ تین برس کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔
کچھ نہ سمجھنے والی۔ اس بے چاری کو کیا معلوم کہ اس کی ماں کو

کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے۔
اور بہت سوں کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کا مقدر اتنا
خراب کیوں ہوتا ہے۔ ان کے لیے سوائے بد نصیبی اور
ٹھوکروں کے اور کچھ کیوں نہیں ہوتا۔

تھی۔ کہاں تو اس کا وہ انداز ہوتا تھا کہ ادب سے گردن
جھکائے کھڑا رہتا۔ اور سر کار اور حضرت کہہ کر مخاطب کر رہا ہوتا
اور کہاں یہ حال کہ بے تکلفی سے مخاطب کر رہا تھا۔

”جمال، میں تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لیے بہت
دنوں سے تمہیں تلاش کر رہا تھا۔“ میں نے کہا۔

”جناب، آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔ وہ تو صرف
ایک مذاق تھا۔“

”مذاق؟“ میں نے حیرت سے اس کی طرف
دیکھا۔ ”کیسا مذاق؟“

”دیکھیں، آپ ناراض مت ہوئے گا۔“ اس نے
کہا۔ ”ہم چند دوستوں میں یہ شرط لگ گئی تھی کہ ہمیں کسی کو
بے وقوف بنانا ہے۔ اس پارک میں، میں نے آپ کو دیکھا

اور اپنا ڈراما آپ کے ساتھ شروع کر دیا۔ اس کے بعد بھی
آپ جہاں جہاں دکھائی دیے۔ میں آپ کے ساتھ یہی
ڈراما کرتا رہا لیکن اب نہیں، اب بہت ہو گئی۔ اس لیے میں

آپ کو صاف صاف بتا رہا ہوں۔ پلیز معاف کر دیجئے گا۔“

”میرے دوست، معافی کیسی۔“ میں نے اس کے
شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”میں تو تمہارا شکر گزار ہوں۔“

”جی۔“ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

”ہاں بھائی، تمہارے اس ڈرامے کی بدولت مجھے
نئی زندگی مل گئی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم نے جس کام کو ڈراما

سمجھ کر شروع کیا تھا، میرے خدا نے تمہارے اس ڈرامے کو
میرے لیے اطاعت اور فرمانبرداری کا راستہ بنا دیا ہے۔

میں دعویٰ تو نہیں کرتا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ ہو سکتا ہے کہ تم
کسی دن واقعی میرے پاس آ جاؤ کہ حضرت میرے لیے دعا

کیجئے گا۔ تمہارا بہت بہت شکریہ!“

میں اس نوجوان کو حیرت زدہ چھوڑ کر اپنے کاروباری
دوست کے پاس واپس آ گیا۔ وہ نوجوان اپنی جگہ کھڑا ہو کر

میری طرف دیکھتا رہا تھا۔

پھر وہ دوستوں سے معذرت کرے ہوئے سے باہر
چلا گیا۔

اس کے بعد وہ مجھے نظر نہیں آیا جبکہ میں آج بھی اس کی
تلاش میں ہوں۔ کیونکہ یہ راستہ میں نے اسی کی بدولت پایا ہے۔

خدا آپ سب کی زندگی میں ایسا کوئی نوجوان بھیج
دے جو اسی طرح آپ کے ساتھ ڈراما کرے اور آپ
اپنے دل میں شرمندہ ہو کر خدا کے سامنے سر جھکا لیں۔

اب زاویہ ہی بدل چکا تھا۔

میں نے نمازیں شروع کر دی تھیں۔ ہر نماز میرے لیے
آنسوؤں کا تحفہ لے کر آتی اور ایسا لگتا جیسے آنسوؤں کے ساتھ

ساتھ میرے گناہ اندر سے دھل دھل کر باہر آرہے ہوں۔

کہتے ہیں کہ کیوتر با کیوتر، باز با باز، جب میں نے
اپنے خدا کی طرف دھیان دینا شروع کیا تو پھر اس نے

میرے لیے ایسے دوست، ایسے ایسے لوگ بھیجے شروع
کر دیے جو خدا کے نیک بندے تھے۔

یہ لوگ میرے لیے پیغامات اور ہدایات لے کر آیا
کرتے۔ دو ہی مہینوں میں میری تو دنیا ہی بدل گئی تھی۔ میں

کچھ اور ہو گیا تھا۔

ایک بالکل مختلف انسان، اور اب وہ نوجوان مجھے دکھائی
نہیں دیتا تھا۔ اس نے تو میری دنیا بدل دی تھی۔ جب تک میں

گناہوں کے راستے پر چلتا رہا، وہ مجھ سے کئی بار ملا اور جب
میں نے واقعی اپنے خدا کا دامن تھام لیا تو وہ غائب ہو چکا تھا۔

نہ جانے اس میں خدا کی کون سی مصلحت تھی۔

شاید وہ خدا کا کوئی فرشتہ تھا جسے میری ہدایت کے
لیے بھیجا گیا تھا اور مجھے سیدھے راستے پر لگا کر اور اپنی ڈیوٹی

دے کر وہ واپس چلا گیا تھا۔

اس کے باوجود میری نگاہیں اسے تلاش کرتی رہتی
تھیں۔ صرف اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے، میں اس کا

احسان مند تھا۔ اگر وہ میری زندگی میں نہیں آتا تو نہ جانے
اور کتنے شاکر میری زندگی میں آچکے ہوتے۔

اور بالآخر ایک دن اس سے ملاقات ہو ہی گئی۔ یہ
ملاقات ایک ہوٹل میں ہوئی تھی۔ میں اپنے ایک کاروباری

دوست کے ساتھ منچ کے لیے گیا تھا۔ میں یہ بتا چکا ہوں کہ
میں نے زندگی کے معمولات ترک نہیں کیے تھے۔ کیونکہ

تلاشِ رزقِ حلال بھی خدا کا حکم ہے۔ اس لیے میں اپنا
کاروبار بدستور کرتا رہا تھا۔

یہ اور بات ہے کہ خود میری زندگی کے رنگ ڈھنگ
بدل چکے تھے۔ اس میں اب خوفِ خدا کا عنصر شامل ہو گیا

تھا۔ جب میں نے اس نوجوان کو دیکھا تو اپنے کاروباری
دوست کو بٹھا کر اس کے پاس پہنچ گیا۔

وہ نوجوان اس وقت اپنے چند ہم عمر دوستوں کے
ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

”ارے جناب آپ۔“

میں نے اس کے رویے میں ایک تبدیلی محسوس کی

میں نے ایک بہت غریب گھرانے میں ہوش سنبھالا تھا۔ نہ جانے کیوں کچھ بد نصیبوں کو خدا بہت پیاری صورت شکل دے دیتا ہے۔ اس نے میرے ساتھ بھی ایسا ہی کیا۔ اس نے مجھے اچھی خاصی شکل دے دی تھی۔

غریب گھر میں لڑکی اگر خوبصورت ہو جائے تو اس کی خوبصورتی اس کے لیے جان کا عذاب ہو جاتی ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔

میرا باپ نہ صرف ایک غریب انسان تھا بلکہ نشے کا عادی بھی تھا۔ اکثر میری ماں سے جھگڑا کیا کرتا۔ ماں کے پاس صرف ایک حربہ تھا۔ اور وہ تھی اس کی زبان، جو تپتی کی طرح چلتی اور باپ کے نیچے ادھیر کر... رکھ دیتی۔

اس وقت باپ کے ہاتھ اپنا کام دکھانے لگتے تھے اور پورے محلے میں ایک شور برپا ہو جاتا۔ اور اس وقت میں ایک کونے میں دبک کر کھڑی ہو جاتی۔

اس ماحول میں میں نے اپنا بچپن گزارا تھا۔ اگرچہ میں نے زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی، اس کے باوجود مجھے ایک احساس رہتا تھا اور وہ تھا اپنی عزت کا۔

میں اپنی عزت بچانے کی کوشش کیا کرتی۔ میری کوشش یہی ہوتی تھی کہ ہوسناک نگاہوں کی زد سے بچی رہوں۔ اپنے آپ کو بہت لیے دیے رہتی تھی۔

ہوسکتا ہے کہ میرا یہ فعل میرے باپ کو پسند نہ ہو۔ لیکن میری ماں کو بہت خوشی ہوتی تھی۔ وہ مجھ سے کہا کرتی۔ ”دیکھ زلیخا، میں نے جس انداز کی زندگی گزار دی۔ وہ تو میرا مقدر ہے لیکن خدا سے میری دعا ہے کہ تجھے ایک پیار کرے اور تجھے سمجھنے والا شوہر مل جائے۔ تو اپنی حفاظت کرتی رہنا بیٹی۔ کیونکہ تو بہت خوبصورت ہے۔“

”اماں، آخر ایسا تمہارے ساتھ ایسا سلوک کیوں کرتا ہے؟“ میں پوچھا کرتی۔

”یہ میری قسمت ہے بیٹی۔ اور میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“ کچھ دنوں سے ماں کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی اور مجھے ڈر لگا رہتا تھا کہ ماں کے ساتھ کچھ نہ ہو جائے ورنہ میں کہیں کی نہیں رہوں گی۔ میرے باپ کو تو اپنے نشے ہی سے فرصت نہیں ملتی تھی۔

میں جس قدر خوفزدہ تھی، اس سے کہیں زیادہ ماں خوفزدہ تھی۔ وہ سبھی ہوئی رہتی تھی۔ وہ کہا کرتی۔ ”بیٹا، میں بیمار رہنے لگی ہوں۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو پھر اپنے آپ کو بچانے کی ذمہ داری خود تیری ہوگی۔ کیونکہ تیرے باپ کا

کوئی بھروسہ نہیں ہے، وہ نہ جانے کیا کر بیٹھے۔“ آخر وہی ہوا، جس کا اندیشہ تھا۔

ماں کا انتقال ہو گیا اور میں اپنے باپ کے رحم و کرم پر رہ گئی۔ بہت دنوں تک وہ سیدھا رہا، وقت پر کام کے لیے جاتا، شام کو جلدی گھر واپس آ جاتا اور میری دل جوئی کیا کرتا۔ وہ باپ کا فرض ادا کرنے لگا تھا۔

میں بھی خوش تھی کہ میرے باپ کو عقل آگئی ہے لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہیں چل سکا تھا۔ ایک دو مہینوں کے بعد ہی وہ اپنے راستے پر آ گیا۔

اس نے نشے کا استعمال دوبارہ شروع کر دیا۔ ہوسکتا ہے کہ اس دوران بھی کرتا رہا ہو لیکن اب باقاعدہ گھر پر ہی کرنے لگا تھا۔ میں نے جب ایک بار اس کو برا بھلا کہا تو اس نے مجھے مارنا شروع کر دیا۔

واہ، کیا قسمت تھی میری۔ کیا باپ ملا تھا مجھے، بے رحم اور بے حس، اس رات میں اپنی ماں کو یاد کر کے بہت دیر تک روتی رہی تھی۔

ماں کی موجودگی میں میرے باپ کو نہ تو کبھی مجھ پر ہاتھ اٹھانے کی ہمت ہوئی تھی اور نہ ہی اس نے نشے کا استعمال گھر پر کیا تھا، لیکن اب اسے روکنے والا کون تھا۔ کوئی بھی نہیں۔

اور ایک نوجوان آئی گیا۔ وہ راجو کہلاتا تھا۔ میرے ہی محلے کا تھا، دیکھنے میں بہت ہانکا سیا، ہمیشہ اچھے کپڑوں میں رہتا۔ محلے میں اس کی بہت عزت تھی۔ اس نے میرے باپ سے دوستی کر لی تھی۔ دونوں اکثر ایک دوسرے کے ساتھ دیکھے جاتے۔

کبھی کبھی میرا باپ اسے اپنے گھر بھی لے آتا تھا۔ راجو کبھی خالی ہاتھ نہیں آتا تھا۔ جب بھی آتا اس کے ہاتھ میں پھل یا مٹھائی کے تھیلے ہوتے۔ میں جب اس کے لیے چائے لے کر جاتی تو وہ باپ کی نگاہوں سے اپنی نگاہیں ہچا کر مجھے دیکھتا رہتا۔ میں نے ان نگاہوں کا مفہوم اچھی طرح جان لیا تھا۔

بہت کچھ کہتی ہوئی نگاہیں تھیں۔ عورت ایسی نگاہوں کا مفہوم جان لیتی ہے۔ ایک دن وہ اس وقت آیا جب باپ گھر پر نہیں تھا۔ اس شام بھی وہ اپنے ساتھ دو تھیلوں میں کھانے پینے کی بہت سی چیزیں لے کر آیا تھا۔

میں نے دروازے پر اسے بتایا کہ بابا گھر پر نہیں ہے۔ اس نے وہ دونوں تھیلے میری طرف بڑھا دیے۔ یہ

لو، ان میں پھل وغیرہ ہیں۔“

”یہ تم اتنا تکلف کیوں کرتے ہو۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے اچھا نہیں لگتا۔“

”ارے تو کیا فرق پڑتا ہے۔“ وہ مسکرا کر بولا۔ ”یہ تو میری عادت ہے۔ مجھے خالی ہاتھ آنا اچھا نہیں لگتا۔“

میں نے مروتا اس سے کہہ دیا۔ ”آؤ اندر آ کر کچھ دیر انتظار کر لو، ہوسکتا ہے کہ بابا آئی جائے۔“

اس کو بھی شاید اسی موقع کا انتظار تھا۔ وہ جلدی سے اندر آ گیا اور آنگن میں اس جگہ بیٹھ گیا جہاں وہ بیٹھا کرتا تھا۔ یہ پہلی بار تھا کہ وہ میرے باپ کی غیر موجودگی میں آیا تھا۔

میں نے جب اس کے لیے چائے لا کر اس کے سامنے رکھی تو اس نے مجھ سے کہا۔ ”زلیخا، ذرا میری بات سن لو۔“

میں اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ وہ چند لمحوں تک میری طرف دیکھنے کے بعد بولا۔ ”کیا تم یہ جانتی ہو کہ میں یہاں کیوں آیا کرتا ہوں؟“

”ظاہر ہے، بابا کے لیے۔“ میں نے کہا۔ ”نہیں، بابا کے لیے نہیں، بلکہ تمہارے لیے۔ تمہارے بابا سے دوستی بھی صرف تمہارے لیے کی ہے۔“

وہ بولتا جا رہا تھا۔ ”آج موقع ملا ہے تو تم سے اپنے دل کی بات کہہ رہا ہوں، ورنہ خاموش ہی رہتا۔“

اس کی بات سن کر عجیب سی کیفیت ہو گئی تھی میری۔ سب کچھ پہلی پہلی بار ہی ہو رہا تھا۔ پہلی بار کسی نے مجھ سے اس قسم کی باتیں کی تھیں۔ پہلی بار کسی نے احساس دلایا تھا کہ میں ایک لڑکی ہوں اور مجھے پسند بھی کیا جاسکتا ہے۔

میری دھڑکنیں تیز ہونے لگی تھیں۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ بہت تیزی سے وہ میرے قریب ہو رہا تھا۔ پر اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ کہہ سکتی دروازے پر بابا کے کھانسنے کی آواز آئی اور ہم الگ ہو کر بیٹھ گئے۔

حیرت یہ تھی کہ بابا نے بھی اس بات پر اعتراض نہیں کیا تھا کہ راجو گھر میں کیوں موجود ہے۔ وہ دونوں بے تکلف دوستوں کی طرح ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے اور میں وہاں سے ہٹ گئی۔

کچھ دن اسی طرح گزر گئے۔ پھر ایک رات بابا نے مجھ سے کہا۔ ”زلیخا، میں نے تیرے لیے ایک بات سوچی ہے جو کچھ میں کرنے جا رہا ہوں وہ میرا فرض ہے اور میں

یہ چاہتا ہوں کہ جلد سے جلد اس فرض سے نمٹ جاؤں۔“ میں سمجھ تو گئی تھی کہ بابا کیا کہنے والا ہے، پھر بھی انجان سی بنی رہی۔

”زلیخا، یہ بتا راجو تجھے کیسا لگتا ہے؟“ بابا نے پوچھا۔ ”کیوں بابا۔“

”تو میری بات کا جواب تو دے، یہ بتا کیسا ہے وہ؟“ ”ٹھیک ہی ہے۔“

”میں نے اس سے تیرے رشتے کا سوچا ہے۔ تجھے کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔“

میں نے اپنی گردن جھکالی۔ شاید قدرت کو مجھ پر رحم آ گیا تھا۔ اس لیے بابا نے مجھ سے میرے دل کی بات کہہ دی تھی۔

”جواب دے بیٹا۔“ بابا نے کہا۔ ”اب میں کیا جواب دوں بابا۔ جو تمہاری مرضی۔“

میں نے کہا۔ ”جو تم نے میرے لیے سوچا ہے اچھا ہی سوچا ہوگا۔“

”اس رشتے کی بات خود راجو نے ڈالی تھی۔“ بابا نے بتایا۔ ”اس کی طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا، لیکن یہ خود اس کی خواہش ہے۔“

بابا اس کی تعریفیں کر رہا تھا کہ بہت اچھا ہے۔ اس کا اپنا کاروبار ہے۔ خوب آرام سے رکھے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔“

شادی کی تیاریاں کیا کرنی تھیں۔ بے چاری ماں نے جو کچھ سمیٹ کر رکھا تھا، بابا اس کو جینز کے لیے مجھے دے دیتا۔ یہ بھی بد قسمتی تھی کہ ہمارا کوئی رشتہ دار بھی نہیں تھا۔ ورنہ ایسے موقعوں پر رشتے کی عورتیں آ کر سارا کام سنبھال لیتی ہیں۔

شادی کی تیاریوں میں مدد دیتی ہیں لیکن میں کس کو بلاتی؟ خود ہی چھوٹی موٹی چیزیں جمع کرتی رہی۔ بابا نے اس موقع کے لیے صرف بیس ہزار دیے تھے۔ بیس ہزار میں ہوتا ہی کیا ہے لیکن اب کیا ہوسکتا تھا۔

بابا کا یہ کہنا تھا کہ محلے کے دو چار آدمیوں کو گھر ہی میں بلا کر نکاح پڑھوا دے گا اور وہی تقریب رخصتی کی بھی ہوگی۔ مہمانوں کے لیے بریانی اور زردے کی دو دھلیں آجائیں گی۔ بس، ہوگی شادی۔

مجھے بھی اور کیا چاہیے تھا۔

چاہے کسی بھی انداز سے ہو۔ راجو کے ساتھ شادی ہو رہی تھی، شاید ایک محفوظ زندگی میرا انتظار کر رہی ہو۔ راجو نے اس دوران اپنی شرافت کا مظاہرہ یوں کیا

کہ ایک بار بھی میرے گھر نہیں آیا۔ اور نہ ہی اس نے مجھ سے ملنے کی کوشش کی۔

ایک دفعہ رات میں ملاقات ہوئی تو اس نے اتنا ہی کہا۔ ”اب کس بات کی بے صبری، اب تو شادی کے بعد ہی ہم ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے ملیں گے۔“

ان دنوں میری خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ شاید میری زندگی میں میرے لیے خوشیوں کے وہی گئے چنے دن تھے جب میں ہواؤں میں اڑتی پھرتی تھی۔

شادی والے دن گھر میں بہت گہما گہما تھی۔ اس دن محلے کی کچھ عورتیں آگئی تھیں جنہوں نے مجھے دلہن بنادیا۔ میری قسمت ایسی کہاں تھی کہ کوئی مجھے بیوٹی پارلوں وغیرہ لے جاتا۔ بس ان عورتوں کے پاس جتنا میک اپ تھا وہ انہوں نے مجھ پر صرف کر دیا تھا۔ اس کے باوجود وہ عورتیں میری تعریف کرتے نہیں تھک رہی تھیں۔

آنگن میں دریاں بچھا کر سفید چاندنی بچھادی گئی تھی۔ ایک طرف دولہا کے لیے قالین اور گاؤں کے تھے۔ گلی میں دیکیں پک کر آگئی تھیں۔

میں ایک کمرے میں دلہن بنی اماں کو یاد کر کے روئے جا رہی تھی۔ محلے کی عورتیں میری قسمت پر افسوس بھی کر رہی تھیں۔ لیکن میرے دل کو بس یہ ڈھارس تھی کہ اب شاید میرے دن بدلنے والے ہیں۔

وقت مقررہ پر راجو برات لے کر آگیا۔

برات کیا تھی، اس کے دوست تھے۔ وہی محلے کے کچھ لوگ۔ مولوی صاحب آئے، میرا نکاح پڑھایا گیا اور راجو سے میری شادی ہوگئی۔

اس طرح میری زندگی کا ایک دور ختم ہوا اور دوسرا شروع ہوا۔

پہلا دور بہت پریشانیوں کا تھا۔ اماں اور بابا کے جھگڑے، اماں کے آنسو، اور بابا کی گالیاں چیخ وھاڑ، گھر کے آنگن میں ناچتی ہوئی مفلسی، باپ کا نشے کا عادی ہونا، وغیرہ وغیرہ۔

اور دوسرا دور راجو کی بیوی بن کر اس کے ساتھ زندگی گزارنا تھا۔

راجو نے اس محلے سے ہٹ کر ایک دوسرے محلے میں کرائے کا ایک مکان لے لیا تھا، میں کتنی خوش تھی۔ ایک پیار کرنے والا شوہر، ایک چھوٹا سا مکان، کرائے کا سہی، اور

ایک ہنسی کھیلی زندگی۔

ہم ہر ہفتے کہیں نہ کہیں سیر کے لیے چلے جاتے۔ کبھی چڑیا گھر، کبھی سفاری پارک اور کبھی ساحل کی طرف، کبھی کبھی بابا بھی آجاتا تھا۔

جب بابا آتا تو راجو اور بابا دونوں کہیں چلے جاتے۔ اس رات راجو دیر گئے گھر آیا کرتا تھا لیکن مجھے اس پر اعتراض نہیں تھا۔

وہ کسی اور کے ساتھ تو نہیں جاتا تھا۔ بابا ہی کے ساتھ جاتا تھا۔

ایک دن پتا چلا کہ بابا اپنے گھر میں مردہ پایا گیا ہے، کئی دنوں کے بعد جب گھر سے بدبو اٹھنے لگی اور محلے والے پریشان ہو گئے تو آنگن والا دروازہ توڑ دیا گیا۔

بابا کی دو تین دنوں پرانی لاش محن میں ہی پڑی ہوئی تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے ظاہر ہوا تھا کہ دیسی شراب بہت زیادہ پی جانے سے اس کی موت ہوئی ہے۔ میرے لیے بہت شرمندگی کی بات تھی۔

میں بابا کی زندگی میں بھی اتنی ذلیل نہیں ہوئی تھی جتنی ذلت اس کی موت نے دے دی تھی۔ لیکن کیا ہوتا تھا، اس کی آخری رسومات ہم دونوں نے ادا کی۔ اور اس گھر کو تالا لگا کر واپس آ گئے۔

اب وہ گھر قانونی طور پر میری ملکیت تھی کیونکہ میں اکلوتی وارث تھی۔ اس گھر کی قیمت کوئی زیادہ تو نہیں تھی۔ پھر بھی ایک آسرا تھا۔

ہم نے اس گھر کو کرائے پر لگا دیا تھا، تین ہزار کرائے کے طور پر ملنے لگے تھے۔

اس دوران میں ایک بچی کی ماں بن چکی تھی۔ مجھے بچپن میں دیکھنے والوں کا یہ کہنا تھا کہ وہ بچی بالکل میری طرح ہے۔

ویسا ہی سبک چہرہ، خوبصورت نقش ونگار اور چمکتا ہوا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، غرضیکہ میری عذرا ایک حسین بچی تھی۔ راجو بھی اس کو دیکھ دیکھ کر نہال ہوا جاتا تھا۔

سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا، پھر خرابی اس دن سے شروع ہوئی جب راجو ایک آدی منیر کو گھر لے آیا، وہ ایک شوباز قسم کا آدمی تھا۔ اس کی قمیص پر سونے کے بن لگے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں بہت قیمتی گھڑی تھی۔ جس کے بارے میں راجو نے بتایا کہ پورے تین لاکھ کی ہے۔ وہ شخص پہلے ہی دن سے مجھے بہت برا لگا تھا۔ اس

کے دیکھنے کا انداز ایسا تھا جیسے قصائی کمرے کا جائزہ لے رہا ہو۔ اس نے راجو پر خدا جانے کون سا جادو کر رکھا تھا کہ راجو کو اس کے بغیر چین نہیں آتا تھا۔

وہ ہر ہفتے کی شام ہمارے یہاں کھانے پینے کی ڈھیروں چیزیں لے کر آ جاتا۔ یہ عام طور پر مہنگے مہنگے ہوٹلوں کی چیزیں ہوتی تھیں۔

کسی ہفتے وہ زبردستی ضد کر کے ہمیں اپنے ساتھ آؤنگ پر لے جاتا۔ اس کے پاس سفید رنگ کی ایک ٹیوٹا تھی۔ راجو نے اس کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ ایک ٹھیکیدار ہے، اور بہت پیسے والا ہے۔

وہ چاہے جیسا بھی ہو۔ میرے لیے وہ ایک ایسے آکٹوپس کی طرح تھا جو آہستہ آہستہ مجھے اپنی گرفت میں لینے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔

میں نے ایک دو بار راجو کو اس کے روئے کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے میری بات پر دھیان ہی نہیں دیا۔ بابا بات کچھ اور تھی جس کا اندازہ مجھے بعد میں ہوا تھا۔ ایک رات راجو گھر سے باہر تھا کہ منیر گھر آگیا۔

مجھے اس کا آنا برا لگا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے ساتھ شراب کی بوتل لے کر آیا تھا اور کھانے پینے کی چیزیں بھی۔ میں نے اس کو ٹالنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ زبردستی اندر آگیا۔

مجھے اس کا رویہ بہت برا لگا تھا۔ میں اس کو ایک کمرے میں بٹھا کر دوسرے کمرے میں آ کر اپنی بچی کی دیکھ بھال میں لگ گئی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ بھی اسی کمرے میں آگیا، اس کے پاؤں ڈمگمارہے تھے۔

”منیر صاحب، پلیز، آپ دوسرے کمرے میں جا کر بیٹھیں۔“ میں نے کہا۔ ”آپ یہاں کیوں چلے آ رہے ہیں۔“

”ارے، تم کس طرح کی بات کر رہی ہو۔“ وہ لڑکھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میں تمہارے لیے کوئی غیر تو نہیں ہوں۔“

”آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں“ میں نے غصے سے کہا۔ ”جائیں چلے جائیں یہاں سے۔“

”کیوں چلا جاؤں، پورے دس ہزار روپے دیے ہیں تمہارے شوہر کو۔“ اس نے بتایا۔

”کیا مطلب“ میں اس کی بات سن کر دنگ رہ گئی تھی۔ یہ آپ کیا بکواس کر رہے ہیں۔“

”بکواس نہیں ہے میری جان! خود سوچو، راجو اچانک کیوں چلا گیا۔ وہ ابھی تک واپس کیوں نہیں آیا۔ اس کو تو آ جانا چاہیے تھا۔ لیکن آج اس کی جیب میں پورے دس ہزار ہیں وہ کہیں اور عیش کر رہا ہوگا۔“

میں نے میز پر رکھی ہوئی ایک بوتل اٹھالی۔ ”کیئے، تو ابھی اسی وقت کمرے سے نکل جا، ورنہ میں یہ بوتل تیرے سر پر توڑ دوں گی۔“

اس نے ہنستے ہوئے اچانک بستر پر پڑی ہوئی میری بچی عذرا کو گود میں اٹھالیا۔ ”ٹھیک ہے، تو یہ بوتل میرے سر پر توڑ دے۔ میں اس بچی کو جان سے مار دوں گا۔“

”خدا کے لیے چھوڑ دو میری بچی کو۔“ میں نے اس کے آگے اپنے ہاتھ جوڑ لیے۔ ”چھوڑ دو میری بچی کو۔“

”اب یہ بچی اس طرح تو نہیں چھوٹے گی۔“ بہت مکروہ ہنسی تھی اس کی۔ ”اب تو یہ اسی وقت تمہارے پاس جائے گی جب تم میری بات مانو گی۔“

میرا خیال ہے کہ میری جگہ دنیا کی کوئی بھی عورت ہوتی تو وہ اپنی اولاد کی وجہ سے مجبور ہو جاتی۔ اس ذلیل نے میری مانتا سے کھیلنے کی کوشش کی تھی۔

میں نے اس کی کمینگی کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا۔ وہ مجھے توڑ مروڑ کر چلا گیا۔ راجو کی واپسی رات دیر سے ہوئی تھی۔ میں اس وقت بھی بری طرح روئے جا رہی تھی۔

”ارے کیا بات ہو گئی ہے راجو نے پوچھا۔

میں نے اسے منیر کی زیادتیوں کے بارے میں بتا دیا۔ میرا خیال تھا کہ یہ سب سن کر وہ بھڑک اٹھے گا۔ منیر کا خون کر دے گا۔ پاکم از کم اس کو اتنا مارے گا کہ اس کے ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔ اس کے برعکس اس نے مجھے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ”ارے تو کیا ہو گیا۔ اس میں اتنا رونے دھونے کی کیا ضرورت ہے۔“

”راجو! مجھے جیسے سکتا سا ہو گیا تھا۔“ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ یہ کیسی بے خبری کی بات کر رہے ہو۔“

”ارے سب ٹھیک ہے۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔ ”کوئی آسمان نہیں ٹوٹا ہے اور یہ تو دیکھو، اس نے تمہارے لیے بیس ہزار روپے بھی دیے ہیں۔“

اس نے اپنی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور میں نے میز پر رکھی ہوئی سی چھری اٹھا کر پوری قوت کے ساتھ اس کے سینے میں اتار دی۔

وہ ایک کریمہ چیخ کے ساتھ ایک طرف جا گرا تھا۔ مجھ پر اس وقت ایک وحشیانہ جنون سا سوار ہو گیا تھا۔ میں نے اس پر وار کرنے شروع کر دیے۔ ایک بار دو بار دس بار۔ اس کی کریمناک چیخوں نے پورے محلے کو جمع کر دیا تھا۔ اس کو مار ڈالنے کے بعد میں نے.... چھری ایک طرف پھینک دی اور عذرا کو اپنے سینے سے لگا کر زور زور سے رونے لگی۔

اس کے بعد صرف ایک دھندسی باقی رہ گئی تھی۔ کب پولیس آئی، کب مجھے تھانے پہنچا دیا گیا، مجھے کوئی ہوش نہیں تھا۔ بس جیسے میں ایک خواب کے عالم میں سفر کر رہی تھی۔ اگر ہوش تھا تو صرف اس بات کا کہ مجھے اپنی بچی کو خود سے ایک پل کے لیے بھی جدا نہیں کرنا ہے۔ اس کو سینے سے لگائے رکھنا ہے۔

یہ میری زندگی کی کہانی کا دوسرا باب تھا۔ پہلا باب ماں کی موت، پھر شادی اس کے بعد باپ کی موت تک تھا۔ اور دوسرا باب راجو کے ساتھ اس کے گھر میں زندگی گزارنا تھا، اپنی پیاری سی بچی کے ساتھ۔ پھر منیر کا مجھے تاراج کرنا اور میرے ہاتھوں راجو کی موت تک تھا۔

اس کے بعد میری زندگی کا تیسرا دور شروع ہوا۔ یہ ایک بہت مختلف دور تھا۔ مجھے سات سال کی سزا ہوئی تھی۔ مجھے سات سال جیل میں اپنی بچی کے ساتھ گزارنے تھے۔ جو اس وقت صرف تین برس کی تھی۔

یہ سات سال میرے لیے سات صدیوں کے برابر تھے۔ چونکہ میرا کوئی بھی نہیں تھا۔ اس لیے حکام نے مجھے اجازت دے دی تھی کہ میں اپنی بچی عذرا کو اپنے ساتھ رکھ سکتی ہوں۔

جیل کے شب و روز بہت سخت اور خطرناک تھے۔ وہ ایک زنانہ جیل تھی۔ جس کی وارڈن ہٹلر کی جاتی تھی۔ انتہائی ظالم اور بے رحم۔

وہ دیکھنے ہی سے خوفناک معلوم ہوتی۔ اس کی آواز بھی بہت کرخت تھی۔ ایک سے ایک گالیاں اسے ازبر تھیں۔ اس کے ہاتھ میں بید کی ایک چھڑی ہوا کرتی تھی، لچکتی ہوئی، ذرا ذرا سی بات پر وہ کسی کو بھی دھنک کر رکھ دیتی تھی۔ کہا جاتا تھا کہ وہ چند اعلیٰ حکام کی منظور نظر ہے۔ اس لیے اس کے خلاف کوئی شنوائی نہیں ہوتی تھی۔

وہ منظور نظر کیوں تھی۔ اس کا پتا جیل میں آنے کے دو مہینے کے بعد ہوا تھا۔ جب ایک رات اس نے مجھے اپنے

کمرے میں طلب کیا۔

اس وقت وہ کسی عفریت کی طرح بید اپنے ہاتھ میں لیے اپنی کرسی پر بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے اپنی چھڑی میز پر مارتے ہوئے کہا۔ ”اوائے بات سن، آج رات تجھے کہیں جانا ہے۔“

”مجھے جانا ہے۔“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”مجھے کہاں جانا ہے؟“

”اپنے باپ کے پاس۔“ وہ غصے سے دھاڑی۔

”تجھے لیاقت صاحب کے پاس جانا ہے۔ ان کی کوٹھی میں ان کے ساتھ رات گزارنا ہے۔ جانتی ہے، یہ لیاقت صاحب کون ہیں، بہت بڑے آفیسر ہیں۔“

”دیکھیں میڈم، اگر مجھے یہی کرنا ہوتا تو پھر مجھے اپنے شوہر کو مارنے کی ضرورت کیا تھی۔“

”اوہو، تو تو اس طرح کہہ رہی ہے جیسے بہت سنی ساوتری ہے۔“ وہ غرائی۔ ”یاد رکھ، اگر بات نہیں مانی تو تیرا وہ حشر کروں گی کہ زندگی بھر یاد رکھے گی۔“

اس نے صرف کہنے پر اکتفا نہیں کی۔ بلکہ اپنی چھڑی اٹھا کر مجھے مارنا شروع کر دیا۔ میری چیخیں گونج رہی تھیں۔ لیکن کوئی بھی بچانے والا نہیں تھا۔

میں جب مار کھاتے کھاتے نیم بے ہوش ہو گئی تو اس نے دو آدمیوں کو بلا کر حکم دیا۔ ”جاؤ، اس کو اسی حال میں لیاقت صاحب کے پاس لے جاؤ۔“

مجھے گھسیٹتے ہوئے لے جایا گیا۔ پھر وہ لیاقت میرے ٹوٹے ہوئے جسم کو پامال کرتا رہا۔ میں کچھ بھی نہیں کر سکی۔ اس وقت پتا چلا کہ وہ وارڈن اعلیٰ حکام کی منظور نظر کیوں ہے۔

وہ اس طرح جوان عورتوں کو رشوت کے طور پر پیش کر دیا کرتی تھی۔ جس کے نتیجے میں اس پر انگلیاں اٹھانے والا کوئی نہیں ہوتا تھا۔

اس کے بعد تو یہ سلسلہ شروع ہی ہو گیا۔ صاحب لوگ جیل کے معائنے کے لیے آتے اور مجھے پسند کر کے چلے جاتے اور مجھے ان کے حضور پیش کر دیا جاتا۔

میری بچی اسی ماحول میں بڑی ہو رہی تھی۔

جب وہ جیل میں آئی تو تین برس کی تھی اور اب نو برس کی ہو چکی تھی۔ خدا نے اس کو بے مثال حسن دیا تھا۔ جس طرح مجھے دیا تھا۔

نہ جانے کیوں جیل کے گھٹے ہوئے ماحول میں رہنے کے باوجود، روکھی سوکھی کھانے کے باوجود دس برس تک

قابل

MENT

ملتی
ایوارڈ
بولڈر

ELLECE
CE AWARD

ODERMA

کیم
کیم
کیم

-13

-13

-13



نہ جانے رفتن

مکرمی مدیر اعلیٰ
تسلیم ونیاز

بعض واقعات ایسے مضحکہ خیز ہوتے ہیں جن پر ہنسی آتی ہے لیکن سر پٹنے کو دل کرتا ہے۔ اب اسی واقعہ کو لے لیں۔ اگر میں اس کا ایک کردار نہ ہوتا تو یقیناً مسکرا کر بھول جاتا لیکن کئی سال پر محیط یہ واقعہ بھلائے نہیں بھولتا۔ امید ہے قارئین کو بھی پسند آئے گا۔

(کراچی)

یہ واقعہ چونکہ میرے سامنے پیش آتا رہا ہے۔ اسی لیے آپ مجھے اس کہانی کا ایک کردار سمجھ لیں یا چشم دید گواہ سمجھ لیں۔ صرف چالیس گز کا کوارٹر تھا۔

خود سوچیں چالیس گز ہوتا ہی کیا ہے۔ صرف ایک کوٹھڑی۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا باورچی خانہ اور اس کے ساتھ ہی ٹوائلٹ۔ یعنی چالیس گز ختم۔ نہانے دھونے کے لیے محلے کے نلکے پر جانا پڑتا تھا۔

دونوں باپ بیٹے اس چالیس گز کی کوٹھڑی میں زندگی کے دن گزار رہے تھے۔ باپ بے چارہ بیمار رہتا تھا۔ رات بھر کھانسا رہتا۔ اس کے کھانسنے کی آوازیں پورے محلے میں

حال نہیں دیکھا جا رہا تھا۔

میں کئی دنوں تک کروٹ تک بدلنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اتنا ظلم ہوا تھا مجھ پر۔۔۔ کس کے لیے، بچی کے لیے میں اس کے لیے کوئی غلط بات تو برداشت کر ہی نہیں سکتی تھی۔

چار دنوں کے بعد وارڈن پھر میرے پاس آئی۔ اس وقت اس نے مجھ سے بہت گھناؤنی بات کی۔ وہ ایک بار مجھ عذرا کے بارے میں بات کر رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”میں تیری بیٹی کو اپنے ساتھ لے جا رہی ہوں۔“

”اپنے ساتھ۔“ میں کانپ کر رہ گئی۔ ”کہاں لے جا رہی ہیں؟“

”گھبراتا مت۔ اس کو کسی مرد کے حوالے نہیں کروں گی، اپنے ساتھ رکھوں گی۔“ پھر اس نے کچھ قش قش قسم کی باتیں کیں۔

”جس وقت یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ ہم اس وقت بیرک کے باہر کھڑیوں کے پاس کھڑے تھے۔ مجھے جھاڑیاں کانٹیں تھیں۔ اس لیے کھڑی میرے ہاتھ میں تھی اور میری جان، میری بیٹی بھی میرے پاس ہی تھی۔

اس کی باتیں سن کر میں نے کھڑی اٹھائی اور..... اپنی بچی کے بدن میں اتار دی۔ اس کی خوبصورتی کی نگہبانی اس کی موت ہی کر سکتی تھی۔

اس کی موت ہوسناک نگاہوں اور ہاتھوں سے اسے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیتی۔ وہ مرکز محفوظ ہو گئی۔ پھر میں نے اس کھڑی سے اپنے آپ کو مارنا چاہا لیکن کھڑی مجھ سے چھین لی گئی تھی۔

اس کے بعد پھر مجھے ہوش نہیں رہا کہ میں کون ہوں اور کہاں ہوں۔

کہتے ہیں کہ مجھے سات سال تک پاگل خانے میں رکھا گیا تھا۔ اس کے بعد جانے کی آزادی دے دی گئی۔ لیکن میں کہاں جاتی بے سہارا عورتوں کو سہارا دینے والی ایک این جی او مجھے اپنے ساتھ لے آئی۔ اور اب میں ان ہی کے ساتھ ہوں اور اس این جی او کو اپنی کہانی سناتی ہوں جسے ایک لڑکی لکھ رہی ہے۔

لوگ مجھے قاتل اور خونی کہتے ہیں۔ میں نے پہلے اپنے شوہر کو مارا، پھر اپنی بچی کا خون کر دیا، تو کیا میں ایسا ہی ہوں۔ خونی اور قاتل؟



آتے آتے وہ بہت گداز بدن کی ہو چکی تھی۔

اس بد نصیب کو تو میرے ساتھ ہی رہنا تھا۔ جب تک میں آزاد نہ ہو جاؤں اس کو آزادی نہیں ملنے والی تھی۔ میں کسی محافظ کی طرح اس کی نگرانی کرتی رہتی۔

ادھر مت جاؤ، ادھر مت جاؤ، اس عورت سے بات مت کرو۔ وغیرہ۔ اس جیل میں کچھ بد فطرت عورتیں بھی تھیں۔ جن کے ہر انداز سے بد معاشی ظاہر ہوتی۔

میں اپنی ہر ممکن کوشش کرتی تھی کہ اسے بیرک میں ہی رکھوں، باہر نہ نکلنے دوں۔ لیکن ایک مجبور قیدی عورت کر بھی کیا سکتی تھی۔

ایک دن وارڈن نے مجھ سے کہا۔ ”تیری بیٹی تو بہت غضب کی نگلی ہے۔“

”ہاں میڈم۔“ میں نے گہری سانس لی۔ ”اس لیے اس کی طرف سے ڈر لگا رہتا ہے۔ خدا جانے اس کے نصیب میں کیا ہے۔“

”بہت اچھا نصیب ہے اس کا۔“ وارڈن مسکرا کر بولی۔ ”دو چار سال اور بڑی ہو جائے تو اس کے چاہنے والے تجھے ایک رات کے ہزاروں دیا کریں گے۔“

میں ہلک سی ہو کر رہ گئی۔ جیسے کسی نے مجھے خنجر مار دیا ہو۔ میں ٹپ اٹھی تھی۔ ”میڈم، ایسا نہ کہیں۔“

”اور کیا کہوں۔ جیل سے نکلنے کے بعد بھی تیری بدنامی تو تیرے ساتھ رہے گی۔“ اس نے کہا۔ ”اس

معاشرے میں کون قبول کرے گا تیری بیٹی کو۔ کوئی بھی نہیں۔ کیونکہ سب کو معلوم ہوگا کہ تو کون ہے۔ پھر کیا ہوگا، یہی ہوگا ناکہ یہ لوگوں کو خوش کرنے کے کام آئے گی۔“

مجھ سے اب اس کی بکواس برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے قریب رکھی ہوئی بوتل اٹھا کر دیور پر مار کر اسے توڑا اور اس عورت پر حملہ کر دیا۔

اس نے میرا وار اپنی کلائی پر روکا، اس کی کلائی کٹ گئی تھی۔

پھر میں اس پر دوسرا وار نہیں کر سکی۔ اس نے مجھے قابو کر لیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے محافظوں کو بلا لیا۔ اس کے بعد میری جوگت بنی ہے وہ میں ہی جانتی ہوں۔ سب مل کر مجھے اس بری طرح مار رہے تھے کہ چیختے چیختے میرا گلا بیٹھ گیا تھا۔

مجھے اسی حالت میں اٹھا کر بیرک میں پھینک دیا گیا۔ میری بچی مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔ اس سے میرا یہ

وہیلے کسی بھی گوشے میں اور ملک گھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ سسٹمز ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ (بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 6,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیادوں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا مینی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ شمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
C-63 فیئر II سسٹمز ڈائجسٹ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

اس ہفتے میں نے دیکھا کہ دونوں نے ایک راستہ نکال

دونوں ہی باہر سونے لگے تھے۔ دونوں کی چار پائیاں گلی میں تھیں۔ ”یار، رمضان، یہ کیا حماقت ہے۔“ میں نے ان سے پوچھا۔

”یہ حماقت نہیں عقلمندی ہے۔“ رمضان نے کہا۔ ”اب ان الزام نہیں لگا سکتا کہ باپ نے بیٹے کو باہر سلا یا ہے۔“

میں کئی راتوں تک یہ سلسلہ دیکھتا رہا۔ دونوں کی پائیاں گلی میں رکھ دی جاتیں۔ بستر بچھائے جاتے اور باپ بیٹے اپنی اپنی چار پائی سنبھال لیتے۔

بوڑھے شہزادے کے کچھ دوست بھی تھے۔ اسی کی عمر کے۔ وہاں آ جاتے اور ایک چوپال سی جم جاتی۔ بے چارہ ان اپنے باپ اور اس کے دوستوں کے لیے چائے وغیرہ کا بہت کر دیا کرتا۔

وہ محلہ ایسا تھا کہ لوگ وہاں برسوں سے ایک دوسرے سے متاثر رہ رہے تھے۔ ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے۔ اسی لیے سب ایک دوسرے پر اعتماد بھی کرتے تھے۔ محلے کی بو بیٹیاں راستے سے گزرا کرتی تھیں لیکن انہیں کسی قسم کی شکایت نہیں ہوتی تھی۔

کچھ دنوں کے بعد ایک رات دونوں چار پائیاں غائب ہو گئیں۔ یعنی کوارٹر سے باہر کوئی چار پائی نہیں تھی۔ میں نے دوسرے دن رمضان سے پوچھا۔ ”کیا ہوا رمضان، خیریت تو رات تم دونوں کہیں گئے ہوئے تھے کیا؟“

”نہیں تو۔ ہم دونوں اندر ہی کوٹھری میں سوئے ہوئے“

”اندروں سے تھے۔“

”ہاں فریدی بھائی۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔

”کیوں، اب کیا کہہ رہے ہیں محلے والے؟“

”کہہ رہے ہیں۔ دیکھو دونوں بے وقوفوں کو۔ گھر سے ہوئے گلی میں سو رہے ہیں اور ایک رات دونوں سردی مار گئے ہوئے ملیں گے۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔ یعنی کہانی وہیں پہنچ گئی جہاں سے ماہولی تھی۔“

”ہاں فریدی بھائی، یہی ہوا ہے۔ اب ہم دونوں پھر

”واقعی رمضان تم ایک سعادت مند اولاد ہو۔“ میں نے اسے شاباش دی۔ ”ورنہ آج کل کی اولاد کہاں اتنا خیال رکھتی ہے۔“

رمضان میری حوصلہ افزائی سے بہت خوش ہوا تھا۔ اس کے بعد وہ بے چارہ باہر گلی ہی میں سوتا رہا۔ میں رات کے وقت جب بھی اُدھر سے گزرتا اس سے گپ شپ کر لیا کرتا تھا۔ ایک رات جب وہ اپنے چہرے پر کھلے ڈالے سو رہا تھا میں نے اس کے پاس جا کر آواز دی۔ ”رمضان! رمضان! سو گئے کیا۔“ اس نے چہرے پر سے کھل ہٹا دیا۔ وہ رمضان نہیں بلکہ شہزادے تھا۔ رمضان کا باپ۔

”ارے چاچا، خیریت تو ہے!“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”تم باہر کیوں سو رہے ہو؟“

”بیٹا، کم بخت محلے والوں کی وجہ سے۔“ شہزادے نے بتایا۔

”کیوں، محلے والے کیا کہہ رہے ہیں؟“

”زندگی عذاب کر دی ہے۔ کہہ رہے ہیں کیا بے رحم باپ ہے جو خود تو اندر کمرے میں سوتا ہے اور بیٹے کو باہر گلی میں پھینک دیا ہے۔ بس بیٹا ہم دونوں باپ بیٹے نے یہی فیصلہ کیا کہ اب میں باہر سویا کروں گا۔“

”چاچا، مجھے تم دونوں کی محبت نے بہت متاثر کیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”بس بیٹا، یہی زندگی رہ گئی ہے۔ اب جیسی بھی گزرے، اس کا احسان ہے۔“

بوڑھا شہزادے پھر باہر ہی سوتا رہا۔ رمضان سے ملاقات ہوئی تو وہ کچھ بے چین سا دکھائی دیا۔ ”فریدی بھائی، محلے والوں نے پھر بولنا شروع کر دیا ہے۔“

”اب کیا بول رہے ہیں؟“

”یہی کہ کیا بے رحم بیٹا ہے۔ جس نے اپنے باپ کو گلی میں سونے کے لیے مجبور کر دیا ہے۔ بے چارہ بوڑھا سردی کی رات میں رات بھر کھانا ستا رہتا ہے۔“

”ہاں یہ تو ہے۔ ٹھنڈ تو شروع ہو چکی ہے۔“ میں نے کہا۔

”اب آپ ہی مشورہ دیں، ہم کیا کریں۔“

”میں اب کیا کہہ سکتا ہوں۔“ میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم دونوں خود ہی سوچ کر کوئی راستہ نکالو۔“

گوئی رہتی تھیں۔

میں ان کے کوارٹر سے کچھ فاصلے پر ایک بڑے کوارٹر میں رہتا تھا۔ میرا کوارٹر بڑا اس طرح ہو گیا تھا کہ والد صاحب نے تین کوارٹر ایک ساتھ خرید لیے تھے۔ اس طرح میرے پاس ایک سوئیں گز زمین تھی جو اچھی خاصی ہوتی ہے۔

والد صاحب نے اس پر نئی تعمیر بھی کروادی تھی۔ اس طرح میرا گھر اس گلی کا سب سے اچھا گھر ہو گیا تھا۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد میں اپنی ایک چھوٹی بہن اور والدہ کے ساتھ رہتا تھا۔

میں ان دونوں کو دیکھ کر بہت افسوس کیا کرتا۔ کوئی مشورہ اس لیے نہیں دے سکتا تھا کہ مشورہ دینے کا فائدہ ہی نہیں تھا۔ ویسے یہ سوچ کر ہی وحشت ہوتی تھی کہ دونوں باپ بیٹے ایک تنگ سی کوٹھری میں زندگی گزار رہے ہیں۔

باپ کا نام شہزادے تھا اور بیٹے کا نام رمضان۔ پتا نہیں ایسے نام کیوں رکھے جاتے ہیں۔ میں نے ایک دن رمضان سے پوچھا۔ ”یار رمضان، یہ تم دونوں باپ بیٹے کے نام ایسے کیوں ہیں۔ اسلامی تہواروں پر۔“

رمضان ہنس پڑا۔ ”فریدی بھائی، تم کو میری بہن کا نام تو معلوم ہی نہیں۔ وہ بے چاری بچپن ہی میں انتقال کر گئی تھی۔“

”اچھا، کیا نام تھا اس کا؟“

”عیدن۔“ اس نے بتایا۔ ”ہم پیار میں اسے عید و عیدو کہتے تھے۔“

ایک رات میں نے رمضان کی چار پائی باہر گلی میں اس کے دروازے کے پاس دیکھی۔ اس وقت وہ جاگ ہی رہا تھا۔ میں نے اُدھر سے گزرتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا بات ہے رمضان، تم باہر کیوں سو رہے ہو؟“

”کیا بتاؤں فریدی بھائی۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”محلے والوں نے زندگی عذاب کر دی ہے۔“

”کیوں، محلے والوں نے کیا کہا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”کم بخت طرح طرح کی باتیں بنا رہے تھے۔“ رمضان نے کہا۔ ”ایک چھوٹی سی کوٹھری میں بیمار باپ کو رکھا ہوا ہے۔ بے چارہ ڈھنگ سے سانس بھی نہیں لے سکتا۔ وہ تو گھٹ کر مر جائے گا اور بھی اسی قسم کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اسی لیے ہم دونوں باپ بیٹے نے یہ فیصلہ کیا کہ آئندہ سے میں باہر ہی سویا کروں گا۔ کچھ تو زبان بند ہوگی کم بختوں کی۔“

اس کوٹھری میں ہیں۔“

”دیکھو، اگر تم دونوں اسی طرح کرتے رہے تو ایک دن خرچ ہو جاؤ گے۔ محلے والے چاہے اب کچھ بھی بولتے رہیں۔ تم اب کوٹھری سے باہر نہیں نکلتا۔“

”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“

ایک دن رمضان نے میرے سامنے ایک بہت ٹیڑھا مسئلہ رکھ دیا۔ ”فریدی بھائی“ میں تو بہت چکر میں پھنس گیا ہوں۔ اب تم ہی مشورہ دو کہ میں کیا کروں۔“

”اب کیا مسئلہ ہو گیا تمہارے ساتھ؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ بہت ہی ٹیڑھا مسئلہ ہے۔“ رمضان نے کہا۔

”میرے ابا میری شادی کروانے کے چکر میں ہیں۔ انہوں نے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے کہ میں کسی بھی حال میں شادی کر لوں۔“

”تو اس میں پریشانی کیا ہے؟ کر لو شادی۔“

”فریدی بھائی“ تم تو سارے حالات جانتے ہو۔ شادی کر لی تو ابا کہاں رہے گا۔ اس کو پھر باہر گلی میں سونا پڑے گا۔ اس کے بعد کیا ہوگا۔“

”ہاں، یہ تو ہے۔ یہ تو واقعی بہت ٹیڑھا مسئلہ ہے۔“

رمضان منہ ہی منہ میں کچھ بولتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔

شاید وہ بے چارہ اپنی قسمت کو برا بھلا کہہ رہا ہوگا۔

کچھ دنوں کے بعد اس کی شادی ہو گئی۔ بہت چھوٹی سی تقریب تھی جس میں گنتی کے کچھ لوگوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ ان میں سے ایک میں بھی تھا۔

اس کا بوڑھا باپ اس وقت بھی کھانس رہا تھا اور میں اسے دیکھ کر افسوس کر رہا تھا کہ اس کھانستے ہوئے بوڑھے کو ایک بار پھر گلی میں اپنا پلنگ بچھانا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ وہ بیٹے اور بہو کے ساتھ کمرے میں تو نہیں رہ سکتا۔

لیکن اس کے برعکس ایک اور بات ہو گئی۔

رمضان کا پلنگ پھر باہر آ گیا۔ حالانکہ رمضان اور اس کی بیوی نے کوارٹر کے دروازے کے باہر پلنگ ڈال کر اسے چاروں طرف سے کپڑے سے اس طرح کور کر دیا تھا جیسے کوئی گمراہ بنا دیا گیا ہو۔

دو دن تو خیریت سے گزر گئے۔ تیسرے دن رمضان بہت پریشان ہو کر میرے پاس آیا۔ ”فریدی بھائی“ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اب میں کیا کروں۔“

”کیوں اب کیا بات ہو گئی۔“

”محلے والے یہ کہہ رہے ہیں کہ میں اس طرح باہر پلنگ ڈال کر پورے محلے کا ماحول کو خراب کر رہا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”محلے کے لوٹے کم بخت اندھیرے میں گلی میں بیٹھے رہتے ہیں۔“

”یہ بات تو ہے رمضان۔“ میں نے کہا۔ ”اس بار مجھے والوں کا اعتراض بالکل درست ہے۔“

”تو پھر بتاؤ، کیا کروں۔“

”اب میں کیا بتا سکتا ہوں۔ تم لوگ خود ہی کوئی راستہ نکالو۔“

اس بے چارے نے راستہ یہ نکالا کہ تیسرے دن سے اپنے باپ کو گلی میں سلاتا شروع کر دیا۔ خیال تھا کہ شاید اب محلے والے اس کا پیچھا چھوڑ دیں لیکن ایسا کیسے ہو سکتا تھا۔

ایک بار پھر وہی اعتراض کہ بے چارہ باپ تو باہر گلی میں سو رہا ہے اور دونوں میاں بیوی کمرے میں عیش کر رہے ہیں۔ تنگ آ کر رمضان نے باپ کو بھی کمرے میں بلا لیا اب

وہ تینوں ایک ہی کوٹھری میں تھے۔ اس پر وہ طوفان اٹھا کہ بے چارہ رمضان بلبل کر رہ گیا۔ اب یہ کہا جا رہا تھا کہ بڑھے باپ کی بے غیرتی دیکھو کہ شادی شدہ بیٹے اور بہو کے ساتھ ایک ہی کمرے میں کھس کر سویا رہتا ہے۔ یہ سب قیامت کی نشانیاں ہیں۔ ایسے لوگوں کی وجہ سے برکتیں ختم ہو گئیں ہیں اور خدا کا عذاب نازل ہونے لگا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

رمضان نے بہت ہی پریشان ہو کر مجھ سے فریاد کی۔

”فریدی بھائی، اب بتائیں، اب میں کیا کروں۔ اب تو کوئی راستہ ہی نہیں رہ گیا ہے۔“

”اب میں تمہارے لیے سوائے دعاؤں کے اور کچھ نہیں کر سکتا۔“ میں نے کہا۔

پھر ایک دن پتا چلا کہ رمضان کا باپ سخت بیمار ہو کر اسپتال پہنچ گیا ہے اور اس بیماری کے عالم میں ایک ہی ہفتے میں اس کا انتقال ہو گیا۔

مجھے اس شخص کی موت کا افسوس بھی تھا۔ لیکن یہ خیال بھی تھا کہ اب بے چارے رمضان کو سکون مل جائے گا کیونکہ بے چارہ باپ ہی نہیں رہا تھا۔ لیکن تو یہ کریں۔ باپ کی موت کے بعد پورا محلہ دو واضح گروہوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔

ایک گروہ کا کہنا تھا کہ بے چارہ رمضان اب تنہا رہ گیا ہے۔ باپ کا سہارا ختم ہو گیا ہے۔ اب وہ زندگی بھر دعاؤں کے لیے ترستا رہے گا۔ باپ تھا تو مشورے دیتا رہتا تھا جبکہ

محترم عذرا رسول
السلام علیکم

میری زندگی ایک عجیب کہانی ہے۔ ایسی کہانی جو ہر ایک کے لیے سبق آموز ہے۔ میں چاہتا ہوں میری کہانی سرگزشت کے قارئین تک پہنچے تاکہ دوسرے لوگ بھی عبرت حاصل کریں۔ میں لکھاری نہیں ہوں اس لیے اپنی کہانی کو عام سے انداز میں لکھ رہا ہوں۔ اسے کسی اچھے رائٹر سے دوبارہ لکھوالیں تو احسانِ عظیم ہوگا۔ لیکن شائع ضرور کریں۔ امجد

(سرگودھا)

”تر کا بچہ ہے، اس لیے اس کے یہاں نہ ہی پیدا ہوگا۔“ میرے دوست نے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”کیا ضروری ہے کہ امجد کے یہاں بیٹا ہی ہو۔“ ایک اور دوست نے تبصرہ کیا۔
”بکواس مت کرو۔“ مجھے اس کی بات پر غصہ آ گیا۔ ”یہ ہمارے یہاں کی روایت ہے۔ پہلی اولاد ہمیشہ بیٹا ہی ہوتی ہے۔ میرے دادا کے یہاں میرا باپ پیدا



وے دیا تھا۔

میرا خیال تھا کہ اب وہ بے چارہ سکون کی زندگی گزارے گا لیکن شاید اس بے چارے کے مقدر میں سکون ہی نہیں تھا۔ ایک دن وہ صدر کے علاقے میں مجھے مل گیا۔ پریشان تھا۔ چہرے پر ہوائیاں اڑتی ہوئی۔ مجھے دیکھتے ہی تیزی سے میرے پاس آ گیا۔ ”فریدی بھائی“ اچھا ہوا آواز۔ ”میں تو خود آپ کے پاس جانے کی سوچ رہا تھا۔“ تم بتاؤ، تم خیریت سے تو ہونا؟ میں نے پوچھا۔ ”خیریت کہاں فریدی بھائی۔“ اس نے ایک گہرا سانس لی۔ ”ہم جیسوں کے نصیب میں خیریت نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔“

”کیوں“ اب کیا مسئلہ ہو گیا۔ تم تو وہ محلہ چھوڑ چکے ہو۔“ ”محلہ تو چھوڑ چکا ہوں۔ لیکن اب جس محلے میں کیا ہوں، وہ لوگ اور بھی دو چار ہاتھ آگے کی چیز ہیں۔“ ”کیوں، ان کے ساتھ کیا پرالیم ہو گئی۔“ ”پرالیم یہ ہے کہ محلے والوں کو یقین ہی نہیں آ رہا کہ میں کوئی شریف آدمی ہوں۔ ان کا کہنا ہے کہ جو شخص راتوں رات اپنا پرانا محلہ چھوڑ کر بھاگ نکلے، اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی گناہ ضرور ہے۔ وہ سب مجھے اور میری بیوی کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا کرتے ہیں۔ اب آپ بتائیں، میں کیا کروں۔“ ”اب تمہارے لیے صرف ایک مشورہ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم نے اپنا کوارٹر کرائے پر دیا ہے نا۔“ ”جی ہاں۔“

”بس تم اپنے کوارٹر میں واپس آ جاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”اور دھڑلے سے رہنا شروع کر دو۔ کیونکہ یہ دنیا ایسی ہے کہ چاہے کچھ بھی کر لو، وہ تمہارے کام میں نقص نکالتی رہے گی۔ اس لیے اب کسی کی پروا مت کرو۔ لوگ بکواس کرتے ہیں تو کرنے دو۔ ورنہ شاید تمہارے لیے زندہ رہنا دشوار ہو جائے۔“ رمضان نے میرے اس مشورے پر عمل کر لیا۔ اب وہ محلے والوں کی بالکل بھی پروا نہیں کرتا اور انتہائی سکون کی زندگی گزار رہا ہے۔

میرا یہی مشورہ ہر شخص کے لیے ہے۔ لوگ جو کہتے ہیں انہیں کہنے دیں کیونکہ ایک بات یاد رکھیں کہ تنقید کرنے والے ہر جال میں تنقید کریں گے۔ چاہے آپ کچھ بھی کر لیں۔

✕

سلطان آشفقہ

(1939-1995ء) پنجابی کے ممتاز ادیب اور شاعر۔ وہ پھلاناٹک (لوہاری منڈی) لاہور میں پیدا ہوئے۔ تعلیم لاہور ہی میں حاصل کی۔ 1953ء میں بہ سلسلہ ملازمت سعودی عرب چلے گئے اور وہاں عربین آئل کمپنی میں خدمات انجام دینے لگے۔ وہیں انہوں نے عربی سیکھی اور ریاض یونیورسٹی سے ایم اے نفسیات کیا۔ فلسفہ، تاریخ، پراسرار علوم، الہیات، شعر و شاعری، تصوف اور ڈراما نویسی سے دلچسپی تھی۔ بحیثیت شاعر انہوں نے 1961ء میں اردو غزل سے شاعری کی ابتدا کی۔ پنجابی زبان و ادب کی ترویج کے لیے بھی کوشاں رہے۔ پنجابی تحقیقاتی مرکز کے صدر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ 1976ء میں پھر سعودی عرب چلے گئے مگر چند برس بعد واپس وطن آئے۔ فلموں کے لیے دو درجن کہانیاں لکھیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں بھی حصہ لیتے رہے۔ لاہور میں انتقال ہوا۔

مرسلہ: افتخار احمد، لاہور

دوسرے گروہ کا کہنا تھا کہ رمضان ہی کی وجہ سے بے چارے شہرانی کا انتقال ہوا ہے۔ اس نے جان بوجھ کر ایسی حرکت کی ہوگی کہ بے چارہ بیمار ہو کر انتقال کر گیا۔ یعنی باپ کی موت کا سارا ملایا بے چارے رمضان پر آ گرا تھا۔

رمضان ایک بار پھر بلبلا تا ہوا میرے پاس آ گیا۔ ”فریدی بھائی“ اب تو انتہا ہو گئی ہے۔ باپ زندہ رہا تو مصیبت۔ مر گیا تو اور مصیبت۔ اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں۔“ ”اب تو صرف ایک ہی طریقہ رہ جاتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ لوگ تمہیں زندہ نہیں رہنے دیں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم یہ محلہ ہی چھوڑ دو۔ کہیں اور چلے جاؤ۔“ ”ہاں“ یہ ٹھیک رہے گا۔“ رمضان نے میری تائید کی۔ ”میں خود اب ایسے محلے میں نہیں رہنا چاہتا جہاں لوگوں کو چین ہی نہیں مل رہا ہے۔“

اس کے دس پندرہ دنوں کے بعد رمضان واقعی محلہ چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلا گیا۔ اس نے اپنا کوارٹر کسی کو کرائے پر

ہوا تھا۔ میرے باپ کے یہاں میں پیدا ہوا۔ ہمارے یہاں پہلی اولاد کے طور پر بیٹی کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔“

”اور اگر بیٹی ہوگئی تو پھر کیا کرے گا۔“

”گلابا کروں گا، اور کیا کروں گا۔“

”کمال ہے یار۔ تو ابھی تک جہالت کے دور سے واپس نہیں آسکا ہے۔“ میرے اس دوست نے کہا جو بیٹی کے حق میں تھا۔

”اب چاہے کچھ بھی سمجھ لے۔ ہمارے یہاں یہی ہوتا ہے۔“

میں کہنے کو یہ سب تو کہہ رہا تھا لیکن میں بھی اندیشوں ہی میں تھا۔ اگر واقعی بیٹی ہی ہوئی تو پھر کیا ہوگا۔ میں کسی بھی صورت پہلی اولاد کے طور پر بیٹی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں یہ برداشت کر ہی نہیں سکتا تھا کہ میرے یہاں بیٹی ہو۔

میں نے اپنی بیوی صفرا سے بھی یہی کہہ دیا تھا۔ ”دیکھو صفرا، تم ماں بننے والی ہو۔ یہ بہت خوشی کی بات ہے۔ لیکن یاد رکھو، ہماری پہلی اولاد بیٹی نہیں ہونی چاہیے۔“

”یہ آپ کیسی بات کر رہے ہیں۔“ وہ تڑپ گئی تھی۔

”کیا یہ کسی کے بس میں ہے۔ یہ تو خدا کی دین ہے۔ وہ جو بھی دے۔“

”میں یہ سب نہیں جانتا ہمارے خاندان میں یہی چلا آ رہا ہے۔ پہلی اولاد ہمیشہ بیٹا ہوا ہے۔ میں خاندان اور برادری میں اپنی ناک نہیں کھانا چاہتا، اسی لیے ہر حال میں بیٹا چاہیے۔“

”امجد، خدا کا خوف کریں۔ آپ آج کے زمانے میں بھی ایسی باتیں لے کر بیٹھ گئے۔“ صفرا نے کہا۔

”ہاں، مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے آج کے زمانے سے۔“

میرا لہجہ انتہائی سخت اور درشت ہوتا جا رہا تھا۔ ”یاد رکھو، اگر بیٹا نہیں ہوا تو میں نہیں جانتا کہ پھر کیا ہونے والا ہے۔“

ایسا نہیں تھا کہ مجھے کچھ معلوم نہ ہو، میں ستر محسوس یا اٹھارہ سو صدی کا انسان نہیں تھا۔ اس کے باوجود میں کسی بھی صورت میں بیٹی قبول کر لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

مجھے صفرا سے بھی محبت تھی۔ میں نے اس سے محبت کی شادی کی تھی۔ ہم دونوں کے درمیان مکمل ہم آہنگی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اس کے باوجود میں یہ برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ ہمارے یہاں بیٹی پیدا ہو، خاص طور پر پہلی اولاد۔

صفرا نے ایک ہاسپٹل میں اپنا نام لکھوایا تھا۔ ڈاکٹر نے میرے سامنے مشورہ دیا کہ الٹراساؤنڈ کروالیا جائے کیونکہ آثار ایسے تھے کہ شاید کوئی پیچیدگی پیدا ہو جائے۔ لیکن میں نے الٹراساؤنڈ کروانے سے انکار کر دیا تھا۔

”نہیں ڈاکٹر، اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میری بیوی آپ کے پاس آگئی ہے۔ اب اس کا کیس آپ کے پاس ہے۔“

”وہ تو ہے، لیکن الٹراساؤنڈ سے پتا چل جائے گا کہ آنے والی اولاد بیٹا ہے یا بیٹی۔“

”اس کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ میں جاننا ہوں کہ بیٹا آ رہا ہے۔“ میں نے کہا۔

”کمال ہے، آپ کو کیسے معلوم۔“

”اس لیے کہ میرے خاندان کی یہی روایت ہے۔“ میں یقین بھرے لہجے میں بولا۔ ”برسوں سے یہی چلا آ رہا ہے۔“

اس وقت ڈاکٹر نے اس طرح میری طرف دیکھا جیسے اسے میری دماغی صحت پر شبہ ہو رہا ہو۔ لیکن مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔ میں نے تو اپنا ذہن بنالیا تھا کہ ہمارے یہاں بیٹا ہونے والا ہے۔

مجھے بیٹی کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

میں اس وقت ایسا ہو گیا تھا کہ مجھے صفرا کے احساسات کی بھی پروا نہیں رہی تھی۔ اسے ہر حال میں اپنے کی ماں بننا تھا۔

میں نے آنے والی اولاد کے لیے خریداری بھی شروع کر دی تھی اور ہر کھلوٹا ایسا لارہا تھا جسے لڑکے ہی استعمال کرتے ہیں۔ میں نے صفرا سے کہا۔ ”جانتی ہو، میں نے آنے والے کا نام بھی سوچ لیا ہے۔“

”اچھا، وہ کیا۔“

”شہباز، ہے نام مردانہ نام۔“

”ہاں“ اس کے ہونٹوں پر پھینکی سی مسکراہٹ آگئی، شاید وہ ابھی تک اندیشے میں مبتلا تھی، بے وقوف! پھر وہ دن بھی آ گیا، جب مہمان کو دنیا میں آنا تھا۔ صفرا کو لیبر روم میں لے جایا گیا، ڈاکٹر نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ چند وجوہات کی بنا پر کیس پیچیدہ ہو گیا ہے، لیکن وہ اپنی سی پوری کوشش کریں گی۔ میں بہت بے چین تھا۔ ایک تو یہ فکر تھی کہ بیٹا نہیں آنے والا کون ہے، پھر صفرا کی طرف سے بھی پریشانی تھی۔ میں نے اس سے محبت کی تھی۔ وہ ایک وفادار اور پیارا کرنے والی بیوی رہی تھی۔

بہت دیر بعد ڈاکٹر لیبر روم سے باہر آئی، اس کا چہرہ ہوا تھا، اس نے اشارے سے مجھے بلایا، اور جب میں کے قریب گیا تو اس نے دھیرے سے کہا، ”تمہارے بچہ جنم لیا۔“

”جی ڈاکٹر بتائیں۔“ میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

”پہلی بات تو یہ ہے کہ تمہاری بیوی کی حالت نازک ہے، بچے کی کوشش کر رہے ہیں، آگے خدا کی مرضی۔“

”اور..... اور دوسری خبر۔“

”دوسری خبر یہ ہے کہ بیٹی پیدا ہوئی ہے۔“

میرے پورے بدن میں جیسے آگ سی لگ گئی، صفرا مجھے کیسا تحفہ دیا تھا۔ جس کو میں کسی طور برداشت کر ہی نہیں سکتا تھا۔ مجھے بیٹی نہیں چاہیے تھی۔ میں اس وقت یہ ہی سمجھ رہا تھا کہ ڈاکٹر نے صفرا کی حالت نازک ہونے کی اطلاع دی تھی۔

میں تو صرف یہ جانتا تھا کہ میں ایک بیٹی کا باپ بن رہا ہوں، میری برادری میں ناک کٹ گئی ہے۔

”بھائی، جلدی سے اپنی دم توڑتی ہوئی بیوی کے پاس جائیں، وہ آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔“

میرا دل تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن جانا پڑا، صفرا اس وقت اپنے ہوش میں تھی۔ اس کی سانسیں چل رہی تھیں۔ اس کے برابر میں وہ قابل نفرت وجود کھلبلا رہا تھا جو میری زندگی میں زہر کھولنے آیا تھا۔

صفرا نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ سے میرا ہاتھ تھام لیا، ہاتھ آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی۔ ”میری بیٹی، بچی کا خیال رکھنا۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اپنا چہرہ کی دوسری طرف کر لیا تھا۔

بہر حال کچھ دیر بعد ہی اس کا انتقال ہو گیا۔ خدا نے وہ اپنے دل پر کیا بوجھ لے کر گئی ہوگی۔ ضروری خانہ کے بعد ڈاکٹر نے کہا۔ ”اب آپ اپنی کی بیوی میت لے جاسکتے ہیں۔“

”ڈاکٹر صاحبہ، میں میت کو کس کے پاس لے جاؤں۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ ہمارا کوئی ہے ہی نہیں۔“ میں نے ناف جھوٹ بول دیا تھا۔

”یہ کیا بات ہوئی۔ لڑکی کے والدین، عزیز واقارب، لے لے تو ہوگا۔“

”نہیں ڈاکٹر اس غریب کا کوئی بھی نہیں ہے۔“ اور یہ حقیقت تھی، جبکہ میرے رشتے دار موجود تھے۔ لیکن میں نے ڈاکٹر کو ان کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔

”پھر تو آپ ایڈمی کو فون کر دیں، وہی لاش اٹھا کر لے جائیں گے۔“

میں نے یہی کیا۔ میں نے لاش ایڈمی والوں کے حوالے کر دی تھی۔ گرچہ دل پر ایک بوجھ اور دکھ محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن اس کے علاوہ میں اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

اس کے بعد کا مرحلہ بچی کا تھا۔ اس کے ساتھ کیا کیا جائے۔ بہر حال میں اس بچی کو اپنے سینے سے لگائے ہاسپٹل سے باہر آ گیا۔ اس نے وہی کپڑے پہن رکھے تھے جو بے چاری صفرا بنا کر اپنے ساتھ ہاسپٹل لائی تھی۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ ایک طرح سے اس کا مرجانا اچھا ہی ہوا۔ ورنہ وہ بھی اس بچی کو ٹھکانے لگانے کی اجازت نہیں دیتی۔ میں نے اس بچی کو کچھ لے کے کسی ڈھیر پر ڈال دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ میرے لیے اس کے وجود کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ رہے یا مرجائے، یا اس کا جو بھی حشر ہو۔

میں اسے لے کر ایک ایسی جگہ آ گیا جہاں ہر طرف کچرا ہی کچرا تھا۔ وہاں کئی آوارہ کتے بھی تھے۔ یہ اچھی بات تھی۔ ذرا سی دیر میں وہ کتے اس کو چٹ کر جاتے۔

میں کچرے کے ڈھیر کے پاس پہنچا ہی تھا کہ کسی طرف سے ایک پولیس والا نمودار ہو گیا، جو بڑی شک بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ”اوائے، یہ کیا ہے۔“ اس نے سینے سے لپٹی ہوئی بچی کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ بچی ہے میری۔“ میں نے بتایا۔

”تیری بچی ہے، یا کہیں سے چڑا کر لایا ہے۔“

”کیسی بات کر رہے ہو۔ میرے ساتھ ہاسپٹل چلو، خود پتا چل جائے گا۔“ میں غصے سے بولا۔

شاید اسے یقین آ گیا تھا، اس لیے وہ مجھے گھورتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اب اس کم بخت کو کچرے کے ڈھیر پر پھینکنا مناسب نہیں تھا۔ پھر اسے کہاں لے جاتا۔ میں اپنے ساتھ اسے رکھ نہیں سکتا تھا۔ کسی بھی قیمت پر نہیں۔

پھر مجھے خالہ زینب کا خیال آ گیا۔ وہ اکیلی رہتی تھیں۔ میں نے وہ بچی ان کے پٹنگ پر رکھ دی۔ ”یہ لو خالہ، سنبھالو اس کو۔“

”ارے یہ کون ہے؟“

”ہماری بچی، میرا مطلب ہے صفرا کی بچی، صفرا تو اس

سیپ کی قسم کا ایک سمندری جانور، جس کے سونڈ جیسے آٹھ ہاتھ پاؤں ہوتے ہیں۔ وہ ان سے کیڑے اور جھینگے پکڑ کر کھاتا ہے، اور انہی کی مدد سے تیرتا ہے۔ آکٹوپس مل جل کر بڑے بڑے پتھروں کے مورچے بنا لیتے ہیں۔ خطرے کے وقت چٹانوں کے نیچے کوئوں کھدروں میں چھپ جاتے ہیں یا اپنی تھیلی میں سے کالی سیاہی پانی میں چھوڑ کر اسے دھواں دار بنا دیتے ہیں۔ ماحول اور طبیعت کے مطابق اپنا رنگ بھی بدل سکتے ہیں۔ بحیرہ روم اور بحر اوقیانوس میں دس دس فٹ لمبے آکٹوپس ملتے ہیں۔ بحر الکاہل کے آکٹوپس کی موٹائی تیس فٹ سے زیادہ ہوتی ہے۔ دنیا کے اکثر ملکوں میں آکٹوپس بطور غذا استعمال ہوتا ہے۔

مرسلہ: اختر ہوشیار پوری، لاہور

”تو نے کس کو کھیتے ہوئے دیکھا ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”بہت سی بچیوں کو۔“ اس نے بتایا۔ ”وہ آنگن والے دروازے سے باہر گلی میں کھیل رہی تھیں۔ میں بھی ان کے ساتھ کھیلوں گی۔“
میں غصے سے لرزے لگا تھا۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ تو دروازے تک گئی تھی۔“
”ہاں بابا۔ لیکن میں باہر نہیں گئی۔ ان کی آوازیں سنتی رہی تھی۔“

”ٹھیک ہے، اب تیرا علاج کرنا پڑے گا۔“
میں نے اس کا علاج یہ کیا کہ اس کے پیروں میں زنجیر باندھ دی۔ اب وہ کوٹھری سے باہر جانی نہیں سکتی تھی۔ وہ رونی اور لرزتی رہی۔ لیکن میں نے اس کی پروا نہیں کی، میں کسی بھی حال میں اس کے ساتھ کوئی رعایت کرنے کو تیار نہیں تھا۔ کسی بھی قیمت پر نہیں۔

اس طرح کئی مہینے گزر گئے۔ میں واپس آ کر ذرا سی دیر کے لیے اس کی زنجیر کھول دیتا۔ اسے صرف واش روم تک جانے کی اجازت تھی۔ فارغ ہو کر وہ پھر کوٹھری میں آ جاتی اور میں اس کے پیر میں دوبارہ زنجیر ڈال دیتا۔ میں پوری طرح نفسیاتی بیمار بن گیا تھا۔

جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا۔ اس کے خلاف میری نفرت شدید ہوتی جا رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ

ساتھ جاؤ گی، جاؤ اپنا سامان لے کر آ جاؤ۔“
مجھے اس وقت انتہائی کوفت ہو رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا اس کم بخت کو وہیں چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔ زبردستی کا دھول گلے میں لٹکانا پڑ رہا تھا۔ رابعہ اپنا سامان لے کر آ گئی تھی۔ سامان کیا تھا۔ اس کے لئے سیدھے کپڑوں کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔

میں اسے رات کے سناٹے اور اندھیرے میں اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ صرف اس خیال سے کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ وہ بچی میرے ساتھ آتے ہوئے بہت بری طرح خوفزدہ تھی۔

میں اسے کوٹھری میں لے آیا۔ ”دیکھ، تو اب اسی کمرے میں رہے گی۔ یہاں سے باہر نہیں نکلے گی۔ یہ کمرے کے برابر میں واش روم ہے۔ تو خاموشی سے جائے گی اور واپس آ جائے گی۔ تجھے کسی کو اپنا چہرہ نہیں دکھانا ہے۔“

وہ لرزتی اور کانپتی رہی۔ مجھے اس پر غصہ آنے لگا تھا۔ میرے لیے وہ مصیبت بن کر آ گئی تھی۔ اب اس کے لیے کھانے وغیرہ کا بندوبست بھی کرنا تھا۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرے دوستوں یا محلے والوں کی نگاہوں میں آئے۔ اس میں میری سبکی تھی اور میں یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

پھر یہ میرا معمول بن گیا۔ میں اسے کوٹھری میں بند کر کے اپنی ڈیوٹی پر جایا کرتا۔ وہ کبھی کبھی جب گھبرا کر رونے لگتی تو میں اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اس کی آواز بند کر دیتا۔

میں اس کے لیے کھانا اور ناشتا باہر سے لایا کرتا تھا۔ میں نے اس کم بخت کے خوف سے اپنے دوستوں کو گھر میں بلانا چھوڑ دیا تھا۔ منع کر دیا تھا کہ وہ میرے پاس نہ آیا کریں۔ میں رات گئے جب واپس آتا تو اس کی کوٹھری میں اندھیرا ہوتا اور وہ پلنگ پر لیٹی رہتی یا دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی ہوتی ملتی۔

میں اس کے رونے کی آوازیں بھی سنا کرتا تھا۔ لیکن مجھے اس کے رونے دھونے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بڑے خوف سے وہ صرف سسکیاں لیتی رہتی تھی۔

ایک رات میں گھر واپس آیا تو اس نے مجھ سے کہا۔ ”بابا، مجھے باہر جانے دو۔“

”وہ کیوں؟“
”میں بھی کھیلوں گی۔“

نہیں تھا۔
دیکھتے دیکھتے پانچ برس گزر گئے۔
پانچ برس کم نہیں ہوتے۔ بہت کچھ تبدیل ہو چکا ہے۔ بچی پانچ برس کی ہو گئی ہوگی۔ لیکن مجھے تو اس سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔ چاہے وہ کچھ بھی ہو، کیسی بھی ہو۔
میں تو جیسے اسے بھول ہی گیا تھا۔ یاد ہی نہیں رہا تھا کہ میری کوئی بیٹی بھی ہے۔ ایک دن اچانک خالہ نے سب سے پیغام ملا کہ میں ان سے فوراً آ کر ملوں۔

پانچ سال میں یہ پہلا موقع تھا کہ خالہ نے یاد کیا تھا۔ میں وہاں جانا نہیں چاہتا تھا لیکن جانا پڑا۔ خالہ نے سب سے انتظار ہی میں بیٹھی تھیں۔ ”بیٹا امجد، اب تم اپنی امانت کو میرے پاس سے لے جاؤ۔“
”وہ کیوں؟“

”اس لیے کہ ایک تو مجھے اپنی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ میں عمرے پر جاری ہوں۔ تیرے خالو مرحوم کے بچنے کے ساتھ۔“

”خالہ، میں اسے لے جا کر کیا کروں گا۔ تم اسے کسی کے حوالے کر دو۔ دے دو کسی کو۔ یتیم خانے میں ڈال دو۔“
”خدا جانے کیسا پتھر دل ہے تیرا۔ اتنی پیاری بیٹی کو اس طرح ٹھکرا رہا ہے۔“

”کچھ بھی ہو خالہ، میں اسے لے جا کر اپنی گردن نہیں جھکا سکتا۔“
اس دوران وہ بچی کمرے سے نکل کر آنگن میں آ گئی تھی۔ ”رابعہ بیٹا، یہ تمہارے ابو ہیں۔“ خالہ نے میری طرف اشارہ کر کے بتایا۔ ”ان کو سلام کر دو۔“
”سلام ابو۔“

میں نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ میں کسی بھی صورت اس کے لیے موم ہونے کو تیار نہیں تھا۔ وہ بچی خاموش رہ گئی تھی۔

خالہ نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”امجد، میرا دل نہیں چاہ رہا کہ میں تجھ جیسے پتھر دل انسان کے حوالے اپنے اس معصوم فرشتہ کو کر دوں، لیکن کیا کروں، مجبور ہو کر رہ گئی ہوں۔“ پھر انہوں نے بچی کی طرف دیکھا۔ ”رابعہ بیٹا، اب تم اپنے ابو کے ساتھ ہی رہو گی۔“

”دادی مجھے تو آپ کے ساتھ رہنا ہے۔“
”نہیں بیٹا۔“ خالہ نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ شاید ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ ”تم اپنے ابو کے

کو جنم دیتے ہی مر گئی۔ پتا نہیں یہ کم بخت کیوں زندہ رہ گئی۔“
”ارے ایسا نہیں بولتے بے وقوف۔“
”خالہ، تم بتاؤ، کیا کروں اس کا، کیا اچار ڈالوں؟“
”دیکھو، بچیاں خدا کی نعمت اور رحمت ہوتی ہیں۔“
خالہ نے کہا۔ ”تو تو شروع سے بیٹی کے خلاف تھا۔“
”ہاں خالہ، اور یہ بھی دیکھو کہ پیدا بھی بچی ہوئی۔ مجھے تو صغرا کی موت سے زیادہ اس کے پیدا ہونے کا افسوس ہو رہا ہے۔“

”خدا سے ڈرا امجد، ایسی باتیں نہیں کرتے۔“
”اچھا خالہ! میں تو اس کی پرورش نہیں کر سکتا۔ تمہیں ہر مہینے تین ہزار روپے دیے دیا کروں گا، تم ہی اس کی پرورش کرنا۔“
”ہاں، ہاں کیوں نہیں۔ میں تو سینے سے لگا کر رکھوں گی اس کو۔“

میں نے اپنی جیب سے تین ہزار نکال کر خالہ کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ ”یہ لو خالہ، اس مہینے کے لیے۔“
”امجد، اگر میرے حالات صحیح ہوتے تو میں اس فرشتے کی پرورش کا ایک پیسا بھی نہیں لیتی۔“

میں اپنا۔۔۔ بوجھ اتار کر اس گھر سے باہر آ گیا۔ اب وہ پرورش پائے یا نہ پائے۔ خالہ اسے رکھیں یا نہ رکھیں۔ کسی کو دے دیں۔ مجھے اب اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ میرا اس سے کوئی واسطہ ہی کہاں تھا۔ میں تو خواہ مخواہ اس بد بخت کا باپ بن گیا تھا۔

اپنے محلے میں بیٹھا تو محلے والوں اور دوستوں نے گھیر لیا۔ وہ سب صورت حال معلوم کرنے کے لیے بے چین ہو رہے تھے۔ میں نے بہت ہی دھکی لہجے میں بتایا۔ ”میری بیوی تو ڈلیوری کے ایک گھنٹے بعد ہی مر گئی تھی اور بچہ تین گھنٹوں بعد اللہ کو پیارا ہو گیا۔“

میں نے اس وقت بھی انہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ میرے یہاں بیٹی پیدا ہوئی تھی۔

بہر حال وہ سب بہت دیر تک افسوس کرتے رہے تھے۔ اس کے بعد زندگی معمول پر آ گئی۔ میں ہر مہینے خالہ نے سب کو پیسے بھیجتا رہا تھا۔ خود کبھی نہیں گیا۔ صرف اس لیے کہ ایسا نہ ہو کہ اس کی صورت دیکھنی پڑ جائے۔ اس دوران کئی لوگوں اور محلے والوں نے مجھ سے کہا بھی کہ میں دوسری شادی کر لوں۔ لیکن میرا دل ہی نہیں مانتا تھا۔ سچ یہ ہے کہ میں دوسری بار بیٹی کی پیدائش کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار



جرم

ڈیٹر ایڈیٹر!
السلام علیکم

انسان کی زندگی میں ایسے بے شمار واقعات رونما ہوتے ہیں جن پر ایک اچھی فلم بن سکتی ہے ایسا ہی ایک واقعہ میرے ساتھ رونما ہوا، یہ واقعہ ایسا ہے جسے میں جتنا ذہن سے جھٹکتا ہوں وہ اسی قدر چمٹ جاتا ہے۔ رہ رہ کر میرے مظلوم دوست کا چہرہ نظروں کے سامنے آ جاتا ہے۔ آج وہ دوست بہت شدت سے یاد آ رہا ہے اسی لیے اس واقعہ کو قلمبند کر رہا ہوں۔ اگر سرگزشت کے معیار کا ہو تو شامل اشاعت کریں۔

خورشید عالم
(گجرات)

میں اُن دنوں لاہور کے گورنمنٹ کالج میں پڑھتا تھا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب تعلیم کو بزنس انڈسٹری کا درجہ حاصل نہیں ہوا تھا اور اسکولوں، کالجوں میں واقعی طلباء کو تعلیم دی جاتی تھی۔

گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لینا تو گویا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ وہاں پنجاب کے دور دراز علاقوں سے طلبہ تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔ میرا تعلق گجرات کے ایک کاروباری گھرانے سے

”کیا پاگل ہو گئے ہو۔ اتنی پیاری بچی کے صرف دس ہزار، پچاس ہزار لوں گا۔“
بہر حال کافی بحث کے بعد تیس ہزار میں بات طے ہو گئی تھی۔ ”اب تم ایسا کرو، میدان والے درخت کے پاس پہنچو، میں بچی کو لے کر آ رہا ہوں، لیکن رقم تیار رکھنا۔“
”اس کی فکر مت کرو، اتنے پیسے تو ہر وقت جیب میں ہوتے ہیں۔“
”ایک گھنٹے کے بعد پہنچ جانا۔“

میں جب گھر پہنچا تو خاصا اندھیرا ہو چکا تھا۔ اسی اندھیرے میں مجھے اس لڑکی کو نکال کر دلبر کے پاس لے جانا تھا۔ میں نے کوٹھری کا دروازہ کھولا اور اچانک کسی چڑ سے ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ میرا سر پلنگ کے پائے سے ٹکرا کر پھٹ گیا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے کچھ پتا نہیں چل سکا تھا۔

پھر راجہ نے کمرے کا بلب جلا دیا۔ وہ میرے چہرے کو خون میں رنگا ہوا دیکھ کر بری طرح رونے لگی۔ اس نے میرا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ وہ روتی جا رہی تھی اور اپنی ہتھیلیوں سے میرا خون صاف کر رہی تھی۔ ”بابا، تمہیں چوٹ لگی ہے، بابا بہت چوٹ لگی ہے نا۔“
اور اس وقت میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے اپنا کانٹا ہوا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔

اس واقعے کو برسوں گزر چکے ہیں، میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ اور ابھی ابھی ایک پیاری سی بچی میرے پاس سے اٹھ کر گئی ہے۔ وہ میری نواسی ہے، یعنی راجہ کی بیٹی۔ جی ہاں، اس حادثے نے میرے اندر کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ مجھے احساس ہوا کہ بیٹی اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے۔ میری راجہ کے آنسو میرے دل پر گر رہے تھے۔ ہم دونوں باپ بیٹی ایک دوسرے سے لپٹ کر نہ جانے کتنی دیر تک روتے رہے تھے۔

پھر سب ہی کچھ بدل گیا تھا۔ راجہ میرے لیے سب کچھ ہو گئی تھی۔ وہ میری جان تھی، میری زندگی تھی، میں اسے لے کر دوسرے محلے میں آ گیا۔ میں نے اسے تعلیم دلوائی، اس کی شادی کرائی۔ اور اب وہ دو بچوں کی ماں ہے۔ وہ ہفتے میں کئی بار میرے پاس آ جاتی ہے اور مجھے اس سے اور اس کے بچوں سے پیار کر کے اور آنسو بہا کر اظہارِ محبت کا موقع مل جاتا ہے۔

☹

میں اس کے لیے کیا کروں۔
ایک شام میں گلو کے ہوٹل میں بیٹھا ہوا یہی سب سوچ رہا تھا کہ مجھے دلبر دکھائی دے گیا وہ بہت دنوں کے بعد دکھائی دیا تھا۔
وہ عورتوں اور لڑکیوں کا پوپا رہا تھا۔ ان کے سودے کیا کرتا تھا۔ یہ بات مجھے معلوم تھی کہ اس کا دھندا کیا ہے۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آ گیا۔ ”کیا حال ہے دلبر بادشاہ؟“ میں نے پوچھا۔
مجھے دیکھ کر وہ چونک گیا تھا۔ ”ارے امجد بھائی، بیٹھو، بیٹھ جاؤ۔“

میں اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”ہاں بھائی، کہاں رہے اتنے دنوں تک؟“
”میں دو سال کے لیے دہلی چلا گیا تھا۔“
”دہلی گئے تھے یا اندر ہو گئے تھے۔“
”یار امجد بھائی، اب تم سے کیا چھپانا۔“ وہ ہنس دیا۔ ”ہاں کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔“
”کیوں، کیا غلط ہاتھ پڑ گیا تھا۔“
”ہاں یار، عین وقت پر گڑ بڑ ہو گئی تھی۔“
”آج کل کیا کر رہے ہو؟“
”یار، تم تو اس طرح پوچھ رہے ہو جیسے پولیس میں نوکری کر رہی ہے۔“

”میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ میرے پاس تمہارے لیے ایک سودا ہے۔“ میں دھیرے سے بولا۔
”نہیں بھائی، میں اب خطرے والا کوئی کام نہیں کروں گا۔“

”ارے کوئی خطرہ نہیں۔ صاف ستھرا معاملہ ہے۔“
میں نے بتایا۔ ”چھ سال کی بچی ہے۔ بہت پیاری، بہت پیسے مل جائیں گے اُس کے۔“

”اور اس کے ماں باپ۔“
”کوئی بھی نہیں ہے۔ اس لیے تو اتنے دھڑلے سے سودے کی بات کر رہا ہوں۔“
”کوئی گڑ بڑ تو نہیں ہوگی۔“

”اس کی گارنٹی میں دیتا ہوں۔ کوئی گڑ بڑ نہیں ہوگی۔“ میں نے اسے یقین دلایا۔ ”لیکن تم میری بات کرو، مجھے کیا ملے گا۔“

”دیکھو بھائی، آج کل اس دھندے میں بہت خطرے ہیں۔ اس لیے تمہیں دس ہزار سے زیادہ نہیں دے سکتا۔“

ہے۔ گجرات میں بھی کالج موجود ہیں لیکن میری خواہش تھی کہ مجھے گورنمنٹ کالج لاہور میں ہی پڑھنے کا موقع ملے۔ میٹرک میں میری فرسٹ ڈویژن آگئی تو پھر تو وہاں داخلہ نہ ملنے کا کوئی جواز ہی نہ رہا۔ اس دور میں فرسٹ ڈویژن آنا بھی کھیل نہیں تھا۔ ان دنوں تو جس کی سیکنڈ ڈویژن بھی آتی تھی، لوگ اسے بھی رشک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

میں ہوسٹل پہنچا تو مجھے کمرانمبر ایک سو چودہ میں بھیج دیا گیا۔ اس زمانے میں ہوسٹل کے ہر کمرے میں چار چار طالب علم مقیم ہوتے تھے۔ ہوسٹل کے کمرے خاصے کشادہ تھے۔ طالب علموں کے سنگل بیڈ بلکہ اس دور میں تو بیڈ کی بجائے لوہے کے پلنگ ہوا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی میز تھی۔ پھر بڑی سی ایک الماری، ہر لڑکے کے پاس اپنا سامان ہوتا تھا، ہم اپنے جوتے وغیرہ پلنگ کے نیچے رکھتے تھے۔

میں کمرے میں داخل ہوا تو وہاں گھسے ہوئے جسم اور مضبوط ہاتھ پیروں کا ایک لڑکا پہلے سے موجود تھا۔ وہ اپنا سامان سیٹ کر رہا تھا۔

اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور بولا۔ ”السلام علیکم! میرا نام خالد ہے اور میں نے اس کالج میں ایڈمیشن لیا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا مضبوط ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔

”وعلیک السلام!“ میں نے جواب دیا۔ ”میرا نام خورشید ہے اور میں نے بھی یہاں داخلہ لیا ہے۔“

اس نے مجھ سے کہا۔ ”آپ فکر مت کریں، میرا سامان تو سیٹ ہو ہی چکا ہے، میں آپ کا سامان بھی سیٹ کر لوں گا۔ جب تک آپ ہاتھ منہ دھو کر تازہ دم ہو جائیں، لمبا سفر کر کے آئے ہیں۔“

”او بھائی، میں نے کوئی لمبا سفر نہیں کیا ہے۔ میں گجرات سے آیا ہوں اور مجھے بالکل بھی تھکن نہیں ہے اس لیے آپ زحمت نہ کریں۔“

خالد نے میری ایک نہ سنی اور میرا تمام سامان سیٹ کر دیا۔

وہ جتنا اوپر سے کالا سیاہ تھا، اس کا دل اندر سے اتنا ہی اجلا تھا۔

ابھی اہم فارغ ہو کر بیٹھے ہی تھے کہ ایک ساتھ دو لڑکے داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک کا نام سہیل تھا اور

دوسرے کا ریاض! وہ دونوں ہی مجھے بہت پسند آئے۔ ہم سب نے مل کر ان کا سامان بھی قرینے سے رکھ دیا۔ پھر خالد کی خواہش پر ہم لوگ چائے پینے کے لیے ہوسٹل کے باہر چلے گئے۔

میں لاہور اس سے پہلے بھی کئی دفعہ آچکا تھا لیکن میرے تینوں ساتھی پہلی دفعہ لاہور آئے تھے اور ہر چیز پر تجسس نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

خالد ملتان کے ایک پھولے سے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ سہیل دیپالپور کے قریب کسی گاؤں پر رہنے والا تھا اور ان کی اچھی خاصی زمین تھی۔ آپ اسے چھوٹا موٹا جاگیردار کہہ سکتے ہیں۔ ریاض بھی خاصے بڑے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ گویا ان لوگوں میں صرف میں ہی تھا جو کاروباری گھرانے سے تعلق رکھتا تھا ورنہ وہ تینوں زمیندار تھے۔ ان کے انداز بھی زمینداروں والے تھے۔ سہیل کے والد نے تو اس کے ساتھ ایک ملازم رکھنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن کالج انتظامیہ نے اسے مسترد کر دیا اور کہا کہ ملازم رکھنے کا اتنا ہی شوق ہے تو اپنے بیٹے کو لاہور میں ہی مکان دلادیں۔

وہ لوگ سہیل کو شاید کوئی مکان دلا بھی دیتے لیکن سہیل راضی نہیں ہوا کہ وہاں تو میں بالکل اکیلا ہو جاؤں گا۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔ میں بغیر ملازم کے ہی گزارہ کر لوں گا۔

ایک سال گزرتے گزرتے ہم لوگ آپس میں بہت گہرے دوست بن چکے تھے۔

ہم چاروں ایک دوسرے کی خوبیوں اور خامیوں سے بھی اچھی طرح واقف ہو گئے تھے۔

سہیل کے انداز میں جاگیرداروں والی نخوت تھی۔ وہ ہمارے ساتھ تو کبھی وہ رویہ نہیں اپناتا تھا لیکن اس کے ساتھ باہر جاتے ہوئے مجھے ہمیشہ یہ دھڑکاہٹ لگا رہتا تھا کہ کب اس کی جاگیردارانہ ذہنیت جاگ اٹھے اور وہ ہمارے لیے اور خود اپنے لیے کوئی مسئلہ کھڑا کر دے۔ اس نے کسی نہ کسی طرح ضد کر کے اپنے ابا جی کی گاڑی منگوالی تھی۔ چھٹی والے دن ہم سب اس کی گاڑی میں بیٹھ کر لاہور اور اس کے نواح کی سیر کرتے۔

سہیل کو قیمتی کپڑوں اور جوتوں کا بھی جنون کی حد تک شوق تھا۔ اس کی الماری کپڑوں کے لیے کم پڑتی تھی۔ خالد نے رضا کارانہ طور پر اسے اپنی الماری بھی دے دی تھی۔

اس کے چند جوڑے تو میری الماری میں بھی آگئے تھے۔ ریاض بھی زمیندار تھا لیکن وہ سہیل کی طرح نفاست پسند اور اکڑنوں والا بندہ نہیں تھا۔ وہ دوسروں کے ذاتی معاملات میں بہت کم دخل دیتا تھا۔ سہیل کی طرح وہ بھی کھلے ہاتھ سے خرچ کرنے کا عادی تھا۔

اسی طرح خالد بھی ایک زمیندار گھرانے کا فرد تھا۔ کھلے ہاتھوں سے وہ بھی خرچ کرتا تھا لیکن لباس کے معاملے میں وہ سہیل اور میری طرح نہیں تھا۔

میں چونکہ بچپن سے گجرات میں رہا تھا۔ گجرات بھی اچھا خاصا شہر ہے، پھر اکثر لاہور بھی آتا رہتا تھا اس لیے وہ سب مجھے شہری بابو کہتے تھے۔ اس دور میں کالج کے طلباء بھی تھری پیس سوٹ پہنتے تھے اور آج کل کی طرح سولہ سترہ سیال کے نہیں ہوتے تھے بلکہ ان کی عمر بھی خاصی زیادہ ہوتی تھی۔ خاص طور پر ہوسٹل میں رہنے والے تو دور دراز علاقوں سے آتے تھے اور وہ پڑھنا بھی دیر میں شروع کرتے تھے۔

اپنے گروپ میں سب سے کم عمر میں تھا۔

خالد دل کا تو بہت اچھا تھا۔ بس اس کا رنگ کالا سیاہ تھا لیکن اس رنگت کی وجہ سے وہ کسی احساس کمتری میں مبتلا نہیں تھا۔ اس میں ایک اور بہت بڑی برائی تھی۔ لڑکیوں کے معاملے میں وہ بہت ندیدہ تھا۔ جہاں کوئی لڑکی دیکھی اور اس کی رال ٹپکی۔ اس نے اپنی کالی رنگت کے باوجود اس ایک سال کے عرصے میں دو عشق بھی کر لیے تھے اور ان لڑکیوں سے راتوں کو ملتا بھی رہتا تھا۔

ہم اسے ٹوکتے تو وہ کہتا ”یار، مجھے کیا ان لڑکیوں سے شادی کرنا ہے۔ میں تو ناٹم پاس کر رہا ہوں۔“

”یہ بہت بری بات ہے خالد!“ سہیل نے کہا۔ ”تم شریف لڑکیوں کو بر باد کر رہے ہو۔“

اس کی بات سن کر خالد ہنسا اور بولا۔ ”اوپار کہاں کی شرافت! وہ لڑکیاں تو پہلے ہی سے دود، تین تین محبوب بھگتا چکی ہیں۔“

ہم لوگ بھی خاموش ہو جاتے۔ یہ اس کا ذاتی فعل تھا۔ ہم اسے جتنا سمجھا سکتے تھے، سمجھا چکے تھے۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ اپنے شوق کی تکمیل کے لیے اس نے بازار حسن کار رخ نہیں کیا ورنہ لاہور کی ہیرا منڈی تو پورے برصغیر میں مشہور ہے۔

میں مذاق میں اسے ”اسپ تازی“ کہا کرتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ صنف تازک کے معاملے میں وہ کسی گھوڑے

ہی کی طرح دیوانہ ہو جاتا تھا۔

پھر اسپ تازی سے اس کا نام ”کالا گھوڑا“ پڑ گیا اور یہ نام ایسا فٹ ہوا کہ نہ صرف ہم بلکہ کلاس کے دوسرے لوگ بھی اسے گھوڑا کہہ کر پکارنے لگے۔ وہ کبھی برا نہیں مانتا تھا۔ ہم لوگ سیکنڈ ایئر میں آئے تو سب سے کم نمبر گھوڑے کے تھے اور سب سے زیادہ نمبر میرے۔ ہم سب نے وعدہ کیا کہ اس سال خوب دل لگا کر پڑھائی کریں گے، پھر واقعی ہم نے پڑھائی شروع کر دی۔

دو تین ماہ ہمیں اسی طرح پڑھتے ہوئے گزرے۔ اب گھوڑے نے بھی اپنی محبوباؤں سے قطع تعلق کر لیا تھا یا پھر ان کی طرف سے قطع تعلق کر لیا گیا تھا۔ غرض یہ کہ وہ بھی اب راتوں کو غائب نہیں رہتا تھا۔

ایک دن اچانک سہیل کے گھر سے تار آیا کہ فوراً گاؤں پہنچو۔

سہیل سمیت ہم سب پریشان بلکہ حواس باختہ ہو گئے۔ ان دنوں میں ”تار“ کا استعمال بدشگونی بلکہ کسی بری خبر کی آمد سمجھا جاتا تھا۔ پھر سہیل سے فوری طور پر گاؤں پہنچنے کو کہا گیا۔

میں نے اسے پیش کش کی کہ میں اس کے ساتھ چلتا ہوں بلکہ ہم تینوں نے اسے یہ پیشکش کی لیکن سہیل نے انکار کر دیا اور اپنی گاڑی کے ذریعے اکیلا ہی روانہ ہو گیا۔

اگلے چار پانچ دن تک ہم سب پریشان رہے اور گویا سولی پر لٹکے رہے۔

پانچویں دن سہیل کا خط ملا۔

معلوم ہوا کہ سب خیریت ہے بلکہ تم لوگوں کے لیے ایک خوش خبری ہے۔ میری شادی ہو رہی ہے۔ ابا جی نے مجھے اسی لیے گاؤں بلایا ہے۔ ہاں تم تینوں کو بھی ہر قیمت پر شادی میں شریک ہونا ہے ورنہ سمجھ لینا کہ تم میں سے جو بھی شریک نہ ہوا اس سے ہمیشہ کے لیے میرا تعلق ختم ہو جائے گا۔ دو تین دن میں کالج میں سر دیوں کی چھٹیاں ہو رہی ہیں۔ تم لوگوں کے پاس اب شریک نہ ہونے کا کوئی بہانہ بھی نہیں ہے۔ میری شادی سے دو چار دن پہلے گاؤں پہنچ جانا تاکہ ہم لوگ ذرا انجوائے کریں، ذرا ہلا گلا کریں، فقط، تمہارا دوست سہیل۔

ہمیں تو یہ بھی حیرت تھی کہ سہیل کی ابھی سے شادی ہو رہی ہے۔ پھر اس پر رشک بھی آ رہا تھا کہ وہ بہت جلد دوا بن جائے گا۔ اس دور میں شادی کے تصور ہی سے بدن

میں گدگدی ہونے لگتی تھی۔

ہم تینوں نے فوری وہاں جانے کا پروگرام بنالیا۔ ریاض اور خالد گھوڑے کے گاؤں تو وہاں سے دور تھے۔ میں انہیں اپنے ساتھ لے کر کچھ دن کے لیے گجرات آگیا۔ وہاں میں نے اپنے دوستوں کو گجرات گھمایا، خاص طور پر اپنے چنگھوں کے کارخانے دکھائے کہ وہاں کیسے کام ہوتا ہے۔

ریاض مذاق میں بولا۔ ”یار! مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا۔ اب تجھے ہم سب کو ایک ایک پنکھا فری دینا ہوگا۔“

اس وقت میرے ابا جی بھی موجود تھے۔ وہ ہنس کر بولے ”پتر، تم لوگ اپنے گھروں کے پتے لکھو، وہاں کے مقامی ایجنٹوں سے کہہ دوں گا کہ وہ پتے تمہارے گھروں پر پہنچا دیں گے۔“

ریاض نے کہا ”چا چا جی، میں نے تو مذاق کیا تھا لیکن ابا جی نہ مانے اور انہوں نے ریاض اور خالد کے گھر کے پتے لے ہی لیے۔

ہم سہیل کے گاؤں پہنچے تو اس نے ہمارے استقبال کیا جیسے اس کے گاؤں میں کوئی وزیر یا حکومت کا کوئی اعلیٰ افسر آیا ہو۔

اس کی وسیع و عریض حویلی، نوکروں کی فوج ظفر موج، گاڑیاں اور گھوڑے دیکھ کر ہم مزید مرعوب ہو گئے۔ ابھی شادی میں چار دن باقی تھے اور حویلی ابھی سے بقول نور بنی ہوئی تھی۔ اس نے ہم سب کے لیے الگ الگ کمروں کا بندوبست کیا تھا لیکن میں نے اور ریاض نے اس پر احتجاج کیا کہ الگ الگ رہ کر ہم کیا انجوائے کریں گے۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ ہم چاروں ہوٹل کے کمروں کی طرح ایک ساتھ رہ کر لطف اندوز ہوں۔

سہیل کی سمجھ میں بھی یہ بات آگئی۔ اس نے حویلی کی دوسری منزل پر ایک ہال کمرے میں چار بہترین قسم کی مسہریاں ڈلوادیں۔ فرش پر دبیز قالین تھا۔ باقی حصے میں اس نے کٹن اور گدیاں رکھ کر فرش نشست بنادی۔

سردی عروج پر تھی۔ ہم لوگ رات کو دیر تک جاگتے رہتے اور کئی مذاق کرتے رہتے۔ اس کے ساتھ ہی ڈرائی فروٹ کے ڈھیر ہمارے سامنے لگے رہتے، ہم پتے، بادام، اخروٹ اور مونگ پھلی سے بھی پورا پورا انصاف کرتے۔

اس کے دونوں کمرے ہمارے لیے چائے اور کافی بنانے پر مامور تھے۔ اس کے والد نے ہمارے لیے

خاص طور پر کافی منگوائی تھی کہ شہری منڈے ہیں چائے اور کافی ضرور پیتے ہوں گے البتہ صبح ناشتے میں کسی ضرور پلائی جاتی۔

شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ لیکن خالد گھوڑا اکیلا ہی گاؤں کی سیر کو نکل گیا جب وہ کافی دیر تک واپس نہ آیا تو ہمیں فکر ہوئی۔

میں نے سہیل سے کہا۔ ”یار ابھی تک اس گھوڑے کا کچھ پتا نہیں۔۔۔۔۔ نہ جانے وہ کہاں گیا؟“

سہیل مسکرا کر بولا ”فکر مت کرو اس نے یہاں بھی کوئی لڑکی ڈھونڈ لی ہوگی۔ عیش کر رہا ہوگا۔“

”یار، کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔“ ریاض نے کہا ”اگر گھوڑے نے یہاں بھی وہی حرکت کر دی تو کیا ہوگا۔ گاؤں کے لوگ تو اپنی لڑکیوں کی عزت کے معاملے میں بہت حساس ہوتے ہیں۔ ذرا سی بات پر کلہاڑیاں اور ڈنڈے نکل آتے ہیں۔“

(اس دور میں جدید اسلحے کا اتنا رواج نہیں تھا)

سہیل نے منہ بنا کر کہا۔ ”وہ چوہدری ثار احمد خان کا مہمان ہے۔“ سہیل کے والد کا نام ثار احمد تھا۔ ”کسی کی جرات ہے کہ وہ خالد کو میزبانی نظر سے دیکھے۔ اسے میں نے گاؤں ہی کے ایک آدمی کے ساتھ بھیجا ہے۔ تم فکر مت کرو۔ وہ ابھی تھوڑی دیر میں آجائے گا۔

اور واقعی خالد گھوڑا تھوڑی دیر بعد واپس آگیا۔ وہ بہت نڈھال اور تھکا تھکا سا نظر آ رہا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ”کیا ہوا گھوڑے، خیریت تو ہے۔ تو گھنٹوں سے کہاں غائب تھا اور کیا وہاں سے پیدل آیا ہے جو آتے ہی یوں پڑ گیا؟“

”یار، سہیل کا گاؤں تو بہت ہرا بھرا ہے، دل چاہ رہا ہے کہ میں ہمیشہ کے لیے یہیں رہ جاؤں، پھر پیار کی بہاریں، توبہ! کیا زبردست لڑکیاں تھیں۔“

”شکر خورے کو ہر جگہ شکر مل جاتی ہے۔“ ریاض نے ہنس کر کہا۔ ”لگتا ہے کہ صبح سے عشق ہی کر رہا تھا، ان ٹیاریوں نے تجھے کچھ کھلایا یا بھی ہے یا نہیں؟“

”کھانے پینے کا موقع ہی کہاں ملا؟“ گھوڑے نے بہت مسکین سی شکل بنا کر کہا۔

اس کی بات پر سہیل سمیت ہم سب کے قہقہے نکل گئے۔

سہیل نے فوراً اپنے ایک ملازم سے کہہ کر

گھوڑے کے لیے کھانے کا بندوبست کرادیا۔ گھوڑا تازہ دم ہونے کے لیے نہانے چلا گیا۔ وہ نہبا دھو کر آیا تو کھانے پر ٹوٹ پڑا۔

رات کو جب ہماری محفل جمی تو میں نے باتوں باتوں میں سہیل سے پوچھا۔ ”سہیل ایک بات بتا! اگر کوئی لڑکی اور لڑکا یہاں رینگے ہاتھوں پکڑے۔ جائیں تو گاؤں والے اس کا کیا حشر کرتے ہیں؟“

”دونوں کو وہیں مار دیتے ہیں۔“ سہیل نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اگر لڑکی یا لڑکے میں سے کوئی بچ کر نکل جائے تو اسے تلاش کرتے رہتے ہیں، چاہے اس میں کئی ماہ لگیں یا کئی سال، پھر وہ اسے مار کے ہی دم لیتے ہیں۔“

ہماری باتیں سن کر گھوڑے کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ بہت سکون سے بادام اور پتے چبا رہا تھا، اس کا منہ چلنا ہی بند ہو گیا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سہیل کو دیکھنے لگا۔

اس کی حالت کو ہم تینوں ہی نے محسوس کر لیا اور ہم بے تحاشا ہنسنے لگے۔

سہیل نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”او گھوڑے تو نے چار اکیوں چھوڑ دیا۔ یہ ان لوگوں کے لیے ہے جو پکڑے جائیں۔ تو پکڑا گیا ہے؟“

اس کی بات سن کر خالد کے چہرے پر رونق آ گئی۔

برات جانے میں ابھی دو دن باقی تھے۔ ہم لوگ سہیل کی جیب میں شکار کے لیے نکل گئے۔ میرے علاوہ ان سب کا نشانہ بہترین تھا۔ وہ زمیندار گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے اس لیے بچپن سے شکار کھیلتے آئے تھے۔ مجھے کبھی رائفل یا پستول چلانے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ مجھے تو ان لوگوں کی طرح تیرنا تک نہیں آتا تھا۔ سہیل، ریاض اور گھوڑا تو نہر میں خوب مزے سے تیرتے تھے۔

ایک دن جب خالد نے صرف جانیہ پہن کر نہر میں چھلانگ لگائی تو سب نے پھبتی کسی۔ ”یار پانی پر کیوں ظلم کر رہا ہے، اتنا بہترین اور شفاف پانی ہے، تیرے جسم کی سیاہی سے کالا ہو جائے گا۔“

”تو فکر مت کر۔“ گھوڑے نے کہا۔ ”پانی کالا ہو یا نیلا، مجھے اس سے کیا غرض، ہاں، اگر تو تیرنے کا وعدہ کرے تو میں ابھی باہر آ جاتا ہوں۔“

اس کم بخت کو میری کمزوری کا علم تھا۔ ہاں، میں ان سے ایک بات میں بہت آگے تھا۔

ڈرائیونگ میں کوئی میرا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا! سہیل اور ریاض کی بات تو الگ ہے ان کے ڈرائیور تک میری ڈرائیونگ پر اشک کرتے تھے۔

ہم نے دو دن گھومنے پھرنے میں گزار دیے۔ گاؤں کی کھلی فضا اور خالص غذائیں، چار دن میں ہی میرا وزن بڑھ گیا تھا۔ ریاض کی رنگت بھی سرخ و سفید ہو گئی تھی۔ بس گھوڑا ہی ہنسا جس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

سہیل نے برات سے پہلے ہی لڑکی والوں کے گھر پیغام بھجوادیا تھا کہ میرے ساتھ میرے کچھ خاص دوست بھی ہیں۔ میں ان کے ساتھ رہوں گا اس لیے میرا بندوبست ان ہی لوگوں کے ساتھ ایک ہی کمرے میں کیا جائے۔

جس دن برات روانہ ہوئی اس دن سہیل کی جج دھج دیکھنے کے قابل تھی۔ سہیل کے والد چوہدری ثار احمد کا طرہ پہلے سے زیادہ اونچا اور کاف والا نظر آ رہا تھا۔

سہیل کی دادی نے اس گاڑی کے پہیوں پر سے بھی پیسے صدقہ کر کے خیرات کیے جس میں سہیل کو بیٹھنا تھا۔ پھر اس کے والد نے ہزاروں روپے کے نوٹ اور ریزگاری سہیل پر سے صدقہ کر کے نچھاور کر دی جو گاؤں کے کمیٹیوں نے لوٹ لی۔

لڑکی والوں کا گاؤں یہاں سے چھ، سات گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ ہاں اگر آج کی طرح یہاں پختہ سڑک ہوتی اور نہر پر پل ہوتا تو یہ مسافت دو گھنٹے میں طے ہو جاتی۔

راستے میں سہیل کی گاڑی کا ٹائر پچھڑ ہو گیا۔ اس کی دادی نے ٹوکا یہ تو بہت بدشگونی ہو گئی۔ ہم لوگ گاؤں سے باہر آ گئے۔ پیچھے والی گاڑی میں سہیل کے والد کے محافظ سوار تھے۔ وہ سب کلہاڑیوں، گنڈاسوں سے مسلح تھے۔ ایک دو کے ہاتھ میں مجھے تھری ناٹ تھری کی رائفلیں بھی نظر آ رہی تھیں۔

وہ سب ہم سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہو گئے۔ اسی وقت ایک خوب صورت سی مقامی لڑکی اپنی بکریاں ہانکتی ہوئی وہاں سے گزری۔

خالد گھوڑے نے آہستہ سے کہا۔ ”کیا آفت جوانی ہے؟“

اس کی بات کو سہیل نے بھی سن لیا۔ وہ آہستہ سے بولا۔ ”تو کہے تو اسے بھی ساتھ لے چلو؟“

”یہ ہمارے ساتھ کیسے جائے گی؟“ گھوڑے نے حیرت سے کہا۔

آلو: Potato

انسانی غذا کا ایک اہم جزو۔ زمین کے اندر ہوتا ہے۔ پودا چھوٹا، پتے چوڑے اور پھول سفید ہوتے ہیں۔ اس کی کاشت، سب سے پہلے میکسیکو اور پیرو میں ہوئی۔ وہاں سے ہسپانوی ملاح اسے یورپ لے گئے اور اب یہ تقریباً تمام دنیا میں کاشت کیا جاتا ہے۔

پیرو کے لوگ اسے بتاتا کہتے تھے۔ ہسپانیوں نے اسے پاتا کہا، جو انگریزی میں بگڑ کر پوٹیو ہو گیا لیکن ممبئی میں اسے بتاتا کہتے ہیں جو ہسپانوی سے ملتا جلتا نام ہے۔ اہل ہند نے اسے آلو کا نام دیا، کیونکہ اس کی شکل آلوچے اور آلو بخارے سے ملتی جلتی تھی۔

آلو ایک قوت بخش غذا ہے، اس میں 81 فیصد پانی، 16 فیصد نشاستہ اور باقی شکر، چکنائی، ایسڈ، حیاتین اور نمک ہوتے ہیں۔ گاجر اور مولیٰ کی طرح یہ جڑیلی سبزی نہیں ہے۔ یہ دراصل زمین کے اندر، پودے کی شاخ کا پھولا ہوا سرا ہوتا ہے، جسے بصلہ یا گنٹھا کہتے ہیں۔ سوائے بادی کے مریضوں کے، ہر عمر کے لوگوں کے لیے بہترین غذا ہے۔ جتنا کاربوہائیڈریٹ، لوہا اور حیاتین سی اس میں ہوتا ہے، سنگتروں کے سوا اور کسی پھل یا سبزی میں نہیں ہوتا۔

برصغیر پاک و ہند میں آلو کی کاشت سترھویں صدی عیسوی میں شروع ہوئی۔ پاکستان میں صوبہ سرحد، صوبہ سندھ اور پنجاب میں اچھے قسم کے آلوؤں کی کاشت ہوتی ہے۔ دنیا بھر میں آلو کی کوئی سات سو اقسام پائی جاتی ہیں۔ پاکستان میں آتش، ایف بی 3، 9003 ایف 13-9369 ڈایا منٹ، پٹرنس، ملٹا، سپینفا، کارڈنیل، ولجیا جوز نامی قسموں کے آلو کاشت کیے جاتے ہیں۔

مرسلہ: فہمیدہ نسرین ملتان

”تم تو یوں ہی مت۔“ میں نے پھر کر کہا۔ ”ورنہ میں تمہاری مرمت کروں گا۔ تم سہیل کے مہمان ہو، میرے نہیں ہو۔“

میرا غضب ناک لہجہ سن کر گھوڑا خاموش ہو گیا۔ ”تو واپس جائے گا کیسے؟“ ریاض نے پوچھا۔ ”یار، مجھے یہاں سے کوئی نہ کوئی سواری تو مل ہی جائے گی، کوئی بس، کوئی تیل گاڑی، کوئی ٹریکٹر، اگر وہ بھی نہ ملا تو میرے پیرو تو ہیں۔ واپس جانا کون سا مسئلہ ہے؟“ ”خورشید!“ سہیل نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تو نے میری بات کا اتنا برا منایا ہے؟“ ”میں نے نہیں بلکہ تو نے میری بات کا برا مانا ہے۔“ یہ کہہ کر میں مڑا، اور واپس جانے کے ارادے سے قدم بڑھائے۔

سہیل نے بھاگ کر مجھے پکڑ لیا اور بولا۔ ”خورشید! میں تجھ سے معافی مانگتا ہوں۔ مجھے اچانک غصہ آ گیا تھا۔ مجھے معاف کر دے یار!“

”میرا سوال اب بھی اپنی جگہ موجود ہے۔“ مجھے بھی کچھ ضدی ہو گئی تھی۔ جو شخص دوسروں کی بہو بیٹیوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح اٹھانے کی بات کر رہا تھا، وہ اپنے گھر کی لڑکیوں کے بارے میں کیا خیالات رکھتا ہے۔

”تو میرا جواب سننا ہی چاہتا ہے تو سن۔“ سہیل نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اگر ہمیں شبہ بھی ہو جائے تو ہم اس آدمی اور اپنے خاندان کی لڑکی کے ٹوٹے کر دیتے ہیں۔“ میں نے نرمی سے کہا۔ ”میں بھی تجھ سے یہی سننا چاہتا تھا۔ اسی طرح دوسروں کے جذبات بھی ہوں گے۔ غیرت تو دوسروں کی بھی ہوتی ہے۔“

”چل، اب غصہ تھوک دے۔“ سہیل نے کہا۔ ”اگر تو کہے تو میں تیرے پاؤں پکڑ لوں۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

میں نے اسے سینے سے لگالیا اور کہا۔ ”سہیل! پڑھ لکھ کر تو انسان میں شعور آتا ہے۔ مجھ سے وعدہ کر کہ آئندہ اس قسم کی جاہلوں والی کوئی بات نہیں کرے گا۔“

”اچھا یار، میں وعدہ کرتا ہوں، مردوں والا وعدہ۔“ اس نے میرے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ہم ریاض اور گھوڑے سے کچھ دور تھے۔ ہمیں ہنستا دیکھ کر وہ دونوں بھی ہنسنے لگے۔

سہیل ہنس کر بولا۔ ”یار، اب اس گھوڑے سے بھی کچھ

گاڑی میں ڈال لیں گے۔“ ”تمہارا دماغ خراب ہے؟“ میں نے پہلی دفعہ اسے غصے میں سہیل کو مخاطب کیا۔ ”کیا تم یہاں کے بادشاہ ہو یا تم پر کوئی قانون لاگو نہیں ہوتا جو تم یوں سرعام لڑکیاں اٹھانے کی بات کر رہے ہو۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تم نے پڑھ لکھ کر بھی عقل کو ڈبو دیا ہے۔ تمہارے بزرگ ساتھ ہیں اور تم کہہ رہے ہو کہ تمہارے آدمی ابھی ان لڑکیوں کو اٹھا کر گاڑی میں ڈال لیں گے۔ کیا تمہارے والد کو اس پر اعتراض نہیں ہوگا؟“

سہیل کے چہرے پر پہلے تو برہمی کے تاثرات نمودار ہوئے، پھر وہ آہستہ آہستہ نارمل ہو گیا اور بولا۔ ”خورشید بات اصل میں یہ ہے کہ ہم لوگ اپنے مہمان کے لیے اپنی جان تک دینے سے گریز نہیں کرتے۔“

”چاہے مہمان کسی کی عزت پر ہاتھ ڈال دے۔۔۔؟“ ریاض نے طنز یہ لہجہ میں کہا۔ ”مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم لوگ اب بھی دو سو سال پہلے کے زمانے میں رہ رہے ہو۔ یہ لڑکیاں ابھی کسی گھر کی عزت ہوں گی۔ وہ لوگ لاکھ کم زور سہی لیکن اپنی عزت پر جان لے نہیں سکیں گے تو جان دے تو سکتے ہیں۔“

”سہیل! میں ایک بات کہوں؟“ اگر تم برائے مانو تو؟“ ”کہو یار تم بھی کہو، تم بھی تو آخر مہمان ہو؟“ ”فرض کرو گھوڑے کو تمہارے گھرانے کی کوئی لڑکی پسند آ جائے، تو تم کیا کرو گے؟“

”خورشید!“ سہیل غضبناک ہو کر چیخا۔ ”تمہاری جرات کیسے ہوئی ایسی بات منہ سے نکالنے کی؟“

”بات تلخ ضرور ہے سہیل!“ میں نے کہا ”لیکن میں نے تم سے ایک سوال کیا اور تم آپے سے باہر ہو گئے۔ اگر میں نے سوال کر کے کوئی جرم کیا ہے تو ابھی اپنے آدمیوں سے کہو کہ وہ میرے ٹکڑے کر دیں۔ سچی بات تو کرو لگتی ہی ہے۔“ سہیل چند لمحوں تک مجھے گھورتا رہا۔

پھر ریاض نے کہا۔ ”چھوڑو یار، کیوں اچھا بھلا ماحول خراب کر رہے ہو۔ ہم سہیل کی شادی میں جا رہے ہیں اور تم۔۔۔“

”ہم نہیں، تم اور گھوڑا۔“ میں نے منہ بنا کر کہا۔ ”میں واپس جا رہا ہوں، کہاں تو یہ مہمانوں کے لیے اپنی جان دینے کی بات کر رہا تھا اور کہاں یہ مجھ پر یوں چلا رہا ہے جیسے میں اس کا ذاتی ملازم ہوں؟“ ”چھوڑو یار، اب غصہ تھوک دے۔“ گھوڑے نے کہا۔

”ہم ابھی تک اپنی ہی زمینوں پر ہیں۔“ سہیل نے فخر سے گردن اٹھا کر کہا۔ کس کی مجال ہے کہ چوہدری سہیل احمد خان کو انکار کر سکے۔“

”اوپس کر یار!“ ریاض نے کہا۔ ”یہ گھوڑا تو اپنے ساتھ ساتھ ہمیں بھی ذلیل کرائے گا۔ لڑکی والوں کے گھر پہنچ کر ان سے کیا کہو گے؟ یہ لڑکی ہم گھوڑے کا دل بہلانے کو لائے ہیں یا اس کی خدمت کرنے کو؟“

”یار تو میں کون سا اسے ساتھ لے کر جا رہا ہوں؟“

گھوڑے نے منہ بنا کر کہا۔ ”حقیقت یہ ہے کہ ریاض اگر نہ ٹوکتا تو گھوڑا، سہیل سے ضرور فرمائش کرتا کہ اس چرواہی کو بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ ویسے بھی گاؤں کی بہت سی عورتیں برات کے ساتھ تھیں۔ اس چرواہن پر کون دھیان دیتا۔“

ڈرائیوروں نے کار کا پیہر بدل دیا تھا، ہم لوگ گاڑی میں سوار ہو گئے اور گاڑی پھر روانہ ہو گئی۔

ہم لوگوں نے دوپہر کے کھانے کے لیے ایک جگہ قیام کیا، یہاں ہرا بھرا علاقہ تھا۔ گھاس کے فرش پر سہیل کے ملازموں نے قالین بچھا کر دسترخوان لگا دیا اور کھانا جن دیا گیا۔ میں حیران تھا کہ اتنا کھانا یہاں کیسے آیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ایک ٹرک میں کھانے کا سامان اور باورچی بھی ساتھ جا رہے ہیں۔

ہم لوگ کھانا کھا کر فارغ ہوئے اور ٹپلتے ہوئے کچھ دور چلے گئے۔ سہیل کھانے کے بعد سگریٹ پیتا تھا۔ وہ سگریٹ اپنے ابا جی اور دوسرے بزرگوں کے سامنے تو نہیں پی سکتا تھا۔

وہاں سے دو لڑکیاں گزریں ہمیں دیکھ کر دونوں ٹھٹھک گئیں۔ میں نے گھوڑے کی آنکھوں میں عجیب سی چمک دیکھی۔ ”سہیل کے گھوڑے؟“ ریاض نے جلدی سے کہا۔ ”یہ چوہدری سہیل احمد خان کی زمین نہیں ہے۔“

”ابے تو کیا اپنی آنکھیں بند کر لو؟“ گھوڑا چڑ کر بولا۔ ریاض کا جملہ شاید سہیل کی جاگیردارانہ ذہنیت پر کوڑا بن کر لگا۔ اسے لگا جیسے ریاض نے اس پر طنز کیا ہو۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے تو یہی لگ رہا تھا۔

سہیل بھاری آواز میں بولا۔ ”میں جانتا ہوں یہ کس کی زمین ہے۔“ اس نے کچھ توقف کیا اور بولا۔ ”یہ ایک چھوٹا سا زمیندار ہے۔ گھوڑے اگر تجھے ان میں سے کوئی لڑکی پسند ہے تو اشارہ کر۔ میرے آدمی ابھی اسے اٹھا کر

مت کہنا۔ وہ بے چارہ تو تیری ڈانٹ سے پہلے ہی ہم گیا ہے۔
اسے بھی معاف کر دے۔ وہ اپنی عادت سے مجبور ہے۔
اس نے یہ بات اتنے سنجیدہ انداز میں کہی کہ مجھے ہنسی آگئی۔

ہم لوگ دوبارہ روانہ ہوئے تو چراغ جلے دہن کی حویلی پہنچے۔

دہن والوں نے سہیل کی ہدایت کے مطابق ہمارے لیے حویلی کی دوسری منزل پر ایک خاص کمرے کا انتظام کیا تھا۔ کمرے میں بہترین مسہریاں تھیں۔ ایک طرف فرشی نشست پر گاؤں کی رکھے تھے، درمیان میں کونکوں کی انگلیٹھی دیک رہی تھی۔ اس دن سردی اچانک بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ کمرے میں نئے اور نرم ملائم کپڑے اور ریشمی رضائیاں بھی تھیں۔ ڈرائی فرسٹ کے تھال ہوتے رکھے تھے، چائے اور کافی کی ہدایت شاید سہیل کے والد نے دی تھی۔

ہم لوگ گرم گرم پانی سے نہا کر تازہ ہو گئے، پھر گرم گرم بھاپ اڑائی چائے اور شامی کبابوں نے لطف دو بالا کر دیا۔

دوسرے دن نکاح تھا، اس سے پہلے سہیل کے خاندان میں بہت رکیں رائج تھیں اس لیے سہیل ہم سے اجازت لے کر زنان خانے میں چلا گیا۔ وقت گزاری کے لیے ہم نے تاش کی گڈی نکال لی اور تاش کھیلنے لگے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم خشک میوے بھی ٹوٹک رہے تھے۔ وقفے وقفے سے ہم لوگ چائے اور کافی بھی پی رہے تھے۔

جب ہم کھیل کھیل کر اکتا گئے تو اٹھ کر اپنے بستر پر لیٹ گئے۔ دہن والوں کے ملازم وقفے وقفے سے انگلیٹھی میں کونکے ڈال دیتے تھے۔ کمر خوب گرم ہو رہا تھا، نرم ملائم بستر پر لیٹتے ہی مجھے نیند کے جھونکے آنے لگے، حالانکہ اس سے پہلے میں نے کم سے کم دو تین کپ چائے اور اتنی کافی پی لی تھی۔ سہیل ابھی تک غائب تھا، آخر وہ دوا تھا۔ وہ بے چارہ خواتین کے درمیان مختلف رسوم میں پھنسا ہوا تھا۔ آج کا دور ہوتا تو ہم بھی اس کے ساتھ ہوتے۔ ایسے میں گھوڑے کی تو گویا عید ہو جاتی۔

میں یہی سب کچھ سوچتے سوچتے نہ جانے کب سو گیا۔ اچانک سرد ہوا کا جھونکا آیا تو میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا اور ٹھنڈی ہوا مسلسل آرہی تھی۔ کمرے کے وسط میں رکھی ہوئی انگلیٹھی کے کونکے سرد پڑ چکے تھے۔ مجھے شدید پیشاب بھی آرہا تھا لیکن میں

نے سہیل سے یہ پوچھا ہی نہیں تھا کہ بیت الخلا کس طرف ہے؟ اس دور میں آج کی طرح انچ باتھ تو ہوتے نہیں تھے۔ میں نے ریاض کو آواز دی۔ ”ریاض!“ میں نے چند لمحوں تک اس کے جواب کا انتظار کیا لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ شاید بہت گہری نیند میں تھا۔ پھر میں نے گھوڑے کو آواز دی۔ ”گھوڑے... خالہ...“ لیکن جواب نہ دیا!

وہ دونوں یا تو بہت گہری نیند میں تھے یا پھر اپنے بستر میں تھے ہی نہیں۔ میں سگریٹ بھی نہیں پیتا تھا کہ پاچس ہی جلا کر کمرے کا جائزہ لے لیتا۔ سرد ہوا ہڈیوں میں صہی جا رہی تھی۔

دہن والوں کے ملازمین کا خیال آیا۔ وہ لوگ یقیناً برآمدے میں بستر لگائے سو رہے ہوں گے۔ میں نے زور سے آواز دی۔ ”کوئی ہے؟ باہر کوئی ہے؟“ میں نے اس مرتبہ قدرے بلند آواز میں پکارا لیکن میری آواز کا کسی نے جواب نہیں دیا۔

میں جھنجھلا کر خود ہی بستر سے اٹھا اور ٹٹولتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ میرا اندازہ تھا کہ دروازہ میری مسہری سے کچھ فاصلے پر دائیں جانب ہے۔

میں اندازے سے آگے بڑھا تو فرش پر پڑی ہوئی ایک رضائی میں الجھ کر گرتے گرتے بچا۔ اب میری نظریں اندھیرے سے کچھ کچھ مانوس ہو گئی تھیں لیکن اتنا گھپ اندھیرا کیوں تھا؟ کیا لائٹ چلی گئی تھی یا فیوز اڑ گیا تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ دروازے کی طرف جانے کی بجائے ریاض یا گھوڑے کو اٹھاؤں۔ میں پھر پلٹا۔ ریاض کی مسہری میری مسہری کے نزدیک ہی تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کی مسہری کو ٹٹولا تو وہاں صرف لحاف تھا۔ بستر پر ریاض نہیں تھا۔ میں اندازے سے گھوڑے کی مسہری کی طرف بڑھا۔ اس کی مسہری بھی خالی تھی۔ وہ دونوں نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔

مجھے ایک خیال یہ بھی آیا کہ ممکن ہے دہن والوں کے گھر میں کوئی ایسی رسم ہو جس میں مرد بھی شرکت کرتے ہوں۔ شاید ریاض اور گھوڑا وہیں گئے تھے لیکن یہ اندھیرا کیوں تھا؟

میں نے اپنی ریڈیم ڈائل والی گھڑی پر نظر ڈالی تو اس میں سوا تین بج رہے تھے۔

رات کے اس پہر یہ لوگ کہاں چلے گئے تھے۔ سہیل

تو خیر پہلے ہی غائب تھا۔

میں پھر اندازے سے دروازے کی طرف بڑھا اور باہر نکلنے کی کوشش کی تو دیوار سے ٹکرا گیا۔ میں جھنجھلا کر رہ گیا۔ پھر میں دیوار کو ٹٹولتا ہوا اس کے سہارے آگے بڑھا اور بالآخر دروازے تک پہنچ گیا۔ دروازہ چوٹ کھلا ہوا تھا۔ میں باہر نکلا تو باہر بھی کوئی ملازم نہیں تھا۔

مجھے یاد آیا کہ دن میں جس غسل خانے میں غسل کیا تھا، اس کے برابر میں ہی بیت الخلا تھا۔ میں اندازے سے غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے بیت الخلا کے دروازے پر ہتھ رکھ دیا۔ اب نہ جانے وہ غسل خانہ تھا یا بیت الخلا۔

اچانک پیچھے سے ایک انتہائی کڑک اور مکرہ آواز آئی۔ ”کہاں جا رہا ہے؟“ میں بھڑک کر پلٹا تو خوف و دہشت سے میرا خون خشک ہو گیا۔

وہ انسان نہیں کوئی عجیب مخلوق تھی۔ مجھے اندھیرے میں صرف اس کا ہیولا نظر آرہا تھا۔ اس کا قد بلاشبہ آٹھ، ساڑھے آٹھ فٹ لمبا تو ہوگا کیونکہ مجھ جیسا دراز قد آدمی بھی اسے سر اٹھا کر دیکھنے پر مجبور تھا۔ وہ سیاہ مائل گہرے رنگ کے لباس میں تھا۔ مجھے صرف اس کے بال نظر آرہے تھے جو اس کے سر سے نیچے شانوں تک پھرے ہوئے تھے۔

اس نے میرے مڑنے پر ایک بھیانک قہقہہ لگایا اور بولا۔ ہا ہا ہا... آج تو قبضے میں آیا ہے۔ مجھے کتنے عرصے سے کسی صحت مند نوجوان کے خون کی ضرورت تھی۔ آج اگر میں نے تیرا خون نہ پیا تو صبح تک میں مرجاؤں گا۔“

میں بزدل نہیں ہوں لیکن گھپ اندھیرے اور اس پراسرار ماحول میں مجھے عجیب سا خوف محسوس ہو رہا تھا۔ پھر اس سے پہلے ہم لوگ اس قسم کے پراسرار واقعات پر گفتگو بھی کرتے رہے تھے۔

تیجی مجھے دادی اماں کی بات یاد آئی کہ پتر کوئی بھوت پریت یا آسیب ٹکرا جائے تو آیت الکرسی پڑھ لیا کر، وہ فوراً اس کے جلال سے یا تو ڈر کر بھاگ جائے گا یا بھسم ہو جائے گا۔

میں نے ہمت کر کے کہا۔ ”آخر تو کون ہے اور چاہتا کیا ہے؟“

میں رام چند کی بھکتی ہوئی آتما ہوں۔“ اس نے عجیب سے کھردرے لہجے میں کہا۔ ”گھر میں جب بھی کوئی

آگرہ

بھارت کے صوبہ اتر پردیش (سابق صوبہ جات متحدہ آگرہ داودھ) کا مشہور تاریخی شہر۔ دریائے جمنا کے کنارے دہلی سے بجانب مشرق سومیل کے فاصلے پر آباد ہے۔ آبادی 2001ء میں 11,00,000 تھی۔

سلطنت مغلیہ کے بانی شہنشاہ بابر نے اسے اپنا دارالحکومت بنایا تھا۔ اس کے پوتے اکبر نے سلیم چشتی سرخ قلعے کی مرمت و توسیع کی۔ اس کا شاندار مقبرہ سکندرہ کے مقام پر ہے۔

شاہجہان نے 1632-50ء کے دوران یہاں اپنی ملکہ ممتاز محل کا شہرہ آفاق مقبرہ تاج محل تعمیر کرایا۔ آگرے کی اہمیت 1659ء سے کم ہونی شروع ہوئی جب شہنشاہ عالمگیر نے پایہ تخت دہلی منتقل کر لیا۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے دوران میں حکمران جلد جلد بدلتے رہے۔ بالآخر 1803ء میں لارڈ لیک Lake نے اسے مرہٹوں سے فتح کر کے انگریزی سلطنت میں شامل کر لیا۔ 1835ء سے 1858ء تک آگرہ شمال مغربی صوبہ جات کا دارالحکومت رہا۔ اہم ریلوے جنکشن اور خاصا بڑا تجارتی مرکز ہے۔ جوتے، شیشے کے سامان، دستکاریوں، قالین اور بالخصوص مغلیہ طرز کی عمارات کی وجہ سے مشہور ہے۔

تاج محل کے علاوہ شاہجہان کی تعمیر کردہ موتی مسجد، شیش محل Mirror Palace اور یونیورسٹی (قیام 1927ء) کی عمارات بھی بڑی دیدہ زیب ہیں۔ یہاں ہوائی اڈا، ریلوے اسٹیشن بھی ہیں۔

مرسلہ: زاہد سلیم، کراچی

شادی ہوتی ہے یا کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو مجھے خون کی ضرورت پڑتی ہے۔ آج میں تیرا خون پیوں گا۔“

میں نے آیت الکرسی پڑھنے کی کوشش کی لیکن مجھے آیت الکرسی یاد ہی نہیں آرہی تھی۔ میں نے پھر ذہن پر زور دیا تو مجھے آیت الکرسی کی بجائے الحمد شریف یاد آگئی، میں نے اس کا ورد کرتے ہوئے اچھل کر اس بھوت کے پیٹ میں زوردار ٹکرماری۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں اپنی زندگی سے مایوس ہو گیا تھا۔ سوچا کہ جب مرنا ہی ہے تو اس کا مقابلہ کر کے کیوں نہ مروں گا۔ میری ٹکراتی شدید تھی کہ وہ دھڑام سے فرش پر گر پڑا اور کراہ کر بولا۔ ”اوئی مر گیا!“

اس وقت اچانک لائٹ روشن ہوگئی۔ میرے سامنے فرش پر کوئی اجنبی پڑا تھا۔ ٹکرتے سے اس کے بالوں کی دگ دور جاگ رہی تھی۔ وہ دراصل لمبے لمبے بانسوں پر چل رہا تھا۔ میری ٹکر سے وہ توازن برقرار نہ رکھ سکا اور فرش پر گر گیا۔

اس وقت سہیل، ریاض اور گھوڑا ہنستے ہوئے ایک طرف سے نمودار ہوئے۔ دہلن کے بھائی اور کرن بھی ساتھ تھے۔

دہلن کے بھائی نے آگے بڑھ کر مجھ سے معافی مانگی اور بولا۔ ”معافی چاہتا ہوں، دراصل یہ پلان آپ کے دوست ہی کا تھا کہ آپ لوگوں کو خوفزدہ کیا جائے۔ یہ ان ہی کی ایکٹوٹی تھی۔“

میں سہیل سے مخاطب ہوا۔ ”تم سے تو میں بعد میں نمٹوں گا پہلے اس بے چارے جن بابا کو دیکھو۔ میری ٹکر کچھ زیادہ ہی زور سے لگ گئی ہے۔“

دہلن کے بھائی کے اشارے پر دو تین ملازمین اس کی طرف بڑھے۔ اسے اچھی خاصی چوٹ آئی تھی لیکن آدمی جان دار تھا اس لیے ملازموں کی مدد سے فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ملازموں نے اس کے پیروں میں بندھے ہوئے بانس کھول دیے تھے۔

”صاحب جی!“ اس نے لجاجت بھرے لہجے میں کہا۔ ”میں تو حکم کا غلام ہوں۔ مجھے تو سلطان صاحب نے کہا تھا۔“

”تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔“ میں نے اس سے کہا ”تمہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔“

”نہیں صاحب جی! ہم لوگ تو ایسی چوٹیں کھانے کے عادی ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

وہ بھی دہلن والوں کا ملازم تھا، کچم شیم آدمی تھا اس

لیے اس کا انتخاب کیا گیا تھا۔

بعد میں سہیل نے ہنستے ہوئے مجھے بتایا کہ میرا پلان تو یہ تھا کہ تم تینوں کو خوف زدہ کیا جائے لیکن جب میں یہاں پہنچا تو ریاض اور خالد جاگ رہے تھے۔ انہوں نے ہماری باتیں سن لیں۔ میں نے سوچا کہ اب تو سارا پلان ہی چوٹ ہو جائے گا۔ اب پلان بنا ہی لیا ہے تو کم سے کم خورشید ہی کو ڈرا دیا جائے۔ مجھے معاف کر دینا یا، یہ صرف مذاق تھا۔“

میں نے تو سہیل سے کہا بھی تھا کہ خورشید نہیں ڈرے گا۔ ”ریاض نے کہا۔“ ہاں، میں یا گھوڑا ہوتا تو ہم دونوں خوف زدہ ہو جاتے۔ میں تو شاید اس ”جن“ کو دیکھ کر ہی بے ہوش ہو جاتا لیکن تم نے تو باقاعدہ اس جن سے بات چیت شروع کر دی۔“

سہیل نے کمرے کی تمام کھڑکیاں بند کیں تو مجھے خیال آیا کہ سرد ہوا میں ان ہی کھڑکیوں سے آرہی تھیں۔ اس نے ملازمین کو انکسٹی دھکانے کا حکم دیا اور مجھ سے بولا۔ ”یار تم لیٹ جاؤ اب تمہارے لیے گرما گرم چائے بنواتا ہوں۔“

او بھائی، میں پیشاب کرنے گیا تھا۔ اندھیرے میں کچھ نظر ہی نہیں آرہا تھا۔ پہلے میں فارغ ہولوں، پھر تم سے بات کرتا ہوں۔ ہاں تمہارا یہ مذاق ادھار رہا۔ اس کے بدلے میں تم سے ایسا مذاق کروں گا کہ زندگی بھر یاد رکھو گے۔“ یہ کہہ کر میں بیت الخلا کی طرف بڑھ گیا۔

دوسرے دن سہیل کا نکاح تھا۔ نکاح کے لیے سہیل نے اپنی طرف سے تینوں دوستوں کے لیے بہت قیمتی سوٹ بنوا کر دیے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ اس سے دہلن والوں پر رعب پڑے گا۔“

”رعب پڑے گا۔“ ریاض نے کہا۔ ”نظر سے بچنے کے لیے ہمارے ساتھ کالا ٹیکا بھی ہے۔“

”بیٹا! کل تمہیں اس کا لے ٹیکے ہی نے بجا لیا۔“

”اچھا اب بک بک بند کرو اور نیچے چلنے کی تیاری کرو۔“ سہیل نے کہا۔ ”میں نیچے جا رہا ہوں، قاضی صاحب آچکے ہیں۔ تم لوگ بھی نیچے پہنچو۔ نظام الدین!“

اس نے ایک ملازم سے کہا۔ ”ان لوگوں کو نیچے بڑے کمرے میں لے آنا۔“

سہیل کا نکاح بہت شاندار طریقے سے ہوا۔ دہلن والے اگر سہیل کے گھرانے سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں تھے۔ باہر سیکڑوں دیکیں دم ہو رہی تھیں۔ ان لوگوں نے

درجنوں کمروں کی قربانی کی تھی اور درجنوں بکرے صدقے کے طور پر ذبح کر کے پورے گاؤں میں تقسیم کر دیے تھے۔ ہم لوگ تو یوں بھی دی آئی پی تھے کہ دولہا کے مہمان تھے۔ اس موقع پر مجھے دہلن کی بہنوں اور دوسری خواتین کو دیکھنے کا موقع بھی ملا۔ میں انہیں دیکھنے کی بجائے گھوڑے کی طرف دیکھ رہا تھا کہ وہ کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر دے اور رنگ میں بھنگ پڑ جائے۔ ریاض تو باقاعدہ اس کے ساتھ بیٹھا تھا اور اس کا ایک ہاتھ گھوڑے کے ہاتھ میں تھا۔ گویا اس نے گھوڑے کی لگام تمام رکھی تھی۔

پر تکلف کھانے کے بعد وہاں دہلن والوں کی طرف سے فنکشن کا انتظام بھی تھا۔ دور دور سے بھانڈ مرانی آئے تھے۔ دہلن والوں نے لاہور سے ناچنے والیاں بھی بلائی تھیں۔ یہ محفل رات گئے تک جاری رہی، پھر ہم لوگ اپنے کمرے میں آ گئے۔

میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سہیل بھی ہمارے ساتھ تھا۔ ”تم یہاں ہو؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”تمہیں تو دہلن کے پاس ہونا چاہیے۔“

سہیل نے ایک طویل اور ٹھنڈا سانس لیا اور بولا۔ ”یار خورشید تمہیں حیرت ہوگی۔ یہ ہماری فیملی کی ایک عجیب و غریب رسم ہے بلکہ میں تو اسے المیہ کہوں گا۔“

”یار، صاف صاف بات کرو۔“ میں نے الجھ کر کہا۔ ”ہمارے خاندان میں رسم ہے کہ نکاح کے بعد کم سے کم دو مہینے اور زیادہ سے زیادہ چار مہینے تک دہلن اور دولہا آپس میں نہیں مل سکتے۔“

”یہ کیسی رسم ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا، پھر اتنی لمبی چوڑی تقریب کی ضرورت کیا ہے۔ سیدھا سیدھا نکاح کر کے تجھے دور بھیج دیتے اور رخصتی کے وقت بلا لیتے۔ ہم بھابی کو ساتھ لے کر جاتے تو اس کا مزہ ہی اور تھا۔ یار تو نے موڈ خراب کر دیا۔“

”موڈ تو میرا خراب ہے یار!“ سہیل نے کہا۔ ”آج میری سہاگ رات ہے بلکہ ہونا چاہیے تھی۔ مجھے آر سی مصحف کے موقع پر صرف دہلن کا چہرہ دکھایا گیا ہے۔ اس سے میری آتش شوق مزید بھڑک اٹھی ہے۔“

”کیا بات ہے یار؟“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”تو جھنجھلاہٹ میں بہت ثقل اردو بول رہا ہے۔“ ”آتش شوق!“

”یار، تجھے مذاق سو جھ رہا ہے اور میں۔“

”چھوڑ میرے دوست!“ میں نے کہا۔ ”اللہ صبر

کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

”یہ باتیں ریاض اور گھوڑا بھی سن رہے تھے۔ انہوں نے بھی اپنے اپنے طور پر سہیل کو تسلی دی۔ گھوڑے نے تو دو چار پھڑکتے ہوئے لطفے بھی سنائے اور سہیل ہنسنے پر مجبور ہو گیا۔

ہاں، میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ دہلن والوں نے ہمارا کمراتیار کر دیا تھا۔ اب ہم نچلی منزل کے ایک بڑے کمرے میں تھے۔ وہاں شاید ان لوگوں نے دہلن کا جھینر وغیرہ رکھا تھا جو سہیل کے گھر والوں کے ساتھ جاتا۔ ہمیں ابھی مزید ایک دن وہاں قیام کرنا تھا۔

ریاض نے کہا ”یار، مجھے تو ابھی نیند نہیں آرہی ہے۔ سہیل کو بھی نیند نہیں آرہی ہوگی۔ کیوں نہ ہم تاش ہی کھیل لیں۔ گھوڑے نے تاش کی گڈی نکالی اور پتے بانٹنے لگا۔ سہیل نے اسے روک دیا اور بولا ”یار ٹوٹ پیس کی بجائے فلیش کھیلیں گے۔ یا تو آج میں تم لوگوں کی جیبیں خالی کراؤں گا یا اپنی جیب خالی کر دوں گا۔“

ہم نے سوچا، اگر سہیل کی یہ.. خوشی ہے تو یہ ہی سہی۔ ہم تو اسے کسی نہ کسی طرح بہلانا چاہتے تھے تاکہ وہ پھر سے نارمل ہو جائے۔

”ایک روپے کا بیٹھو گا۔“ سہیل نے کہا۔ ایک روپیہ اس دور میں خاصی قدر رکھتا تھا۔ عام طور پر لوگ چار آنے رکھتے تھے۔

”منظور ہے۔“ میں نے کہا۔ ”چل بھی گھوڑے، پیسے نکال۔“

ریاض اور گھوڑے نے پیسے نکالے اور فرش پر ڈال دیے۔ میں نے بھی پیسے نکال کر ڈال دیے اور ہم لوگ فلیش کھیلنے لگے۔

اس دن گھوڑا ہر بازی جیت رہا تھا اور ہم جھنجھلا کر مزید پیسے لگا رہے تھے۔ ہم جب سے سہیل کے گاؤں آئے تھے ہماری جیب سے ایک پیسا بھی خرچ نہیں ہوا تھا۔ صرف پانچ پانچ سو روپے ہم نے نکاح کے بعد سہیل پر سے صدقہ کر کے اس کے ملازمین کو دیے تھے۔ میرے خیال میں تو یہ رقم بہت زیادہ تھی لیکن سہیل کی عزت کا بھی خیال رکھنا تھا۔

کھیلتے کھیلتے جب ایک بازی ختم ہوئی تو گھوڑا بولا۔ ”یار، میں ذرا پیشاب کر کے آتا ہوں۔ اس وقت تک ایک بازی تم تینوں کھیل لو۔“

وہ اٹھ کر چلا گیا۔

ہم تینوں ہی کھیلے رہے۔ اس مرتبہ دو تین بازی میں جیتا، پھر سہیل نے جیتنا شروع کر دیا۔ ریاض بری طرح ہار رہا تھا۔

اچانک اس نے کہا۔ ”یار، یہ گھوڑا کہاں جا کر مر گیا۔ کیا یہ کہیں پڑ کر سو تو نہیں گیا کہ اسے جیتی ہوئی رقم دوبارہ نہ بارنا پڑ جائے۔“

گھوڑا اس وقت تک ہم سے تقریباً دس ہزار روپے جیت چکا تھا۔ اس دور میں دس ہزار لڑا اچھا خاصا ایک مکان مل جاتا تھا۔

ہم نے اس کے انتظار میں دو تین بازیاں مزید کھیلیں، پھر اسے ڈھونڈنے کے لیے اٹھنے ہی والے تھے کہ گھوڑا واپس آ گیا۔

”کہاں مر گئے تھے یار؟“ ریاض نے اپنے مخصوص لہجے میں پوچھا۔

”یار میں پیشاب کرنے گیا تو مجھے کسی ملازم کا کرا نظر آیا۔ وہاں بستر پر بیٹھا تو بستر اتنا نرم اور گرم تھا کہ مجھے اونگھ آ گئی۔“

”اچھا، یار بات مت بنا۔ چل پتے بانٹ!“ ریاض نے کہا۔ ”تو کیا سمجھتا ہے کہ ہم تیری جیب سے مال نکالے بغیر تجھے چھوڑ دیں گے؟“

”یار، تم لوگوں کو مزید ہارنے کا شوق ہے تو چلو میں کھیلنے کو تیار ہوں۔“ گھوڑے نے کہا اور پتے پانٹنے لگا۔

اس مرتبہ میں بہت غور سے اس کے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے پتے پانٹتے وقت عجیب سی حرکت کی تھی۔ بازی شروع ہونے سے پہلے ہی میں نے کہا۔ ”ایک منٹ۔“

سب میری طرف دیکھنے لگے۔

”اس وقت ہمارے سامنے بارہ پتے پڑے ہیں۔ گڈی میں جو کرسمیت اکٹالیس پتے ہونے چاہئیں۔“

”ہاں تو پھر؟“ سہیل نے پوچھا۔

”ریاض!“ میں نے کہا۔ ”ڈرا گڈی کے پتے گنو۔“

ریاض نے پتے گنے تو وہ انتالیس تھے۔ ان میں جو کر بھی موجود تھا۔

”باقی دو پتے کہاں ہیں؟“ میں نے سخت لہجے میں گھوڑے سے پوچھا۔

”یار، یہیں ہوں گے،“ گھوڑے نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ”کہاں جائیں گے؟“

”ایک منٹ!“ ریاض گھوڑے کی آستینوں کی تلاشی لینے لگا۔ ان میں سے اینٹ کا ایک غلام اور حکم کا بادشاہ نکل کر باہر گر پڑے۔

”یہ کیا ہے؟“ میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔ ”تم ہم لوگوں سے نو سر بازی کرتے رہے ہو، تم کیا سمجھتے ہو، تم بہت بڑے شار پر ہو۔ چلو ساری رقم نکالو۔“

اس نے میرے اور ریاض کے تیور دیکھے تو جیب سے رقم نکال کر سامنے ڈال دی۔ ریاض نے اس کی تلاشی لی اور سزا کے طور پر اس کی جیب سے تمام رقم ضبط کر لی۔ پھر ہم نے اس رقم کو تین حصوں میں تقسیم کیا اور اپنی اپنی جیب میں رکھ لی۔

سہیل نے ہنس کر کہا۔ ”یار! گھوڑا میرا مہمان ہے۔ اس کی جیب میں اتنی رقم تو چھوڑ دو کہ یہ گھر پہنچ سکے۔ پھر اس نے اپنے حصے کی رقم گھوڑے کو دے دی۔

ہم لوگوں نے کھیل بند کر دیا اور آپس میں گپ شپ کرنے لگے۔ پھر نہ جانے کب ہم لوگوں کو نیند کے جھونکے آنے لگے اور ہم سب اٹھ کر اپنے اپنے بستروں میں چلے گئے۔

دوسرے دن ہم وہاں سے روانہ ہوئے تو گھوڑا خلاف معمول خاموش تھا اور کسی سوچ میں گم تھا۔ ہم پھر وہی تھکا دینے والا سفر کر کے سہیل کے گاؤں پہنچے۔

ہم تو اسی رات وہاں سے روانہ ہونا چاہتے تھے لیکن سہیل کے والد نے روک لیا۔ ”پتر! تم لوگ ابھی اتنا لمبا سفر کر کے آئے ہو۔ آج رات آرام کرو۔ صبح میں اپنی گاڑی میں بیٹھیں لاہور بھجوا دوں گا۔“

اس دن ہم واقعی تھک گئے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد ہی کچھ دیر میں سو گئے۔

دوسرے دن ہم لوگ لاہور روانہ ہو گئے۔ سہیل ہمارے ساتھ نہیں تھا۔ اس نے ایک ہفتے بعد آنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہاں سے نکلنے کے بعد ریاض نے ڈرائیور سے کہا۔

”مجھے لاری اڈے پر چھوڑ دینا، میں اپنے گھر جاؤں گا۔“

ابھی کالج کی چھٹیاں باقی تھیں۔ میں نے بھی گجرات جانے کا فیصلہ کر لیا۔ گھوڑے نے مجھ سے کہا کہ میرا گاؤں یہاں سے کافی دور ہے۔ میں تمہارے ساتھ گجرات چلتا ہوں۔ وہیں سے لاہور چلا جاؤں گا۔

گجرات پہنچ کر بھی گھوڑا کچھ خاموش خاموش ساتھ تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”یار گھوڑے! میں محسوس کر رہا ہوں کہ تو جب سے سہیل کی شادی سے واپس آیا ہے، تب

سے خاموش خاموش ہے آخر بات کیا ہے؟“

”یار! بات بہت خطرناک ہے۔“ گھوڑے نے کہا۔

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”کیا مطلب؟ صاف صاف بات کر۔“

”مجھے یاد ہو گا کہ اس دن جب ہم لوگ تاش کھیل رہے تھے تو میں کچھ دیر کے لیے وہاں سے چلا گیا تھا۔“

”ہاں، تو نے بتایا تھا کہ تجھے اونگھ آ گئی تھی۔“ میں نے کہا۔

”مجھے اونگھ نہیں آئی تھی۔“ گھوڑے نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں کمرے سے باہر نکلا تو مجھے علم نہیں تھا کہ نیچے کی منزل میں بیت الخلا کس طرف ہے۔ سامنے کوئی ملازم بھی نہیں تھا کہ میں اس سے پوچھتا۔ باہر قحن کے کونے پر مجھے ایک کرا نظر آیا۔ میں سمجھا کہ اس میں ضرور کوئی ملازم ہو گا۔ میں اس کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہاں گھپ اندھیرا تھا لیکن چوڑیوں کی جھنکار سے معلوم ہوا کہ وہاں کوئی عورت موجود ہے۔“

”تو نے کیا کیا ہے گھوڑے؟“ میں نے وحشت زدہ ہو کر پوچھا۔

”میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ میں گھبرا کر واپس پلٹا تو اس عورت نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور سرگوشی میں بولی۔“ مجھے یہاں بلا کر اب خود کہاں جا رہے ہو؟“

پھر... پھر... میں نے جھٹکا کر پوچھا۔

”پھر اس لڑکی نے مجھے مجبور کر دیا اور...“

”بکو اس مت کر۔ کون لڑکی تجھے مجبور کرے گی؟ تو نے خود ہی دست درازی کی ہو گی؟“

”میری بات کا یقین کر خورشید۔“ گھوڑے نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں اپنی مری ہوئی ماں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس لڑکی نے مجھے مجبور کیا تھا۔ وہ تو مجھے آستے ہی نہیں دے رہی تھی کہ کچھ دیر اور رک جائیں، نہ جانے پھر موقع ملے یا نہ ملے۔“

”یہ تو نے اچھا نہیں کیا گھوڑے؟“ میں نے پُر تشویش لہجے میں کہا۔ ”اگر وہ سہیل کے خاندان کی کوئی لڑکی ہوئی تو اس سے ہم سب کے تعلقات تو خراب ہوں گے ہی، تیری جان کے لئے کئی بڑ جائیں گے۔ تو اچھی طرح جانتا ہے کہ اس معاملے میں سہیل کیا کہہ رہا تھا؟“ پھر میں کچھ توقف کے بعد بولا۔ ”اور اگر وہ سہیل کی سسرالی ہوئی تو تو دہری مصیبت میں پڑ جائے گا۔ سہیل تو تیرا دشمن ہو گا ہی، اس کی سسرال والے بھی تیری جان کے دشمن ہو جائیں گے۔“

”تو پھر میں کیا کروں؟“ گھوڑے نے بے بسی سے پوچھا۔ ”کیا کہیں بھاگ جاؤں؟“

”بھاگ کر تو کہاں جائے گا؟“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”یہ لوگ تو برسوں اپنی عزت کے دشمنوں کا پیچھا کرتے ہیں اور جب بھی موقع ملے، اس کا کام تمام کر دیتے ہیں۔ اب تو بھی دعا کر اس لڑکی نے کسی کو کچھ نہ بتایا ہو۔“

”یار! اس نے مجھے اندھیرے میں پہچانا کب ہو گا؟“ گھوڑے نے کہا۔

اس کی اس بات پر میں کانپ کر رہ گیا۔ اگر اس لڑکی نے اسے نہیں پہچانا ہو گا تو پھر ان لوگوں کا شبہ ہم تینوں پر جائے گا۔ اب ہمارے لیے بھی اتنا ہی خطرہ تھا جتنا گھوڑے کے لیے تھا۔

میں اس انتظار میں رہا کہ کب سہیل یا اس کے آدمی ہمارے گھر پہنچتے ہیں لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ کالج کھل گئے اور ہم دوبارہ لاہور آ گئے۔ سہیل بھی واپس آ گیا۔ وہ بالکل نارمل تھا اور پہلے کی طرح ہنس بول رہا تھا۔ کسی طرح سے احساس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ اسے کوئی مسئلہ ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس لڑکی نے کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔

میرا خیال اب تک یہ تھا کہ گھوڑے نے اس لڑکی کے ساتھ زیادتی کی ہو گی لیکن اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ گھوڑا جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ اس لڑکی نے خود ہی اسے مجبور کیا ہو گا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ سہیل یا اس کی سسرالی نہیں بلکہ کوئی ملازمہ ہو گی ورنہ بڑے گھرانوں کی لڑکیاں یوں خود کو کسی کے سامنے تھالی میں رکھ کر پیش نہیں کرتیں، وہ بھی یہ دیکھ بغیر کہ وہ ہے کون؟ بات آئی گئی ہو گی۔

ہم سب پھر پڑھائی میں لگ گئے۔

دو مہینے بعد سہیل کے گھر سے بلاوا آیا کہ گاؤں پہنچو، دلہن کو رخصت کر کے گھر لانا ہے۔ تمہارا کوئی دوست آنا چاہے تو تم اسے بھی لا سکتے ہو۔

ریاض نے تو معذرت کر لی۔ اس کی طبیعت یوں بھی ٹھیک نہیں تھی۔ وہ اپنے گھر جا رہا تھا۔ گھوڑے کے دل میں چور تھا اس لیے وہ بھی بہانہ بنا کر رہ گیا۔

سہیل میرے پیچھے پڑ گیا کہ یار! اس موقع پر تو ہی میرے ساتھ چل، اس کے شدید اصرار پر مجھے اس کے ساتھ جانا پڑا۔

دلہن کے گاؤں میں پھر ہمارا اسی انداز میں استقبال ہوا۔ پھر بکرے ذبح ہوئے، دیکھیں چڑھیں، منہ دے دیے

”تو پھر میں کیا کروں؟“ گھوڑے نے بے بسی سے پوچھا۔ ”کیا کہیں بھاگ جاؤں؟“

”بھاگ کر تو کہاں جائے گا؟“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”یہ لوگ تو برسوں اپنی عزت کے دشمنوں کا پیچھا کرتے ہیں اور جب بھی موقع ملے، اس کا کام تمام کر دیتے ہیں۔ اب تو بھی دعا کر اس لڑکی نے کسی کو کچھ نہ بتایا ہو۔“

”یار! اس نے مجھے اندھیرے میں پہچانا کب ہو گا؟“ گھوڑے نے کہا۔

اس کی اس بات پر میں کانپ کر رہ گیا۔ اگر اس لڑکی نے اسے نہیں پہچانا ہو گا تو پھر ان لوگوں کا شبہ ہم تینوں پر جائے گا۔ اب ہمارے لیے بھی اتنا ہی خطرہ تھا جتنا گھوڑے کے لیے تھا۔

میں اس انتظار میں رہا کہ کب سہیل یا اس کے آدمی ہمارے گھر پہنچتے ہیں لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ کالج کھل گئے اور ہم دوبارہ لاہور آ گئے۔ سہیل بھی واپس آ گیا۔ وہ بالکل نارمل تھا اور پہلے کی طرح ہنس بول رہا تھا۔ کسی طرح سے احساس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ اسے کوئی مسئلہ ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس لڑکی نے کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔

میرا خیال اب تک یہ تھا کہ گھوڑے نے اس لڑکی کے ساتھ زیادتی کی ہو گی لیکن اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ گھوڑا جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ اس لڑکی نے خود ہی اسے مجبور کیا ہو گا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ سہیل یا اس کی سسرالی نہیں بلکہ کوئی ملازمہ ہو گی ورنہ بڑے گھرانوں کی لڑکیاں یوں خود کو کسی کے سامنے تھالی میں رکھ کر پیش نہیں کرتیں، وہ بھی یہ دیکھ بغیر کہ وہ ہے کون؟ بات آئی گئی ہو گی۔

ہم سب پھر پڑھائی میں لگ گئے۔

دو مہینے بعد سہیل کے گھر سے بلاوا آیا کہ گاؤں پہنچو، دلہن کو رخصت کر کے گھر لانا ہے۔ تمہارا کوئی دوست آنا چاہے تو تم اسے بھی لا سکتے ہو۔

ریاض نے تو معذرت کر لی۔ اس کی طبیعت یوں بھی ٹھیک نہیں تھی۔ وہ اپنے گھر جا رہا تھا۔ گھوڑے کے دل میں چور تھا اس لیے وہ بھی بہانہ بنا کر رہ گیا۔

سہیل میرے پیچھے پڑ گیا کہ یار! اس موقع پر تو ہی میرے ساتھ چل، اس کے شدید اصرار پر مجھے اس کے ساتھ جانا پڑا۔

دلہن کے گاؤں میں پھر ہمارا اسی انداز میں استقبال ہوا۔ پھر بکرے ذبح ہوئے، دیکھیں چڑھیں، منہ دے دیے

”تو پھر میں کیا کروں؟“ گھوڑے نے بے بسی سے پوچھا۔ ”کیا کہیں بھاگ جاؤں؟“

”بھاگ کر تو کہاں جائے گا؟“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”یہ لوگ تو برسوں اپنی عزت کے دشمنوں کا پیچھا کرتے ہیں اور جب بھی موقع ملے، اس کا کام تمام کر دیتے ہیں۔ اب تو بھی دعا کر اس لڑکی نے کسی کو کچھ نہ بتایا ہو۔“

”یار! اس نے مجھے اندھیرے میں پہچانا کب ہو گا؟“ گھوڑے نے کہا۔

اس کی اس بات پر میں کانپ کر رہ گیا۔ اگر اس لڑکی نے اسے نہیں پہچانا ہو گا تو پھر ان لوگوں کا شبہ ہم تینوں پر جائے گا۔ اب ہمارے لیے بھی اتنا ہی خطرہ تھا جتنا گھوڑے کے لیے تھا۔



قسمت

محترم ایڈیٹر
سلام تہنیت

یہ روداد میری نہیں، میرے ایک واقف کار کی ہے لیکن ایسی دلچسپ ہے کہ اسے سرگزشت کے قارئین سے شیئر کرنے پر مجبور ہو گئی ہوں، امید ہے آپ کو بھی پسند آئے گی۔

ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری
(بھکر)

آگئی۔ اسے دیکھ کر میں نے یہی سمجھا کہ میں نئی دلہن ہوں اس لیے وہ ملنے آئی ہے لیکن کچھ ہی دیر میں مغالطہ دور ہو گیا اس نے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد کہا ”بھابی سنا ہے آپ کہانیاں شہانیاں بھی لکھتی ہو۔“

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نئی نئی شادی ہو کر کوٹ ادو سے بھکر آئی تھی۔ یہاں مجھ سے پہلے یہ خبر پہنچ گئی تھی کہ میں ڈائجسٹوں میں کہانیاں لکھتی ہوں۔ اس دن میں اپنے کمرے میں بیٹھی تھی کہ مجھ سے ملنے ایک عورت

کہا۔ ”اچھا ہوا، آپ نے وہ کڑا اتار دیا جو اس رات آپ نے پہن رکھا تھا۔ مجھے مردوں کے ہاتھ میں کڑے اچھے نہیں لگتے ہیں۔“

”کون سا کڑا؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔
”آپ اتنے بھولے نہ بنیں، اس رات تو آپ نے وہ کڑا پہن رکھا تھا اور جناب مجھے بلا کر خود واپس جا رہے تھے۔ میں اگر آپ کا ہاتھ پکڑ کر نہ روکتی تو آپ نکل جاتے۔ شاید آپ کو خوف ہو کہ کوئی آنہ جائے۔“

میں سنائے میں رہ گیا لیکن یار...
”میں جانتا ہوں خورشید! وہ خالد تھا۔ کڑا وہی پہنتا ہے اور تجھے یاد ہے وہ تاش کی بازی چھوڑ کر اٹھ گیا تھا اور کافی دیر بعد واپس آیا تھا۔“

”ہاں مجھے یاد ہے۔“ میں نے کہا۔ پھر میں نے سہیل کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا کہ اصل واقعہ کیا ہے اور اس سے کہا۔ ”سہیل! جو کچھ بھی ہوا غلط فہمی میں ہوا۔ گھوڑا قسمیں کھا رہا تھا کہ میں تو واپس آ رہا تھا لیکن اس لڑکی نے زبردستی میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے روک لیا۔ اس میں قصور تو کسی کا بھی نہیں ہے۔“

”ہاں، اس میں قصور کسی کا نہیں ہے، قصور تو میرا ہے، اب میں زندگی بھر اس بے غیرتی کے ساتھ زندگی گزار دوں گا کہ میری بیوی مجھ سے پہلے کسی اور کی ہو چکی ہے۔“
میں اسے دیر تک سمجھا تا رہا، پھر وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

رات کا شاید آخری پہر تھا جب میں نے دھماکے کی آواز سنی، آواز سہیل کے کمرے کی طرف سے آئی تھی۔ سب لوگ اس کے کمرے کی طرف دوڑ پڑے۔ میں بھی ساری احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر دوڑا۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ سہیل کے والد نے زور زور سے دروازہ پیٹا تو دروازہ کھل گیا اور مجھے مریم کا سہا ہوا چہرہ نظر آیا۔ وہ بری طرح لرز رہی تھی اور سکتے کی حالت میں تھی۔ بیڈ پر خون میں لت پت سہیل کی لاش پڑی تھی۔ اس نے اپنے... ریوالور سے اپنی عزت پر جان قربان کر دی تھی۔ میں بوجھل قدموں سے واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔

مجھے آج بھی سہیل یاد آتا ہے تو آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ گھوڑا، اس کے بعد ملک ہی چھوڑ گیا۔

*

مجھے اور سہیل دلہن کو لے کر روانہ ہوا۔
میں آیا تو سہیل کی گاڑی میں تھا لیکن اب اخلاق اس کے ساتھ بیٹھنا اچھا نہیں لگا۔ اس نے تو ڈرائیور کو بھی ساتھ نہیں لیا تھا اور اپنی گاڑی خود ہی ڈرائیور کر رہا تھا۔

میں جانتا تھا کہ وہ دونوں اس وقت اپنی اپنی بے تابی اور بے چینی کی روداد سنائیں گے، ایک دوسرے سے محبت کے بول بولیں گے۔

جب ہم واپس سہیل کے گاؤں پہنچے تو سہیل خوش ہونے کی بجائے انتہائی اداس اور غم زدہ لگ رہا تھا۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح سخت ہو رہا تھا۔

میں ہول کر رہ گیا کہ کہیں دلہن نے اسے گھوڑے کی ”واردات“ کے بارے میں تو نہیں بتا دیا۔

رات کے کھانے کے بعد وہ دلہن کے کمرے میں جانے کی بجائے میرے کمرے میں آ گیا اور بے چینی سے ٹھہرنے لگا۔

میں نے تشویش سے پوچھا۔ ”خیریت تو ہے سہیل! تو اتنا پریشان کیوں ہے؟“

میرا اتنا کہنا تھا کہ سہیل مجھ سے لپٹ کر بچوں کی طرح رونے لگا۔ میں گھبرا گیا کہ ایسی کیا بات ہو گئی۔

وہ روتے ہوئے بولا۔ ”میں لٹ گیا خورشید! میری عزت کا جنازہ نکل گیا... میں... میں برباد ہو گیا، تو بتا اب میں کیا کروں؟“

میں نے گھبرا کر پوچھا۔ ”کیا ہوا سہیل! کچھ بتا تو سہی۔“
”یار! جس دن میرا نکاح تھا، اس دن میں نے اپنی بہن کے ذریعے یہ بندوبست کرایا تھا کہ وہ دلہن کو کسی طرح مجھ سے ملو ادے۔ پھر تو ہماری ملاقات دو مہینے بعد ہونے والی تھی۔ مجھ سے اتنا صبر نہیں ہو رہا تھا۔ میری بہن نے مجھ سے وعدہ کر لیا کہ وہ موقع دیکھ کر مریم کو گھن کے آخری کوٹنے والے کمرے میں بھیج دے گی۔ اس طرف یوں بھی کوئی نہیں جاتا ہے تاش کی بازی ختم ہونے کے بعد میں اس کمرے میں پہنچا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں کافی دیر وہاں مریم کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ نہیں آئی۔ میں سمجھا کہ اس بے چاری کو آنے کا موقع ہی نہیں ملا اس لیے میں مایوس ہو کر واپس آ گیا۔“

”پھر... پھر... کیا ہوا؟“ میرے ذہن میں گھوڑے کی کہانی گونجنے لگی۔

”آج جب میں دلہن کو لے کر آ رہا تھا تو اس نے

”جی ہاں آپ نے صحیح سنا ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور اسے بغور دیکھنے لگی۔ اس لیے کہ وہ مجھ سے عمر میں کافی بڑی لگ رہی تھی۔

”باقی میں چاہتی ہوں آپ میرے بھائی کی کہانی بھی لکھیں۔“

”لوگ اپنی کہانی لکھنے کی فرمائش کرتے ہیں اور تم اپنے بھائی کی کہانی لکھنے کی بات کر رہی ہو میں سمجھی نہیں، ان کی ایسی کون سی بات ہے جسے کہانی کا روپ دیا جاسکے؟“

”بھائی وہ موت سے پہنچ لڑا کر آیا ہے۔ اس کی زندگی بہت بڑی کہانی ہے۔ یہاں کے بہت سے لوگ اس بارے میں جانتے ہیں۔ آپ پتا کر لیں۔ زندگی نے اس کے ساتھ ایسا عجیب کھیل کھیلا ہے کہ میں بتا نہیں سکتی اسی لیے کہہ رہی ہوں کہ آپ اس کی کہانی لکھیں بلکہ میں نہیں بھائی سے کہہ کر آپ کی بات بھائی سے کرادیتی ہوں نہیں بھائی بھی انکار نہیں کریں گے۔“

وہ اتنا کہہ کر چلی گئی۔ میں نے بھی اس کی بات کو اہمیت نہیں دی لیکن تیسرے دن خود نہیں نے مجھ سے کہا کہ ایسا کرو کہ کسی دن شہباز کی کہانی سن کر اسے لکھ ڈالو۔ وہ دو دن سے میرے پاس آ رہا ہے۔“

نفس کا کہا میں کیسے نالتی اس لیے ایک دن میں نے سیکنہ کو بلوا لیا کہ وہ اپنے بھائی کو لے کر آجائے۔ میرا حکم سننے ہی وہ اپنے بھائی شہباز کو لے کر آگئی۔

شہباز 28، 30 سال کا پورا مرد تھا۔ اس کے سامنے بیٹھ کر اس کی روداد سننے میں مجھے شرم آرہی تھی پھر بھی میں بیٹھنے پر مجبور تھی۔ آصف نے کہنا شروع کیا کہ باجی میں آپ کو شروع سے سنا تا ہوں۔ یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب میں کراچی میں رہتا تھا۔

☆☆☆

اس دن میں مرکز کے خصوصی بلاک پر مرکز آیا تھا کہ مریض کا فون پھر آ گیا۔ فون مریض کے گھر والوں نے کیا تھا۔ مریض کو قصبہ کالونی کے قریب ایک بستی سے لینا تھا اور سندھ گورنمنٹ اسپتال پہنچانا تھا۔ میں ایمبولنس لے کر نکل پڑا۔ جب میں قصبہ کالونی سے آگے بڑھا تو مجھے راستے کے کنارے کھڑے کچھ لوگ نظر آئے۔ ان کے نزدیک ایک چارپائی تھی جس پہ ان لوگوں نے مریض کو لٹا رکھا ہے۔ ایمبولنس دیکھ کر ان لوگوں نے ہاتھ سے رکنے کا اشارہ دیا۔ میں نے رک کر پوچھا تو وہ بولے کہ انہوں نے ہی فون

کیا تھا۔ میں نے ایمبولنس سے اسٹریچر نکالا اور اس پر مریض کو لٹا کر اندر کر لیا۔ مریض کے ساتھ تین آدمی تھے۔ ان تینوں نے اندر آنا چاہا تو میں نے کہا کہ اتنے آدمیوں کو ساتھ بٹھانے کا حکم نہیں ہے۔ صرف دو آدمی آسکتے ہیں وہ لوگ میری منت سماجت کرنے لگے تو میں مان گیا اور دو کو پیچھے مریض کے پاس اور ایک کو برابر میں بٹھالیا اور ہوٹر بجاتا ہوا چل پڑا۔ ابھی میں کچھ ہی دور گیا ہوں گا کہ مجھے اپنی کمر میں کسی چیز کے چبھنے کا احساس ہوا۔ میں نے اُدھر دیکھنے کی کوشش کی تو روح فنا ہوگئی۔ میرے برابر میں بیٹھے شخص نے میری کمر سے پستول لگا دیا تھا۔ پھر اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا ”ایمبولنس روک دے۔“

”مگر کیوں؟ میں نے سوال کیا۔“

”اگر نہیں روکے گا تو تیری قبر یہیں بن جائے گی۔“

میں سمجھ گیا تھا کہ یہ لوگ میری ایمبولنس چھیننا چاہتے ہیں اور اس کے ذریعے دہشت گردی کی کارروائی کریں گے۔ ایسی کئی خبریں میرے علم میں تھیں کہ ایمبولنس چھین کر دہشت گردی کی گئی۔ میں رضا کار ہوں اس طرح تو بہت کچھ ہو جائے گا۔ میرا کام زندگی بچانا ہے زندگی لینے کا سبب میں کیسے بن جاتا اس لیے میں نے ایمبولنس روکنے سے صاف انکار کر دیا۔ میرے انکار پر وہ جھنجھلا گیا اور اس نے پوری قوت سے میرے پیروں پر پیر مارا۔ بریک پر دھاؤ پڑنے سے ایمبولنس جھٹکا کھا کر رک گئی۔ دوسرے شخص نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولا اور مجھے نیچے دھکیل دیا۔ میں باہر گرا ضرور مگر فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے زور آزمائی کرتے دیکھ پستول والے نے ہاتھ باہر نکالا اور میرے پیر پر تین فائر کر دیے۔ زخم کی تکلیف سے میں الٹ کر گر اٹھا۔ اتنی دیر میں وہ ایمبولنس لے کر بھاگ گئے۔ میں درد سے بے حال ہو گیا تھا۔ میرے پیر سے خون بہہ رہا تھا۔ چلنا تو دور کی بات ہے مجھ سے کھڑا ہونا بھی دشوار ہو گیا تھا کیونکہ ایک گولی کمر کے قریب بھی لگی تھی۔ ایسے میں عافیت اسی میں تھی کہ میں وہیں بڑا رہوں اور کسی امداد کا منتظر رہوں۔ سڑک پر ٹریفک کم تھی مگر چلتی تو ہے۔ کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ آ ہی جاتا اسی امید پر کافی دیر تک وہیں درد سہتا، بے دم سا پڑا رہا میں نے خون روکنے کے لیے شرٹ بھاڑ کر باندھ لیا تھا۔ مگر جب کافی دیر ہوگئی تو یہ سوچ کر اٹھ گیا کہ مجھے حوصلہ دکھانا ہو گا ورنہ میں اسی جگہ مر جاؤں گا۔ اس لیے کہ درد بڑھتا جا رہا تھا۔

ایسے وقت میں جب موت بہت قریب محسوس ہو۔ اس کی آہٹ صاف سنائی دینے لگے تو انسان کو اپنا ماضی کسی چلتی پھرتی فلم کی طرح آنکھوں کے سامنے نظر آنے لگتا ہے۔ مجھے بھی جیتے ہوئے پل یاد آرہے تھے۔ مجھے بھائی بھائی کی شادی یاد آرہی تھی۔ ان کی باتیں یاد آرہی تھیں، اماں موقع پاتے ہی بھائی کو گھیر لیتی تھیں۔

”ایاز پتر، تو اب شادی کر لے۔۔۔ مجھ سے اب اور رہا نہیں جاتا۔“

”ماں تو تو جھلی ہوگئی ہے۔ یہ کون سا وقت ہے ایسی باتیں کرنے کا۔“ ایاز بھائی منہ بنا کر بولتے۔

”بیٹا سیکنہ کے بعد میں بہت اکیلی ہوگئی ہوں پھر میرا کیا بھروسہ۔ جسم میں جان تک نہیں ہے خود کو گھسیٹ رہی ہوں۔“

”ہاں بھائی جان۔۔۔ اب آپ شادی کر ہی لیں۔“ میں بھی اماں کا ساتھ دینے لگتا۔

”ارے واہ اب تو تو مجھ سے بھی بڑا ہو گیا ہے۔ مجھے مشورہ دینے لگا ہے۔“ ایاز بھائی میری پیٹھ پر ہاتھ مار کر کہتے۔

”ایسا غلط کیا کہا ہے اس نے۔ یہ میری حالت دیکھ ہی رہا ہے۔“ اماں اپنی کمزوری کو آڑ بنانے لگتی تھیں۔

”ماں ابھی مجھے بہت کچھ کرنا ہے۔ شہباز کو اعلیٰ تعلیم دلوانا ہے۔ پھر میں اپنے بارے میں سوچوں گا۔“

”اور تب تک تو بوڑھا ہو چکے گا۔“ اماں کہتیں۔

”تو کیا ہوا اب اسے کیا وعدہ تو پورا ہو جائے گا۔“

”تمہارے ابا نے یہ کب کہا تھا کہ تم اپنی زندگی خاک کر لو۔۔۔ تمہاری شادی کے بعد بھی شہباز کی پڑھائی جاری رہے گی رک تو نہیں جائے گی۔“

”اور کیا۔۔۔ بھائی کے آجانے سے میرا دل بھی لگ جائے گا۔ اس لیے کہ پہلے بھائی آئے گی پھر بھتیجا آئے گا ہا ہا۔“ میں بول کر اٹھ جاتا کہ بھائی کہیں زوردار ہاتھ نہ جڑ دیں۔

”تم لوگ سمجھ نہیں رہے ہو۔ شادی سے اخراجات بڑھتے ہیں۔ اتنی چھوٹی سی تو تنخواہ ہے۔“

”آنے والی اپنا رزق خود لے کر آئے گی۔ پھر اب مجھ سے اکیلے گھر سنبھالا بھی نہیں جاتا۔“ اماں اپنی بات پر اڑی رہتیں۔

”اماں آپ مجھے بلیک میل تو نہ کریں۔ وقت آئے گا تو میں خود شادی کے لیے کہہ دوں گا۔“

”ہاں بھائی میں نے خود دیکھا ہے۔ اماں کس طرح

گھر کا کام نمٹاتی ہیں۔ صرف جھاڑو دینے کے لیے گھنٹا بھر لگا دیتی ہیں۔“

”گویا تم لوگ ایک ماسی کے لیے پریشان ہو۔۔۔ رکھ لو کسی کو میں اسے خواہ دے دیا کروں گا۔“ بھائی ہنس کر کہتے۔

”مجھے ماسی کا بیٹا نہیں اپنی بھائی کا بیٹا چاہیے۔ میں سب سے چھوٹا ہوں مگر اب مجھ سے بھی ایک چھوٹا ہونا چاہیے۔“

”میرے بڑھاپے پر رحم کرو۔ حقیقت کو سمجھو۔ میری ہڈیوں میں اب جان نہیں رہی۔“

”پلیز بھائی جان گھر کی رونق کے بارے میں سوچیں۔ کب سے ہم نے کوئی خوشی نہیں دیکھی ہے۔ اس بہانے خوش ہو لیں گے۔“

”ٹھیک ہے آپ لڑکی دیکھیں۔ مگر ایک شرط ہے کہ لڑکی کو وعدہ کرنا ہو گا کہ وہ میرے شہباز کو بیٹے کی طرح رکھے گی۔“ بالآخر بھائی نے ہتھیار ڈال دیے۔

”ہر رے۔۔۔ بس میں آج ہی اپنے تمام دوستوں سے کہتا ہوں باجی سیکنہ کو خبر دیتا ہوں کہ پھر میں جو تک لگ گئی۔۔۔ سب مل کر لڑکی ڈھونڈنا شروع کر دیں۔۔۔ اماں آپ بھی فوراً لڑکی کی تلاش میں لگ جائیں۔“

”لڑکی تلاش کیا کرنا ہے۔ دیکھی بھائی ہے۔ شیدے کی بیٹی رعنا ہے نا۔ کتنی سیدھی سادی۔ اللہ میاں کی گائے ہے گائے۔ میں آج ہی شیدے سے بات کرتی ہوں۔“

اماں نے اسی دن شیدے چاچا کو بلانے کے لیے گاؤں کے ملک کے گھر فون کر دیا۔ شیدے چاچا آئے اور چٹ پٹ شادی ہو گئی۔ بھائی گھر آ گئی۔ وقت تیزی سے گزرنے لگا اور صرف دیرھ سال میں ہمارے یہاں ایک نیا مہمان بھی آ گیا۔ اس دن تو میں بہت خوش تھا۔ بچے کو گود میں لیے ادھر سے ادھر بھاگ رہا تھا اور اماں چیخ رہی تھیں۔

اور میں اپنی رو میں بولے جا رہا تھا ”بھائی میں آپ سے بہت خوش ہوں۔۔۔ میری پرسوں کی تمنا آپ نے پوری کی ہے۔“ بھائی رعنا مسکرا رہی تھی اور میں بچے کو جھلاتے ہوئے بول رہا تھا ”اب تک اس گھر میں سب سے چھوٹا میں تھا مگر اب مجھ سے بھی چھوٹا آ گیا۔ میں بتا نہیں سکتا میں کتنا خوش ہوں۔ اس وقت میرا دل گانے کو کر رہا ہے“ تھر پھر فار بھائی ہب ہب ہرے۔

”نومولود ہے۔۔۔ تیرے جنگلی پن سے وہ ڈر رہا ہے۔۔۔ دے دے ماں کو۔۔۔ بھوکا ہو رہا ہے۔“ اماں بولیں۔

”نہیں اسے اپنی گود سے نہیں اتاروں گا۔“ میں نے

ضدکی۔

”ارے بے وقوف دودھ پی لینے دے پھر لے لیتا۔“ اماں نے جھڑکا۔

”بھابی اسے میری گود میں رہنے دیں۔ اسی طرح دودھ پلا دیں۔“ میں نے ضدکی۔

”جو تے کھائے گا۔ کم عقلا کہیں گا۔ تیری گود میں وہ کیسے دودھ پلائے گی۔“

”ارے چھوڑیں پرانی باتیں۔ میں سکندر کا نپل لے آتا ہوں اسے بوتل سے دودھ پلائیں گے۔“

”سیدھی طرح سے بچہ اسے دے دے ورنہ ابھی جوتی اتار لوں گی۔“

”میں گن کر سو جوتی کھانے کو تیار ہوں مگر بچہ نہیں دوں گا۔ ایک تو بھابی نے اتنی دیر لگا دی۔ ہم سب کے تڑپنے کا لطف لیتی رہیں۔ اب میں ان کو تڑپاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ بچہ تمہارے پاس ہی رہے گا۔ ابھی تو دے دو۔ ابھی تمہارے بھائی جان بھی آتے ہوں گے۔“ بھابی نے کہا۔

”چلو جب آپ بھائی جان کا خوف دلا رہی ہیں تو دے دیتا ہوں مگر ابھی مجھے کمرے میں لا کر دے جائیں گی۔“

”تم سب اسی میں الجھے ہوئے ہو۔ اس کا نام کیا ہوگا یہ بھی سوچا ہے؟“ اماں نے ٹوکا۔

”اس کا نام ارباز ہوگا ارباز ملک۔“ میں نے فوراً کہا۔

”بہت خوب اچھا نام ہے۔۔۔ شہباز۔۔۔ ایاز۔۔۔ ارباز۔۔۔ واہ۔“ اماں نے تعریف کی۔

”اور کیا میرا دیا ہوا نام تو لوگ اپنے بچوں کو فخریہ دیتے ہیں۔ بھابی آپ کو یقین نہیں آئے گا۔۔۔ کل میں آپ کو پانچ سال پرانا اخبار دکھا دوں گا۔ امریکا کے صدر نے اپنے بیٹے کا نام مجھ سے پوچھ کر رکھا تھا۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”چل ہٹ۔۔۔ امریکی صدر کا بیٹا تیری عمر سے بڑا ہے۔“

”ارے بھابی جس طرح غالب میرے خواب میں آکر میرا شعر چرائے جاتے ہیں اسی طرح امریکی صدر بھی اس وقت آکر نام لے گیا تھا۔“ کہتے ہوئے میں نے قہقہہ لگایا۔

”بچے کو ہلاتے ہوئے بھابی نے کہا ‘غالب نے کون سا شعر لیا ہے؟‘

”باز۔ بچہ‘ اطفال ہے دنیا میرے آگے۔۔۔۔۔ ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے۔ یہ میرا شعر تھا اگلے غالب نے مانگ لیا۔۔۔ اتنے بزرگ آدمی۔۔۔ مجھ سے انکار کیا نہ گیا

اور میں نے شعر دے دیا۔“

”تم مجھے پینڈو سمجھ رہے ہونا؟ یہ شعر سو سال پرانا ہے اور غالب کا ہی ہے۔“

”قسم لے لیجئے جو میں آپ کو پینڈو سمجھ رہا ہوں، آپ تو پینڈو ہیں ہی۔“

”مار بیٹھوں گی۔ میں انٹر پاس ہوں انٹر پاس۔ سمجھے؟“

”انٹر کے معنی اندر ہر لڑکی گھر کے اندر رہتی ہی ہے۔ آپ نے کون سا عجوبہ کام کر لیا۔ انٹر کر لیا تو کیا کیا۔“

”بکواس بند کرو اور باہر جاؤ میں اسے فیڈ کراؤں گی۔“

”اچھا اچھا۔۔۔ جا رہا ہوں اگر مدد کی ضرورت ہو تو بتا دیں۔۔۔“ ہنس کر کہا اور باہر بھاگ آیا۔

☆ ☆ ☆

اس وقت روڈ پر خود کو گھسیٹتے ہوئے میں پرانے وقت کو یاد کر رہا تھا۔ میں سو سے زائد زخمیوں کو اسپتال پہنچا چکا تھا۔ جانتا تھا کہ درد کو کم کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اسے محسوس نہ کیا جائے اور اسے محسوس نہ ہونے دینے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ذہن کو بٹا دینا۔ اسی لیے میں پرانی باتوں کو یاد کر رہا تھا۔ مجھے ایک بات یاد آ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے سامنے فلم سی چل رہی ہو۔ مجھے بھابی کا وہ منظر شدت سے یاد آ رہا تھا جب ان کی ایک غلط بیانی پکڑی گئی تھی۔ اس دن ہم سب گھر میں بیٹھے تھے۔

بھابی اندر داخل ہوئے اور تھکے ہوئے انداز میں صوفے پر گر گئے۔ ان کی حالت دیکھ کر بھابی نے پوچھا ”کیا بات ہے آج کل آپ کافی دیر سے آرہے ہیں۔“

”بس دوستوں نے تنگ کر رکھا ہے۔ ہر روز کوئی نہ کوئی دوست گھیر لیتا ہے۔ اپنا اور میرا نام خراب کرتا ہے۔“

”دوستوں میں بیٹھ کر آپ اپنے بیٹے کو بھی بھول جاتے ہیں۔“ بھابی نے طنز دیا۔

”شہباز ہے نا۔ وہ کسی اور کو گود میں لینے کب دیتا ہے۔“ کہہ کر انہوں نے قہقہہ لگایا۔

”بھابی میں حقیقت بتاؤں؟“ میرے لہجے پر بھابی میری طرف حیرت سے دیکھنے لگے تھے۔

”بولو۔۔۔ ایسی کیا بات ہے جو اتنے پراسرار انداز میں بتانا چاہتے ہو؟“ بھابی نے پوچھا۔

”در اصل یہ خبر مجھے آج ہی ملی ہے۔“

بھابی نے چونک کر پوچھا ”کون سی خبر؟“

”آپ نے غلط بیانی کی ہے۔ آپ کا کوئی دوست آپ

نہیں روکتا اور نہ آپ کسی ہوٹل میں بیٹھنے کے عادی ہیں۔“

”کیوں میں دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر چائے نہیں پی سکتا۔ باتیں نہیں کر سکتا؟“ بھابی نے جواب دیا۔

”گپ لگانے والے اور لوگ ہوتے ہیں۔ آپ اس فیل کے ہیں ہی نہیں۔“ میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیوں بھابی کیوں۔۔۔ میں گپ کیوں نہیں لگا سکتا۔۔۔ ذہن ہلکا کرنے کے لیے دوستوں کے ساتھ بیٹھنا بھی ضروری ہے۔“

”مگر آپ نے کبھی ایسا کیا ہی نہیں۔ آپ کو تو بس کام اور کام اسی سے دوستی ہے۔ اس وقت بھی آپ کام پر سے آرہے ہیں۔“ پھر میں نے بھابی کی طرف مڑ کر کہا ”جانتی ہیں بھابی۔۔۔ چنانچہ کیسے ان کو یقین آ گیا ہے کہ ان کی تنخواہ سے گھر نہیں چلے گا اس لیے آج کل انہوں نے پارٹ ٹائم کرنا شروع کر دیا ہے۔“

”چنانچہ کس پروموشی نے یہ خبر اڑائی ہے۔۔۔ تم نے بھی یقین کر لیا۔“ بھابی نے آنکھیں چراتے ہوئے کہا۔

”بھابی جان میں بھی آپ ہی کا بھائی ہوں اگر کوئی کچھ کہتا ہے تو میں نہ تنگ جاتا ہوں آپ گلشن میں ایک بلڈر کے آفس میں اکاؤنٹ دیکھ رہے ہیں۔“

”اب ارباز بھی ہو گیا۔۔۔ خرچ بڑھتا تو ہے۔۔۔ آمدنی بھی بڑھانا پڑے گی نا۔۔۔ وہی کر رہا ہوں۔“ بھابی نے جھوٹ کھل جانے پر کہا۔

”اس طرح تو آپ اپنی جان ہلکان۔۔۔ کر رہے ہیں۔۔۔ اپنی صحت بھی دیکھیں۔۔۔ اتنا کام کریں گے تو کیا ہوگا یہ سوچا ہے۔“

”اسی لیے تو میں نے سوچا ہے کہ کسی طرح ایک بار دہی چلا جاؤں وہاں تنخواہ اچھی ہے۔ ایک سال میں سارے دلہندوں کو دور ہو جائیں گے۔“

”کیا مفت میں کوئی لے جائے گا۔۔۔ وہاں جانے کے لیے بھی لاکھ روپے چاہئیں۔“ میں نے ٹوکا۔

”میرا ایک دوست مجھے خرچ دے رہا ہے۔۔۔ میں وہاں پہنچ کر اس کے پیسے لوٹا دوں گا۔“

”کہیں دھوکا نہ ہو جائے۔ آج کل ایسا بہت ہو رہا ہے۔“ میں پُرسوج انداز میں بولا۔

”نہیں۔۔۔ کہنی بڑی ہے اور وہ شخص بھی جانا پہچانا ہے۔“

”مگر بھابی کا کیا ہوگا۔۔۔ وہ اکیلے کیسے رہیں گی؟“

”دو سال کی تو بات ہے۔۔۔ وقت گزرتے دیر گتی گتی

آگ بجھانے کا آلہ

Fire Extinguisher

کاربن ڈائی آکسائیڈ خود نہیں جلتی، جلتی ہوئی چیزوں کو بجھا دیتی ہے۔ کاربن ڈائی آکسائیڈ کی اس خاصیت کے پیش نظر آگ بجھانے کا آلہ بنایا گیا۔ یہ آلہ تکنیکی شکل کا ہوتا ہے اور سرکاری اور غیر سرکاری عمارتوں اور اسپتالوں وغیرہ میں دیواروں کے ساتھ لٹکا ہوتا ہے۔ بسوں اور لاریوں کے اندر بھی آویزاں ہوتا ہے۔ اس کا بیرونی خول دھات کا بنا ہوتا ہے، جس کے نوکدار سرے پر ایک باریک سوراخ ہوتا ہے اور پینڈے پر سوراخ نما کیل ہوتی ہے۔ کیل کے باہر کا سرا جوڑا ہوتا ہے۔ خول کے پینڈے پر دھات کی کیل کے نوک دار سرے سے کچھ اوپر ایک شیشے کی تلی رکھی ہوتی ہے۔ شیشے کی یہ تلی ہلکے گندھک کے تیزاب (سلفیورک ایسڈ) سے بھری ہوتی ہے۔ تلی کے ارد گرد سوڈیم بائی کاربونیٹ (دھوبی سوڈا) کا محلول بھرا ہوتا ہے۔ جب آگ بجھانے کے لیے اس آلے کو استعمال کرنے کی ضرورت ہو تو بیرونی چوڑے سرے کو زور سے زمین پر مارا جاتا ہے، جس سے شیشے کی اندرونی تلی پھٹ جاتی ہے اور اس کے اندر کا گندھک کا تیزاب باہر نکل آتا ہے۔ جب یہ تیزاب سوڈیم بائی کاربونیٹ سے ملتا ہے تو فوری طور پر تیز کیمیائی عمل پیدا ہوتا ہے اور کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس خارج ہونے لگتی ہے اور آگ بجھانے کے لیے استعمال کی جاسکتی ہے۔

مرسلہ فرحت ذاکر، لاہور

آواز Sound

اشیاء کی حرکت سے پیدا ہونے والی توانائی۔ آواز کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کی خدمت ہوا انجام دیتی ہے۔ ٹھوس اشیاء یا سیال مادوں میں ارتعاش سے پیدا ہونے والی بڑی اور چھوٹی موجیں جب کان کے پردوں سے ٹکراتی ہیں تو ہم آواز سنتے ہیں۔ آواز دو حالتوں، پانی، لکڑی اور دوسرے ٹھوس اجسام میں سے گزر سکتی ہے۔ سرد ہوا میں اس کی رفتار کم اور گرم ہوا میں زیادہ ہوگی۔ لوہے اور فولاد میں 16 ہزار فٹ فی سیکنڈ، تانبے میں 11666 فٹ، سیسے میں 4030 فٹ اور چاندی میں 8553 فٹ فی سیکنڈ کے حساب سے سفر کرتی ہے۔ تازہ پانی میں جس کا درجہ حرارت 59 فارن ہائیٹ ہو، اس کی رفتار 4714 فٹ فی سیکنڈ ہوتی ہے۔ ہوا کا درجہ حرارت صفر درجے سینٹی گریڈ ہو تو اس کی رفتار 1880 فٹ فی سیکنڈ یا 742 میل فی گھنٹا ہوتی ہے۔

انسانی کان صرف اس لرزتے ہوئے جسم کی آواز سن سکتا ہے جس کی فریکوئنسی کی قیمت 20 سے زیادہ اور 20 ہزار سے کم ہو۔ آواز پیدا کرنے کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں: ایک مرتعش جسم اور دوسرا مادی واسطہ، material medium مثلاً ہوا وغیرہ کیونکہ آواز کی لہریں خالی فضا یا خلا vacuum میں سے نہیں گزر سکتیں۔ جب آبی بخارات کی مقدار ہوا میں بڑھ جاتی ہے تو ہوا کی کثافت کم ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرطوب ہوا میں آواز کی رفتار بڑھ جاتی ہے۔ اسی طرح نمپر پچر بھی آواز کی رفتار پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر ہوا کے نمپر پچر میں ایک درجہ سینٹی گریڈ کا اضافہ کیا جائے تو اس میں آواز کی رفتار کی قیمت تقریباً 2 فٹ فی سیکنڈ ہے۔ دیگر واسطوں میں آواز کی رفتار مقابلتاً زیادہ ہے۔

مرسلہ: شاہنواز بھٹی، لاڑکانہ

”کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا۔ میں اسی دیرانے میں مر جاؤں گا۔۔۔۔۔ لوگ مجھے لاوارث سمجھ کر دفن کر دیں گے۔۔۔۔۔ آہ میں کیا کروں۔۔۔۔۔ اے میرے اللہ۔۔۔۔۔ تُو نے سب کی مدد کی ہے۔۔۔۔۔ میری بھی مدد کر دے۔۔۔۔۔ کسی کو بھیج دے۔“ پھر زور سے آواز لگائی ”کوئی ہے۔۔۔۔۔ ارے میں مر رہا ہوں۔۔۔۔۔ کوئی مجھے بچالے۔“ بھی میں نے دیکھا کہ ایک عورت تیز تیز قدموں سے آگے بڑھتی جا رہی ہے۔ میں نے آواز دی۔ ”اے عورت۔۔۔۔۔ اے بی بی بات سنو۔۔۔۔۔ میری مدد کرو۔ یہاں آؤ۔۔۔۔۔ مجھ پر رحم کھاؤ۔۔۔۔۔ کون ہو تم۔۔۔۔۔ نزدیک آؤ۔۔۔۔۔ کسی کو بلا لاؤ۔۔۔۔۔ یا صرف مجھے سہارا دو۔۔۔۔۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔۔۔۔۔ پیر میں گولی لگی ہے۔۔۔۔۔ اسی زخمی ٹانگ سے تمہاری بستی تک پہنچ جاؤں گا۔۔۔۔۔ بس مجھے سہارا دو۔“ عورت مڑ کر دیکھتی ہے۔ اس پر نظر پڑتے ہی میں زور سے چیخا ”ارے یہ تم ہو۔۔۔۔۔ رعنا یہ تم ہو۔۔۔۔۔ یہاں آؤ۔۔۔۔۔ مجھے سہارا دو۔“ مگر وہ عورت فوراً غائب ہو گئی۔ اور میں بلکنے لگا ”اف میرے مولیٰ۔۔۔۔۔ یہ کیسا امتحان ہے۔۔۔۔۔ کیوں میرے ذہن کو بھٹکا رہے ہیں۔ بار بار آنکھوں میں کیوں میرے اپنوں کی شبیہ ابھر رہی ہے۔۔۔۔۔ یقیناً میں مرنے والا ہوں۔۔۔۔۔ بھی تو سب اس طرح یاد آ رہے ہیں۔۔۔۔۔ میری موت ایسی ہوگی۔۔۔۔۔ بے یارو مددگار ہوگی۔۔۔۔۔ نہیں میں ایسی لاواری کی موت مرنا نہیں چاہتا اپنوں سے دور میں مرنا نہیں چاہتا۔ اے میرے اللہ۔۔۔۔۔ مجھے بھائی جان جیسی موت نہ دے۔“ اس دن جب یہ خبر آئی تو میں کتنا رو دیا تھا۔ اسی کے بعد ہی تو میری زندگی کا رخ بدلا تھا۔ میں کچھ سے کچھ ہو گیا تھا۔ وہ منظر آج بھی یاد ہے۔ جیسے آنکھوں میں منجمد ہو گیا ہے۔

پوسٹ میں خط دے کر گیا تھا۔ وہ خط لہراتے ہوئے میں نے رعنا کو چھیڑا تھا ”اوتے ہوئے دہی سے خط آیا ہے۔“ رعنا خوش ہو کر بولی ”تمہارے بھائی جان کا خط ہے نا۔“ ”دہی کا ڈاک نکٹ لگا ہے تو وہیں سے آیا ہے اور وہاں بھائی جان کے علاوہ کون ہے جو خط لکھے گا۔“ ”دو مجھے دو۔“ رعنا نے ہاتھ بڑھایا۔ ”کیوں دوں۔۔۔۔۔ میں نہیں دیتا۔“ ”کیوں نہیں دو گے۔“ ”بس میری مرضی۔“ ”واہ رے مرضی۔۔۔۔۔ شرافت سے دے دو۔“ ”نہیں دیتا کیونکہ یہ میرے بھائی کا خط ہے۔“ ”یہ میرے ار باز کے ابو کا خط ہے۔“

اس وقت ایک نہایت حسین لڑکی بھائی جان کی خدمت کا ٹھیکا لیے ہوئے ہے۔۔۔۔۔ آپ کو تو وہ صرف پچاس ہزار روپے رائج الوقت بطور حق مہر ادا کر کے لائے ہیں جب کہ وہ ہر ماہ دس ہزار لے رہی ہے۔“

”نہیں جناب میرے شوہر ایسے نہیں ہیں۔۔۔۔۔ فکر نہ کرنا تمہارا کام ہے۔۔۔۔۔ وہ تو کسی کو نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔“ ”جی ہاں وہ نظر اٹھا کر اسے نہیں دیکھتے۔ تمام مراحل جھکی جھکی نظروں سے طے ہوتے ہیں۔“

”اماں اے سمجھا دیں۔۔۔۔۔ میں مار بیٹھوں گی۔“ ”تو کیا ابھی کھڑی ہیں؟ ابھی تو بیٹھی ہیں۔“ ”اللہ کرے تمہاری بیوی دن رات تم پر شک کرتی رہے۔“ ”ارے بھائی میں اسے فرصت ہی نہیں دوں گا پھر شک کرنے کا وقت کیسے نکالے گی۔“

”جس طرح تم میرے شوہر کو بدنام کر رہے ہو میں بھی اس کے سامنے تمہیں بدنام کر دوں گی۔“ ”بدنام جو ہوں گے تو کیا نام نہ ہو گا۔۔۔۔۔ آپ کو کھلی اجازت ہوگی۔۔۔۔۔ دل بھر کر بدنام کر دینا۔۔۔۔۔ پوائنٹ بھی مجھ سے لے لیتا۔ میں خود بتا دوں گا کہ اس کے کان میں کس کس قسم کا زہر انڈیل سکتی ہیں۔“

”بھتیجی میرا نام رعنا ہے۔ میں اسے ایسا بھڑکاؤں گی کہ وہ ایک ہاتھ میں بیلن دوسرے میں سونٹا لے کر کھڑی رہے گی۔ ادھر تم اندر آئے اور ادھر اس نے۔۔۔۔۔“ ”اللہ بھائی آپ کو قسم سے جلدی سے کسی لڑکی کو ڈھونڈ لیں۔۔۔۔۔ زندگی میں بہار آجائے گی۔“ ”بھتیجی ابھی مفت کا تماشا دیکھا کرے گا۔ واہ واہ کیا سین ہوگا۔“ ”بس رک جاؤ ادھر تمہارے بھائی آئے ادھر میں نے لڑکی ڈھونڈی۔“

”خدا قسم بھابی۔۔۔۔۔ اب اور ظلم نہ کریں۔۔۔۔۔ جلدی سے لڑکی ڈھونڈنا شروع کر دیں۔۔۔۔۔“ ”ادھر میں مزا کا بھابی سے کہہ رہا تھا کہ لڑکی ڈھونڈیں اور ادھر ایک بھیا تک بات مجھے ڈھونڈ رہی تھی۔ گویا میرا پیچھا کر رہی تھی۔ مجھ تک پہنچنے کی سعی میں مصروف تھی۔ دہی باتیں تو مجھے اس رات زخمی حالت میں اندھیری سڑک پر کچھ زیادہ ہی یاد آ رہی تھیں۔ میں سینے کے بل ریٹکتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور ان باتوں کو یاد کر رہا تھا۔ بڑبڑاتا جا رہا تھا۔

”ہے؟“ تبھی دروازے پر دستک ہوئی ہے۔ میں اٹھ کر دروازے پر گیا تو اصغر بھائی کھڑے تھے انہوں نے ایک لفافہ دیتے ہوئے کہا کہ یہ بھائی کو دے دینا۔

میں نے لفافہ لا کر بھائی کو دیا۔ بھائی نے لے کر کھولا پھر اندر کے کاغذات دیکھ کر بولے ”لو دینے کے لیے پاسپورٹ جمع بھی ہو گیا۔ جلد ویزا مل جائے گا۔“

ایک ماہ بعد بھائی چلے گئے۔ اور زندگی پیچ و خم سے روشناس کراتی چلی گئی۔ ایک سال میں کتنے سارے واقعات زندگی کا حصہ بنے۔۔۔۔۔ کتنی بڑی بڑی تبدیلیاں آئیں۔ زندگی کے کیسے کیسے رنگ سامنے آئے مگر مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ میں تو ایک کھنڈر لڑکا تھا۔ مزا جا ویسا ہی رہا۔ ہنسنا ہنسنا ہی کو زندگی سمجھ رہا تھا۔ زندگی کبھی رخ بھی بن جائے گی اس کا سوچا بھی نہیں تھا۔ کیونکہ بھابی کے آجانے سے زندگی مزید خوبصورت بن گئی تھی۔ وہ خود بھی ہنس کھنکھناتے اس لیے زندگی کا صحیح لطف آ رہا تھا۔ زندگی میں حسین رنگ بھرنے کے لیے ار باز بھی آ گیا تھا۔ اس کی قلقاریوں سے ڈھیروں خون بڑھ جاتا۔ کالج سے آتے ہی میں اس کو گود میں لیے ادھر سے ادھر ٹھٹھکتا رہتا تھا۔ وہ خاصا سا وجود میرا عادی ہو گیا تھا۔ بھابی لاکھ کہتیں کہ اس طرح اس کی عادت بگڑ رہی ہے مگر میں نہیں سنتا۔ ان ہی کا مذاق اڑاتا کہ بھائی جان کو آنے دیں میں کہوں گا کہ میرے بھتیجے کو گود میں لینے سے یہ جلتی ہیں۔ آپ بھی بھی کبھی ان کو۔۔۔۔۔ بس میرا اتنا کہنا ہی کافی ہوتا کہ وہ مصنوعی غصے میں منہ بنا لیتیں۔ بھائی جان کا خط پابندی سے آرہا تھا۔ ہر ماہ ایک لاکھ روپے کا ڈرافٹ بھی آ جاتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک سال گزر گیا۔ اب ہم سب ان کی واپسی کے منتظر تھے کہ ان کا خط آ گیا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ یہاں ایک نئی کمپنی سے معاہدہ کیا ہے۔ وہ لوگ ہر ماہ دہڑھ لاکھ روپے پاکستانی ادا کریں گے۔ اس لیے میں ابھی نہیں آؤں گا۔ چھ مہینے بعد چھٹی طے کی تب آؤں گا۔ اس خبر سے اماں بھی اداس ہو گئی تھیں اور میں بھی بھابی کا تو پوچھنا ہی کیا۔ وہ تو بہت زیادہ دکھی تھیں مگر میں اپنے آپ کو خوش دکھانے کے لیے، بھابی کے دکھ کو کم کرنے کے لیے ہمہ وقت ہنسی ٹھنکھول کرتا رہتا۔ اس دن بھی بھابی میرا نشانہ بن رہی تھیں۔

”بھابی میرا کہنا میں۔ آپ ایک چکر دہی کا لگا آئیں۔“ ”کیوں۔۔۔۔۔ کیا مجھے وہاں جاتے ہی نوکری مل جائے گی۔“ ”بالکل نوکری ملے گی۔۔۔۔۔ جانتی ہیں کیوں۔۔۔۔۔ کیونکہ

”تو ارباز کو دوں گا آپ کو کیوں دوں۔“

”اللہ ستاؤ نہیں دے دوں۔“

”پہلے بتائیں خط لے کر کیا کریں گی؟“

”پڑھوں گی.... اور کیا کروں گی۔“

”کئیے پڑھیں گی.... میں بتاؤں؟.... پہلے آنکھوں سے لگائیں گی پھر چوم کر کہیں گی ”جان تمنا خط ہے تمہارا... پیار بھرا افسانہ... دل لوند رانہ“ ہے نا... یا کوئی اور گانا گائیں گی.... یہ والا ”میرے پیارے رنگوں وہاں سے کیا ہے ٹیلی فون... تمہاری یاد ستانی ہے۔“

”دیکھو اب زیادہ مت ستاؤ.... شرافت سے خط میرے حوالے کر دو۔“

”خط... ہاتھ سے پکڑیں گی نا۔“

”تو کیا پیر سے پکڑوں گی۔“

”جس ہاتھ میں خط ہوگا پہلے میں اس ہاتھ کو چوموں گا۔“

”اسی ہاتھ کا ایسا تھپڑ پڑے گا کہ اولاد بھی منہ میڑھی پیدا ہوگی.... سبھے.....“

”نہیں بھابی مجھے منہ میڑھی اولاد نہیں چاہیے ورنہ لوگ شک کریں گے کہ میری بیوی بھی منہ میڑھی ہے... اس لیے لیجئے مگر پہلے بتائیں دینی میں آپ کا کون رہتا ہے۔“

”میرے شوہر رہتے ہیں اور کون رہے گا۔ میں نے اپنی ٹھوڑی پر انگلی رکھ کر ”شرمانے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔“ ”میرے شوہر... لیجئے“ اور دونوں ہتھیلیوں پر رکھ کر خط پیش کر دیا۔ ”آپ ہی پہلے پڑھ لیجئے پھر میں پڑھوں گا اگر میرا ذکر ہوا تب۔“

رشنا جلدی جلدی خط کھولتی ہے۔ خط پڑھتے پڑھتے اس کے چہرے کی رنگت بدلنے لگتی ہے پھر وہ تورا کر نیچے گر جاتی ہے۔ رشنا کی حالت دیکھ کر میں نے اماں کو پکارا ”اماں... جلدی آئیں۔“

اماں نے داخل ہوتے ہی پوچھا ”کیا ہوا؟“

”بھابی کو سنبھالیں“ پھر میں خط کے متن پر نظریں دوڑانے لگا۔ لکھا تھا ”میں ایاز کے ساتھ کام کرتا ہوں۔ وہ میرا بہترین دوست تھا۔ گزشتہ ہفتے کمپنی کے ایک ورکر کی غلطی سے وہ بوائلر میں گر گئے۔ یہ خبر باہر جاتی تو کمپنی کی بدنامی ہوتی اس لیے اس کو طبیعتی موت کا سرٹیفکیٹ دے کر جلدی جلدی یہیں دفن کر دیا گیا۔ کمپنی نے بطور ہرجا نہ پانچ لاکھ روپیہ دیا ہے جو میں نے آپ کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دیا ہے۔ آپ چیک کر لیں۔“

الٹ پلٹ کر خط دیکھا مگر اس پر کسی کا نام نہ تھا۔ پورے گھر میں سوگاری چھا گئی۔

وقت گزرنے لگا۔ گزرتے وقت کے ساتھ غم میں کی آگئی۔ ایک دن جب اماں میرے ساتھ بیٹھی تھیں میں نے کہا ”اماں اب کیا ہوگا؟“

”میرا تو دماغ ہی معاؤف ہو گیا ہے۔ تم ہی بتاؤ۔“

”بھابی کا غم دیکھا نہیں جاتا... بے چاری نے خوشیاں دیکھی ہی کہاں... بچپن تنگی ترشی میں گزرا... اب جب راج کرنے کا وقت آیا تو بھائی جان نہ رہے۔“

”مجھے تو ایک اور ڈر ستانے لگا ہے۔“

”کون سا ڈر؟“

”اب ایاز تو رہا نہیں۔ رشنا کا رشتہ ایاز سے تھا۔ جب وہ ہی نہ رہا تو اس کا اس گھر سے کیا رشتہ؟... اس کے گھر والے آکر لے جائیں گے.... وہ جائے گی تو ارباز کو بھی ساتھ لے جائے گی۔“

”ہاں یہ تو ہو سکتا ہے۔“

”ابھی رشنا جوان ہے۔ شیدے اس کی دوسری شادی ضرور کرائے گا۔ ارباز کی تو زندگی ہی بگڑ جائے گی۔“

”ہم ایسا ہونے نہیں دیں گے۔“

جس بات کو میں نے منع تھا۔ انکار کیا تھا کہ میں ایسا ہونے نہیں دوں گا مگر ایسا ہی ہونے جا رہا تھا۔ اماں کا ڈر سچ نکلا۔ عدت کے ایام ختم ہوتے ہی شیدے چاچا آگئے تھے۔

”شیدے بھابی رشنا کو ابھی کچھ دن اور رہنے دیں۔ ابھی زخم نیا ہے۔ یہاں رہے گی تو ہم لوگوں کی خاطر وہ زیادہ غم نہیں منائے گی۔ ہماری خاطر وہ اپنے دکھ کو چھپائے رہے گی۔“

”اگر یہ رشنا کی خواہش ہے تو میں دخل نہیں دوں گا۔ بتائیں میں کب آؤں۔“ شیدے چاچا بولے۔

”فصل کی کٹائی کے کچھ دن بعد آجائیں۔“ اماں نے کہا۔

”آپ جیسا کہیں میں آج ہی لوٹ جاتا ہوں۔“

اس دن شیدے چاچا چلے گئے۔ ہم نے اطمینان کی سانس لی لیکن وقت کبھی رکا ہے بڑی تیزی سے گزرا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چھ ماہ گزر گئے اور چاچا پھر آگئے۔

”باجی آپ کے حکم پر میں اتنے دنوں تک رکا رہا مگر اب اور اسے یہاں نہیں چھوڑ سکتا ہوں۔“ شیدے چاچا نے آتے ہی کہا۔

”یہاں برائی کیا ہے۔ بھابی یہاں رہیں یا وہاں

بات تو ایک ہی ہے۔“ میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ تو گویا ٹھان کر آئے تھے کہ رشنا کو لے کر ہی جانا ہے۔

”نہیں بیٹا اب ایسا ممکن نہیں کیونکہ اب وہ رشتہ ہی نہیں رہا جس رشتے کی ڈور سے وہ بندھی تھی.... اگر اب میں نے اسے یہاں چھوڑا تو لوگ جینا دو بھر کر دیں گے۔ ابھی سے لوگ باتیں بنا رہے ہیں۔ مجھے لسنے دے رہے ہیں کہ بیٹی کو کھانا نہیں سکتا.... میں غریب ضرور ہوں مگر تدار ہوں۔“ شیدے چاچا نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ارباں یہاں سے جائے گا تو بکھر جائے گا۔ اسے چاکی گوڈ کی عادت ہے۔“ اماں نے آخری حربہ آزمایا۔

”ہاں یہ سچ ہے۔ میں ایک غریب آدمی ہوں۔ اس ریت میں بھی تینوں بیٹوں کو پڑھا رہا ہوں۔ اسے جس قسم کی سہولت چاہیے وہ میں نہیں دے سکوں گا۔“

”اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ بھابی کو یہیں رہنے دیں۔“

”کیسے رہنے دوں بھائی.... لوگ طعنے دے دے کر مارے دے رہے ہیں.... اسے یہاں سے لے جائے بغیر چارہ بھی نہیں ہے۔“ شیدے چاچا بولے۔

”بھابی کو یہاں سے لے جا کر کیا کریں گے؟ ان سے اسکول میں ٹیچری کرائیں گے؟“ میں نے جل کر کہا۔

”میں ایک غریب آدمی ہوں۔ بیانی بیٹی بہت بڑا بوجھ ہوتی ہے۔ اسے گھر میں بٹھا بھی نہیں سکتا۔ اس لیے اس کی دوسری شادی کرادوں گا۔“ سانس لے کر وہ بولے ”رہا ہوال ارباز کا تو رزق کا مالک اللہ ہے۔ وہ کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی دے گا.... ہو سکتا ہے جہاں اس کی شادی کراؤں اور لڑکا خود ہی کہہ دے میں اس بچے کو ساتھ رکھوں گا۔“

”یہ ناممکن ہے کہ ہم ارباز کو جانیں دیں یہ اس معصوم پر غم ہوگا۔“ میں نے ختمی لہجے میں کہا۔

”ایک اور راستہ ہے۔“ شیدے چاچا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کون سا راستہ؟“ اماں نے جلدی سے کہا۔

”آپ بھلے ہی کراچی میں رہتی ہیں مگر برادری کے ہم درواج سے تو واقف ہیں نا۔“

”ہاں بولیں۔“ اماں نے کہا۔

”برادری میں صدیوں سے رسم چلی آرہی ہے کہ

مائی کے بعد بھابی پر دیور کا حق ہوتا ہے۔ شہباز اس سے ناوی کر لے۔“

”نہیں میں ایسا نہیں کر سکتا یہ دقیانوسی باتیں ہیں۔“

میں گویا چیخ پڑا۔

”یہ جاہلانہ باتیں نہیں ہیں۔ تم کسی بھی عالم دین سے مشورہ کر لو۔ شوہر اگر پردیس میں جا کر مفقود الخیر ہو جائے تو طلاق ہو جاتی ہے۔ یہاں تو مرنے کا ثبوت بھی ہے، ایاز کے دوست کا خط موجود ہے۔“

”گویا رشنا کا دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے نا، شہباز سے نکاح؟“ اماں نے چونک کر کہا۔

”مگر میں بھابی کو بہت عزت دیتا ہوں۔“

”اگر عزت دیتے ہو تو یہ کیسے قبول کرو گے کہ کوئی اور اس عزت کا مالک بن جائے؟ ذرا سوچو.... ارباز کی طرف دیکھو.... کیا اسے سوتیلے باپ کے حوالے کر دو گے؟ بولو، ہے کوئی جواب؟“ شیدے چاچا نے گویا میری دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی تھی۔

”پہلے میں بھابی سے بات کروں گا۔“ میں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

”میں بات کر آئی ہوں وہ تیار ہے۔“ اماں نے کمرے میں آکر کہہ ساد اور میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

☆ ☆ ☆

اس ویرانے میں زخمی حالت میں سینے کے بل ریختے ہوئے بھی میں یہی کچھ سوچ رہا تھا۔ بھائی کو یاد کر رہا تھا۔ اللہ سے معافی مانگ رہا تھا۔ ”اے میرے اللہ اس اذیت سے نجات دے.... اف“ کیسی شدید اذیت ہے۔ درد مارے ڈال رہا ہے اب برداشت نہیں ہو رہا ہے.... آہ.... اے خدا میرے اللہ میری اذیت کو کم کر دے.... مجھے حوصلہ دے.... برداشت کرنے کی قوت دے۔ کسی کو اتنے نہ دیکھ کر میں سر کو زمین پر رکھ کر رونے لگا ”میری کوئی مدد نہیں کرتا۔ میں کیا کروں میں مرنا نہیں چاہتا.... میں زندہ رہنا چاہتا ہوں.... میں کیا کروں.... میرا بچہ تو ابھی دنیا میں آیا بھی نہیں ہے.... میں ایک نظر اسے دیکھنا چاہتا ہوں.... اب اور سہا نہیں جاتا.... بہت درد ہو رہا ہے.... بہت اذیت ہو رہی ہے.... اب میں نہیں بچوں گا.... آسمان پر سپیدی سحر نمودار ہونے لگی تھی میں پھر آگے بڑھنے لگا۔ ذہن بنانے کے لیے بڑبڑاتا جا رہا تھا۔ ”مجھے معاف کر دیں بھابی.... میرا کوئی قصور نہیں ہے.... میں نے تو انکار کیا تھا.... کتنا منع کیا تھا.... مگر میری کوئی نہیں سن رہا تھا.... سب ایک ہو گئے تھے.... خود بھابی کی خواہش تھی۔ ارباز کی خاطر میں نے ہاں کی تھی وہ بھی ارباز کے

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

مستقبل کی خاطر راضی ہوئی تھی... اس رات میں کتنا رویا تھا۔ میرے ذہن میں سہاگ رات کا منظر تازہ ہو گیا تھا۔ رعنا دلہن بنی بیٹھی تھی۔ اسی بیڈ پر دوری بنائے میں بھی بیٹھ گیا تھا۔

”ہر مرد کی زندگی میں یہ رات خوشیاں لاتی ہے... مگر میرے لیے یہ رات غمناک ہے... یہ گٹے میں پھولوں کا ہار نہیں... پھنکار تے ہوئے ناگ ہیں... جو مجھے مسلسل ڈس رہے ہیں۔ کیا کروں سمجھ میں نہیں آتا۔“ میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

”یہی زندگی ہے۔ تم تو پڑھے لکھے ہو... تم نے ہی مجھے مطالعے کا شوق دلایا... کہتے تھے مطالعہ ذہن کو وسعت دیتا ہے... وہ کہانی بھی تمہی نے پڑھائی تھی جس میں ایک لڑکی اپنے حق کی خاطر دنیا سے ٹکرا جاتی ہے۔ دوسروں کی خاطر اپنی خوشیوں کا گلا گھونٹ لیتی ہے۔ میں نے بھی قربانی دی ہے تم بھی غور کرو... میں اب اس کے ساتھ چلی جاتی تو کیا ہوتا۔“

”مجھے تو سزا نہ ملتی... یہ بہت بڑی سزا ہے۔“

”نہیں یہ سزا نہیں انعام ہے... سوچو ابانے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ میرا بوجھ نہیں اٹھا سکتے... گھر لے جا کر میری دوسری شادی کر دیتے۔ اس کے بعد کیا ہوتا میرا راز باز سوتیلی باپ کے رحم و کرم پر رہتا... اس کی زندگی برباد ہو کر رہ جاتی... یہاں تم ہو... اماں ہیں... اس کی زندگی پر غم کا سایہ بھی نہیں پڑے گا۔ اس کی زندگی بنانے کے لیے ہم اور تم دونوں نے قربانی دی ہے۔“

”مگر کیا کروں آپ کا تقدس دل میں موزن ہے... آپ کو ہاتھ لگاتے ہوئے بھی دل ڈرے گا۔“

”آپ نہیں تم... اب میں آپ کی بیوی ہوں۔ راز باز کی خاطر سب کچھ بھول جائیں، اس کی خاطر مجھے اپنی زندگی میں شامل کر لیں۔“ کہتے ہوئے اس نے لائٹ بجھا دی تھی۔

☆☆☆

پھر اندھیرا چھٹ گیا۔ دور ایک بستی کا ہیولا نظر آنے لگا۔ میں ادھر بڑھتا جا رہا تھا۔ بڑبڑاتا جا رہا تھا۔ ”اے میرے اللہ... بس اتنی ہمت دے دے... میں کسی طرح اس بستی تک پہنچ جاؤں۔ اف... کاش اس دن میں گھر سے نہ نکلتا... کاش میں پروگرام کینسل کر دیتا۔ اس دن کا منظر نظروں میں آنے لگا۔

مرکز سے بار بار کال آرہی تھی۔ میں نے چھٹی لے رکھی تھی مگر نوکری ایسی تھی کہ امیر جنسی میں مجھے بلایا جا رہا

تھا۔ ایسے وقت انکار نہیں کیا جاسکتا اس لیے میں جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ جب باہر نکلنے لگا تو رعنا نے کہا ”آپ کب تک واپس آئیں گے؟“

”دو چار گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے۔“

”اگر اس درمیان اسپتال جانا پڑا تو؟“

”اماں ہیں نا... ان کو لے کر چلی جانا۔ سہرا ب کور سینٹرون کر دینا۔ آخر کسی کو بھیج دے گا۔“

”پھر بھی آپ کا ہونا ضروری ہے۔“

”ارے بھائی سارے مراحل ڈاکٹریوں کو سٹے کر رہے مجھے نہیں۔“

”آپ تو ہر بات کو مذاق میں اڑا دیتے ہیں۔“

”اور سنو اس بار راز باز کے لیے بہن لاتا ہے۔“

”گو یا یہ سب میرے اختیار میں ہے۔“

”اے لوجب مجھ پر اختیار حاصل کر سکتی ہو تو پھر...“

”سنجیدہ ہو جائیں... جلدی واپس آنے کی کوشش کریں گے۔“

”اچھا بابا مریض کو اتار کر فوراً آ جاؤں گا۔“ کہہ کر میں گھر سے باہر آ گیا۔ مرکز پہنچتے ہی مجھے ایمبولنس کی چابی دی گئی اور آرڈر بک۔ میں سائرن بجاتا ہوا قحبہ کالونی کی طرف دوڑ چلا پھر میرے ساتھ جو کچھ ہوا وہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ میں زخمی حالت میں کراہتا ہوا خود کو گھسیٹتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ آسمان پر سفیدی چھا گئی تھی، آبادی اب صاف نظر آ رہی تھی اسی لیے میں زور زور سے آواز لگانے لگا ”ارے بھائی کوئی ہے... کوئی میری مدد کرو۔“ یہی دور سے کسی کی آواز سنائی دی ”کون... کون ہے؟“

”میں یہاں ہوں... ادھر جھاڑیوں کے پیچھے... میں زخمی ہوں میری مدد کرو۔“ میں نے چیخ کر کہا۔

ایک شخص سامنے آیا۔ معائنہ کے بعد بولا ”غیر و میں رکشالے کر آتا ہوں۔“

”اسی اللہ کے بندے نے مجھے اسپتال پہنچایا۔“ ڈاکٹر بھی میری سرگزشت سن کر حیران رہ گئے۔ ان کے بقول میں نے پورے تین کلومیٹر کا فاصلہ رینگتے ہوئے طے کر لیا تھا، وہ میری سخت جانی پر محو حیرت تھے۔ اس اسپتال میں ٹریینٹ دے کر اگلے دن رخصت کر دیا گیا میں ایمبولنس میں سوار ہو کر گھر پہنچا۔ ایمبولنس جب میرے دروازے پر رکی تو گھر بند پڑا تھا۔ برابر والے نے آکر جانی دی اور بتایا اماں رعنا کو اسپتال لے کر گئی ہیں۔ اسی کی مدد لے کر

ایمبولنس والے نے مجھے بیڈ روم تک پہنچایا۔ بیڈ پر لیٹا ہوا میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اپنے گھر تک پہنچ گیا۔ اتنی بڑی مصیبت سے بچ کر آ گیا۔ بھی دروازہ کھلا اور میں حیرت سے چل پڑا۔ اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ میرے خواب و خیال ہی بھی نہ تھا کہ ایسا کچھ دیکھوں گا مگر حقیقت نظروں کے سامنے تھی اسے جھٹلا بھی تو نہیں سکتا تھا۔

”بھائی آپ... آپ؟“

”ہاں یہ میں ہی ہوں۔“

”مگر وہ خط وہ اطلاع؟“

”وہ خط میں نے ہی بھجوا دیا تھا۔“

”مگر کیوں... یہ بھی سوچا تھا کہ اس کا رد عمل کتنا خوفناک ہوگا۔“

”اس وقت وہی ایک راستہ تھا۔ بڑی لمبی کہانی ہے ناؤں گا... اماں کہاں ہیں... رعنا نظر نہیں آرہی؟ راز باز کتنا بڑا ہوا؟ کیسا ہے وہ؟“

”وہ... وہ... اماں اور رعنا کہیں گئی ہیں۔“ میری آواز میں گھبراہٹ تھی۔

”اوب قاعدہ سب گھول کر پی گئے... بھائی نہ کہہ کر نام لے رہے ہو... میری عدم موجودگی میں اس کا وقار تک بھول گئے؟ بھائی کی تیوری چڑھ گئی تھی۔“

”وہ... وہ آپ نے رعنا کہا تو... تو میرے منہ سے بھی نکل گیا... گھبراہٹ میں...“

میرے دماغ میں شور ہو رہا تھا کہ اب کیا ہوگا... بھائی اتنی بڑی خبر سن کر پاگل ہوا نہیں گے... کہ اب ان کی بیوی میری بیوی ہے... میرے بچے کی ماں بننے اسپتال گئی ہے... یہ گھر تو اب شاہ ہو جائے گا... اماں بھی ٹوٹ کر رہ جائیں گی۔

”رعنا راز باز کو ساتھ لے کر گئی ہے۔“

”جی... جی ہاں۔“

”کب تک آئیں گی؟“

”بس آتی ہوں گی... آپ بیٹھیں تو...“

”تمہاری یہ حالت کیسے ہوئی... رعنا کی الجھن میں اتنی بڑی بات پوچھنا بھول گیا۔“

”بس سے پھسل کر گر گیا تھا۔“

”اچھا اچھا... رعنا کیا دور گئی ہے۔“

”پتا نہیں... جہاں بھی گئی ہیں اماں کے ساتھ گئی ہیں۔“

”راز باز بھی ساتھ ہے نا؟ وہ اسکول جاتا ہے نا۔“

آفتاب ظفر

پاکستان کے ممتاز مصور۔ وہ گورداسپور میں پیدا ہوئے۔ 1943ء میں جب ان کی عمر صرف چھ برس کی تھی تو انہوں نے تحریک پاکستان سے متعلق کئی ایک تصاویر بنائیں۔ 1948ء میں ان کے والد نے تمام تصاویر حضرت قائد اعظم کی خدمت میں پیش کیں تو قائد اعظم نے جواب دیا کہ مجھے امید ہے کہ آگے چل کر یہ بچہ میری قوم کا بڑا فنکار بنے گا۔ گیارہ سال کی عمر میں نیشنل کالج آف آرٹس جو اس وقت میوا اسکول آف آرٹس کہلاتا تھا میں داخلہ لیا جہاں انہوں نے تین سال کا کورس مکمل کیا۔ 13 سال کی عمر میں اپنے اسکول کے وائس پرنسپل اور مشہور مصور شیخ احمد کے ساتھ کراچی چلے گئے اور اپنے استاد کے ساتھ مل کر امریکا کے مشہور ناشر سلور برڈٹ کی تاریخ پاکستان اور جغرافیہ کی کتابوں کے لیے تصاویر بنائیں۔ 1966ء میں انہوں نے پاکستان آرٹ انسٹیٹیوٹ کراچی کی بنیاد رکھی۔ اس دوران میں 1965ء میں کراچی آرٹس کونسل میں ان کی بنی ہوئی تصویر ”گھریلو خاتون“ پر انہیں پہلا انعام دیا گیا۔ 1967ء میں لڈی ڈانس کو دوسرا انعام دیا گیا۔ 1970ء میں انہیں پاکستان کے قومی عجائب گھر واقع کراچی میں گندھارا گیلری کو سجانے کا موقع دیا گیا۔ حکومت پاکستان نے مرزا غالب پر ایک دستاویزی فلم کے لیے غالب کی زندگی کے مختلف مناظر ان سے بنوائے۔

مرسلہ: زاہد تسلیم، کراچی

”جی ہاں... آپ بیٹھیں تو اور یہ بتائیں ایسا کیوں کیا تھا۔“

”دولت بہت بری چیز ہے۔ زیادہ سے زیادہ کمانے کے چکر میں غلط لوگوں میں پھنس گیا تھا۔ ان لوگوں کے ساتھ کام کر کے دوبار میں ہی چار لاکھ روپے جمع کر لیے تھے کہ ان کا ایک بندہ پکڑا گیا۔ وہ میرے گھر بھی آتا تھا اس لیے مجھے بھی گرفتار کر لیا گیا۔ وہاں کا قانون ہے کہ ڈرگ سپلائی کرنے والے کو موت کی سزا دے دی جاتی ہے... میں نے یہی سمجھا کہ مجھے بھی یہی سزا ملے گی... بے عزتی الگ ہوگی۔ یہ خبر پاکستان پہنچی تو تم لوگ بھی شرمسار ہوتے... لوگ تمہیں طعنے دیتے... راز باز کی زندگی برباد ہو جاتی... لوگ اسے اسمگلر کا بیٹا کہتے... اسی لیے میں

نے.... وہ جھوٹی اطلاع بھجوا دی۔ مگر بعد میں شک کی بنیاد پر صرف دس سال کی سزا ہوئی۔ خیر جو ہونا تھا ہو گیا۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے میں کچن میں دیکھتا ہوں شاید کچھ مل جائے۔ بھائی جان کمرے سے باہر نکل گئے۔

بھائی جان باہر نکل گئے تھے مگر میرے اندر ایک طوفان سا اٹھ رہا تھا۔ اس وقت میری بس ایک ہی دعا تھی کہ اے اللہ کسی طرح آنے والے طوفان کا رخ موڑ دے۔ بھائی کو حقیقت معلوم ہوگی تو قیامت آجائے گی..... رعنا ان کی بیوی ہے وہ اسپتال سے لوٹے گی تو اس کی گود میں میرا بچہ ہوگا.... یہ بہت بڑی بات ہے قیامت ہی تو آجائے گی..... اب کیا ہوگا.... بھائی کا رد عمل کیا ہوگا... اماں کیا کہیں گی..... خود رعنا کا رد عمل کیا ہوگا۔ بھائی سارا قصور میرا ٹھہرائیں گے..... یہ گھر تباہ ہو جائے گا.... بسی بسائی گرہستی اجڑ جائے گی.... میں بستر پر لیٹا یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ بھائی واپس آئے۔ ان کا چہرہ سپاٹ تھا... ان کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ اسے انہوں نے میرے سر ہانے رکھا اور باہر جاتے ہوئے بولے ”میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں“ اور باہر نکل گئے۔ وقت گزرتا رہا میرے اندر جنگ جاری رہی... سارا وقت میں نے سوچ میں گزار دیا شام ہونے کو آگئی تھی۔ میں نے بیڈ سوچ دبا کر بلب جلایا تھا کہ میری نظر کتاب پر پڑی اور میں نے وقت گزاری کے لیے اسے اٹھا لیا تبھی اس میں سے نکل کر ایک خط نیچے گرا۔ میں نے اسے کھولا تو ایک ایک سطر قیامت تھی۔ بھائی نے لکھا تھا ”میرے بھائی شہباز“ میں نے سب کچھ جان لیا ہے۔ تمہارے کمرے میں رعنا کی دلہن بنی تصویر دیکھ کر مجھے تمہارے گھبراہٹنے کی وجہ سمجھ میں آگئی ہے۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ حالات کچھ بھی کرا سکتے ہیں اس لیے میں ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں مجھے ڈھونڈنے کی کوشش مت کرنا اور نہ کسی کو کچھ بتانا۔ سب مجھے مردہ تصور کر رہے ہیں تو کرنے دو۔ حقیقت بتا کر رعنا اور اماں کی زندگی کو ملامت میں نہ ڈالنا۔ قسمت میں جو لکھا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ فقط تمہارا بد قسمت بھائی ایاز“ میں دو یا موت کے منہ سے بچا ہوں ایک بارتب جب گولی لگی اور دوسری بارتب جب بھائی آئے۔ وہ غصے میں کچھ بھی کر سکتے تھے۔ ان کی بیوی اب میری جو ہے اس لیے وہ

مجھے گولی بھی مار سکتے تھے۔ کوئی بھی بڑا حادثہ ہو سکتا تھا مگر میں زندہ رہ گیا۔ بھائی کی عظمت کو یاد کرنے کے لیے زندہ رہ گیا۔ مگر نہیں یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ اس لیے کہ اصل قیامت تو تب آئی جب رعنا تین دن بعد اسپتال سے میرے بیٹے کو گود میں اٹھائے گھر آئی۔

جب وہ گھر آئی تھی تو میں نارمل ہو چکا تھا مگر میری ایک چھوٹی سی غلطی نے سب کچھ الٹ پلٹ دیا۔ میں سوکر اٹھا تو بچہ بری طرح رو رہا تھا۔ میں نے رعنا کو بیدار کرنے کے لیے اسے کندھے سے ہلایا تو وہ لڑھک گئی۔ تب میں نے دیکھا کہ اس کی مٹھی میں کاغذ دبا ہوا ہے اور منہ سے جھاگ سا گر رہا ہے۔ میں نے جلدی سے مٹھی کھولی تو اس کاغذ پر لکھا تھا ”تمہارا بچہ تمہارے حوالے۔ تم سے مجھے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میری قسمت ہی ایسی ہے۔ تم نے بات چھپائی کہ تمہارے بھائی آئے تھے مگر میں نے تمہارے بستر کے نیچے پڑا خط پڑھ لیا ہے، میرا شوہر زندہ تھا اور میں نے دوسری شادی کر لی۔ میرا ضمیر مجھے جینے نہیں دے گا اس لیے میں نے نیند کی گولیاں کھالیں۔ میری خودکشی پر پردہ ڈال دینا ورنہ خواہ مخواہ پولیس تھانے کا مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔ میرے دونوں بیٹوں کا خیال رکھنا۔ فقط بد نصیب رعنا۔“ میں نے خط چھپا لیا۔ سب نے یہی سمجھا کہ پیدائش کے وقت کوئی پیچیدگی ہوگئی ہے اسی لیے رعنا زندہ نہ رہ سکی۔ اماں نے بچے کو سنبھال لیا لیکن وہ بھی زیادہ دن ساتھ نہ دے سکیں۔ ان کے بعد میں بچوں کو لے کر بہن کے پاس آ گیا ہوں۔ اگر آپ کو میری کہانی ایسی لگے کہ اسے چھپوایا جا سکتا ہے تو ضرور چھپوادیں۔

شمارہ فروری 2013ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیش کش..... آپ کا انتخاب

☆ اول: کیسا اپنا پن..... ارسلان احمد (کراچی)

☆ دوم: انگارا..... عمران (لاہور)

☆ سوم: دوہرا معیار..... ڈاکٹر مہرین مہرو (فیصل آباد)

پہلے دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بھی منتخب کیجئے

ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے